منتخب
اردو
ڈرامے
(۱)

سلسلہ مطبوعات نمبر ۳۶۰

مرتبہ کمال احمد رضوی

طابع شیخ نیاز احمد

مطبع علمی پرنٹنگ پریس لاہور

۱۹۶۰ء

کمال احمد رضوی

پھول، موسیقی اور چاندنی رات کے نام

مندرجات

عنوان	مصنف	صفحہ
گفتنی	محمود نظامی مرحوم	۹
سیدھی بات	کمال احمد رضوی	۱۴
فالتو چیزیں	آغا بابر	۱۷
ایک ہے لڑکی	ابراہیم یوسف	۳۷
ان کا معاہدہ	ابن سعید	۵۳
صبح و شام	اپندر ناتھ اشک	۸۹
مصور	احمد ندیم قاسمی	۱۲۷
چھوٹے میاں	اصغر بٹ	۱۶۱
تنکے کا سہارا	امجد حسین	۱۸۵
باشندے	انتظار حسین	۲۱۹
مایا	انتظار حسین	۲۴۱
بخت آور	سید انصار ناصری	۲۵۹
گدھوں کے سائے	انور جلال	۲۹۳
کوچ	انور عظیم	۳۱۵
آقا	جاوید اقبال	۳۴۳
اناناس اور ایٹم بم	خواجہ احمد عباس	۳۶۹
دینو	دھرم پرکاش انند	۳۸۵
خواجہ سرا	راجندر سنگھ بیدی	۳۹۹
جبرو	رحمان مذنب	۴۳۵
سلسلے بگڑتے بنتے	ریاض جاوید	۴۶۷
دشمن	ریوتی سرن شرما	۴۸۵
بیمار	سجاد ظہیر	۵۱۵
ماچس کی ڈبیہ	سعادت حسن منٹو	۵۳۱

جہاں پناہ	شوکت تھانوی	۵۴۵
اجالا	ظہیر کاشمیری	۵۶۱
سرود زندگی	عشرت رحمانی	۵۷۳
دلہن کیسی ہے	عصمت چغتائی	۶۰۳
سرخ فیتہ	قدرت اللہ شہاب	۶۱۹
سرائے کے باہر	کرشن چندر	۶۳۱
خانے اور یہ خانے	کمال احمد رضوی	۶۵۵
اس دیوار	مجتبٰی حسن	۶۸۵
حویلی	مرزا ادیب	۷۱۳
مہمان	ممتاز مفتی	۷۴۱
مریض قلب	ناصر شمسی	۷۶۱
نوری خالہ	ہاجرہ مسرور	۷۷۹

O

خدا : ہم زمین پر انسان کو اپنا خلیفہ بنا رہے ہیں ۔

فرشتے : لیکن بار الٰہ ۔ یہ تو وہاں قتل و خونریزی کرے گا اور فساد پھیلائے گا اس منصب کے مستحق تو ہم ہیں کہ تیری تسبیح کرتے ہیں ۔

خدا : جو ہم جانتے ہیں وہ تم نہیں جانتے ۔ سجدہ کرو اسکی طرف ۔

(تمام فرشتے سجدہ کرتے ہیں)

ہاں ! عزازیل ! تم نے سجدہ نہیں کیا !

عزازیل: میں اسے سجدہ نہیں کروں گا ۔ کیونکہ یہ مٹی سے بنا ہے اور میری خلقت آگ سے ہے ، جو مٹی سے افضل ہے ۔

خدا : ہم تمہیں اس نا فرمانی پر راندۂ درگاہ قرار دیتے ہیں ۔ نکل جاؤ یہاں سے ۔

یہ ہے وہ بزم ہستی کا پہلا ڈرامہ جو محفل قدس میں انسان کی خلقت کے موقعے پر کھیلا گیا ہوگا ۔ جب مٹی کے اس پتلے میں روح پھونکی گئی ہوگی تو دربار خداوندی کا منظر کسقدر دلکش اور پر ہیبت ہوگا ۔ فرشتوں کے نورانی پیکر دو رویہ دست بستہ قطار باندھے کھڑے ہوں گے ۔ ایک طرف عزازیل اپنی خودی کے نشے میں سرشار ، سینہ تانے استادہ ہوگا ۔ مٹی کے پتلے میں جان ڈالنے کے بعد خدائے قہار کی طرف سے سجدے کا حکم ملا ہوگا ۔ فرشتے جھکے ہوں گے اور عزازیل نے جس متکبرانہ انداز سے تن کر سجدہ کرنے سے انکار کیا ہوگا وہ منظر کتنا قابل دید ہوگا ۔ پھر خدا اور عزازیل کا مکالمہ کسقدر سنجیدہ اور سحر آمیز ہوگا ۔ یعنی اس واقعے میں ڈرامے کے پورے عناصر جلوہ گر ہیں ۔

انسان کی خلقت اس مقدس تمثیل سے ہوئی ۔ پھر خود اس کا بھی وہی حشر ہوا جو عزازیل کا ہوا تھا ۔ وہ بھی جنت سے زمین پر پھینک دیا گیا ۔ اور

کرۂ ارض پر ھابیل و قابیل کا سانحہ انسانی زندگی کا پہلا المیہ ہے۔ پھر یہ سٹیج وسیع ہوتی گئی اور انسان نے قدم قدم پر زندگی کو ڈرامہ بنا دیا۔ یہ دنیا اور ہے کیا؟ ایک سٹیج ھی تو ہے۔ انسان اپنی زندگی میں اپنے ھاتھوں بحران پیدا کرتا رہا اور تمام حادثے اور واقعے تاریخ کے نام سے قلمبند ہوتے رہے۔ جو ذھن زیادہ حساس اور متجسس تھے وہ ان بحرانوں کو ڈراموں کے قالب میں ڈھالتے رہے۔ ایسے ھی لوگوں کو ھم تمثیل نگار کہتے ھیں۔ جب کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے یا کوئی جذبہ پیدا ہوتا ہے تو تمثیل نگار اسے دکنے چوکنے تاثر کے ساتھ اپنے الفاظ میں ڈھالتا ہے۔ وہ کوئی نئی بات نہیں کہتا بلکہ محض گزری ھوئی باتوں یا معاشرے کے ان اندھیرے اجالوں کی عکاسی کرتا ہے جو ھر روز ھمارے آگے پیچھے نظر آتے ھیں۔

ڈرامے کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ دنیا میں شاید ھی کوئی ملک ایسا ھو جہاں سٹیج مختلف شکلوں میں ظاھر نہ ہوتی رھی ھو۔ اس فن کی ترقی اور نشوونما میں مغرب کو خاص امتیاز حاصل ہے جہاں ڈرامے نے تمام تدریجی مراحل طے کیں اور نقطہ کمال کو پہنچا۔ مغرب ھی نے دنیا کو بائیسکوپ اور موجودہ فلمی صنعت سے روشناس کیا لیکن فلم کی عالمگیر مقبولیت کے باوجود مغرب میں سٹیج کی اھمیت کم نہیں ہوئی۔ سٹیج پر تماشائی اور اداکار کا رابطہ بلا واسطہ ہوتا ہے۔ اداکار ایکٹ کرتا ہے اور تماشائی کسی درمیانی واسطے کے بغیر اسے دیکھتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس فن کو سائنس کی بڑی سے بڑی ایجاد، سنیما اور ٹیلی ویژن وغیرہ بھی نابود نہیں کر سکیں۔ البتہ ھمارے ھاں فلمی تصاویر کی وجہ سے سٹیج کو فروغ حاصل نہ ھو سکا۔

یہاں پاکستان میں ڈرامے کی نشو و نما اور عروج و زوال پر بحث کرنا مقصود نہیں لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو میں تمثیل نگاری کسی دور میں بھی نہ تو اپنے ماحول کی مکمل عکاسی کر سکی اور نہ ھی انفرادی صنف کی حیثیت سے اس کا رنگ جم سکا۔ اردو ڈرامے کا آغاز اندرسبھا سے ہوا ھو یا نہیں اور سے، یہ الگ بحث ہے لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ اردو پر فارسی کا اثر غالب رہا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ھماری زبان میں اندرسبھا تک ایک درد نا ک سا خلا نظر آتا ہے حالانکہ ھندوستان میں سنسکرت ڈرامہ موجود تھا اور وہ ھمارے مصنفین کو متاثر کر سکتا تھا۔

بہر حال جب ھمارے ھاں ڈرامہ کو فروغ ہوا تو اکثر و بیشتر شیکسپیئر کے چربے نظر آنے لگے۔ یا اس سے ھٹ کر اگر اپنے گرد و پیش اور معاشرے کی

طرف رجوع کیا گیا تو تمثیل نگار رنڈی کے کوٹھے اور شراب خانے سے باہر نہ نکل سکا ۔ اس دور کے ڈراموں پر نظر ڈالیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کے موضوعات کی کوئی تعیین نہیں تھی ۔ ہر پھر کر ایک ہی لگے بندھے انداز اور چند موضوعات کی لکیر پیٹی جا رہی تھی ۔ معاشرے میں جو خرابیاں یا نقائص تھے وہ سب کے سب تمثیل نگاروں کے ذہن میں نہ تھے ، گھسے پٹے موضوع کے علاوہ کوئی آنچ ان کے بس کی نہ تھی ۔ غالباً وہ یہ سوچ ہی نہ سکتے تھے کہ زندگی ایک بحر ناپیدا کنار ہے ۔ قدم قدم پر ایک طلسم تماشا موجود ہے ۔ لوگوں کی روزمرہ کی زندگی ، ان کے احساسات ، آرزوئیں اور خدشات ، ان کی جہد البقا ۔ ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مسائل اور معاشرے میں گونا گوں جذبات کے محرکات ۔ ان کی طرف کسی کا دھیان ہم کر نہیں جاتا تھا چنانچہ ہماری زبان کے تمثیل نگاروں کی کم فہمی ، بے علمی ، اور محدود نقطۂ نظر کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ تو ڈرامے کی انفرادیت قائم ہو سکی اور نہ ہی معاشرے کی زندگی کی صحیح ترجمانی ہو سکی ۔

اس خیال سے گزشتہ دور کے کسی ڈرامہ نویس کی تحقیر یا توہین مقصود نہیں ۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ در برحق تھے مگر وہ زمانہ تھا ہی کچھ ایسا کہ علما اور اساتذہ میں سے کسی مسلمہ شخصیت نے اس فن کی طرف توجہ نہ دی ۔ غالباً شاعر اور ادیب اس فن پر قلم اٹھانا اپنی توہین تصور کرتے تھے ۔ اس کے وجوہ کچھ بھی ہوں لیکن حقیقت کچھ ایسی ہی تھی ۔ چنانچہ ڈرامہ لامحالہ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں چلا گیا اور آخر دم تک رہا جو اگر جاہل نہیں تھے تو کم از کم ان کا شمار بطور اہل علم یا اساتذہ کسی تذکرے میں نہیں آتا ۔

خیر ، وہ دور گزرا تو ایک اور مصیبت ہمارے سر آ پڑی ۔ ہر طرف فلم کا سکہ چلنے لگا ۔ گو اس فن شریفہ میں بھی کچھ اسی قسم کے لوگ شامل ہوئے اور ہیں مگر فلم کی آمد سے اردو ڈرامہ میں ایک اور خلا پیدا ہو گیا ۔ لیکن مغرب میں فلم کی مقبولیت کے باوجود ڈرامے کے مختلف تجربات جاری تھے جن کی صدائے بازگشت ہمارے ہاں بھی سننے میں آنے لگی تھی۔ تعلیمی ترقی کے باعث لوگوں کی توجہ پہلے ہی سے مغربی شاہپاروں اور اُدھر کے اصول تنقید پر لگی رہتی تھی جن کے طفیل اس صنف سے انہیں دلچسپی پیدا ہوئی ۔ اور کوئی تیس پینتیس برس ہوئے ہیں کہ ہمارے جواں سال ادیب ڈرامہ کے بدلتے ہوئے رجحانات اور تیوروں سے آگاہ ہونے لگے ۔ مغربی ڈراموں کو اردو زبان میں ڈھالنے کی

ایک باقاعدہ تحریک چل نکلی ۔ وقت اور فاصلے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر مغرب میں ایک ایکٹ کا ڈرامہ وجود میں آچکا تھا ۔ چنانچہ ہمارے جدید لکھنے والوں نے اس صنف کو پسند کیا اور اس پر اچھی خاصی طبع آزمائی کی ۔ شروع میں رسائل اور جرائد کی طرف سے ان کی مانگ آئی ۔ پھر ریڈیو، مصنفین کی حوصلہ افزائی کے لیے میدان میں نکلا اور یہ میدان اب تک اسی کے ہاتھ میں ہے ۔ جہاں تک مکمل ڈراموں کا تعلق ہے اس دور میں بھی اعلی قسم کے مکمل ڈراموں کا فقدان ہی رہا لیکن نوجوان طبقہ ڈرامے کی طرف برابر مائل رہا ۔ بعض درسگاہوں نے کوشش کی کہ سٹیج کا معیار قائم رہے اور انہوں نے کئی مکمل ڈرامے سٹیج بھی کیے لیکن وہ اکثر و بیشتر مغربی ڈراموں کا ترجمہ تھے ۔ گزشتہ بیس برس میں ''انارکلی'' یا ایک آدھ اور تصنیف کے علاوہ ایک بھی ایسا مکمل ڈرامہ نہیں لکھا گیا جسے معیاری کہا جاسکے ۔ اس عہد میں یا تو مغربی ڈراموں کے ترجمے کیے گئے یا پھر ایک ایکٹ کے ڈرامے لکھے گئے ۔ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے ہاں سٹیج نہیں تھی اس لیے ڈرامے کو فروغ نہیں ہوا ، لیکن جیسی بری بھلی سٹیج تھی اس کے لیے جو کچھ لکھا گیا اس میں محولہ بالا دونوں چیزیں صاف نظر آتی ہیں ۔ البتہ ریڈیو پر کبھی کبھی اجتہاد سے کام لیا گیا ۔ اس نے بڑی محنت سے نئے نئے لکھنے والے پیدا کیے ، نئی نئی چیزیں لکھوائیں لیکن مشکل یہ ہے کہ سٹیج اور ریڈیو میں زمین آسمان کا فرق ہے اور یہاں ریڈیو ڈرامہ سے بحث کرنا مقصود نہیں ۔ جس طرح اس دور کی ترقیوں اور تیز رفتاری نے ناول کی بجائے مختصر افسانے کو مقبولیت کی نظر سے دیکھا اسی طرح ایک ایکٹ کا ڈرامہ بھی مقبول ہوا اور نہ صرف ایک ایکٹ کے ڈرامے کثیر تعداد میں ترجمہ ہوئے بلکہ طبع زاد بھی لکھے گئے ۔ نوجوان فنکاروں نے اس صنف کی طرف خاصی توجہ دی اور اس پر بہت کچھ لکھا جس سے اردو ادب میں قابل قدر اضافہ ہوا ۔ اگرچہ سٹیج کے تقاضوں کے پیش نظر ایک ایکٹ کا ڈرامہ مکمل طور پر باعث تسکین نہیں ہوسکتا ۔ کیونکہ اس میں ''کرداریت'' کو بعض اوقات اشاروں کنایوں ہی میں نباہ دیا جاتا ہے جس سے عام طور پر تماشائی کی تشنگی برقرار رہتی ہے لیکن دل و دماغ کی کیفیتیں بہرحال ادا ہوجاتی ہیں اور ایک Situation کا پورا تاثر دیکھنے والوں تک پہنچ جاتا ہے ۔ نئے دور کے تمثیل نگار نے اس بات کو خوب سمجھا ہے اور کامیابی کے ساتھ اسطرف توجہ کی ہے ۔

پچھلے بیس پچیس برس میں ایک ایکٹ کے ڈرامے نے جو تدریجی ترقی کی ہے اس کا بیان تفصیل طلب ہے لیکن پیش نظر مجموعے کو ایک نظر دیکھ

لینے سے اس کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے ۔

کمال احمد رضوی نے ایکٹ ایکٹ کے ۲۳ طبع زاد ڈرامے اس مجموعے میں جمع کیے ہیں ، ان کی تلاش اور جستجو تو قابل ستائش تھی ہی لیکن ناشر کی ہمت بھی کچھ کم قابل داد نہیں ۔ آج کا ناشر ہمیشہ یہ کہتا نظر آتا ہے ''حضور ناول لائیے ناول ، یہاں ڈرامے نہیں بکتے ۔ لوگ ناول پڑھتے ہیں یا افسانے'' لیکن قریباً ۱۷سو صفحوں کا یہ مجموعہ دو جلدوں میں چھپ رہا ہے ۔ سترہ سو صفحات کی منتشر تصنیفات کو اکٹھا کرنے کے لیے جس محنت شاقہ کی ضرورت ہے اس کا اندازہ اس مجموعے کو دیکھ کر ہوتا ہے ۔ اور اسے چھاپنے کے لیے جو دل گردہ چاہیے اس کے لیے اس مجموعے کے ناشر کا نام ضامن ہے ۔ جن ڈرامہ نگاروں کو اس مجموعے میں شریک کیا گیا ہے ان میں آغا بابر ، اپندر ناتھ اشک ، احمد ندیم قاسمی ، امجد حسین ، سید انصار ناصری ، خواجہ احمد عباس ، راجندر سنگھ بیدی ، سجاد ظہیر ، سعادت حسن منٹو ، عشرت رحمانی ، عصمت چغتائی ، کرشن چندر ، ممتاز مفتی ، اور قدرت اللہ شہاب کے نام بھی نظر آتے ہیں ۔ اور اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ مجموعہ بہترین فن کاروں کی نمائندگی کر رہا ہے اور پچھلی ربع صدی میں لکھے ہوئے ایک ایکٹ کے بہترین ڈرامے اس میں اکٹھے کر دیے گئے ہیں ۔ اس مجموعے کی ترتیب میں مؤلف کا اپنا تجربہ خاصا ممد ثابت ہوا ہے ۔ کمال احمد رضوی نہ صرف مترجم اور مصنف ہیں بلکہ ڈراموں کے اداکار بھی ہیں ۔ انہوں نے کئی مغربی شاہکار اردو میں منتقل کیے ہیں ۔ اور کئی مرتبہ ڈراموں کے کردار کو ریڈیو اور سٹیج پر خود بھی پیش کیا ہے ۔ ظاہر ہے اس مجموعے کو ترتیب دیتے وقت پڑھنے اور سٹیج کرنے والوں کی جملہ ضروریات ان کے پیش نظر ہونگی ۔

جی چاہتا تھا کہ ان تمام ڈراموں کا فرداً فرداً جائزہ لیتا لیکن اس سے میری بات طویل ہو جائے گی اور قاری تو الجھن ہوگی کہ میں کیا لے بیٹھا ۔ چونکہ اس مجموعے کے تمام ڈرامے اپنے اندر ایک مخصوص جاذبیت رکھتے ہیں اور تقاضا یہ ہے کہ انہیں شروع سے لیکر آخر تک پڑھا جائے ۔ اس لیے میں نہ چاہونگا کہ میری تحریر اس مطالعے میں مزید رکاوٹ ڈالے ۔ سو اجازت دیجئے اور اس مجموعے کو ملاحظہ فرمائیے ۔

لاہور

۱۲ مئی ۱۹۵۹ء

محمود نظامی

سیدھی بات

اردو میں جدید ڈرامہ کا آغاز ۱۹۳۵ء سے ہوتا ہے جو آج تک جاری ہے۔ یہ زمانہ ادبی اور نظریاتی تجربات کا اہم زمانہ ہے۔ اس ڈرامہ کی مقبولیت میں ریڈیو کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ لیکن ریڈیائی ڈراموں پر نئے نئے فنی تجربات کا سلسلہ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔ چنانچہ کئی سالوں سے ریڈیائی ڈرامہ بھی جامد سا ہو کر رہ گیا۔ اس کے مقابلے میں ان ادیبوں نے ڈرامے لکھے، جو ریڈیائی تکنیک یا صوتی ڈراموں سے الگ ڈرامے کی ایک اپنی ٹھوس حقیقت سمجھتے ہیں۔ انھوں نے اسٹیج کی عدم موجودگی کے باوجود ڈرامے کو فنی اعتبار سے قابل غور اور قابل توجہ بنانے کی سعی کی ہے۔ میری نظر میں ان ڈرامہ نگاروں کی جرات اور حوصلہ مندی قابل داد ہے۔ اور وہ اس دور میں ادب کی اس صنف کو زندگی بخشنے میں مصروف ہیں——جب ہر طرف سے یہ آواز بلند ہوتی ہے کہ اسٹیج کی عدم موجودگی میں ڈرامہ محض مکالمہ کی ایک شکل ہے——یہ آوازیں بلند کرنے میں وہ لوگ پیش پیش ہیں جنھوں نے عرصہ ہوا ایک آدھ ڈرامہ لکھا اور اس کے بعد صوتی ڈراموں کی طرف اپنی توجہ مبذول کر لی۔ یہ لوگ صوتی ڈرامہ کے علاوہ اردو میں ڈرامے کے وجود سے ہی منکر ہو گئے۔ ان لوگوں کے خیال میں ڈرامہ اسٹیج یا تھیٹر کے بغیر کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ ان کے اسٹیج کا تصور، لندن، براڈوے یا ڈرین کے تاریخی تھیٹروں کے مزاری ہے۔ چنانچہ جہاں سرے سے تھیٹر کا وجود ہی نہ ہو وہاں اس انداز سے سوچنا، حقائق سے منہ موڑنے کے مترادف ہے۔

۱۹۳۵ء سے ۱۹۶۰ء تک کے ایک ایکٹ کے سینتیس ڈراموں کا یہ مجموعہ، عبوری، تاریخی، اور ادبی معیار کی پوری پوری نمائندگی کرتا ہے۔ اس میں ہر ڈرامہ اسٹیج پر کھیلا جا سکتا ہے۔ اور اس کے لیے کسی عظیم الشان تھیٹر کی ضرورت نہیں۔ یہ ڈرامے زندگی—— ہمہ گیر زندگی کے

ان مسائل، کو پیش کرتے ہیں جن سے ہر شخص کو کسی نہ کسی دور میں دو چار ہونا پڑتا ہے۔ اور بلا شبہ ڈرامہ کا بھی مقصد ہے۔ کامیاب ڈرامہ، اسٹیج کے باہر بھی اپنے اندر اتنی ہی جاذبیت رکھتا ہے کہ قاری ان ڈراموں کو اپنے ذہن کی اسٹیج پر کھیلتا ہوا محسوس کرتا ہے۔

ان ڈراموں کے انتخاب میں ڈرامے کی یہی اہم خصوصیت میرے پیش نظر بھی۔ اس کے علاوہ ۲۵ سال میں ڈرامے پر جو تجربات ہوئے ہیں، ان کے معیار میں جو نکھار پیدا ہوا اس کا تقاضا تھا کہ انہیں اسی طرح اس مجموعہ میں پیش کیا جائے جس طرح یہ پہلی مرتبہ منظر عام پر پیش ہوئے۔ چنانچہ میں نے کسی ڈرامے میں قطع برید کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس طرح ڈرامے کے تدریجی ارتقا کا اندازہ بھی آسانی سے لگایا جا سکتا ہے ـــــ اور ڈرامائی ادب کے طالب علم کو اردو کے جدید ڈرامے کی تاریخ اور معیار کا بھی بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

یہ مجموعہ پریس میں جا چکا تھا کہ اچانک محمود نظامی صاحب کی المناک موت کی جانکاہ اطلاع پہنچی۔ ان کا لکھا ہوا پیش لفظ جو اس مجموعہ میں شامل ہے، ہمیشہ اردو ڈراما کے ذکر کے وقت ایسے قدیم محسن کی یاد تازہ کرتا رہے گا جس کی ادبی خدمات کے پہلو بہ پہلو ریڈیائی ڈراما بھی اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا۔

آخر میں ان تمام احباب کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے جنھوں نے بکمال خلوص و محبت اپنے ڈراموں کو اس مجموعہ میں شامل کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

کمال احمد رضوی

لاهور

۱۳- مئی ۱۹۶۰ء

فالتو چیزیں

آغا بابر

کردار

ایڈمنسٹریٹر

سٹینوگرافر

منیجر

پی۔ اے لڑکی

شہزادہ نوچند

توفیق رؤف

ہوٹل کا منیجر

نازلی

مُلازم

پہلا منظر

(کمپنی کے آفس کا کمرہ۔ عالی فرنیچر۔ دائیں اور بائیں دو دروازے)

ایڈمنسٹریٹر: سٹینو خط ٹائپ ہو چکا؟

سٹینوگرافر: جی

ایڈمنسٹریٹر: شاباش! ابھی یاد آیا ایک اور ضروری خط لکھنا ہے۔

سٹینوگرافر: میں نوٹ بک لے آؤں (جاتا ہے)

ایڈمنسٹریٹر: (انتظار میں سیٹی بجاتا ہے) (سٹینو آتا ہے) ہاں لکھو۔ مائی ڈیئر! تمھارے آخری خط سے معلوم ہوا کہ فیکٹری کو آگ لگ چکی ہے ملبہ اٹھایا جا رہا ہے۔ نقصان خاصا ہوا ہے مگر تم نے آج تک یہ اطلاع نہیں دی کہ ملبہ میں اس کی نعش ملی یا نہیں، اگر ملی ہے تو کس شکل صورت میں ملی۔ اب تمھاری ضرورت یہاں محسوس ہو رہی ہے تم اپنا کام ختم کر کے جلد واپس آنے کی کوشش کرو۔ فقط تمھارا خیر اندیش

(دروازے پر دستک)

ایڈمنسٹریٹر: یس۔ کم اِن!

منیجر: (داخل ہو کر) ہیلو سر!

ایڈمنسٹریٹر: ہیلو منیجر۔ سٹینو جب تک ہم بلائیں نہیں تم نہیں آؤ گے۔

سٹینو: ویٹ از رائٹ سر!

ایڈمنسٹریٹر: کہیے منیجر صاحب

منیجر: جناب ہمارا کام بہت بڑھ جائے گا؟

ایڈمنسٹریٹر: یقیناً۔

منیجر: یہ فائل میرا چیف رپورٹر بنا کر لایا ہے بڑی تفصیل سے ہر بات پر اس نے روشنی ڈالی ہے ہم نے اپنے

ریمارکس لکھ دیئے ہیں۔ یہ فائل مطالعہ فرمانے کے بعد مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کریں۔

ایڈمنسٹریٹر: کہتا کیا ہے تمھارا چیف رپورٹر؟

مینیجر: لب لباب یہ ہے کہ روز بروز انسان دشمنی بڑھ رہی ہے شادیاں دھڑا دھڑ ناکام ہو رہی ہیں بیویاں خاوندوں کو زہر دے رہی ہیں۔ خاوند بیویوں کو قتل کر رہے ہیں اس نے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں اونچے طبقہ کی عورتوں کے اعداد و شمار دیئے ہیں جن میں جرائم بڑھ رہے ہیں۔

ایڈمنسٹریٹر: زندگی کے راستے رکاوٹوں سے بھر رہے ہیں۔

مینیجر: جی ہاں!

ایڈمنسٹریٹر: راستوں سے یہ رکاوٹیں ہٹانے کی ضرورت بڑھ رہی ہے۔

مینیجر: جی ہاں!

ایڈمنسٹریٹر: ہوں ٹھیک ہے۔ بڑھنے دو۔ اس نے نئے گاہکوں کا کچھ اتہ پتہ دیا ہے؟

مینیجر: جی ہاں تین نئے گاہکوں کی تفصیل اس نے دی ہے اس کی یہ بھی تجویز ہے کہ دو چار اور شہروں میں ہمیں اپنا کام شروع کر دینا چاہیئے۔

ایڈمنسٹریٹر: غور کریں گے ہم فائل کو دیکھنے کے بعد کچھ بتا سکیں گے۔ آپ وہ اخراجات کی فائل بھی لائے ہیں؟

مینیجر: جی ہاں!

ایڈمنسٹریٹر: ہمیں بتایئے شہر میں ان گداگروں کی کیا تعداد ہے جو کمپنی کی طرف سے گاہکوں کا پیچھا کرنے کے کام پر مقرر ہیں؟

مینیجر: دو سو!

ایڈمنسٹریٹر: خرچ؟

مینیجر: دو سو۔

ایڈمنسٹریٹر: فیکٹریوں میں ہمارے آدمیوں کی کیا تعداد ہے۔

مینیجر: بارہ سو۔

ایڈمنسٹریٹر : ہوں ! (ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے ٹیلیفون اٹھا کر) ہیلو۔ ہاں میری گھڑی میں ابھی یہی وقت ہے۔ تین منٹ رہتے ہیں۔ تھینک یو۔

منیجر : کیا پندرہ نمبر فلیٹ سر؟

ایڈمنسٹریٹر : یس پندرہ نمبر فلیٹ (ٹیلی فون آتا ہے) یس آگ لگ گئی : عین اس وقت جب ہمارا انجن ادھر سے گزر رہا تھا۔ شاباش! موقع پر پہنچا۔ جو رپورٹ ہو ہمیں اطلاع دو (منیجر سے کہتا ہے) اطلاع ہے کہ آگ نہیں بجھ رہی، آگ کیسے بجھ سکتی ہے؟

منیجر : پانی میں تیل زیادہ تو نہیں ملایا گیا۔

ایڈمنسٹریٹر : نہیں۔ فائر افیسر کو ہمارا مستقل حکم ہے کہ جب تک خاص حکم نہ ہو پانی کی مقدار دستور کے مطابق ہی ملی ہے۔ ایک تو فلیٹ سے زیادہ وقت نہیں لگے گا۔

منیجر : ہمارا فائر افیسر بڑا تیز آدمی ہے۔

ایڈمنسٹریٹر : کمپنی میں کون سا آدمی ہے جو تیز نہیں، اپنے کام میں تم کم تیز ہو؟

منیجر : تھینک یو!

ایڈمنسٹریٹر : ریڈیو لگاؤ۔ خبروں کا وقت ہے۔

منیجر : جی (پاس پڑے ریڈیو کا بٹن گھماتا ہے۔ خبریں سنائی دیتی ہیں) آدم بلڈنگ کے فلیٹ نمبر پندرہ کو آگ لگ جانے کی ابھی خبر آئی ہے۔ اس فلیٹ میں شہزادہ نوچند کی ماں مقیم تھی جو شعلوں میں بڑی طرح لپٹ گئی، راستہ نہ پا کر اس نے کھڑکی سے چھلانگ لگا دی اور جان بحق ہو گئی۔ فلیٹ کی کوئی چیز نہیں بچی۔ دو فائر انجنوں نے بڑی مشکل سے آگ پر قابو پایا۔ آج تاجروں کی تیسری کانفرنس کا جلسہ ہے

ایڈمنسٹریٹر : بند کرو (منیجر ریڈیو بند کر دیتا ہے) یہ بڑھیا کھڑکی سے کیسے کود گئی؟

منیجر : وہ بڑھیا جو آوارہ شہزادے کا پیچھا کرتے ہوئے ملک ملک پھر سکتی ہے اس سے کوئی بعید نہ تھا مگر ہمارا انتظام تھا کہ وہ وہیں بھسم ہو جائے۔

ایڈمنسٹریٹر : وہی تو ہم حیران ہیں۔

پی اے لڑکی : اندر آسکتی ہوں ؟

ایڈمنسٹریٹر : ہاں

پی اے لڑکی : کوئی صاحب ملنے کے لئے آئے ہیں یہ کارڈ ہے اُن کا ۔

ایڈمنسٹریٹر : (پڑھ کر) پرنس نوچند آنے دو (شہزادہ داخل ہوتا ہے) آیئے شہزادہ صاحب ۔۔

شہزادہ : انشہ میں ہے) ہم نے خبر سن لی ہم آپ کے بہت ممنون ہیں آپ اس کے دفنانے کا انتظام کریں
یہ لیجئے اپنی خدمات کے پیسے چیک ۔ میں ابھی ابھی خلائی کر رہا ہوں ۔ یہاں سے خدا حافظ ۔

ایڈمنسٹریٹر : کمپنی کو بہت افسوس ہے شہزادہ صاحب کہ مرحومہ کھڑکی سے چھلانگ لگا گئی ورنہ معاملہ
آپ سے یہ طے ہوا تھا کہ اس کو وہیں بھسم کر دیا جائے گا ۔

شہزادہ : کوئی بات نہیں ۔ مرحومہ بڑی نیک دل تھی فکر نہ کیجئے معاوضہ میں سے ہم نے کچھ رقم کاٹی نہیں بلکہ
پانچ سو روپیہ انعام کا بڑھا دیا ہے ۔

ایڈمنسٹریٹر : اس کی کیا ضرورت تھی شہزادہ صاحب ؟ آپ کتنے نیک دل ہیں ۔

شہزادہ : خدا حافظ !

ایڈمنسٹریٹر : رفتنت مبارک باد (شہزادہ چلا جاتا ہے)

منیجر : آپ کو یاد ہے وہ عورت ؟ مجھے شہزادہ نوچند کی شکل دیکھ کر وہ یاد آ گئی ہے ۔

ایڈمنسٹریٹر : کون سی ؟

منیجر : وہی جس نے گذشتہ سال اپنے مکان کو آسیب زدہ ظاہر کرنے کے لیے ہماری کمپنی سے مدد مانگی تھی ۔

ایڈمنسٹریٹر : ہاں ہاں ! کمپنی کے لیے اگرچہ وہ کام نیا تھا مگر لطف اس وقت آیا جب اس کے خاوند نے
مکان کے اردگرد پولیس کا پہرہ لگا دیا ۔

منیجر : (ہنس کر) آج تک کسی کو معلوم نہیں ہو سکا کہ اینٹیں کہاں سے آتی تھیں ۔

ایڈمنسٹریٹر : یہ کام کمپنی کے ریکارڈ پر سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے

منیجر : واقعی ! پولیس والے بھی ایک پھکڑ ہم نے چنے تھے ۔ اینٹیں اس طرح پھینکتے کہ یہی معلوم ہوتا کہ بھوت بہت

آؤ میں آیا ہوا ہے۔

ایڈمنسٹریٹر: (ہنس کر) آ ہا ہا ہا - مجھے خوب یاد ہے (ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے) ہیلو جی ہاں بول رہا ہوں کیا کہا ہمارے ٹرک کے ڈرائیور کو بہت چوٹ آئی ہے ہسپتال میں لے گئے ہیں؟ نیور مائینڈ۔ ہاں ہم ابھی ہسپتال میں جاکر اسے دیکھ آئیں گے۔ شکریہ (فون رکھ دیتا ہے) بس زیادہ اہم بات تو یہی تھی۔ ہمارے آدمیوں کو جان کی پرواہ نہیں۔

منیجر: ہمارا ڈرائیور زخمی ہو گیا ہے

ایڈمنسٹریٹر: سیٹھ کی گاڑی بڑی تیزی سے آ رہی تھی۔

منیجر: سات نمبر ڈرائیور تھا؟

ایڈمنسٹریٹر: ہاں۔

منیجر: کوئی بات نہیں وہ تو ہتھیلی پر جان لیے رکھتا تھا۔

(دروازہ پر دستک)

ایڈمنسٹریٹر: کم ان۔

پی اے لڑکی: سر جیبر از اے کانفیڈنشل فائل۔

ایڈمنسٹریٹر: ہمیں دے دو (پڑھتا ہے) توفیق رؤف کو کارڈ دے دیا گیا۔

منیجر: دے دیا گیا۔ گڈ۔

ایڈمنسٹریٹر: منیجر اب تم اکیلے جاکر ڈرائیور کو ہسپتال میں دیکھ آؤ۔ ہم نہیں جا سکتے۔ ہمیں توفیق رؤف کے پیسے رکنا پڑے گا۔

منیجر: گڈ لک سر۔

ایڈمنسٹریٹر: گڈ لک (منیجر جاتا ہے) (ایڈمنسٹریٹر ٹیلی فون کرتا ہے) ہیلو سر کیس نمبر ۲۲۳ توفیق رؤف کو کارڈ دے دیا گیا۔ (پھر ٹیلی فون کا دوسرا نمبر ملاتا ہے) جی میں ایڈمنسٹریٹر بول رہا ہوں۔ چیئرمین بورڈ آف ڈائریکٹرز کو مطلع کر دیا گیا ہے۔ آپ کو اطلاع دینا باقی تھی۔ کیس نمبر ۲۲۳۔ توفیق رؤف کو کارڈ دیدیا گیا (ٹیلیفون کا تیسرا نمبر ملاتا ہے) گڈ لک ٹو یو سر کیس نمبر ۲۲۳ رفیق رؤف۔ جی ہاں کارڈ دیدیا گیا تھینک یو سر

دوسرا منظر

(توفیق رؤف کا کمرہ۔ توفیق کوچ پر یوں لیٹا ہے جیسے تھکا ہوا ہو۔
دو تپائیاں قریب پڑی ہیں: ایک پر ٹیلیفون ہے، ایک خالی ہے)

ملازم: (باہر سے) اندر آسکتا ہوں؟

توفیق: کافی لے کر آئے ہو؟

ملازم: جی ہاں۔

توفیق: لے آؤ۔ یہاں رکھدو (خالی تپائی پر وہ کافی رکھدیتا ہے) ان کھڑکیوں کے پردے نیچے گرادو۔

ملازم: (پردے گراکر) اور کچھ سرکار؟

توفیق: اور کچھ نہیں۔

ملازم: بیگم صاحبہ ابھی تک نہیں آئیں؟

توفیق: ان کی دعوت ہے۔ کھانا کھا کر آئیں گی تم جا سکتے ہو؛ صبح جلدی آجایا کرو۔ تم جانتے ہو ہمارے دونوں نوکر چھٹی پر گئے ہوئے ہیں۔

ملازم: جی ہاں۔ میں تو بڑی صبح آجاتا ہوں۔

توفیق: دیکھو، وہ کتاب پڑی ہے سامنے اسے اٹھاؤ (ملازم اٹھاتا ہے) ہاں اسی کو۔ اس کے نیچے ایک کارڈ پڑا ہے۔ چھپا ہوا کارڈ۔ ہاں یہی۔ بس یہیں دے جاؤ۔ ٹھیک ہے اب تم جاسکتے ہو۔

ملازم: سلام صاحب (جاتا ہے)

توفیق: سلام (کارڈ پڑھتا ہے) حاشیہ پر یہ سنہری لکیریں یہ موٹا دبیز کاغذ کتنی عمدہ چھپائی ہے اشتہار بازی کی بھی حد ہوگئی (پڑھتا ہے) فالتو چیزیں ٹھکانے لگانے والے ہر قسم کے ذاتی معاملات طے کئے جاتے ہیں۔ مشورہ مفت۔ کام کی فیس معمولی اور واجبی۔ ہم اپنے کام کے بڑے

ماہر ہیں۔ ملاقات کے لیے ٹیلیفون کریں یا خود وقت مقرر کریں (کارڈ پر سے نظریں ہٹا کر) آ۔ ٹیلیفون
نمبر بھی دیا ہوا ہے، ہو نہ ہو یہ لوگ کباڑیے ہوں گے مگر نہیں یہ تو لکھا ہوا ہے "فالتو چیزیں ٹھکانے
لگانے والے۔ اگر کباڑیے ہوتے تو کارڈ پر لکھا ہوتا، فالتو اور پرانی چیزیں خریدنے والے۔
پھر یہ لوگ ذاتی معاملات سے کیا مراد لیتے ہوں گے؟ کیوں نہ اس وقت ٹیلیفون کیا جائے، شاید کوئی
ہو (ٹیلی فون کرتا ہے) ہیلو۔ کون بول رہا ہے۔ ایڈمنسٹریٹر کی پی اے۔ کیا میں ایڈمنسٹریٹر صاحب سے
بات کر سکتا ہوں؟ تو ٹیلیفون دیجیے ذرا انہیں۔ ہیلو۔ میں کل شام سیر کر کے واپس آ رہا تھا کہ ایک شخص نے
مجھے ایک کارڈ دیا جس پر لکھا ہوا ہے "فالتو چیزیں ٹھکانے لگانے والے"۔ جی ہاں میں توفیق رؤف
بول رہا ہوں آپ کو میرے نام کا کیسے علم ہے۔ مگر آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں ہی آپ کو ٹیلی فون کر رہا
ہوں، میں تو آپ کو جانتا نہیں۔ کمال ہے آپ نے مجھے حیرت میں ڈال دیا ہے۔ ہاں تو ملاقات کا
وقت؟ جی ہاں سہ پہر کو۔ صبح کے وقت میں نہیں آ سکتا۔ چار بجے کام سے فارغ ہو کر آ جاؤں گا۔ جی
ہاں چار بجے۔

پردہ

تیسرا منظر

(ایڈمنسٹریٹر کا آفس — وہی پہلا سین)

پی اے لڑکی : توفیق رؤف آگئے ہیں !

ایڈمنسٹریٹر : اندر آنے دو (پی اے لڑکی چلی جاتی ہے توفیق رؤف داخل ہوتا ہے) ہیلو ! تشریف رکھیے آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں ؟

توفیق : نو تھینک یو !

ایڈمنسٹریٹر : رات آپ ٹیلی فون پر حیران ہو گئے ؟

توفیق : جی ہاں ۔ آپ کو میرا اتہ پتہ کیسے معلوم ہوا ؟ میرا نام ، میرا پیشہ ۔

ایڈمنسٹریٹر : (ہنس کر) ہماری کمپنی کا کام ہی کچھ ایسا ہے کہ اسے ان تمام باتوں سے واقفیت رکھنی پڑتی ہے

توفیق : کمپنی کا کام ہی کچھ ایسا ہے ؟ کیا کاروبار کرتی ہے آپ کی کمپنی ؟

ایڈمنسٹریٹر : ہم فالتو چیزوں کو ٹھکانے لگاتے ہیں ۔

توفیق : آپ کباڑی تو ہرگز نہیں ۔

ایڈمنسٹریٹر : جی نہیں ۔ ہم انسانوں کو ٹھکانے لگاتے ہیں ۔ فالتو اور غیر ضروری انسانوں کو ۔ یہ کام بہت آسان ہے اگرچہ آپ کو یہ بات عجیب و غریب نظر آتی ہے مگر ذرا غور کرنے سے حقیقت آپ پر ظاہر ہو جائے گی کہ دنیا میں بہت سے انسان فالتو ہیں ۔ مثلاً غیر ضروری خاوند ، غیر ضروری بیویاں ، غیر ضروری رشتہ دار ، بیوپار کے ساتھی ہم انھیں راستہ سے ہٹا دیتے ہیں اور اگر آپ اردو صاحت چاہتے ہیں تو یوں کہیے کہ ہم دنیا سے اُن کا حساب چکا دیتے ہیں ۔

توفیق : آپ کا مطلب ہے کہ آپ انھیں مار ڈالتے ہیں ؟

ایڈمنسٹریٹر : جی نہیں ، ہم انھیں راستہ سے ہٹا دیتے ہیں ۔

توفیق : مگر صاحب یہ تو بالکل قتل ہے۔

ایڈمنسٹریٹر : جی نہیں۔ یہ فالتو شے کو ٹھکانے لگانا ہے۔ اگر آپ سنجیدگی سے اس مسئلہ پر غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس دنیا میں بعض لوگوں کی ضرورت ہے اور بعض بالکل غیر ضروری ہیں، بالکل فضول اور فالتو۔ ہم ایسے لوگوں کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ آج تک ایسے کام اناڑی کرتے رہے ہیں اسی لیے ان میں کوئی نہ کوئی خامی باقی رہ جاتی ہے مگر ہم ماہر ہیں فنی ماہر۔ ہم کسی کام کو الجھاتے نہیں ہمارا کام بڑی فنی مہارت سے سرانجام پاتا ہے لہذا اس کے نتائج خطرناک نہیں ہوتے۔ ہم گارنٹی دیتے ہیں اس لیے ہمارا معاوضہ بھی زیادہ ہے۔

توفیق : کیا آپ ہوش وحواس میں ہیں ؟ آپ مجھے کیا بتا رہے ہیں ؟ یہ کہ آپ معاوضہ لے کر لوگوں کو قتل کرتے ہیں ؟

ایڈمنسٹریٹر : توفیق صاحب : میں آپ سے عرض کر رہا ہوں کہ ہم جائز معاوضہ لے کر غیر ضروری لوگوں کو راستہ سے ہٹا دیتے ہیں۔ اگر آپ کو ہماری خدمات درکار ہیں تو ہم حاضر ہیں۔

توفیق : آپ کا یہ مطلب ہے کہ ——————

ایڈمنسٹریٹر : مطلب وطلب کچھ نہیں، ہم اپنا کام اندازوں سے نہیں کرتے۔ ہمیں ہر بات کو یقین کے ساتھ جاننا پڑتا ہے۔ ہم ہر بات کی تہ تک پہنچتے ہیں کیونکہ ہمارا کام ہی یہی ہے اور یہ بات جانے بغیر ہمارا بیوپار نہیں چل سکتا کہ آپ کو ہماری خدمات کی ضرورت ہے۔

توفیق : آپ کی کمپنی : ——————

ایڈمنسٹریٹر : ہماری کمپنی پچھلے پانچ سال سے کام کر رہی ہے۔

توفیق : اس دوران میں آپ نے

ایڈمنسٹریٹر : اس دوران میں ہم نے ۲۵۰ فالتو اشخاص کو ٹھکانے لگایا ہے۔ ان میں اکثریت غیر ضروری خاوندوں اور بیویوں کی ہے جن کے رہنے سے ملک کو کوئی خاص فائدہ نہ تھا۔ ہم اپنے ملک کو تمام فالتو چیزوں سے پاک کر دینا چاہتے ہیں آپ کو ماننا پڑے گا کہ ہم انسانیت کی بہت بڑی خدمت سرانجام

دے رہے ہیں۔ افسوس ہے کہ ہم آپ کو اپنی فائلیں نہیں دکھا سکتے ورنہ آپ ہماری فائلوں کو بہت دلچسپ پاتے۔ ان میں اکثر نام آپ کو جانے پہچانے نظر آتے۔ معلوم ہوتا ہے آپ مجھ سے کوئی سوال دریافت کرنا چاہتے ہیں۔

توفیق: جی ہاں ایک سوال میرے دماغ میں گھوم رہا ہے۔

ایڈمنسٹریٹر: ہمارے طریقوں کے متعلق۔ یہی نا؟

توفیق: جی ہاں!

ایڈمنسٹریٹر: معاف کیجئے ہم اپنے گاہکوں کو ان طریقوں سے آگاہ نہیں کرتے کیونکہ ہمارے طریقے ہی ہمارے کاروبار کے اہم جزو ہیں۔ بہرحال آپ کو یہ بتا دینا کافی ہے کہ ہمارے طریقے مکمل ہیں البتہ اتنا بتائے دیتا ہوں کہ اکثر انسانوں کو راہ سے ہٹانا ظاہراً بالکل حادثہ معلوم ہوتا ہے آپ نے پانچ سال میں کئی حادثات کے متعلق اخبارات میں پڑھا ہوگا، کوئی شخص گاڑی کے نیچے آکر کچلا گیا کسی نے مکان کی چھت سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی۔

توفیق: جی ہاں۔

ایڈمنسٹریٹر: ان حادثات میں اکثر ہمارا ہاتھ کام کر رہا تھا۔ سڑکوں پر گاڑیوں کی ٹکروں کے واقعات خوراک میں زہر۔ توفیق صاحب آپ حیران نہ ہوں۔ ہمارا سٹاف بہت بڑا ہے۔ ہمارا خرچ بھی بہت ہے اسی لیے ہم معاوضہ بھی زیادہ لیتے ہیں آپ جانتے ہیں کہ اناڑی اپنا کام بگاڑ دیتا ہے اور پھر وہ اناڑی پنے کے باعث اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ ہم ماہر ہیں یہ ہمارا پیشہ ہے اور ہم ماہر فن ہونے کی وجہ سے زیادہ معاوضہ طلب کرتے ہیں۔

توفیق: خوب! جس شخص نے مجھے آپ کی کمپنی کا کارڈ دیا تھا وہ آپ کا ایجنٹ ہوگا؟ کیا وہ کارڈ ہر کسی کو دیتا ہے

ایڈمنسٹریٹر: جی نہیں۔ یہ کارڈ خاص خاص لوگوں کو دیئے جاتے ہیں۔

توفیق: اچھا!

ایڈمنسٹریٹر: یہ کارڈ صرف ان لوگوں کو دیئے جاتے ہیں جنہیں ہماری خدمات کی ضرورت ہوتی ہے جیسا کہ میں نے ابھی

سوچ لیا ہے کہ ہمارا اسٹاف بہت بڑا ہے اور اپنے کام کا ماہر ہے وہ لوگ گہری تحقیق و تفتیش کے بعد حقائق معلوم کرتے ہیں۔

توفیق : واقعی!

ایڈمنسٹریٹر : جی ہاں ہمیں آپکے متعلق ایک ایک بات کا علم ہے

توفیق : مگر کیا آپ یہ تمام باتیں مجھے بتا کر کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتے؟

ایڈمنسٹریٹر : جی نہیں۔ یہ خفیہ بات چیت ہے اور پھر آپ ایسے شخص نہیں جو ہمارے اعتبار کو ٹھیس پہنچائیں اور اگر آپ یہ بات باہر جاکر بتا بھی دیں تو آپ کی بات کا یقین کون کرے، دوسرے ہم ہر بات کا دھیان رکھتے ہیں ہم جذبات تک کی نگرانی کرتے ہیں خیر چھوڑیئے ان باتوں کو آپ یہ کہیئے۔ آپ بھی کسی کو راستہ سے ہٹانا چاہتے ہیں؟

توفیق : جی ہاں : اپنی بیوی کو۔ کچھ مدت سے ہم میں بہت اختلافات پیدا ہوگئے ہیں دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں۔

ایڈمنسٹریٹر : ہمیں آپکے جذبات سے کوئی کام نہیں بہرحال آپکا کام ہو جائے گا مگر آپ کب تک چاہتے ہیں۔

توفیق : جس قدر جلد ہو سکے اسی قدر اچھا ہے۔

ایڈمنسٹریٹر : ایسا ہی ہوگا، معاوضہ دس ہزار روپیہ ہوگا، پانچ ہزار روپیہ کی ادائیگی فوراً ہو جانی چاہیئے اور باقی پانچ ہزار دفنانے کے ایک ہفتہ بعد، اگر آپ تمام رقم ابھی دیدیں تو آپ کو ۵ فیصدی کمیشن مل سکتا ہے۔

توفیق : آپ ساری رقم ابھی لے لیجئے، میں چیک دیئے دیتا ہوں اور ہاں آج کے بعد آپ کی میری ملاقات کی کوئی ضرورت نہیں۔

ایڈمنسٹریٹر : آپ ہر طرح سے مطمئن رہیں۔

پردہ

○

چوتھا منظر

(ہوٹل کے منیجر کا آفس)

مسافر: منیجر صاحب آج آپ اپنی سیٹ پر بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔

منیجر: آپ کو یہ سُن کر افسوس ہوگا کہ ہوٹل کے مالک کی بیوی کا آج صبح انتقال ہوگیا ہے۔

مسافر: ہیں!

منیجر: مَیں دو چار منٹ کے لیے ایک ضروری کام سے آیا تھا بس اب جا رہا ہوں۔

مسافر: مگر وہ تو اچھی بھلی تھیں ہُوا کیا؟

منیجر: جی ہاں! بالکل اچھی بھلی۔ آج صبح گھر سے نکلی ہیں۔ پرانے چوک سے گھومتے ہوئے موٹر اینٹوں کے ایک ٹرک سے ٹکرا گئی۔ سخت زخمی ہوئیں اور ہسپتال میں جا کر مر گئیں۔

مسافر: توفیق صاحب کو بہت صدمہ پہنچا ہے۔

منیجر: ان کا حال تو دیکھا نہیں جاتا عورتوں کی طرح رو رہے ہیں۔

مسافر: مَیں یہاں سے کل صبح صبح فلائی کر رہا ہوں۔ واپسی پر تعزیت کر سکوں گا۔ میری طرف سے آپ اظہارِ افسوس کر دیں۔

منیجر: توفیق صاحب تو کئی روز تک ہوٹل میں نہیں آسکیں گے اس ناگہانی موت کا صدمہ برداشت کرنا بڑے حوصلے کا کام ہے۔

مسافر: بے شک۔

پردہ

○

پانچواں منظر

(ہوٹل کے منیجر کا آفس)

منیجر : آپ دفتر میں ایک دم سے ایسے نازل ہوتی ہیں کہ میں بھونچکا سا رہ جاتا ہوں۔

نازلی : ہمارا نام ہی تو نازلی ہے مگر ہمارے آنے سے تم نروس کیوں ہو جاتے ہو؟

منیجر : کون کافر نروس ہوتا ہے بیگم صاحب۔ آپ کے آنے سے تو اس ہوٹل میں اجالا ہو جاتا ہے۔

نازلی : سچ؟

منیجر : کیا مجھے جھوٹ بولنے کی عادت ہے؟

نازلی : اگر تمھیں جھوٹ بولنے کی عادت نہیں تو سچ سچ بتاؤ۔ آج ہوٹل کی آمدنی کتنی ہوئی اور تم مجھے اس میں سے کتنا روپیہ ابھی دے سکتے ہو؟

منیجر : آپ بیروں سے غرض رکھئے آپ کو بیریاں گننے سے کام؟

نازلی : شاباش مجھے ایک پرانی دعوت کا اور ایک بل کپڑے والے کا ادا کرنا ہے۔

منیجر : کل کتنی رقم ہوگی؟

نازلی : سوا دو ہزار سے کام چل جائے گا۔

منیجر : اگر کل کو توفیق صاحب نے مجھے ملازمت سے برطرف کر دیا تو آپ میرے لیے سفارش کا ایک لفظ نہیں نہیں کہیں گی۔

نازلی : ایسا نہ کہو۔

منیجر : آپ بڑی شاہ خرچ ہیں؟

نازلی : یہ دولت کسی نے سینے پر رکھ کر تھوڑی لے جانی ہے۔ پہلی بیوی توفیق کی سب کچھ دھرا دھرایا چھوڑ کر آناً فاناً چل بسی۔ اس چل چلاؤ میں کوئی کسی کا ساتھ نہیں۔ منیجر میرے بھی تو اولاد نہیں ہوئی۔

منیجر : آپ کیوں دل میلا کرتی ہیں۔ تین سال ہی تو ہوئے ہیں۔ ابھی آپ کی شادی کو۔ اولاد اتنی جلدی تو نہیں ہوا کرتی۔

نازلی : توفیق آدمی بڑا اچھا ہے۔

منیجر : پہلی بیوی کو اس کمرے میں آنے کی کہاں اجازت تھی۔ یہ تو آپ ہی ہیں کہ اس طرح بے باکانہ چلی آتی ہیں اور پھر مجھ سے آ کر کہتی ہیں تم اداس ہو جاتے ہو۔

نازلی : آخر یہ کمرہ کیا ہے۔ ایک کمرہ ہے جس کا نام دفتر ہے جس میں تم منیجر بن کر بیٹھتے ہو اور دن بھر جمائیاں لیتے ہو۔

منیجر : جی ہاں جمائیاں لیتا ہوں۔ صبح سے لے کر شام تک سر کھپاتا ہوں۔ سیاہ و سفید میرے سپرد ایسے تو نہیں کر دیا گیا۔ بیگم صاحب، اعتبار بڑی مشکل سے پیدا ہوا کرتا ہے اور یہ اعتبار ہی کے بل بوتے پر آپ کے بیسیوں اخراجات کے لیے روپیہ نکل رہا ہے۔

نازلی : تم بڑے وہ ہو۔

منیجر : وہ کیا؟

نازلی : حرف بات چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑا بڑا مطلب نکالنے والے۔ یہ باہر موٹر کس کی آئی۔ توفیق آ گیا۔ میں چلی ———— (دوسرے دروازے سے چلی جاتی ہے)

توفیق : (ہاتھ میں کچھ کاغذات لیے داخل ہوتا ہے بیٹھ کر دو ایک کاغذات دیکھ کر) دیکھو منیجر ہم نے تم پر اعتبار کیا یہ ہماری غلطی تھی اس طرح تمھیں روپیہ خرد برد کرنے کا موقع مل گیا۔

منیجر : آپ کا خیال ہے میں نے روپیہ غبن کیا ہے؟

توفیق : ہم اسے غبن نہیں کہیں گے مگر تم خود ہی بتاؤ یہ روپیہ آخر گیا کہاں۔ تمہاری حسابات کی کتابوں میں کوئی پتہ نہیں چلتا۔ ہم نے تمھارے ساتھ ہمیشہ نرمی برتی ہے کیونکہ تم ہماری سختی ایک دن بھی برداشت نہ کر سکو گے اگر تمھارے خلاف ہم غبن کا مقدمہ دائر کر دیں تو چند ہی دن میں تم بڑے گھر کی ہوا کھاتے نظر آؤ گے۔

منیجر : اگر ثابت ہو جائے کہ میں نے غبن نہیں کیا ہے؟

توفیق : اور غبن کے سر سینگ ہوتے ہیں؟ زیادہ باتیں مت بناؤ اپنے گریبان میں منہ ڈالو شرم سے تمہارا سر جھک جانا چاہئے۔

پردہ

چھٹا منظر

(توفیق کا کمرہ ساتھ والے کمرے سے کھڑکی کے کواڑ بجنے کی
آواز آتی ہے)

توفیق: یہ آواز کہاں سے آرہی ہے کواڑ بجنے کی ارے کوئی ہے؟

ملازم: (دور سے) آیا حضور!

توفیق: یہ کون سی کھڑکی کھلی رہ گئی ہے؟

ملازم: بیگم صاحب کے کمرے کی کھڑکی ہے حضور۔ وہ شاید اندر سے چٹخنی لگانا بھول گئی ہیں۔

توفیق: جاؤ کھڑکی بند کر دو۔ چٹخنی لگا کر پردہ کھینچ دو۔

ملازم: بہتر!

توفیق: نو بج گئے۔ ابھی تک نہیں آئی نازلی (نوکر سے چھوٹی میز الٹ جاتی ہے) ارے یہ کیا گرایا؟ کیا
توڑا (اٹھ کر) یہ میز کیسے الٹ گئی؟

ملازم: میں تیزی سے مڑتے وقت اس سے ٹکرا گیا۔

توفیق: نالائق۔ تمھیں جلدی کیوں پڑی رہتی ہے۔ ہر وقت کی ہٹ جاؤ۔ مت یوں اکٹھی کرو چیزیں۔ سارا
دراز الٹ گیا ہے ساری چیزیں ان کی بکھر گئی ہیں۔ ایسی خبر لیں گی آکر بیگم صاحبہ کہ یاد کرو گے۔
بھاگ جا۔ ہٹ جا۔ چیزیں ہم اکھٹی کر لیں گے۔ مت ہاتھ لگاؤ تم۔ جاؤ تم کھانا لگاؤ۔

ملازم: جی بہتر!

توفیق: (چیزوں کو اٹھا اٹھا کر دراز میں رکھتا ہے) حد ہوگئی بیگم نے بھی کیا زمانہ کی اوٹ پٹانگ چیزیں
درازوں میں اکٹھی کر رکھی ہیں۔ کوئی پوچھے بھلا انسان کو ان فالتو اشیاء کی کیا ضرورت پڑتی ہے
یہ کیا گرا۔ ایں!! یہ فالتو چیزیں ٹھکانے لگانے والوں کا کارڈ۔ ایساہی تجارتی چمکیلا کارڈ مجھ

تک پہنچا یا گیا تھا۔ یہ کارڈ ہرگز فالتو نہیں ہو سکتا میری بیوی کو کیسے پہنچایا گیا، یہ کارڈ میری ۔ بیوی ۔ میری بیوی ۔ کیا اس وقت تک کیپٹن کے ایڈ منسٹریٹر سے مل چکی ہے شاید مل چکی ہو ممکن ہے مجھے اپنے گھر کا کھانا لاک کر دے۔ ممکن ہے میں صبح فین کے مقدمے کے سلسلے میں عدالت جاتا ہوا کسی حادثہ کا شکار ہو جاؤں۔

(پسینہ پونچھتا ہے)

ملازم : میں اندر آسکتا ہوں؟

توفیق : ہاں ان دروازوں کو میں ڈال دو۔ ٹھیک ہے۔

ملازم : حضور میز پر کھانا لگا دیا گیا ہے

توفیق : کھانا میز پر سے اٹھالو۔ ہم نہیں کھائیں گے۔ بازار سے کون سودا لاتا ہے؟

ملازم : خانساماں!

توفیق : اوں! خانساماں بیگم کا چہیتا نوکر۔ تم کیا دیکھ رہے ہو جاگ جاؤ میلے نہیں مجھے بھوک نہیں سنتے نہیں تم ہم نہیں کھائیں گے

ملازم : کافی پئیں گے؟

توفیق : نہیں ہم کافی نہیں پئیں گے تم لوگ اتنے خیر خواہ بننے کی کوشش کیوں کر رہے ہو نکل جاؤ یہاں سے (نوکر جاتا ہے) (کچھ سوچتا ہے پھر ٹیلیفون کرتا ہے) ہیلو! کیا آپ ہائی وے ایئر فورس سے بول رہے ہیں کیا آپ کا کوئی جہاز رات کو جا رہا ہے کہاں؟ مصر، عراق، شام خوب کیا ایک سیٹ مل سکتی ہے۔ ٹھیک ہو مصر کے لیے ایک سیٹ دیدیجیے میرا نام توفیق رؤف ہے میں ابھی آ رہا ہوں (آواز دیتا ہے) ارے !

ملازم : حاضر!

توفیق : ہماری گاڑی نہیں۔ ایک ٹیکسی لاؤ ہم یہ خط لکھ کر باہر جا رہے ہیں۔

ملازم : بہتر

توفیق : (خط لکھتا ہے اور بولتا جاتا ہے) ڈارلنگ! مجھے ایک ضروری کاروبار کے سلسلے میں اچانک مصر جانا پڑ رہا ہے تم سے ملے بغیر جا رہا ہوں میں تھوڑے عرصے کے بعد وہاں سے فرانس چلا جاؤں گا وہاں پہنچ کر تمہیں خط لکھوں گا۔

ملازم : ٹیکسی آگئی حضور۔

توفیق : یہ بکس اس میں رکھو بیگم صاحب آئیں تو ان کو یہ خط دے دینا۔

ساتواں منظر

(کمپنی کا آفس (ایڈمنسٹریٹر اور ہوٹل کا منیجر بیٹھے ہیں۔)

ایڈمنسٹریٹر: آپ مطمئن رہیں منیجر صاحب۔ ہوٹل اب آپ کا۔ سب کاروبار اب آپ کا ہے۔ آپ کے مالک توفیق رؤف کو ٹھکانے لگا دیا گیا ہے۔ آپ جو چاہتے تھے ہم نے اس کا انتظام کر دیا۔ فالتو چیز راستے سے ہٹا دی گئی۔ آپ کے ذمہ ہماری کمپنی کا پانچ ہزار روپیہ باقی ہے۔

منیجر: جی ہاں! یہ لیجئے پانچ ہزار کا چیک۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ ورنہ نہ جانے غبن کے مقدمے میں میری کیا رسوائی ہوتی۔

ایڈمنسٹریٹر: آپ کو شاید علم نہیں کہ ہماری کمپنی اپنے ہر گاہک کی عزت آبرو کا کچھ زیادہ ہی خیال رکھتی ہے۔ بہرحال میں آپ کو اپنی کمپنی کی طرف سے آپ کی ہونے والی شادی پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

منیجر: میری شادی؟

ایڈمنسٹریٹر: میں آپ کی نظرِ انتخاب کی داد دیتا ہوں۔ آج ہی مسز توفیق اپنے خاوند سے ہمیشہ رنجیدہ خاطر رہیں۔ طبیعت ملنے کی بات ہوتی ہے۔ ان سے نہ ملی، آپ سے مل گئی۔ خدا آپ کو خوش و خرم رکھے۔

منیجر: تھینکس مسٹر۔ مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا؟

ایڈمنسٹریٹر: ہم اپنا کام اندازوں سے نہیں کرتے۔ ہر بات کی تہہ تک پہنچتے ہیں۔ کیونکہ ہمارا کام ہی ایسا ہے اور یہ جانے بغیر کہ کوئی چیز کس حد تک فالتو ہے ہمارا کاروبار نہیں چل سکتا۔

منیجر: مگر اب آپ کی اور میری ملاقات کی کوئی ضرورت نہیں۔

ایڈمنسٹریٹر: بالکل نہیں۔ (دونوں ہاتھ ملاتے ہیں) خدا حافظ!

پردہ

○

ایک ہے لڑکی

ابراہیم یوسف

افراد

آفتاب

اصغر

مشکور

شوکت

انجم

کشور

نجمہ

وغیرہ

پہلا منظر

(ایک کمرہ جس کے دو دروازے ہیں۔ پہلا دروازہ مشرقی
جانب ہے۔ دروازہ کشادہ ہے اور اس پر قیمتی ریشمی پردہ
پڑا ہے۔ یہ دروازہ بیرونِ خانہ کھلتا ہے اور پردہ ہٹ
جانے پر ایک برآمدہ نظر آتا ہے۔ اس دروازے کے
بائیں جانب ایک الماری ہے۔ جس میں خوبصورت گرد پوش
کی کتابیں چُنی ہوئی ہیں۔ دوسرا دروازہ شمالی جانب ہے
یہ پہلے دروازہ کی طرح کشادہ نہیں مگر اس پر بھی پہلے دروازہ
کی طرح ریشمی پردہ پڑا ہوا ہے۔ یہ دروازہ ایک کمرہ میں
کھلتا ہے۔ اس کے دونوں جانب دو بڑی بڑی تصویریں
آویزاں ہیں جن میں عورت کے نیم عُریاں جسم خط و خال کو نمایاں
طور پر ظاہر کیا گیا ہے۔

پورے کمرہ میں دری کا فرش ہے۔ مگر درمیانی حصّے میں
قیمتی قالین بچھا ہے۔ جس کے آس پاس ایک قیمتی صوفہ سیٹ
رکھا ہے۔ مغربی جانب ایک کشادہ کھڑکی ہے جس کے
پاس ایک میز پر ٹیلیفون رکھا ہے۔ مشرقی جانب دیوار سے
لگا ہوا ایک میز پر ریڈیو ہے جس کے آس پاس تین چار
کرسیاں ذرا بے ترتیب سی پڑی ہیں۔ باقی دیواروں پر بھی
تصاویر آویزاں ہیں۔ شام کے پانچ بجے ہیں۔ کھڑکی کے پیچھے

بیٹھے ہوئے ہیں اور سورج کی روشنی کھڑکی سے کمرہ کے اندر
آرہی ہے۔ جب پردہ اٹھتا ہے تو انجم ٹیلیفون کے پاس
کھڑی ہوئی نظر آتی ہے)

انجم : (رسیور اٹھاکر چاروں طرف اس طرح دیکھتی ہے جیسے چوری کر رہی ہو) ٹوسیون۔
نائن جی ہاں ٹوسیون۔ نائن ——— ہیلو ——— مسٹر شوکت تشریف رکھتے
ہیں ؟ ——— نہیں ——— بہت اچھا شکریہ۔
(کشور اور شوکت مشرقی دروازے سے داخل ہوتے ہیں۔ انجم
گھبراکر رسیور اس طرح رکھتی ہے۔ جیسے چوری کرتے ہوئے
پکڑی گئی ہو۔ ——— گھبراکر)
آیئے آیئے۔ تشریف لایئے ——— بہت دیر کی آپ نے ؟

کشور : (قریب آکر مسکراتے ہوئے) کس خوش قسمت کو یاد کیا جارہا ہے ؟

انجم : جی ——— وہ تو میں ——— میرا مطلب ہے کہ ———

کشور : (قہقہہ مارکر) جب آپ شرمندہ ہیں تو جانے دیجیے۔ (مسکراکر) ورنہ آپ بلاوجہ ناراض ہوجائیں گی
——— مسٹر آفتاب کہاں ہیں ؟

انجم : پاس والے کمرہ میں ہیں ——— وہیں سب لوگ جمع ہیں۔

کشور : اچھا ——— کوئی خاص مسئلہ درپیش ہے ؟

انجم : جی ہاں۔ سوال یہ درپیش ہے کہ مسٹر صفر فارسی کی غزل گائیں یا ہندی گیت۔

کشور : میرا تو خیال ہے کہ وہ کوئی ڈانس شروع کردیں۔ (قہقہہ مارکر ہنستی ہے۔ پھر شوکت سے مخاطب ہوکر)
آیئے ہم اس مسئلہ کو حل کریں۔

شوکت : جی ہاں چلئے۔ (کشور دوسرے کمرہ میں چلی جاتی ہے۔ شوکت انجم کے پاس آکر) انجم ! سالگرہ
مبارک ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ میں دیر سے آیا۔

انجم : (شرمیلے پن سے) میں تو آپ ہی کو ڈھونڈ رہی تھی۔

شوکت : تمہاری یہ معصوم حماقتیں بھی کس قدر دلچسپ ہوتی ہیں۔ کیا اس کا امکان تھا کہ میں تمہاری سالگرہ میں شرکت نہ کرتا۔

انجم : میں انتظار کرتے کرتے تھک گئی تھی۔ بس یوں ہی سمجھ لیجئے

کشور : (دروازہ میں جھانک کر) ارے صاحب یہ گفتگو پھر کر لیجئے گا۔ اس وقت تو ادھر تشریف لے آئیے۔

شوکت : جی ہاں جی ہاں۔ ابھی حاضر ہوا۔

کشور : کیا خاک حاضر ہوئے۔ مگر مجھے سپورٹ کیجئے اور انجم تم کیا دلہن بنی کھڑی ہو۔ کیا بدمذاقی ہے۔

(جانے کے لیے مڑتی ہے۔ آفتاب دروازہ میں سے آتا ہے اور مسکرا کر کشور سے)

آفتاب : ارے صاحب تشریف لے جائیے نا۔ اصغر کے چہرہ پر آپ کے دیکھنے سے رونق آگئی ہے۔

کشور : (قہقہہ مار کر) مگر بیمار کا حال اچھا نہیں۔

آفتاب : (مسکرا کر) اور ہو بھی کیسے۔ مسیحا جو بے مروت اور فرض ناشناس ہے۔

کشور : (شوخی سے) بیمار خود بدپرہیزی کرتا ہے اس میں مسیحا کی فرض ناشناسی کیا۔

آفتاب : مگر جب ناخدا منجدھار میں سے جا کر غافل ہو جائے تو کون سہارا دے گا۔

کشور : یہ تو پہلے ہی سمجھ لینا چاہیئے کہ کشتی کا رخ کس طرف ہے۔ کوئی شخص سراب کے پیچھے دوڑے اور مایوس ہو کر سراب کو دوش دینے لگے تو اس کی عقل کا فتور ہے۔ سراب کا نہیں۔

آفتاب : آپ کا فرمانا بجا ہے ___ "کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا"

کشور : جی ہاں ___ بہتر ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل ___ آئیے نا آپ لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں۔

آفتاب : ابھی حاضر ہوئے۔ (کشور مسکرا کر چلی جاتی ہے۔ آفتاب شوکت سے مخاطب ہو کر) کہاں

کموگڈ تھے : اسے بندۂ خدا کبھی تو وقت کی پابندی کرتے۔

شوکت : میں آنے ہی والا تھا۔ کہ کشور کا فون آگیا کہ میری کار کی سخت بیمار ہے اور فی الحال صحت کی کوئی اُمید نہیں مجھے ساتھ لے لیجئے گا۔

آفتاب : دیسے ہی موقع پر ان کی کار کی بستر علالت پر چلی جاتی ہے۔

شوکت : اور جب میں وہاں پہنچا تو بیگم ابھی تیار بھی نہیں ہوئی تھیں۔ اطمینان سے ناول کے مطالعہ میں مشغول تھیں۔ ایک گھنٹہ میں سنگھار ہوا۔ تب کہیں روانہ ہوئے۔ اب وہاں کیا گل کھلا رہی ہیں ؟

آفتاب : (دبی آواز میں) ——— آخر یہ حق کشور کے لیے کیوں دیوانہ ہوا جا رہا ہے ؟

شوکت : صرف نفسیاتی چکر ہے اور کوئی بات نہیں (مسکرا کر) وہ کشور کی بے تکلفی کو رعنائی اور لطافت سمجھتا ہے حالانکہ یہ رعنائی اور لطافت طبع ہے اور یہ سوسائٹی محض کھوکھلی۔

کشور : (پھر دروازہ میں آکر) یہ اکیلی میں سر پھر دیتے رہیئے گا۔ اس وقت تو ادھر تشریف لے آیئے مسٹر آفتاب! آپ بھی کہاں بحث میں مبتلا ہیں۔ اچھی مہمان نوازی ہے۔

آفتاب : (مسکرا کر) اچھا حاضر ہوا۔

(آفتاب اور کشور پھر اسی کمرہ میں چلے جاتے ہیں۔ شوکت کچھ دیر خاموش رہتا ہے۔ پھر انجم کے پاس آتا ہے)

شوکت : انجم (انجم نظریں اٹھا کر شوکت کو دیکھتی ہے جس میں بے پناہ خلوص اور محبت ہے) تم کس قدر اچھی ہو۔

انجم : (مسکرا کر جس میں شرم کی نمایاں جھلک ہے) آپ بعض اوقات کس قدر فضول باتیں کرتے ہیں۔

شوکت : انجم! تمہاری زندگی میں خلوص محبت اور کس قدر رنگینیاں ہیں۔ تم وہ حقیقت ہو جو خواب کے سانچے میں ڈھلی ہے۔ تم وہ نغمہ ہو جس کے لیے موسیقی تخلیق کی گئی ہے۔ تم وہ شعر ہو جس کے لیے شاعری وجود میں آئی ہے۔ تم وہ ———

انجم : بس بس رہنے دیجئے (مسکرا کر شرماتے ہوئے) مجھے معلوم ہے کہ آپ شعر بھی کہہ سکتے ہیں۔

شوکت : مرد کا شاعر بن جانا کچھ مشکل نہیں اور میں ———

(کشور اور مشکور داخل ہوتے ہیں کشور لقمہ دیتے ہوئے)

کشور: اور میں شاعر تو نہیں، مگر شعر سمجھ ضرور لیتا ہوں (قہقہہ مار کر ہنستی ہے) ایک دفعہ میں نے پوچھا کہ یہ اختر شیرانی کی سلمیٰ کون تھی تو فرمانے لگے کہ سلمیٰ عربی شاعروں کی خیالی محبوبہ ہے۔ یہ ہے آپ کی ادب دانی (انجم اور شوکت سے) تشریف لے جائیے۔ آپ لوگوں کا اس کمرہ میں ذکر ہو رہا ہے۔ (شوکت غصہ سے کشور کو دیکھتا ہے انجم بھی اس کے پیچھے پیچھے دوسرے کمرہ میں چلی جاتی ہے چند سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد مشکور سے) میں اس پروفیسر حالی سے عاجز ہوں دن رات انگریزی کی ٹانگ توڑا کرتا ہے۔ بالکل انگریزی کی دم بنا پھرتا ہے۔

مشکور: لیکن آپ اس سے کیوں الجھتی ہیں۔ جھکی آدمی کے ساتھ الجھنے سے فائدہ؟

کشور: آخر کہاں تک کوئی یہ حماقتیں برداشت کرے۔ بڑی محبت سے فرماتے ہیں مائی سویٹ کیٹ۔ گویا اچھی خاصی چلتی پھرتی عورت انھیں بلی نظر آتی ہے اور ہم کو تو ہمیشہ چوہیا کہتا ہے۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی۔

مشکور: بوڑھا آدمی ہے۔ بے چارہ خلوص اور محبت سے پیش آتا ہے۔

کشور: تو جائے نا بوڑھوں میں۔ سینگ کٹا کر بچھڑوں میں کیوں گھستا ہے ——— اور پھر ان اصغر صاحب نے تو زندگی اجیرن کر دی ہے۔ جہاں دیکھو موجود ہیں۔ اور تان سین کی جانشینی کا دعویٰ ——— اور آپ بھی ان کی ہاں میں ہاں ملاتے رہتے ہیں۔

مشکور: (مسکرا کر) وہ میرا پرانا ساتھی ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اُن کی مخالفت کروں؟

کشور: (بگڑ کر) بڑا خلوص ہے آپ کو اُن سے، اور گویا ہم تو کچھ ہیں ہی نہیں ——— مجھے آپ کی یہ دو رُخی پالیسی پسند نہیں۔

مشکور: دو رُخی پالیسی؟ ——— بھئی آپ تو ندا میں سب کیے کرائے پر پانی پھیر دیتی ہیں۔

کشور: جی ہاں میں پانی پھیر دیتی ہوں۔ ——— اُس دفعہ پکنک پر میں نے ہی پانی پھیرا تھا۔ اس دن سے آج تک میری نظر مجمع کے سامنے نہیں اٹھ سکی۔ آج تک میرا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔

شکور : لیکن میں کر ہی کیا سکتا تھا۔ نجمہ کے ساتھ بد اخلاقی بھی تو نہیں کرسکتا تھا۔

کشور : اچھا اخلاق ہے۔ معلوم ہے اس دن سے نجمہ کس غلط فہمی میں مبتلا ہے (شکور سوالیہ انداز میں اس کا چہرہ دیکھتا ہے) یہی کہ تم نجمہ سے محبت کرتے ہو۔ اگر ایسا ہے شکور تو —— پھر ——
آخر تم ——۔

شکور : یہ غلط ہے مس کشور۔ میرے دل میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

کشور : آپ کے دل میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے غلط (شرارت سے مسکرا کر) ہم پر رہیں گی آپ کی جھوٹی تسلیاں مگر

(آفتاب اور شوکت داخل ہوتے ہیں)

آفتاب : (مسکرا کر) صبر کا کیا ہے۔ ایک دن صبر تو آ ہی جائے گا۔ (شوکت قہقہہ مار کر ہنستا ہے) کیا عہدہ پیمان ہو رہے ہیں۔ (شکور اور کشور خاموش رہتے ہیں۔ آفتاب شرارت سے) تشریف لے جائیے میاں اصغر آپ کی عدم موجودگی میں بے چین ہیں —— فارسی غزل گانے کا پروگرام بن چکا ہے۔

کشور : اچھا تان سین کی روح کو تڑپانے کے لیے تیار ہو گئے (شکور سے) آئیے صاحب تھوڑی دیر ان کی بھی بے وقت کی بھیرویں سن لیں۔

(دونوں دوسرے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ آفتاب ایک صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں)

آفتاب : (مسکرا کر) تو آج کل ادھر سوتے ہیں آرام۔

شوکت : ہاں۔ بس سمجھ لو (مسکرا کر) مگر شکور اس قدر احمق نہیں ہے۔ سب کچھ سمجھتا ہے اور پھر اصغر کی دیوانگی نے اور ستم ڈھا رکھا ہے۔

(دونوں خاموش ہو جاتے ہیں۔ شوکت سگریٹ نکال کر جلاتا ہے اور آفتاب کے پاس بیٹھ جاتا ہے۔ کچھ دیر خاموش رہ کر)

آفتاب: آج انجم کی بائیسویں سالگرہ ہے۔ سوچا تھا کہ کیا تحفہ لے کر چلوں۔ پھر یوں ہی چلا آیا۔

آفتاب: مجھے خوشی ہوئی کہ تم گھر سمجھ کر چلے آئے۔ میں خود ان تکلفات کا قائل نہیں۔

(دونوں خاموش ہو جاتے ہیں۔ دوسرے کمرہ سے پیانو کی
آہستہ آہستہ آواز آتی ہے۔ پھر اصغر کے گانے
کی آواز آتی ہے)

اگر آں ترکِ شیرازی بدست آرد دلِ ما را

بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

شوکت: (آہستہ سے) "اگر آں ترکِ شیرازی بدست آرد دلِ ما را" (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) آفتاب! میں
آج کچھ دینا نہیں چاہتا ــــــ تم سے کچھ لینا چاہتا ہوں۔

آفتاب: مجھ سے؟ (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) میں کیا دے سکتا ہوں۔ خیر مانگو۔ کوشش کروں گا کہ تم کو سب کچھ
دے دوں۔

شوکت: آفتاب! ــــــ یہ جرأت، جرأتِ رندانہ سے کم نہیں۔ مگر تم میری گستاخی معاف کر دو گے
(آفتاب خاموش رہتا ہے۔ چند سیکنڈ بعد) میں انجم کو تم سے مانگتا ہوں

آفتاب: انجم کو۔

(ایک دم کھڑا ہو کر ٹہلنے لگتا ہے۔ شوکت غور سے اس کے
چہرہ کے اتار چڑھاؤ کو دیکھنے لگتا ہے۔ پھر آفتاب آہستہ
آہستہ قریب آکر)

شوکت! تم انجم کو مجھ سے مانگ رہے ہو۔ مگر اس کے بھائی کے پاس اس کے علاوہ اور کچھ بھی تو
نہیں ہے۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) جس کی ہر چیز گروی رکھی ہے۔ یہ فرنیچر، یہ مکان اور سب کچھ
اور پھر میرے دل میں اس کے لیے بڑی تمنائیں ہیں۔ مگر تم دیکھ رہے ہو کہ مجھے دو سال سے برابر
گھاٹا ہو رہا ہے اور اگر اس سال بھی یہی حالت رہی تو نتیجہ معلوم۔

(پھر ٹہلنے لگتا ہے اور سوچتا رہتا ہے۔ شوکت اس دوران
میں خاموش رہتا ہے۔ آفتاب پھر شوکت کے پاس آکر)

شوکت! میں چاہتا ہوں کہ انجم تمہیں دے دوں مگر سوچتا ہوں کہ وہ بڑی عام سی لڑکی ہے اور پھر
تمہارے اور اس کے ماحول میں بڑا فرق ہے۔

شوکت: مگر میں اس ماحول سے عاجز آگیا ہوں۔ یہ بڑا چمکدار ہے۔ مگر اندر سے بڑا کھوکھلا (چند سکینڈ
خاموش رہ کر) اور پھر میں انجم کو بے حد پسند کرتا ہوں۔

آفتاب: مجھے علم ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہو مگر اس سماج میں صرف
محبت ہی تو سب کچھ نہیں۔

شوکت: انجم نے مجھے ایک ایسی خوشی دی ہے جس کی لذت سے میں ناآشنا تھا۔ اس نے مجھ
سے پرستار بن کر محبت کی ہے۔ اس کی محبت نے میرے اندر خود اعتمادی، بھروسہ اور خود
پیدا کر دیا ہے ——— —— ———

آفتاب: مگر شوکت میں سوچتا ہوں کہ . . . .

شوکت: (قطع کلام کرکے) میں نے محسوس کیا ہے کہ اس کی محبت میں چاند تاروں کی نرمی ہے آبشاروں
کا ترنم ہے۔ موسیقی ہے۔ اس کی محبت میں زندگی کی حرارت ہے۔ اس کی مسکراہٹیں کسی کے ہونٹوں
سے چرائی ہوئی نہیں، بلکہ خود اپنی ہیں۔

آفتاب: انجم کی اس قدر تعریف نہ کرو کہ میں مغرور ہو جاؤں۔ تمہارا یہ کچھ کہنا درست ہے مگر

شوکت: میں نے کبھی تم سے کچھ نہیں مانگا۔ اور تم نے شاید اسی لیے مجھ پر ہمیشہ اعتماد کیا ہے (کشور پھر
کمرہ میں داخل ہوتی ہے کچھ بولنا چاہتی ہے مگر ایک دم خاموش ہو جاتی ہے) مجھ پر اعتماد کرو۔
آفتاب اور انجم مجھے دیدو۔

آفتاب: (چند سیکنڈ خاموش رہ کر سوچتا ہے پھر آہستہ سے) شوکت! انجم! وہ بڑی عام سی لڑکی
ہے۔ جیسی عام طور پر ہمارے گھرانوں میں ہوتی ہے مگر پھر بھی تمہیں اس سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔

شوکت : جذبات سے مغلوب ہو کر آہستہ سے) آفتاب ! (آفتاب کا چہرہ دیکھتا ہے جو خوشی سے سُرخ ہو رہا ہے) آفتاب !

(آفتاب سے مصافحہ کرتا ہے۔ کشور آگے بڑھتے ہوئے)

کشور : یہ آپ لوگ یہاں کیا سازش کر رہے ہیں یا بد مذاقی کو اپنا پیشہ بنالیا ہے۔ خدا کے لیے ہمیں بور نہ کیجئے (آگے بڑھتے ہوئے) وہاں سب آفتاب صاحب آفتاب صاحب چلا رہے ہیں

(آفتاب اور شوکت دونوں کشور کو دیکھتے ہیں۔ آفتاب دوسرے کمرہ میں چلا جاتا ہے۔ کشور شوکت کے قریب آکر)

مبارک ہو۔ (طنزیہ) آپ تو چھپے رستم نکلے ! یہ سازش کب سے ہو رہی تھی۔

شوکت : مس کشور ! کئی لڑکیوں نے میری زندگی میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ اُن کا خلوص مستعار ہے۔ ان کی بے تکلفی میں بناوٹ ہے، ان کی مسکراہٹ ۔

کشور : بس بس رہنے دیجئے۔ (کڑوی مسکراہٹ سے) جوشِ تقریر میں ان بت کدوں کو نہ ڈھایئے جن کے صنم بہت دل کش ہیں۔ (ٹہلنے لگتی ہے۔ پھر قریب آکر) مسٹر شوکت ! آپ نے مجھ سے بھی تو یہی کہا تھا کہ کشور تم زندگی کا وہ مقصد ہو جس کے لیے مرد سب کچھ قربان کر سکتا ہے۔

شوکت : ہاں ——— مگر وہ میری غلطی تھی

کشور : جی نہیں ——— بلکہ آپ بھی اس حماقت میں مبتلا تھے جس میں ہر خود پرست مرد ہوتا ہے۔ کہ ہر لڑکی اس سے محبت کرتی ہے۔ آپ کو مجھ سے محبت نہ مل سکی تو آپ ناامید ہو گئے

شوکت : نہیں بلکہ تمہارے اس اندازہ کہ مجھے قدم قدم پر رقابت کے وہ کانٹے ملے جنھوں نے میرے جسم کو لہولہان کر دیا۔ دل میں ناسور ڈال دیئے۔ مجھے کبھی سچی خوشی نصیب نہ ہو سکی۔

کشور : آپ جیسا خود پرست مرد ہمیشہ بد چلن عورتوں کی صحبت میں لذت محسوس کرتا ہے ——— مرد کی جوانی کی ہوس سمندر کو اپنے آغوش میں لینا چاہتی ہے۔

شوکت : خدا کے لیے اس وقت ایسی گفتگو نہ کرو۔

کشور : میں سوچتی ہوں کہ مجھے آپ کے ساتھ رہ کر کیا ملا ؟ ایک سرد خلوص ———— ہاں مجھے سوسائٹی ضرور ملی۔ نئے دوستوں سے ضرور متعارف ہوئی مگر آپ کی نگاہیں مجھے ہمیشہ ایک دائرے میں مقید رکھنے کی کوشش کرتی رہیں۔

شوکت : خدا کے لیے کشور

کشور : میں نے آپکے دل کو ٹٹولا وہ سرد تھا۔ اور پھر اپنے دل میں بھی آپ کے لیے کوئی جگہ نہ پائی۔

شوکت : (برہم ہو کر) آپ جس سوسائٹی میں ہیں وہاں محبت اور خلوص کا گذر نہیں۔ آپ محبت کو بچوں کا کھلونا سمجھتی ہیں جس کے ٹوٹ جانے پر وہ روتا اور جھلاتا ضرور ہے۔ مگر دوسرا مل جانے پر وہ اُن سے کھیلنے لگتا ہے۔ آپ دوسروں میں جادو ضرور جگا سکتی ہیں، مگر اپنے دل میں محبت کی جوت نہیں جگا سکیں۔

کشور : غلط ہے۔ محبت ہر شخص کر سکتا ہے۔

شوکت : ہاں کر سکتا ہے مگر سب کا معیار مختلف ہوتا ہے۔ تم ہمیشہ یہ چاہتی رہیں کہ سب تمہیں چاہیں مگر تم کسی کو نہ چاہو۔ تمہارے قدم قدم پر دوست ہوں اور تم اُن سب پر محبت جتلاتی رہو۔

کشور : یہ اخلاق ہے۔ تہذیب ہے۔ عورت کوئی جائداد نہیں ہے۔ کسی کی ملکیت نہیں ہے۔

شوکت : تم نے اخلاق و تہذیب کی جو نئی قدریں پیدا کی ہیں وہ اس قدر مہلک ہیں کہ

کشور : خیر یہ اپنا اپنا خیال ہے۔ مگر شوکت اس پر غور کرو کہ میں

شوکت : (جلدی سے) کشور خدا کے لیے چپ رہو۔ تمہاری زبان سے نکلے ہوئے الفاظ اگر دیواروں نے سُن لیے تو میری زندگی ویران ہو جائے گی۔

کشور : (کسی قدر سنجیدہ ہو کر) مگر میں تو یہ چاہتی ہوں کہ کوئی مجھ سے پرستار بن کر محبت کرے —— مگر مجھے کبھی ایسی محبت نصیب نہ ہوئی۔

شوکت : اس میں محبت کا قصور نہیں خود تمہارا ہے۔ کیا اصغر دیوانگی کی حد تک تم سے محبت نہیں کرتا۔ ——— اگر تم۔

(خاموش ہو جاتا ہے۔ چند سیکنڈ خاموشی رہتی ہے۔ اصغر تیزی
سے کمرہ میں داخل ہوتا ہے اور کشور کی موجودگی پر دھیان دیکر)

اصغر : مبارک ہو شوکت۔ پیارے شوکت (گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے) خدا کی قسم تمہارا انتخاب لاجواب ہے۔

(نجمہ دروازہ میں آکر)

نجمہ : مسٹر شوکت! یہاں تشریف لائیے۔ ہم لوگ آپ کے بے چینی سے منتظر ہیں۔
شوکت : بہت اچھا (اصغر سے) میں ابھی آیا اصغر۔

(نجمہ اور شوکت دوسرے کمرہ میں چلے جاتے ہیں۔ اصغر بھی
ان کے پیچھے پیچھے جاتا ہے۔ کشور کو دیکھ کر)

اصغر : آپ —— یہاں —— ؟
کشور : میں بھی شوکت کو مبارک باد دینے آئی تھی۔
اصغر : (جو ابھی تک بڑی حد تک جذباتی ہے) یہ انتخاب لاجواب —— بے مثل ہے۔
کشور : ہاں —— لاجواب ہے —— مگر ——
اصغر : (کشور کو سر سے پیر تک بغور دیکھ کر) آپ کچھ —— کیا بات ہے کچھ زیادہ خوش نظر نہیں آتیں ؟
کشور : نہیں اصغر یہ بات نہیں ہے۔ میں بہت خوش ہوں (ٹھنڈی سانس بھر کر) زندگی میں ایسے مواقع بہت کم آتے ہیں۔ (پھر خاموش ہو جاتی ہے اور کمرہ میں ٹہلنے لگتی ہے اس کے چہرہ سے پتہ چلتا ہے۔ کہ وہ بڑے جذباتی ہیجان میں مبتلا ہے۔ پھر اصغر کے پاس آکر) مسٹر اصغر! آپ کا محبت کے متعلق کیا نظریہ ہے؟
اصغر : (کشور کو سر سے پیر تک دیکھ کر) بہت عام سا۔ کوئی فلسفہ نہیں ہے (کچھ دیر خاموش رہ کر) یوں سمجھ لیجئے کہ میں پسند کی انتہا کو محبت سمجھتا ہوں (سوچتے ہوئے) یہ پسند کی انتہا الفاظ سے ظاہر نہیں

کی جاسکتی۔

کشور : مگر جس دل میں محبت ہو۔ خلوص ہو۔ وہ دل چھپ بھی نہیں سکتا۔ تمہارے دل میں محبت اور خلوص کا ایک سمندر ہے۔ اس کا احساس مجھے آج ہو رہا ہے۔

اصغر : مس کشور! اس احساس کو پیدا کرنے کے لیے میں قیامت تک زندہ رہ سکتا تھا (جذباتی انداز میں کشور کے دونوں بازو پکڑ کر) میں آج خوش ہوں۔ کشور بہت خوش۔ کشور بہت خوش۔

کشور : (اپنے دونوں بازو چھڑاتے ہوئے مسکرا کر) مرد بہت جلد جذباتی ہو جاتے ہیں۔

اصغر : مگر ایسے مواقع پر مرد کا جذباتی ہو جانا عین فطری امر ہے۔ میں

(نجمہ، مشکور وغیرہ قہقہے لگاتے ہوئے اس کمرہ میں داخل ہوتے ہیں۔ نجمہ کشور سے)

نجمہ : یہ حضور یہاں کون سا تیر مار رہی ہیں اور ادھر شوکت صاحب ہیں کہ پارٹی کے نام پر ابھی سے اڑے جا رہے ہیں۔

کشور : (مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے) دام میں پھنسا ہوا پنچھی اڑا نہیں کرتا۔ صرف پھڑپھڑا کر رہ جاتا ہے

نجمہ : مگر پنچھی دام میں پھنسنے کا نام ہی نہیں لے رہا پھر نہ اڑنا کیا معنی؟

کشور : اب یہ صیاد کی ہنرمندی ہے کہ وہ پنچھی کو اپنے دام میں گرفتار کرلے (شوکت کا چہرہ غور سے دیکھ کر) جس طرح مسٹر شوکت اچھی قسم دام میں گرفتار ہو چکے ہیں (ایک فرمائشی قہقہہ پڑتا ہے۔ نجمہ کی طرف دیکھ کر) تم بھی دام بچھاؤ مگر ہوشیاری سے۔

(نجمہ کے چہرہ پر غصہ کے آثار پیدا ہوتے ہیں مگر وہ خاموش ہو جاتی ہے۔ شوکت بھی برہم سا نظر آتا ہے مگر وہ کچھ اس طرح خاموش ہے۔ جیسے وہ اس وقت کشور سے الجھنا نہیں چاہتا۔ کچھ دیر خاموشی رہتی ہے۔ اس کے بعد آفتاب دروازہ سے آکر)

آفتاب : (ہنستے ہوئے) اچھا آپ لوگ اس کمرہ میں تشریف لے آئیے۔ پروفیسر جمال ایک انگریزی گیت سنا رہے ہیں۔

کشور : انگریزی گیت؟ (ہونٹھ) اچھا آپ لوگ تشریف لے چلئے۔ میں ابھی حاضر ہوئی۔

(سب لوگ دوسرے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ اصغر بھی دوسرے کمرے کی طرف بڑھتا ہے۔ اصغر کو جاتے دیکھ کر)

مسٹر اصغر آپ کو بھی اس انگریزی گیت سے دلچسپی ہے ؟

اصغر : جی ہاں۔ کیوں نہیں (کشور کا چہرہ دیکھ کر) کیا آپ کو پسند نہیں ؟

کشور : کم از کم پروفیسر جمال کا تو ہرگز نہیں (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) آج ٹاؤن ہال میں کوئی ورائٹی پروگرام ہے ؟

اصغر : جی ہاں (کشور کے قریب آکر) کچھ کلاسیکل موسیقی اور رقص کا پروگرام ہے

کشور : آپ کا کیا خیال ہے اس پروگرام کے بارے میں ؟

اصغر : اعلیٰ پیمانہ پر ہوگا۔ ہندوستان کے چوٹی کے فنکار حصہ لے رہے ہیں ؟

کشور : اچھا۔ کیا آپ اس پروگرام میں شرکت نہیں فرمائیں گے ؟

اصغر : کیوں نہیں ! میں نے تو آٹھ روز پہلے ہی دو سیٹ ریزرو کرالی ہیں۔

کشور : دو ! یعنی ؟

اصغر : میری بہن بلقیس کا بھی ارادہ ہے (کشور خاموش رہتی ہے اصغر اس کا چہرہ دیکھ کر) اگر آپ کا ارادہ ہو تو تشریف لے چلیے۔

کشور : لیکن میں نے سیٹ ریزرو نہیں کرائی ——— کل دیکھا جائے گا ؟

اصغر : تو ہرج کیا ہے ——— بلقیس کل چلی جائے گی۔

کشور : لیکن یہ کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

اصغر : جی نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ——— آپ تیار رہیئے گا۔ میں ساتھ لے لوں گا۔ رات دس بجے

سے پروگرام ہے ——— اور ہاں ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔ اصغر فون کے پاس آکر رسیور اٹھاکر) ہوں —— جی ہاں —— ہاں ——— بہت اچھا —— ایک منٹ (رسیور میز پر رکھ کر) مسٹر مشکور کا فون ہے (دروازہ کے پاس جاکر دوسرے کمرے میں جھانکتے ہوئے بلند آواز سے) مسٹر مشکور آپ کا فون۔

(چند سکینڈ بعد مشکور آتا ہے اور رسیور اٹھاکر)

مشکور : ہوں۔ ہاں ہاں! میں مشکور بول رہا ہوں۔ کون شہرنا ہو۔ کہو ہاں ہاں ضرور۔ کس پکچر میں؟ اچھا اچھا ہاں (مسکراکر) وہ یہیں کھڑی ہیں (کشور مشکور کے پاس آتی ہے) میں ذرا پوچھ لوں۔ شہرنا ہے۔ پکچر کے لیے مدعو کر رہا ہے۔

کشور : (رسیور مشکور کے ہاتھ سے لیکر) ہوں شہرنا۔ کہاں غائب ہو۔ (مسکراکر) یہ لیجئے آپ مدعو کریں اور میں انکار کروں —— پہلے شو میں (ہاتھ پر گھڑی دیکھ کر) لیکن اب پہلے شو کا وقت نہیں ہے۔ اچھا ہم دونوں پکچر ہاؤس پہنچتے ہیں آداب (رسیور رکھ کر مشکور سے) چلیئے۔

مشکور : چلئے۔ لیکن آفتاب سے تو اجازت لے لیں۔

کشور : بلاوجہ دیر ہو جائے گی۔ مسٹر اصغر آپ مسٹر آفتاب سے کہہ دیجئے گا کہ ہم لوگ چلے گئے (اصغر خاموش رہتا ہے۔ مشکور سے) آئیے ——

(دونوں دروازہ کی جانب جاتے ہیں)

دیکھیے مسٹر اصغر آفتاب سے کہہ ضرور دیجئے گا اور وہاں وہ ورائٹی پروگرام پھر کسی دن لیجئے۔

(مشکور اور کشور کمرہ سے نکل جاتے ہیں۔ اصغر خاموش تنہا کھڑا رہ جاتا ہے۔ دوسرے کمرہ سے جمالی کے انگریزی گانے کی آواز آہستہ آہستہ آرہی ہے)

اُن کا معاملہ

ابنِ سعید

افراد

آنٹی: عمر ساٹھ سال سے بھی زیادہ۔ لیکن چونکہ اپنے زمانے میں "اچھے دن" دیکھ چکی ہیں اس لیے اب بھی طبیعت میں زندگی کا شوق باقی ہے۔ روپیہ پیسہ بھی ہے اور نئے خیالات سے متاثر بھی ہیں اور اپنے سے کم عمر کے لوگوں کی زندگیوں میں ضرورت سے زیادہ دخل چاہتی ہے۔ سرپرستی کے اسی جذبے کے ماتحت انھوں نے اپنی دو بھتیجیوں شہربانو (شہری) اور فرحت (فری) کو بچپن سے پالا ہے۔ وہ دونوں ان کو آنٹی کہتی ہیں۔ آنٹی ان پر اپنا بہت اثر رکھنا چاہتی ہیں۔ لیکن نوجوان ان کے سامنے ہمیشہ بغاوت پر آمادہ رہتے ہیں۔ ان کا ایک رشتہ کا بھانجا ممتاز بھی ان کے ساتھ رہتا ہے۔

شہربانو: عمر تقریباً پندرہ برس۔ شکل سے اپنی عمر سے بھی کم معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ذہنی اور جذباتی طور پر سن بلوغ کو پہنچ چکی ہے۔ باتیں بھی پختہ طریقے پر کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ دوسرے اس کو بچہ سمجھتے ہیں۔ لیکن وہ خود کو بچہ سمجھنے سے گریز کرتی ہے۔

فرحت: عمر کوئی ۲۲ برس۔ نوجوان ہے۔ آنٹی کے زیر اثر پلی ہے اس لیے خیالات میں آزاد واقع ہوئی ہے۔ نئے خیالات سے بہت متاثر ہے۔ لیکن یہ اثر محض سطحی ہے آنٹی کی سی خودداری اس میں بھی موجود ہے۔

شاہینہ: عمر تقریباً تیس سال۔ کالج میں پروفیسر ہے۔ اس وجہ سے طبیعت میں ایک طرح کا روکھا پن ہے۔ خود سمجھتی ہے کہ زندگی سے بخوبی واقف ہے۔ لیکن اپنے منطقی پیشے کی وجہ سے زندگی کی رنگینیوں میں حصہ نہیں لینا چاہتی ہے۔ دماغی لحاظ سے خود کو دوسروں سے برتر سمجھتی ہے۔ لیکن دوسرے اس کے اس احساس برتری کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔

ممتاز: عمر کوئی پچیس برس۔ ہمیشہ اپنے گھر والوں میں زبردستی بڑا سمجھا گیا ہے۔ اس لیے ایک طرح کی خود ستائی میں مبتلا رہتا ہے۔ اس کی باتوں اور حرکتوں سے بھی یہ خود ستائی عیاں ہے۔

اُف

ایک تانگے والا

مقام

ایک وسیع ڈرائنگ روم

زمانہ

حال

○

پہلا منظر

ڈرائنگ روم میں صوفہ سیٹ اس طرح پر بچھے ہیں کر دو پارٹیاں ان پر الگ الگ بیٹھ سکتی ہیں۔ اور ایک دوسرے سے بالکل غیر متعلق بھی رہتی ہیں ایک صوفہ سامنے کی دیوار میں صوفہ سیٹ کے دائیں اور بائیں آتش دان ہیں جن کے آگے خوبصورت وضع کی سکرین رکھی ہیں۔ آتش دانوں کے اوپر مینٹل پیس ہیں جن پر خاندان کے افراد کی تصویریں اور چھوٹے موٹے (CURIOS) رکھے ہیں۔ دائیں طرف کونے میں ایک رائٹنگ ڈیسک ہے جس کے نچلے حصے میں کئی درازیں ہیں اور اوپر ایک ٹیبل لیمپ رکھا ہے۔ دیواروں پر ایک دو تصویریں بھی آویزاں ہیں۔ جن سے خوش مذاقی کا پتہ چلتا ہے۔ ڈرائنگ روم کے پورے ماحول سے ہی بہ خوش مذاقی اور خوش حالی ظاہر ہوتی ہے۔ دائیں اور بائیں طرف سٹیج کے اگلے حصے میں چوڑی چوڑی کھڑکیاں ہیں۔ اور پچھلے حصے میں دروازے جن پر صوفہ سیٹوں سے میچ کرتے ہوئے پردے لگے ہوئے ہیں۔ دیواروں کا رنگ ہلکا کریم ہے اور بیچ میں ایک بھورے رنگ کی پٹی ہے۔

پردہ اٹھنے پر ڈرائنگ روم خالی نظر آتا ہے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد ہی ممتاز داخل ہوتا ہے۔ وہ بائیں جانب سے تیز تیز قدموں سے چل رہا ہے اور ایک آدھ بار پیچھے مڑ کے بھی دیکھتا ہے۔ جیسے دیکھ رہا ہو کوئی اس کا پیچھا تو نہیں کر رہا ہے۔ اندر داخل ہونے کے بعد وہ لپک کر رائیٹنگ ڈیسک کی طرف جاتا ہے۔ جیسے کسی چیز کی تلاش میں ہو۔ ممتاز نوجوان ہے۔ لمبا قد۔ تندرست جسم۔ چہرہ ذہین۔ بال ذرا پریشان سے

ہیں جیسے کسی نے جلدی میں سنوارنے کی کوشش کی ہو۔ ہلکے رنگ کا سوٹ
پہنے ہے۔ وہ گھبرا گھبرا کر رائٹنگ ڈیسک کی مختلف درازیں کھولتا ہے
اور کبھی کبھی دروازے کی جانب بھی دیکھتا جاتا ہے جیسے کسی کے اندر داخل
ہونے سے پہلے درازوں میں سے کوئی چیز نکال لینا چاہتا ہو ـــــ اتنے
میں اچانک دروازے سے شہر بانو داخل ہوتی ہے۔ اس کی آہٹ پر ممتاز
چونک کر دراز بند کر دیتا ہے اور ڈیسک کی طرف پیٹھ کرکے کھڑا ہو جاتا
لیکن شہر بانو کو دیکھ کر ذرا مطمئن محسوس کرتا ہے۔

ممتاز : اوہ، تم ہو! میں سمجھا

شہر بانو : آپ سمجھے آنٹی ہیں ـــــ ہیں نا؟ (ممتاز کی طرف بڑھتے ہوئے) مجھے معلوم ہے آپ آنٹی سے بہت ڈرتے ہیں۔ حالانکہ ویسے آپ بہت بہادر بنتے ہیں۔

ممتاز : کیوں آنٹی سے کیوں ڈروں؟ ـــــ اونہہ۔

شہر بانو : جی ہاں! مجھے خوب معلوم ہے۔ آپ ان سے بے انتہا ڈرتے ہیں

ممتاز : کیوں اُن میں کون سی ڈراونی بات ہے؟

شہر بانو : فرحت آپا۔ اِن کی ڈراؤنی بات فرحت آپا ہیں۔

ممتاز : (چونک کر) کیا فضول بات ہے!

شہر بانو : آپ کو آنٹی سے ڈر اس لیے لگتا ہے کہ وہ تمام وقت فرحت آپا کو لیے لیے آپ کے پیچھے پیچھے پھرتی ہیں۔ جہاں آپ نے کچھ کہا وہ فرحت آپا کو آپ کے اُوپر بالتو بلی کی طرح پھینک دیں گی۔ مَیں کہتی ہوں مجھ کو تو بلیاں اس قدر بُری نہیں لگتیں۔

ممتاز : (ایک صوفے کے بازو پر بیٹھتے ہوئے ذرا اطمینان کے ساتھ) پالتو بلی ـــــ مَیں پوچھتا ہوں تم نے یہ تمام فضول باتیں کس سے سیکھی ہیں۔ نہ جانے کیا فرحت آپا اور بلیوں کا ذکر کر رہی ہو؟

شہر بانو : ہاں نہ معلوم کیوں مجھ کو ہمیشہ فرحت آپا کے ذکر پر بلیاں یاد آجاتی ہیں۔ شاید ان کے بھورے

پھولے گھونگھر والے بالوں کی وجہ سے ؟

ممتاز : یا شاید ان کی کالی آنکھوں کی وجہ سے ؟

شہر بانو : بلیوں کی آنکھیں کالی نہیں ہوتیں ؟

ممتاز : بہر حال بلیوں کی آنکھیں کیسی بھی ہوتی ہوں مجھ کو تمھاری فرحت آپا سے ڈرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی (جیسے خود سے کہہ رہا ہو) اور آخر میں ان سے ڈروں بھی کیوں ؟

شہر بانو : اچھا آپ ڈرتے نہیں ۔ تو اس وقت یہ گھبرا گھبرا کر اپنے خط کیوں ڈھونڈ رہے تھے ؟

ممتاز : (چونک کر) خط ! تمھیں کیسے معلوم ؟

شہر بانو : مجھے خوب معلوم ہے ـــــ جب پچھلے سال اکرام بھیا اپنی چھٹیاں گزارنے یہاں آئے تھے تو وہ بھی اپنے خط اسی میز میں چھپا چھپا کر رکھتے تھے اور وہ بھی انٹی سے خوب ڈرتے تھے اور جب ان کو شبہ ہو گیا کہ آنٹی فرح آپا کو اپنی بالتو بلی کی طرح اپنے ساتھ ساتھ رکھتی ہیں تو اُن کو ان سے پھر ڈر لگنے لگا تھا اور وہ بھی ایسے ہی گھبرا گھبرا کر اپنے خطوں کی نگہبانی کرتے تھے ۔

ممتاز : میں کہتا ہوں ۔ شہری تم نے یہ تمام الٹی سیدھی باتیں کس سے سیکھی ہیں ؟

شہر بانو : میں نے اکرام بھیا کے وہ تمام خط پڑھے تھے ۔ اور آپ کے خط بھی پڑھ چکی ہوں !

(ممتاز جھلا کر صوفے کے بازو پر سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے)

ممتاز : کون سے خط ؟

شہر بانو : وہی جو آپ کے پاس پونہ اور بمبئی سے آتے ہیں !

(ممتاز جھنجھلا اٹھتا ہے ۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کیا کہے اور کیا کرے)

ممتاز : تمھارا مطلب ہے کہ تم اس قدر ڈھٹائی کے ساتھ مجھے ہی بتا رہی ہو کہ تم چھپ چھپ کے میرے خط پڑھتی رہی ہو ؟

شہر بانو : چھپ چھپ کے ہی خط پڑھنے میں مزہ آتا ہے ـــــ میرا تو خیال ہے کہ سبھی لوگ

چھپ چھپ کے اوروں کے خط پڑھتے ہیں علی الاعلان تو کوئی نہیں پڑھتا۔ آپ بھی ضرور اوروں کے خط پڑھتے ہوں گے۔ بلکہ شاید اس وقت بھی آپ اپنے خطوں کے بجائے کسی اور کے خطوں کی تلاش میں تھے۔ جبھی آپ مجھے دیکھ کر اس قدر ہڑبڑا ئے تھے۔

ممتاز : میں تو تم کو دیکھ کر نہیں ہڑبڑایا تھا۔ میرا خیال ہے تمھارے دماغ میں بہت سی بے کار باتیں بھر گئی ہیں۔ کہوں گا آنٹی سے۔ انھوں نے ہی تمھارا دماغ خراب کیا ہے۔ وہی ٹھیک بھی کریں گی!

شہر بانو : آنٹی کو خود اوروں کے خط پڑھنے کا شوق ہے۔ جب اکرام بھیا آئے ہوئے تھے اور ایک روز میں ان کے خط پڑھ رہی تھی اور آنٹی آگئی تھیں اور میں ڈر پڑی تھی تو آنٹی نے مجھ سے لینے کے بعد وہ خط خود پڑھے تھے اور پھر ہم ساتھ مل کر خط پڑھا کرتے تھے۔ کیونکہ میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ اگر انھوں نے مجھ کو خط نہ پڑھنے دیئے تو میں آنٹی سے کہہ دوں گی۔

ممتاز : خوب! اور آنٹی تم سے ڈرتی تھیں اور تمھارے ساتھ مل کر غیروں کے خط پڑھتی تھیں۔

شہر بانو : ——— اور کہتی تھیں غیروں کے خط پڑھنے میں جتنا مزہ آتا ہے اتنا اپنے خط پڑھنے میں نہیں آتا ——— اور اکرام بھیا

ممتاز : (جھلا کر بات کاٹتے ہوئے) چولہے میں جاؤ تم اور تمھارے اکرام بھیا۔ اگر تم نے میرے خط پڑھے تو ———!

شہر بانو : اگر پڑھے تو! جیسے میں نے پڑھے ہی نہیں! مگر معاف کیجئے آپ کے نام جو خط آتے رہیں وہ اتنے دلچسپ نہیں ہوتے جتنے اکرام بھیا کے خط ہوتے تھے۔ اور ان میں تو سر پھر کے آپ کا ہی ذکر ہوتا ہے (اب اطمینان کے ساتھ ایک آرام کرسی پر بیٹھ جاتی ہے) اور پھر بعض دفعہ ان خطوں میں لکھائی بھی ایسی ہوتی ہے کہ پڑھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

ممتاز : (جواب پھر ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ جھنجلا بہت رہا ہے۔ لیکن کچھ کرنے سے معذور ہے) خیر میرا خیال ہے۔ شہر بانو۔ کہ آنٹی نے تمھارا دماغ بہت خراب کر دیا ہے اور اس کا مجھے بہت افسوس ہے۔ کیونکہ بڑے ہو کر یہ چیز تم کو بہت نقصان دہ معلوم ہوگی۔

(شہر بانو اس کا کوئی جواب دینا ضروری نہیں سمجھتی۔ ممتاز ایک
بار پھر ڈیسک تک جاتا ہے اور اب کی بار ذرا اطمینان کے ساتھ
ایک دراز کھول کے دیکھنے لگتا ہے۔ شہر بانو کی طرف اس کی
پیٹھ ہے)

ممتاز : (تھوڑے وقفے کے بعد) شہری! اس وقت ... آنٹی کہاں ہیں؟

شہر بانو : اپنے کمرے میں بیٹھی البم میں پرانی تصویریں دیکھ رہی ہیں۔

ممتاز : اور فرو کہاں ہیں؟

شہر بانو : وہ تو بہت دیر سے غائب ہیں۔ ممکن ہے ماں تک گئی ہوں۔

ممتاز : اور شاہینہ تو ادھر نہیں آئی تھیں؟

شہر بانو : اوہ! یہ آپ شاہینہ کو کیوں پوچھتے رہتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے آنے سے پہلے باہر
بھاگ جایا کریں۔ وہ ہمیشہ آپ کو ڈانٹ جو دیتی ہیں۔

ممتاز : خیر، ڈانٹ تو وہ مجھ کو کیا بتائیں گی۔

(تھوڑی دیر پھر خاموشی رہتی ہے جس اثنا میں صرف ممتاز دراز
کھولتا بند کرتا رہتا ہے اور اس کا شور مچتا رہتا ہے پھر ایکا ایکی
ممتاز چونک کر پیچھے مڑتا ہے جیسے اس کو ایک دم سے کوئی عمدہ
سی ترکیب سوجھ گئی ہو۔)

سنو! شہری مجھے تم سے ایک ضروری بات کہنی ہے۔

شہر بانو : کس کے بارے میں؟

ممتاز : کہنا چاہیے میرے اپنے بارے میں۔

شہر بانو : اپنے بارے میں۔ یہ آپ ہمیشہ اپنے بارے میں ہی کیوں باتیں کرنا چاہتے ہیں؟

ممتاز : تم میری بات سنو۔ یہ مسئلہ بہت اہم ہے۔ (واپس آکر شہر بانو کے قریب کھڑا ہو جاتا ہے)

میں تم سے ابھی ابھی اپنے غصے میں کہہ رہا تھا کہ تمہارا دماغ بہت خراب ہو گیا ہے لیکن در اصل یہ بات غلط ہے۔ میرا تو خیال ہے تم کافی ذہین لڑکی ہو۔ تم بہت سی باتیں سمجھ جاتی ہو۔ بلکہ تم اپنی عمر کی لڑکیوں سے بہت زیادہ سمجھدار ہو۔ اور شاید اسی لیے آنٹی بھی تم سے ڈرتی ہیں۔

(ذرا رکتا ہے۔ جیسے دیکھنا چاہتا ہو کہ اس کی باتوں کا شہر بانو پر کیا اثر ہو رہا ہے پھر اپنا اطمینان کرکے بولنا شروع کر دیتا ہے)

تو اسی لیے میں تم سے ایک معاہدہ طے کرنا چاہتا ہوں۔

شہر بانو اب اس کی باتوں میں بہت گہری دلچسپی محسوس کر رہی ہے اور غور سے سُن رہی ہے)

در اصل ہم سب لوگ بہت ڈرپوک ہیں۔ یعنی ہم لوگ جو سمجھتے ہیں کہ ہم میں کافی عقل موجود ہے آنٹی بھی ڈرپوک ہیں۔ میں بھی ڈرپوک ہوں۔ فرو بھی ڈرپوک ہیں۔ آنٹی کو تم سے ڈر لگتا ہے۔ مجھ کو آنٹی سے ڈر لگتا ہے لیکن ہم کم عمر والے لوگ

شہر بانو : (بات کاٹ کر) میں کم عمر نہیں ہوں۔

ممتاز : خیر تم لوگ شاید کتے بلی سے تو ڈرتے ہو لیکن ہماری طرح انسانوں سے نہیں۔ اسی لیے میں تم سے یہ معاہدہ طے کرنا چاہتا ہوں۔ تم کو معلوم ہی ہے کہ مجھ کو اس بات سے بہت ڈر لگتا ہے کہ آنٹی فرد کو اپنی بالتو بلی کی طرح سمجھتی ہیں اور اس خیال سے اور بھی زیادہ ڈر لگتا ہے کہ کہیں یہ بلی مجھ پر نہ پھینک دی جائے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس بلی سے بچتے رہنے میں تم میری مدد کرو مثلاً جہاں بلی کی موجودگی میرے لیے خطرہ بن جائے اور میں اس خطرے کو بھولنے لگوں تم میری توجہ اس خطرے کی طرف کرا دیا کرو۔ کسی نہ کسی ترکیب سے! —— تم ہوشیار ہو اور عین وقت پر اچھی سی ترکیب سوچ سکتی ہو۔ تم مجھ کو ہمیشہ چوکنا کر دیا کرو اور بے شک تم میرے خطرے پڑھ سکتی ہو۔ صرف یہ ہے کہ ان کا اشتہار نہ دیا کرو۔

شہر بانو : نہیں! لوگوں کے خطوں کا اوروں سے ذکر کرنا تو بے وقوفی ہے۔ اس طرح تو اور لوگ جو کہنے

ہو جاتے ہیں۔

(بائیں بازو کے کمرے میں قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے
اور آنٹی کی آواز سنائی دیتی ہے)

فرد! —— شہری! —— تم سب کہاں ہو۔ دیکھو یہ ۱۹۰۱ء کی تصویریں جس سال وہ زبردست دربار ہوا تھا۔ یہ تصویریں بہت دلچسپ ہیں۔

(آواز قریب آرہی ہے اور ممتاز تیزی کے ساتھ دائیں دروازے سے باہر نکل جاتا ہے۔ شہر بانو اس کی گھبراہٹ پر تھوڑا سا مسکراتی ہے۔ لیکن جب آنٹی داخل ہوتی ہیں تو شہر بانو اپنی مسکراہٹ ضبط کر لیتی ہے)

(آنٹی لمبے قد کی ہیں۔ ساڑھی اپنی عمر کے لحاظ سے ذرا بھڑکیلی پہن رکھی ہے۔ ان کے بال بہت سفید ہو چکے ہیں لیکن وہ ان کو کافی سٹائل سے بناتی ہیں۔ ان کی شکل اس بڑھاپے میں بھی خاصی دلکش ہے۔ ان کے ہاتھ میں اس وقت بڑے سائز کی ایک چمڑے کی البم ہے)

آنٹی: دیکھو شہری، یہ تصویر دربار کے چند روز بعد ہی کھینچی گئی تھی۔ یہ ہیں ہاشم صاحب تمہارے انکل کے دوست۔ یہ ہیں ان کی بیوی۔ بے حد دقیانوسی تھیں۔ میں نے ہی بیچاری پر تھوڑا بہت اثر ڈال کر سدھار رکھا تھا لیکن پھر بھی ساڑھی پہنتے ہوئے شرماتی تھیں —— اور یہ ہیں تمہارے انکل، اور یہ ہیں بالکل ان کے سامنے۔ اور یہ کچھ اور لوگ ہیں۔ اب تو نام بھی یاد نہیں رہتے دراصل ان دنوں اس قدر لوگوں سے ملنا ہوتا تھا کہ بہت سوں کا تو نام بھی ٹھیک سے پتہ نہ چلتا تھا صرف بہت دلچسپ قسم کے لوگ یاد رہ جاتے تھے —— یہ تصویر میری شادی کے تھوڑے دن بعد ہی لی گئی تھی۔ لیکن میری شادی بھی تو بہت کم عمر میں ہو گئی تھی۔

شہر بانو: (مصنوعی طور پر دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے) لیکن آنٹی۔ انکل تو آپ سے عمر میں بہت بڑے نظر آتے ہیں اس تصویر میں۔ بلکہ مجھ کو تو یہ انکل معلوم ہی نہیں ہوتے۔

آنٹی: لیڈی سمیع اللہ خاں بھی یہی کہتی تھیں۔ لیڈی سمیع اللہ میری شادی سے پہلے تمھارے انکل کی دوست تھیں۔ بلکہ اب تم سے کیا چھپانا۔ مجھ کو تو کچھ اور بھی شبہ تھا۔ لیکن مَیں نے بھی شادی کے بعد ان پر اس قدر رعب ڈالا تھا کہ وہ انکل سے کہتی تھیں کہ مَیں ان سے بہت زیادہ اچھی ہوں۔ بلکہ وہ بالکل میرے لائق ہی نہ تھے ——— لیڈی سمیع اللہ نے اپنے مرنے سے پہلے بھی ایک مرتبہ مجھ کو یاد کیا تھا۔ جب دو برس ہوئے ان کا پرانا ڈرائیور جلیل ہمارے یہاں آیا تھا تو اس نے مجھے بتایا تھا کہ ڈلہوزی کے ہسپتال میں مرنے سے پہلے لیڈی سمیع اللہ نے کئی بار میرا نام لیا تھا۔ لیکن وہ تو ان کی بیماری کا ٹھیک سے پتہ چل جاتا تو مَیں ضرور ان سے ملنے ڈلہوزی جاتی۔ آخر ایسی محبت والے لوگ روز روز تھوڑی مرتے ہیں۔ اب مثلاً بیگم شہیر میں تم سمجھتی ہو کہ اگر مرنے سے پہلے وہ مجھ کو یاد کریں گی۔ تو مَیں ان سے ملنے نہ جاؤں گی۔

شہر بانو: مگر آنٹی بیگم شہیر تو بالکل جوان معلوم ہوتی ہیں۔ عمر میں آپ سے کم نظر آتی ہیں۔

آنٹی: اوہ ہو! تم لوگ تو بہت ہی بے وقوف ہو۔ کوئی بال کٹوائے میک اپ کرے تو جوان بن جاتا ہے وہ مجھ سے عمر میں قطعی بڑی ہیں در اصل وہ بہت چالاک آدمی ہیں اوروں کو تو اپنی عمر کے بارے میں دھوکا دینا چاہتی ہی ہیں خود کو بھی دھوکے میں رکھتی ہیں۔ مگر ظاہر ہے۔ مجھ سے کیا چھپا سکتی ہیں۔ مَیں تو اس وقت سے جانتی ہوں جب وہ بیاہ ہو کر دہرہ دون آئی تھیں۔ اب وہ ننھی بچہ بننے لگیں تو اور بات ہے ——— اور سچ پوچھو تو میرا خیال ہے کہ اس طرح جوان بن کر پھرنے میں ضرور ان کا کوئی مقصد ہے۔

شہر بانو: (گہری دلچسپی کے ساتھ) کیسا مقصد؟

آنٹی: (ڈانٹ کر) تم نہیں سمجھ سکتیں۔

ایک صوفے پر بیٹھ جاتی ہیں۔ البم اپنی گود میں رکھ لیتی ہیں۔

اور ایک ایک ورق آہستہ آہستہ الٹتی جاتی ہیں۔ جیسے ہر
ورق پہ ان کے خیالات میں کوئی ہیجان پیدا ہو رہا ہو۔ شہزاد نو
بھی ان کے برابر آن کر بیٹھ جاتی ہے اور تصویروں کو دیکھنے
لگتی ہے۔ آنٹی دھیمے لہجے میں بول رہی ہیں جیسے اپنے خیالات
میں مستغرق ہوں)

یہ ہیرہ دون کی تصویریں ہیں ـــــ بالوں کا یہ سٹائل ان دنوں فرنگی اور پارسی سمجھا جاتا تھا۔ مگر میں نے جان بوجھ کر اس طرح کے بال بنانے شروع کئے تھے۔ کیونکہ میں کبھی اپنے ماحول سے دب کر نہ رہنا چاہتی تھی۔ در اصل میں ہمیشہ یہ کوشش کرتی تھی۔ کہ ایسی بات کروں جس سے لوگ متوجہ ہوں۔ شروع شروع میں تو تمھارے انکل کو یہ بہت عجیب معلوم ہوا۔ لیکن چند روز بعد ہی میں نے ان کو اس کا عادی بنا لیا ـــــ یہ ہمارے کچھ دوست ہیں۔ اس روز ہم لوگ ڈیہرہ دون سے باہر ایک چشمے پر پکنک کو گئے تھے۔ اور تمھارے انکل کے دوستوں نے مجھ سے گانا سنانے کو کہا تھا ـــــ یہ سر جان ٹامز ہیں انھوں نے خود اپنی تصویر تمھارے انکل کو دستخط کر کے دی تھی۔ ـــــ سر جان ہمیشہ کہتے تھے کہ انھوں نے اردو صرف مجھ سے بات چیت کرنے کے لیے سیکھی تھی۔ سر جان بہت دوست طبیعت انسان تھے۔ ہر ایک کے دوست تھے۔

(آنٹی بول ہی رہی ہیں کہ شاہینہ بائیں طرف سے داخل
ہو کر ان کے صوفے کے پیچھے آن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔
شاہینہ شکل سے ذہین معلوم ہوتی ہے۔ بال سادگی کے
ساتھ پیچھے کو کر کے بنا رکھے ہیں جس سے اس کی پیشانی
اور بھی چوڑی معلوم ہونے لگتی ہے۔ آنکھوں میں کافی سنجیدگی
ہے ـــ)

شاہینہ : اوہ آنٹی ۔ پھر آپ پھر ان مدہم رنگوں کی تصویروں کو دیکھنے میں مشغول ہیں ۔ دل نہیں بھرتا آپ کا ان سے ؟

آنٹی : (ذرا ہنس کر) دل بھرنے کی کیا بات ہے ؟ بھئی یہی تو تم لوگوں میں اور ہم میں فرق ہے ۔ تم کو ہر چیز کا دو دن کا شوق ہوتا ہے نہ کوئی وضعداری نہ کوئی طبیعت میں بھاری پن اب کل ہی کی بات ہے ۔ میں اپنے پرانے کاغذات دیکھ رہی تھی ان میں مسز شریف الدین کا ایک خط نکل آیا ۔ جو انھوں نے چائے پر بلانے کے لیے لکھا تھا ۱۹۲۱ء میں ہم لوگوں کی ملاقات کو پندرہ سال ہو گئے تھے ۔ لیکن ہم لوگوں کا دل نہ بھرا تھا ۔ اور مسز شریف الدین نے وہ چائے کا بلاوا اس قدر محبت سے لکھا تھا کہ میں نے اب تک محفوظ رکھا ہے ۔ اور ایک تم لوگوں کی ملاقاتیں ہوتی ہیں دو حرفی بلاوے دیدیئے جاتے ہیں ۔ بہت ہوتا ہے تو ٹیلیفون کر دیا جاتا ہے ـــــ اور بس ـــــ آ گئے تو دوستی نہ آئے تو سب کچھ ختم ۔ سب کچھ فراموش ! یہ بھی کوئی ملاقاتیں ہیں ۔

شاہینہ : (جواب ایک کرسی پر بیٹھ چکی ہے) پہلے لوگوں کو ملاقاتوں کے علاوہ کچھ اور کام تھا ہی نہیں ۔ اور اب لوگوں کو اس قدر کام ہے کہ ملاقات جیسی غیر ضروری چیز کے لیے وقت ہی نہیں ملتا ۔ اور میں تو سمجھتی ہوں آنٹی کہ آپ بھی خواہ مخواہ اپنا وقت ان مدہم پرانی تصویروں اور کاغذات میں ضائع کرتی ہیں ۔ بہتر تو یہ ہو کہ آپ ان کے بجائے اپنے گرد کی دنیا میں دلچسپی لیجئے ۔ دنیا اب بہت بدل چکی ہے ۔ اب سے پچیس برس پہلے کی دنیا میں آپ کی مسز شریف الدین تھیں ۔ سر جان تھے ۔ بیگم شہیر تھیں ۔ لیڈی سمیع اللہ تھیں ۔ اب یہ لوگ مر چکے ہیں ۔ جو ان میں سے زندہ ہیں وہ زندہ ہوتے ہوئے بھی مردوں سے بدتر ہیں ـــــــ اب تو اس دنیا میں فرحت ہے ممتاز ہے ۔ ہاں ممتاز کہاں ہے ۔ آنٹی اور فرحت کہاں ہے ؟

شہر بانو : ممتاز بھائی تو ابھی ابھی باہر گئے ہیں اور شاید بہت دیر میں آئیں گے ۔ اور فرح آیا تو بہت دیر سے غائب ہیں ؟

انٹی : نہیں دونوں ایک ہی جگہ کب گئے ہیں۔ دس بار فرو سے کہا کہ باہر جاتے ہوئے ممتاز سے پوچھ لیا کرو۔ لیکن وہ ہمیشہ اکیلی ہی غائب ہو جاتی ہے اور ممتاز الگ غائب رہتا ہے۔ عجیب لوگ ہیں۔

شاہینہ : عجیب کی کیا بات ہے۔ انسان سب سے زیادہ انسان سے ہی اکتاتا ہے۔ بلکہ میرا تو خیال ہے کہ انسان کو بہت زیادہ ڈر بھی انسان سے ہی لگتا ہے۔

(شہر بانو حیرت سے اس کو دیکھتی ہے کیونکہ ممتاز کے الفاظ یاد آجاتے ہیں)

اسی ڈر کی وجہ سے آپ اپنے گرد کی دنیا سے گھبراتی ہیں اور بیس برس پہلے کی دنیا میں رہتی ہیں اور اسی لیے ممتاز اور فرحت الگ الگ غائب ہوتے ہیں۔

آنٹی : (جو اب بیس برس پہلے کی دنیا کے اس تحقیر آمیز تذکرے سے گھبرا گئی ہیں) خیر مگر جب لوگ اس قدر خود غرض نہ تھے۔ بیس برس پہلے ہم جس کسی سے بھی ملتے تھے۔ خلوص کے ساتھ، لیڈی سمیع اللہ تھیں وہ ہمیشہ کٹھ پتلیوں کے تماشوں میں مجھ کو ضرور بلاتی تھیں۔ کیونکہ ان کو پتہ تھا کہ مجھے کٹھ پتلیوں کے تماشے بہت پسند تھے۔ —— اور سر جان بچارے ہمیشہ مجھ سے اردو میں بات کرتے تھے

شاہینہ : (بات کاٹ کر) اور اس سب کو آپ خلوص کہتی ہیں؛ اب لوگوں کے تعلقات پر خلوص رہتے ہیں۔ اگر ایک دوسرے سے گھبراتے ہیں یا اکتاجاتے ہیں تو صاف صاف تو کہہ سکتے ہیں۔

آنٹی : مگر آخر فرو کو ممتاز سے گھبرانے کی کیا وجہ ہے۔ مجھ کو تو وہ بہت معقول آدمی معلوم ہوتا ہے۔

شاہینہ : جی ہاں۔ بہت۔ تبھی تو تمام وقت الٹی سیدھی خیالی باتیں کرتا رہتا ہے اور اتنی ہمت نہیں رکھتا کہ کسی سے کوئی بات بھی صاف طور پر کہہ دے۔

آنٹی : اس میں ہمت کی کیا بات ہے۔ خواہ مخواہ کی صاف گوئی کوئی بہت بڑی خوبی نہیں۔ اس سے بعض دفعہ اوروں کی دل آزاری ہوتی ہے۔

شاہینہ: ہاں! آپ لوگ بس چھوٹی دل آزاری سے تو ڈرتے تھے۔ اسی وجہ سے تو آپ لوگ ایک سے ایک ساڑھی کی تعریف کرتے تھے۔ دوسرے سے برائی ایک پارٹی کو ایک شخص کے سامنے دلچسپ بتاتے تھے دوسرے کے سامنے بے حد تلخ۔ کٹھ پتلیوں کے تماشوں کو اس لیے پسند کرتے تھے کہ لیڈی سمیع اللہ کی دل آزاری نہ ہو۔ اور بس زندگی بہت مزیدار تھی۔

(آنٹی اب شاہینہ کی باتوں سے جھنجھلا اٹھی ہیں اور وہ جھلا کر
کھڑی ہو جاتی ہیں اور ڈیسک کے قریب آن کر البم ٹیک
کر اس پر رکھ دیتی ہیں۔ پھر یونہی وقت کاٹنے کے لیے
ایک دراز کھول اس کے اندر کا غذات ٹٹولنے لگتی ہیں۔
لیکن شہر بانو ان کو غور سے دیکھ رہی ہے۔ جیسے ان کی
اس حرکت کو مشتبہ سمجھ رہی ہو۔ پھر ایکدم سے اس کو اپنا
اور ممانہ کا معاہدہ یاد آ جاتا ہے اور وہ اپنا فرض سمجھتی ہے
کہ آنٹی کو ممتاز کے خط نکالنے سے روک لے اس لئے
وہ بھی لپک کر رائٹنگ ڈیسک تک جاتی ہے)

شہر بانو: اوہ آنٹی، میں تو شاہینہ باجی کی ان باتوں میں بالکل بھول ہی چلی تھی۔ فرحت آپا نے باہر جانے سے پہلے کہا تھا کہ وہ آپ کے نمونے کا ساڑھی کا آرڈر دینا چاہتی ہیں۔

آنٹی: (چونک کر) کون سا نمونہ؟

شہر بانو: وہ۔ وہ جس پر کیریاں بنی ہیں۔

آنٹی: (آہستہ سے۔ جیسے اپنی ناکامی کو محسوس کر رہی ہوں) اچھا اوہ! چلو چل کر دیکھیں۔

البم اٹھا کر بائیں طرف سے باہر نکل جاتی ہیں۔ شاہینہ ناک
سکوڑ کے ان دونوں کو باہر جاتے دیکھتی ہے پھر خود بھی اٹھ

کر باہر چلی جاتی ہے۔ اور کمرہ تھوڑی دیر تک بالکل خاموش
رہتا ہے)

(چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ڈرائنگ روم کے دائیں طرف
قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ جس سے اندازہ ہو سکتا ہے
کہ دو آدمی کمرے کی طرف آ رہے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ ان کی
آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں۔ اُونچی آواز میں بولنے والا ایک
تانگے والا ہے)

تانگے والا : تو باوجی : مَیں نے اُس سے پوچھا کہ تو ایسا کام کیوں کرتی ہے؟ کیا مصیبت آن پڑی ہے؟ تو بولی۔ بھیّا مَیں ایسا کام کبھی نہ کروں۔ پر مجھ سے کوئی شادی بھی تو نہ کرتا ہے۔ کوئی مجھ سے آج شادی کر لے مَیں آج یہ چھوڑ دوں۔

باتیں کرتے کرتے ممتاز اور تانگے والا داخل ہوتے ہیں
ممتاز کے چہرے پر گھبراہٹ اب اس قدر نہیں ہے جتنی پہلے
تھی۔
تانگے والا، جو اس سے ذرا پیچھے چل رہا ہے۔ گٹھے ہوئے
جسم کا ہے۔ وہ اس وقت صرف ایک موٹا گلابی آستینوں
والا بنیان پہنے ہوئے ہے اور ایک اونچی سی شلوار۔ سر
کے بال چکنے اور گھنے ہیں اور پیچھے کو کرکے بنے ہوئے
ہیں۔ بالوں کی لٹیں کانوں پر لٹکی ہوئی ہیں۔ ہاتھ میں ہنٹر ہے
وہ اُونچی آواز میں باتیں کرنے کا عادی ہے اور اس وقت
بھی ضرورت سے زیادہ جوش کے ساتھ باتیں کر رہا ہے)

تو باوجی ! مَیں نے کہا۔ تُو جھوٹ بکتی ہے۔ اس پر باوجی وہ تو لال لال دیدے کرکے مجھ پر

بھپک پڑی۔ بولی بھیا جھوٹ بولتی ہوں۔ لے تو ہی کر لے مجھ سے شادی۔ او بے۔ میں نے کہا۔ یہ حرام زادی تو میرے پیچھے پڑ گئی۔ تو بابوجی۔ میں نے دل میں کہا۔ بھاگ چل مشتاق بیٹا۔ اب تو بھاگ چل۔ اور وہ حرام زادی شاید میرے دل کی بات سمجھ گئی۔ بولی دیکھ لے۔ تو ہی خود دیکھ لے۔ میں کیا جھوٹ کہتی ہوں۔ اور میں نے سوچا مشتاق بیٹا اب تو چپ ہی رہو تو اچھا ہے بابوجی۔ وہ تو اپنے دھندے سے لگ گئی اور میں فرفٹی واپس سٹیشن کو۔

(ممتاز رائٹنگ ڈیسک کی ایک دراز کھول کر کچھ پیسے نکال کے تانگے والے کو دیتا ہے۔ تانگے والا بلند آواز میں مہربانی بابوجی کہتا ہے اور دائیں طرف سے باہر چلا جاتا ہے۔ ممتاز ایک اور دراز کھول کر رنگ برنگے لفافوں کا ایک بنڈل نکالتا ہے۔ بائیں طرف سے شاہینہ داخل ہوتی ہے لیکن ممتاز خلافِ توقع اس کو دیکھ کر جھجکتا یا جھینپتا نہیں۔ بلکہ وہ بنڈل ہاتھ میں لیے اس کی طرف بڑھتا ہے)

شاہینہ : اونہہ حسبِ معمول، تم اپنے میں مگن ہو۔ ممتاز اپنے خط، اپنے کاغذات، اپنی تصویریں اپنا ذکر۔ تم کبھی اپنے سے اکتاتے بھی نہیں۔

ممتاز : کیوں میں خود کو اپنے اردگرد کے بہت سے لوگوں سے دلچسپ پاتا ہوں۔ اردگرد کے اکثر لوگ بہت خشک اور غیر دلچسپ ہوتے ہیں ہاں بے شک ابھی ابھی میرا ایک بہت دلچسپ آدمی سے واسطہ پڑا تھا۔ ایک تانگے والے سے۔ جس نے مجھ کو ایک دلچسپ قصہ سنایا تھا۔

شاہینہ : (رکھائی کے ساتھ دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے) کیسا قصہ؟

ممتاز : اس نے مجھ کو بتایا کہ کل شام اس کی ملاقات سٹیشن کے باہر اسٹینڈ پر ایک بہت دلچسپ ہستی سے ہوئی۔ ایک عورت سے۔ سب عورتیں تو دلچسپ نہیں ہوتیں مگر یہ عورت واقعی

دلچسپ تھی۔ وہ عام عورتوں کی طرح کالا برقعہ اوڑھے ہوئے تھی لیکن وہ اکیلی تھی۔

شاہینہ: ہاں اکیلی تھی اور تانگے والا اُس کو لے کر آبادی سے دور بھاگ گیا ہوگا اور اس کے اکیلے پن کا۔ عورت ہونے کا فائدہ اٹھانا چاہتا ہوگا اور اس نے ڈٹ کر اس کا مقابلہ کیا ہوگا۔

ممتاز: (مسکراتے ہوئے طنزاً) نہیں۔ یوں نہیں۔ بلکہ وہ عورت اس کو لے کر بھاگ جانا چاہتی تھی اور وہ تانگہ والا شخص اپنی عقل مندی سے بچ نکلا۔ ورنہ دبوچ ہی لیا ہوتا اُس نے تو (قصہ سنانے کے انداز میں) پہلے تو اس نے کہا وہ شہر سے پانچ میل گڈی پہ جانا چاہتی ہے اور تانگے والا معقولیت کے ساتھ اس کو وہاں لے جانے لگا۔ تو کہنے لگی میں تو بالکل ہی بھول گئی تھی۔ مجھے تو نہر کے کنارے پُل کے قریب ایک کوٹھی پہ جانا ہے اور تانگہ والا اسی معقولیت کے ساتھ ادھر جانے لگا تو بولی۔ بھیا تانگے والے۔ تم مجھ کو کسی سے کچھ پیسے دلواؤ گے۔ وہ بولا۔ کیوں تمہارا کسی پہ قرض چاہیئے ہے تو بہنے لگی۔ کہنے لگی بھیا۔ میرا تو سب ہی مردوں پہ ادھار ہے تانگے والا بچارا اس کی بات نہ سمجھ سکا۔ کہنے لگا کیسا ادھار۔ کیوں دیدیا تھا تم نے ادھار —— تو وہ بولی۔ تم تو بالکل بچے ہو۔ اس پہ وہ غریب تانگے والا اس کا مطلب کچھ سمجھ سکا اور سناٹے میں آگیا اور کہنے لگا۔ میں نے تو کبھی کسی کو اس دھندے میں مدد دی ہی نہیں۔ تو بہت بری ہے کہ کھلم کھلا ایسی باتیں کرتی ہے۔ تو بولی اس میں چھپانے کی بات ہی کون سی ہے۔

اس وقت بائیں دروازے سے شہر بانو داخل ہوتی ہے اور ممتاز اور شاہینہ کو باتوں میں اس قدر محو دیکھ کر پہلے تو دہلیز پہ ٹھٹکتی ہے۔ پھر اُس کو ممتاز سے اپنا وعدہ یاد آجاتا ہے اور وہ محسوس کرتی ہے کہ ممتاز اس وقت ایک بہت ڈیپ خطرے سے بے خبر ہے۔ پہلے تو وہ دھماکے کے ساتھ بائیں طرف والے صوفے پہ بیٹھ جاتی ہے۔ ایسے کہ ممتاز اور شاہینہ کو اس کی موجودگی کا احساس

ہو جاتا ہے ۔ پھر بھی ان دونوں کو مصروف گفتگو دیکھتی ہے
تو ایکا ایکی بلی کی طرح میاؤں میاؤں کرتی ہے لیکن ممتاز
اپنی بات جاری رکھتا ہے۔ وہ ایسے بول رہا ہے کہ شہر بانو
کو اس کی آواز سنائی نہیں دے سکتی ۔ شاہینہ اتنی محو ہے
کہ مڑ کر بھی نہیں دیکھتی ۔)

تو تانگے والا اور بھی سٹپٹایا ۔ اور گھبرا کر بہت مہذب بننے کی کوشش کرنے لگا اور پوچھنے لگا
کہ وہ ایسا حقیر پیشہ کیوں اختیار کر چکی ہے ۔ ظاہر ہے اس عورت کو اس کے اس حقارت آمیز
سوال پر کافی جوش آ گیا اور اس نے جھلا کر صاف صاف کہہ دیا کہ وہ ایسی زندگی محض اس لیے
گزار رہی ہے کہ وہ شادی نہیں کر پاتی ہے ۔

شاہینہ : (اب وہ جھلا اٹھتی ہے ۔ کیونکہ وہ ممتاز کے لہجے کو بھی تحقیر آمیز سمجھتی ہے) جھوٹ قطعی جھوٹ ۔
اس نے کبھی بھی ایسا نہ کہا ہوگا ۔

ممتاز : بہرحال اس تانگے والے نے تو مجھ کو یہی بتایا تھا ۔

اور شہر بانو ایکبار پھر بھی اپنی موجودگی کا احساس دلانے
کو میاؤں ۔ میاؤں کرتی ہے ایکی بار اس کا اثر صرف اس قدر
ہوتا ہے کہ ممتاز اور شاہینہ اس کو چونک کر دیکھتے ہیں لیکن
پھر اسی بحث کو جاری رکھتے ہیں ۔)

شاہینہ : وہ تانگے والا بھی تو آخر مرد تھا اس کی بھی وہی ذہنیت تھی اور جو مردوں کی ہے جو تمھاری
ہے ——— تم سب سمجھتے ہو کہ عورتیں صرف ایک ہی مقصد کو اپنے مدنظر رکھتی ہیں ۔ آخر یہ
سب مردوں کو اپنی گرانقدری کا اس قدر احساس کیوں رہتا ہے ؟

ممتاز : (جس کو اب شاہینہ سے بحث کرنے میں مزہ آ رہا ہے) اس لیے کہ کوئی بھی مردوں کی جگہ
نہیں لے سکتا ۔

اب شہر بانو سوچتی ہے کہ خطرہ ممتاز کے بہت ہی قریب
کھسک آیا ہے۔ اس لیے اب کی بار وہ اور بھی بلند آواز سے ایک لمبی
سی میاؤں کرتی ہے۔ اور ممتاز اور شاہینہ مڑ کر ایک ساتھ
اس کو دیکھتے ہیں۔ وہ صوفے پر اطمینان کے ساتھ بیٹھی رہتی
ہے اور ان دونوں سے نظریں ملانے سے گریز کرتی ہے
اور ایکا ایکی ممتاز کو اپنا معاہدہ یاد آ جاتا ہے اور وہ میاؤں
میاؤں کی وجہ کو محسوس کر کے تھوڑا سا مسکرا اٹھتا ہے۔ لیکن
شاہینہ یہ تمام مطلب سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس لیے بہت
جھلا رہی ہے اور جھلا کر پہلے تو ممتاز کی طرف دیکھتی ہے
پھر شہر بانو کی طرف۔ اور پھر شہر بانو کی طرف بڑھتے
ہوئے کہتی ہے)

شاہینہ: شہری! یہ تم کیا الٹی سیدھی حرکتیں کر رہی ہو؟
(شہر بانو خاموش رہتی ہے اور گہری سنجیدگی کے ساتھ
ممتاز کی طرف دیکھتی ہے۔ ممتاز اب بھی معنی خیز طور پر مسکرا
رہا ہے)

بالکل ہی پاگل ہو گئی ہو۔
(پھر اس کے چہرے کی سنجیدگی کو سمجھنے کے لیے ممتاز کی
طرف دیکھتی ہے اور جیسے کچھ سمجھ جاتی ہے۔

اوہ!

اور پھر ٹہلتی ہوئی باہر چلی جاتی ہے ——
ممتاز اطمینان کا سانس لے کر دوسرے صوفے پر بیٹھ جاتا

ہے اور خطوں کے بنڈل کو جواب تک اس کے ہاتھ میں
ہے، اپنی جیب میں ٹھونس لیتا ہے۔ شہر بانو اٹھ کر
اس کے پاس آکر بیٹھ جاتی ہے۔ اس کے چہرے پر بھی
تک بہت گہری سنجیدگی ہے۔ لیکن ممتاز اس سنجیدگی سے
بے خبر ہے)

شہر بانو: آپ ثنا بیگم سے کیا باتیں کر رہے تھے؟ میں نے کتنی بار "میاؤں میاؤں" کی لیکن پھر بھی متوجہ نہ ہوئے۔ اگر آپ کے دماغ کی غیر حاضری کی یہی کیفیت رہی تو میں آپ کی مدد کیسے کر سکوں گی۔

ممتاز: اوہ! وہ تو میں ثنا بیگم کو ایک تانگے والے کا ایک قصہ سنا رہا تھا۔ اس تانگے والے کا جس نے مجھ کو ایک بہت دلچسپ قصہ سنایا تھا۔ بے حد دلچسپ قصہ۔

شہر بانو: اچھا، کیسا قصہ؟

ممتاز: (جس کو اس بات کا احساس ہے کہ شہر بانو کو وہ قصہ سنانا ٹھیک نہیں ہے) کچھ نہیں، تم نہیں سمجھ سکو گی۔

شہر بانو: (اور بھی سنجیدگی کے ساتھ) کیوں نہیں۔ آخر تم مجھ کو اس قدر بچہ کیوں سمجھتے ہو۔

اور اپنی گہری سنجیدہ آنکھوں سے ممتاز کے چہرے کو
گھورنے لگتی ہے۔ ممتاز ذرا سٹپٹا جاتا ہے۔ وہ یہ
سمجھنے سے قاصر ہے کہ ایکا ایکی شہر بانو اس کو بے تکلفی
کے ساتھ تم سے کیوں مخاطب کر رہی ہے۔ اسی وقت
آنٹی داخل ہوتی ہیں اور یہ دونوں چونک کر ان کی طرف
مخاطب ہو جاتے ہیں)

آنٹی: شہری! تم نے کیا کہا تھا جو ثنا بیگم تم سے اس قدر پریشان ہو کر یہاں سے گئی تھی؟

(شہر بانو گھبرا کر ممتاز کی طرف دیکھتی ہے۔ جیسے اس
کی مدد کی طالب ہو۔)

ممتاز : (اس کی مدد کرتے ہوئے) کچھ نہیں آنٹی۔ میں شاہینہ کو ایک دلچسپ قصہ سنا رہا تھا جو آج
ہی مجھ کو ایک تانگے والے نے سنایا تھا اور شاید شہری بھی وہ قصہ سنانا چاہتی تھی۔ اس لیے وہ
اپنی موجودگی کا احساس لانے کے لیے "میاؤں میاؤں" کرنے لگی۔

آنٹی : اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے کیا کرنے لگی ؟

ممتاز : میاؤں میاؤں"

شہر بانو : (صوفے پر سے اٹھتے ہوئے اور اپنے بڑھتے ہوئے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتے
ہوئے) میں اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے کچھ نہیں کر رہی تھی۔ میں تو محض ممتاز کی مدد
کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ ——————

آنٹی : ممتاز کی ؟ ممتاز ! شہری تم نے ان کو بھائی کہنا کب سے چھوڑ دیا ہے ؟

شہر بانو : اس کا تو میں نے آج ہی فیصلہ کیا تھا۔ بلکہ ابھی کچھ دیر پہلے ۔ —— آخر میں ان کو بھائی
کیوں کہوں۔ ہر ایک کو بھائی کہنا یونہی بے ایمانی سی معلوم ہوتی ہے ۔

آنٹی : کیسی بے ایمانی کیا مطلب ہے تمہارا ؟

شہر بانو : کچھ نہیں آنٹی ! آپ سے اس بات پر بحث کرنی بے کار ہے۔ آپ بالکل نہ سمجھ سکیں گی۔
(ان دونوں کے پاس سے ہٹ کر الگ ایک کرسی پر
بیٹھ جاتی ہے)

ممتاز : (سو اب بالکل گڑبڑا چکا ہے) کیا بات ہے شہری! آنٹی کیا نہ سمجھ سکیں گی۔

شہر بانو : کچھ نہیں۔ کچھ نہیں مجھ کو بیکار کی بحث میں نہ گھسیٹو۔

آنٹی : اونہہ۔ میں خوب سمجھتی ہوں ممتاز! تم ان ترکیبوں سے مجھ کو نہیں بہکا سکتے ہو۔

ممتاز : کیسی ترکیبیں ؟ نہ جانے آنٹی آپ کیا سمجھ رہی ہیں ؟

آنٹی : مجھے خوب معلوم ہے میں تمام ایسی ترکیبیں خوب سمجھتی ہوں۔ ایک بار لاہوری میں بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔ سر گنگا سہائے کے بھتیجے نے بھی بالکل یہی حرکت کی تھی مگر میں لیڈی گنگا کی طرح بے وقوف نہیں ہوں۔ لیڈی گنگا میری گہری دوست ضرور تھیں مگر میرا خیال ہے کہ بعض معاملات میں وہ بالکل بودی تھیں۔ اور اس لیے نقصان نہیں اٹھانا چاہتی ہوں۔ بیچاری لیڈی گنگا۔ اب بھی جب وہ مجھے یاد آتی ہیں مجھ کو ان پر بہت ترس آتا ہے۔

ممتاز : نہ جانے، آنٹی۔ آپ کیا سوچ رہی ہیں۔ میں آپ کی لیڈی گنگا اور ان کے بودے پن سے قطعی ناواقف ہوں۔

آنٹی : ظاہر ہے! وہ تمہارے ہوش سنبھالنے سے بھی پہلے مر چکی تھیں۔ بیچاری بہت شکستہ دل مری تھیں۔ محض اس لیے کہ وہ سر گنگا کے بھتیجے کے بارے میں ایک زبردست غلطی کر بیٹھی تھیں۔ لیڈی گنگا اسی سال مری تھیں جس سال تمہارے انکل نے مجھ کو پہلی بار گورنر کی ایک گارڈن پارٹی میں لے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

ممتاز : خیر۔ آنٹی نہ مجھ کو یہ معلوم ہے کہ انکل نے کس سال پہلی بار آپ کو گورنر کی گارڈن پارٹی میں لے جانے کا فیصلہ کیا تھا اور نہ یہ کہ لیڈی گنگا کس سال مری تھیں۔ بہرحال میں آپ کی اس لمحے کی باتیں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ آپ نہ جانے کیا سوچتی رہتی ہیں۔

شہر بانو جو غالباً اس گفتگو سے بالکل دل برداشتہ ہو چکی ہے۔ اٹھ کر آہستہ قدموں سے باہر چلی جاتی ہے۔ ممتاز اس کو باہر جاتے دیکھتا ہے اور پھر آنٹی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ جو اب اطمینان کے ساتھ باتیں کر رہی ہیں جیسے اپنے دل میں کسی اہم بات کا فیصلہ کر چکی ہوں ؟

آنٹی : ہوں! تم یہ سب کچھ سمجھنے سے قاصر ہو لیکن تم کو خوب سمجھتی ہوں۔ میں آج کل تمام نوجوانوں کو۔

خوب سمجھتی ہوں۔ تم لوگ مجھکو بے وقوف نہیں بنا سکتے ہو۔ مثلاً میں یہ اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم اب شہری کی طرف محض اس لیے توجہ کر رہے ہو کہ تم کو فرد کی طرف توجہ نہ کرنی پڑے (ممتاز حیرت سے منہ کھولے آنٹی کو دیکھنے لگتا ہے) لیکن میں تم کو اسی وقت ہی بتا سکتی ہوں کہ تمھاری یہ کوششیں بالکل بے کار ہیں۔

ممتاز : (اپنی حیرت اور غصے کو قابو میں لاتے ہوئے) آنٹی خدا کے واسطے آپ سمجھنے کی کوشش تو کیجیے۔ اس وقت میں تو صرف شاہینہ کو اس تانگے والے کی باتیں سنا رہا تھا جس نے مجھ کو ایک دلچسپ قصہ سنایا تھا۔ بے حد دلچسپ قصہ۔ اور یہ شہری، نہ جانے کیوں بیچ میں کود پڑی۔ اور اب آپ نہ جانے اس سے کیا نتیجے نکال رہی ہیں۔

(شاہینہ داخل ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ اندر
آنے سے پہلے کچھ دیر ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی
کیونکہ وہ اندر داخل ہوتے ہی ان کی گفتگو میں شریک ہو
جاتی ہے)

شاہینہ : اونہہ! تم مجھ کو وہ اپنا بے حد دلچسپ قصہ سنا رہے تھے: جیسے میں تو کچھ سمجھتی ہی نہیں ہوں۔ جیسے میں نے تو شہری کو میاؤں میاؤں کرتے سنا ہی نہ تھا۔ جیسے میں نے تم کو اس معنی خیز طریقے پر مسکراتے دیکھا ہی نہ تھا۔

ممتاز : شہری اس سے میاؤں میاؤں نہیں کر رہی تھی۔

شاہینہ : پھر کس لیے کر رہی تھی۔ ؟ میں خوب سمجھتی ہوں۔ بہت سے لوگ جلن میں ایسے ہی "میاؤں میاؤں" کرتے ہیں۔ جلن میں لوگ بہت سی الٹی سیدھی حرکتیں کر سکتے ہیں۔

ممتاز : کیسی جلن! کس سے جلن؟

آنٹی : اونہہ۔ کیسے معصوم بنتے ہیں۔ جیسے کچھ جانتے ہی نہ ہوں۔ سب نوجوان ایسے ہی بھولے بنتے ہیں۔ شاہینہ! میں یہ تمام معاملہ خوب سمجھتی ہوں۔ کیونکہ بہت عرصہ ہوا جب ڈلہوزی

میں بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔ سرگنگا سہائے کے بھتیجے نے بھی بالکل ایسی ہی حرکت کرنی چاہی تھی۔ اور اس کے نتیجے کے طور پر لیڈی گنگا شکستہ دل مر گئی تھیں ـــــــ مگر میں شکستہ دل نہیں مروں گی۔ ممتاز تم اطمینان رکھو۔

ممتاز: مگر میں کب چاہتا ہوں کہ آپ شکستہ دل مریں یا کیسے بھی مریں۔

(فرحت داخل ہوتی ہے اس کے شانے پر بٹوہ لٹکا ہوا ہے ساڑھی باندھے ہوئے ہے جس پر چھوٹے چھوٹے پھولوں کی بوٹیاں بنی ہوئی ہیں۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا ہے جیسے بہت مشقت کر کے چلی آ رہی ہو اس کے داخل ہونے پر ممتاز ایک لمحے کے لیے محسوس کرتا ہے کہ شاید اس کو اس تمام الجھاؤ سے چھٹکارا مل جائے اور امید بھری نگاہ سے اس کو دیکھتا ہے۔ فرحت نوجوان ہے۔ عمر کوئی بیس سال خوش شکل قد لمبا)

فرحت: یہ کیا ہنگامہ مچا ہوا ہے وہاں شہر بانو کیوں اودھم مچا رہی ہے؟

(سب مل کر ایک ساتھ ممتاز کی طرف دیکھتے ہیں جیسے اس کو اس اودھم کا ذمہ دار سمجھ رہے ہوں)

ممتاز: کچھ نہیں فرو! تم میری بات سنو۔ میں ابھی ابھی یہاں پر رائٹنگ ٹیبل کے قریب کھڑا ہوا تھا آنٹ کو ایک تانگے والے کی بات بتا رہا تھا۔ اس تانگے والے نے آج مجھ کو ایک دلچسپ قصہ سنایا تھا۔

فرحت: (طنزاً) اچھا تم شاہینہ کو ایک بہت دلچسپ قصہ سنا رہے تھے۔

ممتاز: (جو اس طنز سے بے خبر ہے) ہاں! میں ان کو وہ دلچسپ قصہ سنا رہا تھا وہ قصہ تو مجھ کو ایک تانگے والے نے سنایا تھا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ قصہ واقعی بہت

دلچسپ ہے۔

فرحت : (بات کاٹتے ہوئے) ہاں یقیناً ہو گا۔ جبھی تو تم شاہینہ کو اس قدر محویت کے ساتھ سنا رہی تھیں۔ اور جب یہ بیچاری شہر بانو آن کر تمہارے اس دلچسپ قصے میں مخل ہونے لگی تو تم کو بے حد بُرا معلوم ہوا ؛ اور اس لیے تم نے اس غریب کی سب کے سامنے توہین کی اور ——— ———

ممتاز : توہین ! کیسی توہین !

فرحت : یہی کہ تم نے پہلے اس سے وعدے کیئے اور پھر اوروں کے سامنے صاف مکر گئے جیسے اس سے کوئی وعدہ ہی نہ کیا تھا۔

آنٹی : وعدے :——— خوب ! تو تم نے شہری سے وعدے بھی کر لئے ہیں مجھ کو یہ نہ معلوم تھا کہ معاملہ اس قدر بڑھ چکا ہے۔ مگر خیر میں اب بھی معاملے کو سیدھا کر سکتی ہوں اور ضرور سیدھا کروں گی۔ میں لیڈی گنگا کی طرح شکستہ دل نہیں مرنا چاہتی۔

فرحت : (پھر بات کاٹ کر) کون لیڈی گنگا آنٹی ؟ وہ ڈیرہ دون والی ؟

آنٹی : (جھلا کر) نہیں ڈلہوزی والی۔

فرحت : چچ ! بے چاری مر گئیں۔ آپ تو کہتی تھیں وہ آپ کی بہت زبردست دوست تھیں کب مریں بے چاری ؟

آنٹی : پاگل مت بنو فرد۔ وہ آج سے بہت عرصہ پہلے شکستہ دل مری تھیں۔ اور میں نے ان کا ذکر بارہا کیا تھا۔ اس وقت تو میں محض ان کی ایک بات بتا رہی تھی۔ کیونکہ سر گنگا کے بھتیجے نے بھی بالکل ایک ایسی ہی حرکت کی تھی جیسے یہ ممتاز کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس کا لیڈی گنگا کو بہت رنج پہنچا تھا۔

فرحت : گہری دلچسپی لیتے ہوئے) کیسی حرکت آنٹی ؟

آنٹی : وہی جس کا تم ابھی ذکر کر رہی تھیں ——— یہ جو ممتاز کرنے کی کوشش کر رہے ہیں یعنی

میں ان کو قطعی کامیاب نہ ہونے دوں گی۔ آخر میں اس قدر بے وقوف تو ہوں نہیں۔

ممتاز : (تقریباً رو دیکھی آواز میں) خدا کے واسطے آنٹی۔ نہ معلوم آپ اپنے آپ ہی کیا سوچ بیٹھی ہیں۔ فرو تم میری بات سنو۔ جیسا میں نے تم سے کہا میں شاہینہ کو ایک تانگے والے کا ایک دلچسپ قصہ سنا رہا تھا۔ اور مجھ کو پتہ بھی نہ چلا کہ شہر بانو کس وقت اندر آ گئی اور وہاں صوفے پر آن کر بیٹھ گئی۔ پھر غالباً اس کو یہ بُرا لگا کہ ہم نے اس کا کوئی نوٹس کیوں نہ لیا۔ اس لیے وہ بے چاری اپنی موجودگی کا احساس دلانے کو "میاؤں۔ میاؤں" کرنے لگی۔

شاہینہ : ہونہہ۔ موجودگی کا احساس دلانے کو ـــــــ وہ قطعی جلن میں میاؤں میاؤں "کر رہی تھی۔ میں اس طرح کی "میاؤں میاؤں" کو خوب سمجھتی ہوں۔

فرحت : جلن میں! جی یہ آپ کا خیال ہے۔ شہری کی میاؤں میاؤں" اس کے اور ان کے درمیان ایک معاہدے کا نتیجہ تھی۔

آنٹی : کیا معاہدہ کیا تھا انھوں نے شہری سے ؟

فرحت : بلکہ شہری نے ان سے معاہدہ کیا تھا۔ ان کے اصرار پر اس نے وعدہ کیا تھا کہ جب کبھی شاہینہ اکیلے میں ممتاز سے باتیں کرنے کی کوشش کریں گی وہ ممتاز کی مدد کو آجایا کرے گی اور کسی نہ کسی طرح ممتاز کو خطرے سے آگاہ کر دیا کرے گی۔

(اس غیر متوقع انکشاف پر سب لوگ ممتاز سمیت سناٹے میں آجاتے ہیں۔ سب سے زیادہ شاہینہ جھلاتی ہے اور وہ پہلے تو تلملا کر ممتاز کو دیکھتی ہے۔ جیسے اپنے جذبات کی موجودگی میں کچھ کہنے سے قاصر ہو۔ پھر باقی افراد کی طرف دیکھتی ہے ـــــــ اور پھر تیزی کے ساتھ بائیں طرف کے دروازے سے باہر نکلتی ہے۔ ممتاز اس کی طرف لپکتا ہے۔ لیکن وہ پیر پٹکتی باہر نکل جاتی ہے)

ممتاز: (دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے) سنو تو شاہینہ ـــ سنو! یہ فرحت بالکل جھوٹ کہہ رہی ہیں۔

فرحت: ہونہہ۔ جھوٹ کہہ رہی ہوں۔

(اب ایک آرام کرسی پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ جاتی ہے اور ممتاز کو ایسے دیکھتی ہے۔ جیسے اس کی بے بسی پر لذت محسوس کر رہی ہو ـــ جھوٹ کیا کہہ رہی ہوں

اب ممتاز ایک زخم خوردہ جانور معلوم ہو رہا ہے۔ وہ شاہینہ کے پیچھے پیچھے دروازے تک جاکر پلٹ آتا ہے اور پھر فرحت کی طرف جھپٹتا ہے۔ جیسے اس سے بدلہ لینا چاہتا ہو ـــ بات کرتے میں اس کے ہونٹ کپکپا رہے ہیں)

ممتاز: جھوٹ ہی تو ہے! تم نے جان کر جھوٹ بولا ہے۔ شاہینہ کو یہاں سے چلتا کر دینے کے لیے۔ اب میں تم کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں نے شہری سے یہ معاہدہ کیا تھا کہ اگر تم مجھ سے اکیلے میں بات کرنا چاہو تو میری مدد کو آجائے ـــ شاہینہ کا تو کوئی ذکر بھی نہ تھا۔

(واپس آکر وہ رائٹنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے اور اپنی بے تابی کو چھپانے کے لیے وہ اپنی جیبوں میں ہاتھ ٹھونس لیتا ہے۔ جیب میں ہاتھ ڈالنے پر اس کو خطوں کے بنڈل کی موجودگی یاد آجاتی ہے وہ جھلا کر بنڈل نکال کے میز پہ ٹپک دیتا ہے ـــ آنچ اور فرحت کی نظریں آپ ہی آپ خطوں کے بنڈل کی طرف

اُٹھ جاتی ہیں)

(اور اب ممتاز میں ایک تغیر آ جاتا ہے۔ وہ بدلہ لینے

کی موڈ میں ہے)

ممتاز : یہ خط آپ لوگوں کے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہیں۔ ان کو آنٹی تو شاید پہلے پڑھ بھی چکی ہیں (آنٹی دنگ رہ جاتی ہیں) اور شاید فروتم نے بھی یہ خط پڑھ رکھے ہوں۔ اس لئے تمھارا یوں حیرت میں آنکھیں پھاڑنا بالکل بے کار ہے ——— ان خطوں میں کوئی ایسی بات نہیں جس سے آپ لوگ ناواقف ہوں۔ (اتنا کہہ جانے پر ممتاز اپنے میں ایک نیا اعتماد محسوس کر رہا ہے اور ایک ایک لفظ جما جما کر بولتا ہے) میں تو سب سمجھتا ہوں کہ آپ لوگوں سے زیادہ۔ بلکہ ان خطوں کی لکھنے والیوں سے بھی زیادہ خلوص اس عورت میں تھا جو اس تانگے والے کو ملی تھی جس کا دلچسپ قصہ تھوڑی دیر ہوئی مجھ کو اس تانگے والے نے سنایا تھا۔

اس تانگے والے نے نہایت ایمانداری کے ساتھ اس عورت سے پوچھا تھا —" تو ایسا کام کیوں کرتی ہے" اور اس عورت نے اسی قدر ایمانداری کے ساتھ کہہ دیا تھا۔ مجھ سے کوئی شادی ہی نہیں کرتا" وہ بچاری بدمعاش سہی۔ بدکردار سہی مگر تھی تو ایماندار۔ (ممتاز کے ان الفاظ پہ آنٹی اور فرحت دم بخود رہ جاتے ہیں۔ اور قیصر بانو بھی جو اس اثنا میں آنٹی کے صوفے کی پشت پر آ کھڑی ہوتی ہے۔ حیرت سے منہ کھولے یہ باتیں سن رہی ہے۔ اور ممتاز ان سب کو نظر انداز کرتے ہوئے جاتا ہے) اس غریب کو شوہر کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ تو اس نے صاف صاف کہہ دیا۔ لیکن ہمارے گھروں میں شوہر کے لیے اس طرح کی ترکیبیں چلی جاتی ہیں۔ چالیں کی جاتی ہیں۔ تدبیریں لڑائی جاتی ہیں۔ جھوٹے قصے بنائے جاتے ہیں۔ جان بوجھ کر دلچسپ اتفاقات پیدا کئے جاتے ہیں اور پھر شوہروں کو پھانسا جاتا ہے۔ کوئی منہ سے کچھ نہیں کہتا۔ میں تو سوچتا ہوں کہ ہمارے یہاں کا نظام

رہی کچھ گڑبڑ ہے۔ کسی نامعلوم وجہ سے اس نظام کا تمام توازن بگڑ گیا ہے۔ اور ہم سب اس کو سنوارنے کی کوششیں کرتے ہیں اور یہ توازن اور بھی بگڑ جاتا ہے۔ مشکل تو یہ ہے کہ ہم نے اپنے تمام پرانے فرسودہ سہارے توڑ چھوڑ دیئے ہیں۔ ہم سوچتے ہیں مذہب بے کار ہے۔ تصوف بے کار ہے۔ آرٹ بے کار ہے۔ دیومالا بے کار ہے۔ تعصبات بے کار ہیں توہمات بے کار ہیں۔ اور اتنی چیزوں کو بیکار بنا دینے کے بعد ایک بھی کارآمد چیز حاصل کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ اسی لیے آنٹی کو ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ آج سے تیس برس پہلے کی خیالی دنیا میں رہیں۔ شاہینہ جلن میں پیر پٹکتی باہر چلی جاتی ہے۔ فرحت جان بوجھ کر شاہینہ کے سامنے جھوٹ بولتی ہے اور وہ عورت راہ چلتے تانگے والوں سے گانا دلوانے کو کہتی ہے۔

(ممتاز کی اس تقریر بازی کے مقابلے میں آنٹی اور فرحت
خاموش بیٹھی رہتی ہیں البتہ شہر بانو کے چہرے پر ایک
عجیب سنجاب کی سی کیفیت آجاتی ہے۔ جیسے ممتاز کی
باتیں بہت ہی انوکھی معلوم ہو رہی ہوں۔ جیسے وہ ایک
نامعلوم جذبے کا کھوج لگا رہی ہو۔ یا جیسے اس کے
وجود کو ایک پراسرار راحت کا احساس ہو رہا ہو۔ وہ سب سے
زیادہ محویت کے ساتھ ممتاز کی باتیں سن رہی ہے)

مگر میرا خیال ہے کہ میں بھی اس بے کار جنگ و دو میں خواہ مخواہ شریک ہو گیا تھا شاید میں بھی اس عظیم جھوٹ میں حصہ لینا چاہتا تھا یا شاید مجھ کو آنٹی کی انوکھی باتیں بہت دلکش اور دلفریب معلوم ہونے لگی تھیں۔ اور میں اس تمام گڑبڑ میں الجھ کے رہ گیا تھا۔ لیکن خیر اب میں اس سے باہر نکل آیا ہوں

(شہر بانو کے چہرے پر اب ایک عجیب پراسرار قسم کی
مسکراہٹ کھیل رہی ہے۔ سب اس کے اس تغیر سے

بے خبر ہیں کہ لیکا یک ، وہ بول اٹھتی ہے . جیسے اپنے
جذبات کو قابو میں رکھنے سے معذور ہو)

شہر بانو : اوہ کس قدر حسین ۔ کس قدر درست ! ممتاز (سب ایکدم سے چونک اٹھتے ہیں) ممتاز
تم نے بالکل ٹھیک کہا . تم نے سب لوگوں کو کس قدر اچھی طرح سمجھ لیا ہے ۔

آنٹی : (اپنی حیرت پہ قابو پاتے ہوئے) ممتاز ! ممتاز ۔ واقعی شہر بانو تم اس حد پر اتر آئی ہو
——— اب تم کو کسی بات کا لحاظ نہیں ۔ (ذرا ڈانٹ کر) ممتاز ! یہ کیا کہہ رہی
ہے ۔

(ممتاز اپنی جگہ پر سٹپٹا رہا ہے اور اس غیر متوقع صورت
حال کو سمجھنے سے قطعی قاصر ہے)

شہر بانو (آنٹی کو نظر انداز کر کے . اپنی بات جاری رکھتے ہوئے) تم نے بالکل صحیح کہا . ممتاز ! تم اپنے
اردگرد لوگوں کو کس قدر ٹھیک جان لیتے ہو . مجھ کو اس کا اندازہ آج پوری طرح ہو رہا ہے ۔
——— اور آنٹی ——— اس میں شرم اور لحاظ کی کیا بات ہے میرے اس
تمام معاملے میں یہ جذبات ہیں ۔ میں وہ سچ سچ ظاہر کر دینا چاہتی ہوں — — اور میں
ممتاز سے بھی اپنے تعلقات غیر مخلص نہیں رکھنا چاہتی

ممتاز : (اپنے کو سنبھالتے ہوئے) اور یہ تم کیا کہہ رہی ہو . شہر بانو ؟ تم کو کیا ہو گیا ہے ؟ تم کیسی
باتیں کر رہی ہو ؟

شہر بانو : وہ یوں نہ کہو ممتاز . یوں نہ کہو ورنہ میں سمجھوں گی . تم بھی جھوٹ بول رہے ہو تم کو
بھی اس خلوص پہ اعتقاد نہیں جس کی تم ابھی ابھی تلقین کر رہے تھے .
(کچھ وقفے کے بعد)
بلکہ شاید تم ابھی تک اس فریب میں مبتلا ہو . ہاں شاید .
(اور ممتاز کو ایسے دیکھتی ہے . جیسے اس کو اس پہ بے انتہا

ہم آرہا ہوا اور پھر ایسی ہی نظروں سے آنٹی اور فرحت
کو بھی دیکھتا ہے اور پھر اپنے خیالات میں ڈوبی ہوئی
آہستہ قدموں سے باہر نکل جاتی ہے اس کے چلے
جانے کے بعد سب ایک طرح کا سکون محسوس کرتے ہیں
اور اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر آنٹی حالات پر قابو پانے
کی کوشش کرتی ہیں)

آنٹی : ممتاز۔ تم شاید یہ سمجھتے ہو کہ تم اس قسم کی باتیں کر کے اپنے کو اوروں سے برتر سمجھنے کے حقدار بن گئے ہو۔ حالانکہ تمھارا ایسا سوچنا بھی اسی خلوص کی غیر موجودگی کی وجہ سے ہے جس کا تم ابھی ذکر کر رہے تھے اور جو تم کو محض ہماری زندگیوں میں نظر آتی ہے۔ تم اگر غیر مخلص ہونے کا خیال کر لو تو اس کی وجہ سے بلند تو نہیں ہو جاتے ہو۔ ممکن ہے کہ تم کو بہت زیادہ ڈرپوک سمجھا جاتا ہو۔ بلکہ میرا تو خیال یہ ہے کہ تمھاری نسل کے زیادہ تر لوگ بزدل ہی ہوتے ہیں اور بزدلی کو چھپانے کے لیے تدبیریں لڑایا کرتے ہیں۔ کیوں فرح؟

(لیکن فرحت خاموش رہتی ہے۔ آنٹی اپنی بات جاری رکھتی ہے)

ہماری نسل کم از کم ایسی تو نہ تھی اگر ہم جھوٹی اور غیر مخلص زندگیاں گذارتے تھے تو جھوٹی موت بھی مرنے کے لیے تیار رہتے۔ اگر تم فرحت سے شادی نہیں کرنا چاہتے تو تم کو یہ تدبیریں لڑانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ تم شہ ی کو الٹی سیدھی حرکتوں میں اپنے ساتھ ملاؤ اور اس کو بھی بے وقوف بناؤ۔ اور دل سے عجیب غریب تانگے والوں کے قصے گھڑو ———— تم صاف صاف کہنے سے شاید اس لیے ڈرتے ہو کہ اپنے کو مجبور ظاہر کر سکو۔ اور یوں ہماری ہمدردیاں بھی حاصل کر لو———— لیکن ظاہر ہے۔ میری ہمدردی اتنی سستی نہیں۔ تم بے شک ہمارے اس غیر متوازن نظام سے باہر جا

سکتے ہو۔ جاؤ۔ (اٹھ کر باہر جانے لگتی ہے) چلو فرو۔ میرا خیال ہے کہ اب
ممتاز کو تھوڑی دیر اکیلے رہ کر معاملات پر غور کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ ان
کے اپنے خیالات نے ان کے دماغ کو بہت پراگندہ کر دیا ہے ——— اور مجھے تم کو
وہ کیریوں والا بورڈر بھی دینا ہے وہ بارڈر غالباً میں نے بیگم سمیع اللہ کے پردوں کے
ڈیزائن کو چرا کر بنوایا تھا۔

(دروازے تک پہنچ کے فرحت کے انتظار میں رک
جاتی ہے)

فرحت: (کھوئے ہوئے انداز میں) کیونکہ وہ ابھی تک پورے معاملہ کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتی ہے۔
ہاں بارڈر! کون سا بارڈر آنٹی؟

(اور صوفے سے اٹھنے لگتی ہے)

(اب ممتاز کے چہرے پر صرف ایک لمحے کے لیے شدید
گھبراہٹ جھلک آتی ہے، لیکن وہ فوراً ہی اس پر قابو پا
لیتا ہے۔ کیونکہ وہ اب بھی اپنی شکست ماننے کے لیے
تیار نہیں ہے۔ بس کو اب بھی اپنی منطق پر بہت بھروسہ
ہے اور وہ آنٹی کی غیر متوقع منطق کو قبول کرنے کے لیے
تیار نہیں ہے اسی لیے وہ ایک معنی خیز مسکراہٹ سے
آنٹی کو دیکھتا ہے)

ممتاز: آنٹی! میں پھر کہوں گا کہ آپ ہم لوگوں کی نسل کو سمجھنے سے قطعی قاصر ہیں۔ آپ بیس سال
پہلے کی دنیا میں بری طرح کھو چکی ہیں آپ شاید لیڈی سمیع اللہ کو سمجھ سکتی ہیں بیگم شہیر کو سمجھ
سکتی ہیں۔ سر جان کے اردو بولنے کو سمجھ سکتی ہیں ——— لیکن مجھ کو سمجھنے سے
قاصر ہیں۔ ہم لوگوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ میں نے یہ کب کہا کہ میں فرحت سے شادی نہیں

کروں گا۔

(ممتاز کے آخری فقرے پر آنٹی اور فرحت دونوں کے
چہرے پر گہرے استعجاب کا جذبہ جھلک آتا ہے وہ ایک
ساتھ ممتاز کی طرف غور سے دیکھتی ہیں لیکن پھر بھی اس
کی مسکراہٹ کے معنی سمجھنے سے معذور ہیں)

پردہ

صبح و شام

اپندرناتھ اشک

کردار

انجم

عطیہ

منی

شاہ صاحب

رفعت

افضل

پہلا منظر

پردہ تنا صاحب کے کھانے کے کمرے میں اٹھتا ہے کہ وہ سادہ اور صاف ہے فرنیچر کچھ زیادہ نہیں۔ کمرے کے درمیان ایک کھانے کی میز ہے جس کے اردگرد چھ کرسیاں لگی ہیں۔

بائیں طرف کونے میں ایک سٹینڈ پر ہاتھ دھونے کے لیے چلمچی لگی ہوئی ہے اور قریب ہی تپائی پر پانی کا لوٹا رکھا ہے۔ دیوار میں کھونٹی کے ساتھ ایک تولیہ لٹک رہا ہے۔ میز پوش اور تولیہ نیا معلوم ہوتا ہے۔

چھت پر بجلی کا پنکھا آہستہ آہستہ چل رہا ہے اور سامنے ایک کلاک ٹک ٹک کر رہا ہے۔ دائیں اور بائیں دیواروں میں درمیان کو ایک ایک دروازہ ہے جو بالترتیب آنگن اور ڈرائنگ روم کو جاتا ہے۔ دائیں دیوار میں پیچھے کو بھی ایک دروازہ ہے جو ندیم کے چھوٹے سے سونے کے کمرے میں کھلتا ہے۔

پہلی نظر میں جو چیز دل کو بے اختیار اپنی طرف کھینچتی ہے، وہ کمرے کی صفائی اور ترتیب ہے ——— فرش صاف، دیواریں صاف، الماریاں اور دروازوں کے تختے اور شیشے صاف، چلمچی کا سٹینڈ، تپائی، لوٹا، میز، کرسیاں، ہر چیز صاف و شفاف ہے۔ کہیں کوئی دھبہ جالا یا غبار نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ کسی کا گھر نہیں ہسپتال کا ڈائننگ روم ہے۔

پردہ اٹھتے وقت پانچ کرسیاں میز کے نیچے پڑی ہیں صرف ان کی

پیشتیں نظر آتی ہیں پھپٹی پر عطیہ بیٹھی (غالباً، دوسروں کے آنے کا انتظار کرتے ہوئے) ساڑھی کے پلیٹس بن رہی ہے۔

صبح کا وقت ہے۔ گھڑی میں آٹھ بجنے کو ہیں کچھ دیر تک صرف گھڑی کی ٹک ٹک سنائی دیتی ہے پھر عقب سے انجم کی آواز آتی ہے)

انجم : ندو ابھی کپڑے نہیں بدلے تم نے ؟

ندیم : (عقب میں) بس ہو گیا تیار امی۔

انجم : (عقب میں) منی ! ناشتہ رکھو میز پر۔ ندا کو جلدی ہے۔ تم کیا کر رہی ہو آٹھ بجنے کو آ رہے ہیں اور .....

منی : (عقب میں) بس دلہن لیے جا رہی ہوں۔

انجم : (اور قریب سے) اور شاہد صاحب سے کہو نہا کر سیدھے ادھر آئیں۔ ناشتہ کر لیں پھر جانا ہے جو کرتے رہیں کپڑے ان کے آنگن میں پلنگ پر رکھے ہیں اور کنگھی شیشہ میز پر ابھی تک نہائے نہیں اور آٹھ بجنے کو . . .

شاہد صاحب : (دور غسل خانے سے) ارے بھئی آیا۔ آیا۔ آیا۔

انجم : (اور قریب سے) ان کی عادت بھی ــــــــــــ

(کمرے میں آجاتی ہے)

انجم : تم بیٹھے بیٹھے اکتا تو نہیں گئیں عطی ! میں نے کہا ناشتے کا وقت ہوا جا رہا ہے ان سب کو تیار کر دوں (ہنستی ہے) میں شور نہ مچاؤں تو ناشتہ کو دس بج جائیں۔

(کرسی میز کے نیچے سے کھینچ کر اس پر بیٹھ جاتی ہے)

عطیہ : (بدستور ہنستے ہوئے) میں تو حیران رہ گئی انجو باجی تمہارے یہاں کا سلیقہ اور وقت کی پابندی دیکھ کر۔

انجم : (تعریف سے خوش ہو کر) اس گھر کے ذرے ذرے کو میں نے سلیقہ، وقت کی پابندی، اور

مہذب لوگوں کے ادب آداب سکھائے ہیں کہیں تم پہلے آکر دیکھتیں ——— گھر بھوتوں کا ڈیرہ و بنا ہوا تھا، اتنا بڑا مکان ——— یہ بھی تو معلوم نہ تھا، کون سا کمرہ کھانے کا ہے، کون سا سونے یا اٹھنے بیٹھنے کا۔ سب جگہ برتن اور چارپائیاں پڑی رہتی تھیں۔

عطیہ: لیکن نوکر۔

انجم: تھے، پر نہ انھیں کام کرنے کی تمیز تھی نہ بات کرنے کی (انتہائی نفرت سے) غلیظ، نکمے اور بدتمیز!

عطیہ: میں تو حیران رہ گئی تھی یہ دیکھ کر، نوکرانی معلوم ہی نہیں ہوتی۔ میں سمجھی دودھا بھائی کی بہن۔

انجم: (اچانک مڑ کر) ریبکا!

عطیہ: اتنی صاف ستھری، اتنی مہذب، اتنی سلیقہ شعار ---------

انجم: (خوش ہو کر) کتنی جان کھپائی ہے اس کے ساتھ، تم تصور بھی نہیں کر سکتیں اور افضل۔

عطیہ: وہ آیا تو میں سمجھی تمھارے خسر .... (گھبرا کر) یعنی دودھا بھائی کے ابا ...

(بے طرح گھبرا کر) یعنی .... یعنی .... تمھارے کوئی بزرگ ہیں۔ میں اس کے لیے ادب سے کرسی چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

انجم: (ہنستی ہے) بزرگ

عطیہ: (اپنی بات جاری رکھتے ہوئے) وہ چونکا لیکن جب تک وہ کرسیاں میز صاف کرتا رہا مجھے بیٹھنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ حالانکہ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ نوکر ہے لیکن اب بھی جیسے اعتبار نہیں آتا۔

انجم: "ابا کہا کرتے تھے" نوکروں کو ہمیشہ صاف ستھرا رکھنا چاہیئے، گندے نوکر کی صورت سے انھیں نفرت تھی۔ ان کے ساتھ رہ کر میں بھی ویسی ہی ہو گئی۔ میں چاہتی ہوں کہ ندیم بھی ....!

عطیہ: بڑا پیارا بچہ ہے، ادھر سے گذرا تو مجھے جھک کر سلام کیا۔

انجم: (پھول کر) ادب تہذیب کی کمی تم اس میں نہ پاؤ گی (آواز دیتی ہے) ہو گیا تیار ندو بیٹے۔

ندیم : (عقب میں) جی امّی۔

انجم : (نوکرانی کو آواز دیتی ہے) منّی، ندو بیٹے کو ناشتہ دیدو!

منّی : دے رہی ہوں بیگم!

انجم : وہ ہمیشہ صبح سویرے اٹھتا ہے۔ اپنے ابّا کے ساتھ سیر کو جاتا ہے، غسل کرتا ہے، نماز پڑھتا ہے اور پھر کپڑے بدل کر وقت پر ناشتے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ نانا ابا کہا کرتے تھے "وقت کی پابندی تہذیب کی پہچان ہے" اور ندو کام، آرام اور کھیلنے کے اوقات کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ وقت پر پڑھتا ہے، وقت پر آرام کرتا ہے اور وقت پر کھیلتا ہے۔ سونے کے وقت تم کبھی اُسے کھیلتے یا پڑھتے اور پڑھنے کے وقت کبھی کھیلتے یا سوتے نہ پاؤگی۔

(اٹھ کر دیکھتی ہے کہ چلمچی وغیرہ صاف ہے یا نہیں)

عطیہ : ایک ہمارے یہاں کے بچے ہیں، آٹھ آٹھ بجے تک سوتے رہتے ہیں۔ کان پکڑ پکڑ کر جگانا پڑتا ہے۔ مہینوں نہانے سے بھاگتے ہیں اور بدتہذیب اتنے ہیں کہ ......

انجم : (وہیں سے) نانا ابا کہا کرتے تھے "بچوں کو شروع ہی سے اچھی عادتیں ڈالنی چاہئیں" ندو کو کبھی ڈانٹنے تک کی نوبت نہیں آئی۔

عطیہ : میں نے پوچھا "ندو بیٹا! ناشتہ تو تم ہمارے ساتھ ہی کروگے نا؟" کہنے لگا "میں اپنی ہی میز پر ناشتہ کرتا ہوں۔"

انجم : اس کی میز، ٹائلٹ کا سامان، سونے کا کمرہ سب کچھ الگ ہے۔ وہ ہمیشہ اپنی میز پر ناشتہ کرتا ہے، اپنی الماری میں کپڑے رکھتا ہے، اپنے بستر پر سوتا ہے، اپنی کنگھی سے بال بناتا ہے، اپنے سب کام آپ کرتا ہے۔ نانا ابا کہا کرتے تھے "بچوں کو اپنی مدد آپ کرنے کی عادت ڈالنی چاہئے۔"

عطیہ : میں تو مان گئی بھئی تمہیں۔ میں خود سوچتی ہوں چند دن تمہارے پاس رہ کر اپنی عادتیں سدھاروں، وقت پر اٹھوں، وقت پر سوؤں، وقت پر کھاؤں۔ کہیں مجھے ایسا سلیقہ آجائے۔

انجم : نانا ابا کہا کرتے تھے "سلیقہ عورت کا زیور ہے اور اخلاق مرد کا" اور میں چاہتی ہوں خوش اخلاق، مہذب اور وقت کا پابند ہو۔

عطیہ : اور میں کہتی ہوں تم اپنے مقصد میں پورے طور پر کامیاب ہوئی ہو۔ اپنے گھر تو تم نے گھڑی سا بنا رکھا ہے۔ سب گویا اس کے پرزے ہیں۔

انجم : زندگی خود ایک عظیم گھڑی ہے۔ صبح و شام اس کی سوئیاں ہیں نہایت باقاعدگی سے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتی ہیں۔ میں چاہتی ہوں میرا گھر بھی گھڑی کی طرح ہو۔ ہم سب اس کے پرزے بن جائیں۔ اسی باقاعدگی سے کام کریں۔

عطیہ : دولہا بھائی کو تو بڑا ناگوار گذرا ہوگا۔

انجم : ناگوار (آکر پھر کرسی پر بیٹھتے ہوئے ہنستی ہے) بڑے بیٹھے تھے پہلے پہل لیکن میں سے ہی آئی اپنے ڈھب پر۔ ارے تدو پر مجھے تو جان نہیں کھپانی پڑی تھی جاتی ان پر کوئی بھی تو کل سیدھی نہ تھی۔ نہ صفائی کا خیال نہ وقت کی پابندی کا۔ مجھے چیزوں کو اپنی جگہ رکھنے دیر لگتی اور انھیں بکھیرتے دیر نہ لگتی۔ نہا کر بال بنانے تو کنگھی کہیں رکھ دیتے، شیشہ کہیں اور تولیہ کہیں۔ دفتر سے آکر کپڑے بدلتے تو کوٹ کہیں پھینک دیتے اور پتلون کہیں سچ کہتی ہوں بہت ٹوٹ گئے آتے ہی کرسی پر پٹک دیتے اور پھر جب بے پروائی میں بیٹھ گئے تو ــــــ

عطیہ : لیکن دولہا بھائی تو ــــــ

انجم : (ہنس کر) نہایت باسلیقہ معلوم ہوتے ہیں کبھی ادھر کی چیز ادھر نہیں رکھتے۔ جی ہاں! معلوم ہے کتنا زور کرنا پڑا ہے ان کی عادتیں سدھارنے میں؟ کتنی لڑائیاں لڑی ہیں؟ کتنے فاقے کئے ہیں؟ کتنی بار میں روٹھ کر میکے جا بیٹھی ہوں؟ (ہنستی ہے) میں جب نئی آئی تو ان کے لحاف پر غلاف تک نہ تھا۔ میں نے لحاف کے نیچے چادر لگادی لیکن جب بھی لحاف اٹھتے تو چادر ایک طرف پڑی اور لحاف دوسری طرف۔ ہار کر میں نے

چادر لحاف سے سانخہ ہی سی دی۔ دوسرے دن دیکھا چادر لحاف کے اوپر تیر رہی ہے ۔۔

۔۔۔ نا جناب نے الٹا اوڑھ رکھا ہے۔

(عطیہ ہنستی ہے)

کیونکہ وہ پلنگ پوش سمیت بستر میں گھس جایا کرتے تھے

(شاہ صاحب ہنستے ہوئے داخل ہوتے ہیں)

شاہ صاحب : بھئی دنیا میں دو طرح کے آدمی ہوتے ہیں، ایک وہ جو خود بھی چلتے ہیں، اور دوسروں کو بھی چلاتے ہیں، انجن کی طرح۔ انجو ان میں سے ایک ہے دوسرے وہ ہوتے ہیں جو خود نہیں چل سکتے لیکن کوئی دوسرا چلائے تو اس کے پیچھے پیچھے چلتے جاتے ہیں۔

(ہنستے ہیں)

گاڑی کے ڈبوں کی طرح، تو بھئی ہم تو ان لوگوں میں سے ہیں۔

(کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھ جاتے ہیں)

عطیہ : گاڑی کے ڈبے (ہنستی ہے) دو لھا بھائی بھی ——————

شاہ صاحب : اور انجو جیسے چلاتی ہے ہم چلے جا رہے ہیں کیوں انجو! دیا کبھی شکایت کا موقع ہم نے تمہیں؟ (ہنستے ہیں) دن میں تین تین بار نہاتے ہیں چار چار بار پیر دھوتے ہیں کم از کم چار بار کھانا کھاتے ہیں۔

انجم : اس ناشتہ کو آپ ——————

شاہ صاحب : تم اسے ناشتہ کہہ لو، ہم تو اسے کھانا ہی کہیں گے۔ اور پھر چار پانچ بار کپڑے بدلتے ہیں —— وقت کی پابندی، صفائی، مہذب سوسائٹی کے ادب و آداب ہر بات کا خیال رکھتے ہیں، (ہنستا ہے) انجو کے ساتھ شادی کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے ہم تو پہلے اچھوت تھے، انجو نے آکر ہمارا سدھار کیا ہے۔

پورے زور سے ہنستے ہیں جس میں انجم کی "آپ تو" اور عطیہ کی دولھا بھائی

بھی گم ہو جاتی ہے)

انجم : (خفیف ہو کر) منی ناشتہ رکھو میز پر۔

منی : ناشتے کی ٹرے لاتے ہوئے) یہ لائی دلہن۔

(ذیل کے مکالمے کے دوران میں منی خاموشی سے ناشتے کا سامان لا کر میز پر رکھ دیتی ہے)

شاہ صاحب : اور سچ کہتا ہوں میں نے اپنے آپ کو انجم کے مطابق بنا لیا ہے (نفرت سے منہ بنا کر) مجھے خود اب غلیظ آدمیوں سے نفرت ہونے لگی ہے یہ فوجداری کے وکیل — مجرموں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے خود بھی کچھ انھیں کے سے ہو گئے ہیں (ہنستے ہیں) وہی عادتیں وہی طور طریقے ، اور بھی سچ کہتا ہوں بعض کی صورتیں بھی مجرموں کی سی ———

عطیہ : دولہا بھائی آپ کی تو ماشاء اللہ

شاہ صاحب : مجھے انجم نے بچا لیا ہے ورنہ ان کے ساتھ رہ کر میری صورت بھی (ہنستے ہیں) اخلاق اور تہذیب تو کبھی کو چھو بھی نہیں گئے۔

انجم : نانا ابا کہا کرتے تھے " اخلاق مرد کا زیور ہے "۔

شاہ صاحب : لیکن شاید زیور عورتوں کی چیز سمجھ کر وہ اسے نزدیک نہیں پھٹکنے دیتے۔ ہمیشہ سوقیانہ باتیں کرنے میں انھیں لطف آتا ہے اور غلیظ اتنے ہیں کہ پاس بیٹھنا محال ہو جاتا ہے جوتوں سمیت میز پر پاؤں رکھے بیٹھے ڈکارتے رہتے ہیں (نہایت نفرت سے) بدتمیز کہیں کے سالا پانی کے بتاشے وہی بڑے اور چاٹ کھا کر ————

انجم : نانا ابا کہا کرتے تھے وہی بڑے اور چاٹ ————

شاہ صاحب : شکر ہے کہ نانا ابا نے تمہارے ذریعے اس چٹورپن سے بچا لیا قسم لے لو جو پچھلے چھ برس سے چاٹ کو منہ لگایا ہو اور تو اور کبھی ندو کو ———— منہ لگانے دیتی ہوں میں ندو کو ایسی نکمی چیزیں۔

شاہ صاحب: جب میں دیکھتا ہوں کہ بڑے بڑے وکیل اور ایڈوکیٹ وہی بڑے اور پانی کے ساتھ بہتی کسی چیز پر لطف اٹھا دوسرے وزیر فرش پر پھینک دیتے ہیں، تو میں نانا ابا کو دعائیں دیتا ہوں، جن کی تعلیم ہی کے ذریعہ مجھے اس بدتمیزی سے بچے رہنے ہوئے ہے، خدا گواہ ہے، پچھلے پچاس برس سے میں نے جو کبھی ایک بار بھی منہ نہیں لگایا۔

عقیلہ: (ہنس کر) حضرت دونے دیکھے ہیں۔

——— شاہ صاحب ایک کھلکھلا کر قہقہہ لگاتے ہیں)

انجم: اچھا پھر ہنسئے گا، پہلے ناشتہ کر لیجئے۔

شاہ صاحب: بھئی میں کہتا تھا کچھ دیر انتظار کر لیتے، وہ رفعت کا خط آیا تھا کہ وہ آج صبح کی گاڑی ———

انجم: رفعت کا خط۔ اس دس برس کے عرصے میں اس نے کتنے خط نہیں لکھے لیکن کبھی آیا بھی ——— آپ بھی بس ——— ناشتہ شروع کیجئے، آچکا رفعت!
عظمت بھائی کا خط آتا تو میں آنکھیں دروازے سے لگائے بیٹھی رہتی، لیکن رفعت۔!
کیا بھروسہ ہے اس کا؟

شاہ صاحب: بھئی وہ سیلانی آدمی ہے، ہمیشہ باہر دوروں پر رہتا ہے

انجم: جی! دوروں پر رہتا ہے، جب بھی ادھر سے گذرا ——— بڑے طمطراق سے لکھ دیا ——— خان رفعت حسین خان اس بار ضرور انجم باجی کے غریب خانہ کو رونق بخشیں گے ——— لیکن ہمیشہ گذر گئے اور پتہ بھی نہ دیا کس گاڑی سے گذرے رفعت ——— نانا ابا کہا کرتے تھے رفعت ———

رفعت: (ڈرائنگ روم کی چوکھٹ سے) خان رفعت حسین خان تشریف لاتے ہیں۔

شاہ صاحب: (خوشی سے) رفعت!

رفعت: (بغلگیر ہوتے ہوئے) بھائی جان ———

شاہ صاحب : (بغلگیر ہوتے ہوئے) بھئی بڑی عمر ہے تمھاری۔ ابھی انجو کہہ رہی تھی کہ رفعت !

انجم : رفعت کیا کرتے ہو، گرد اور پسینے سے تمھارے کپڑے گندے ہو رہے ہیں اور پسینے جا رہے ہو ان کے ساتھ، چلو کپڑے بدلو غسل کرو سامان کہاں ہے تمھارا؟

رفعت : (ہنستا ہے) اسے باجی !! اتنے عرصے کے بعد ملے ہیں بھائی جان سے تو آیا بغلگیر بھی نہ ہوں (پھر لپٹ جاتا ہے) کہیئے بھائی جان مزاج کیسے ہیں؟ خدا قسم مدت گزر گئی آپ سے ملے، کالج کا کیا حال ہے۔ شکل سے تو خدا قسم آپ پتنج معلوم ہوتے ہیں —— فوجداری دلیل (سر ہلاتے ہوئے) رتی بھر بھی نہیں، انجو باجی سے شاید —— ——

انجم : چائے ٹھنڈی ہوتی جا رہی ہے چلو نہا لو۔ پھر باتیں کرنا سامان کہاں ہے تمھارا؟

رفعت : سامان ہی کون سا ہے! بستر پڑا ہے باہر برآمدے میں

انجم : سامان نہیں لیکن ——

رفعت : اسے آج کل سامان ساتھ لے کر سفر کرنے کے دن ہیں؟

انجم : لیکن کپڑے —— —— ——

رفعت : ایک شیروانی اور پاجامہ ہے سوٹ کیس میں بند ہے۔

انجم : فضل —— افضل —— ——

افضل : جی بیگم (کمرہ میں آکر) فرمایئے

انجم : باہر برآمدے میں ان کا بستر پڑا ہے، اٹھا لاؤ اور غسل خانے میں تولیہ رکھ دو یہ نہائیں گے۔

رفعت : تم بھی بس باجی —— ابھی چلا آرہا ہوں پسینہ تک سوکھا نہیں کہ تم نے نہانے کا نادر شاہی حکم صادر کر دیا۔ (قمیض اتارتا ہے) ذرا پنکھا تیز کر دو باجی —— انجن کے دھوئیں نے گرد اور گرمی سے مل کر ——

انجم : ارے ارے —— کیا کرتے ہو رفعت تمھیں شرم نہیں آتی، دیکھو یہاں

عطیہ بیٹھی ہے اور تم نے قمیض اتار کر پھینک دی ہے ننگے بدن یہاں بیٹھے تھیں ——

رفعت : ارے باجی! تم تو خواہ مخواہ گرہستی کی چکی میں اپنا دماغ کھپا رہی ہو، تمھیں تو کسی فوج میں کیپٹن یا چھوٹی موٹی لیفٹیننٹ ہو جانا چاہیے تھا۔

انجم : تہذیب تو تمھیں چھو نہیں گئی عطی بیٹھی ہے اور تم ——

رفعت : (ذرا سی گھسٹتے ہوئے) فی الحال تو میں کرسی پر بیٹھ رہا ہوں تم ذرا پنکھا تیز کردو باجی، یہ پسینہ نہ سوکھے گا تو میں نہا نہ سکوں گا (ہنس کر) خدا قسم عطی تمھیں ایک مدت کے بعد دیکھا ہے میں تو پہچان بھی نہ پایا، کیا تمھیں میرا یہاں سپنڈ منٹ پنکھے کے نیچے بیٹھے رہنا اچھا نہیں لگتا۔ (انجم کی قہر آلودہ نگاہوں کو دیکھ کر) ارے باجی! ایسے دیکھ رہی ہیں گویا میں کسی گناہ کا ارتکاب کر رہا ہوں، ابھی کہیں گی (نقل اتارتے ہوئے) نانا ابا کہا کرتے تھے ——— نہیں نانا ابا کی قسم باجی دو منٹ کے لیے ان کا خیال بالکل چھوڑ دو اور پنکھے کی ہوا تیز کردو ———

(میز پر پاؤں رکھ لیتا ہے)

انجم : میں کہتی ہوں تم کتنے بدتمیز ہو، یہ کھانے کی میز ہے اور تم یہاں کپڑے اتار کر پسینہ سکھانے بیٹھ گئے ہو، کوئی حد بھی ہے نانا ابا ———

رفعت : (پھر ٹانگیں نیچے کر کے) کہا کرتے تھے کہ رفعت بے حد بدتمیز ہے کھانے کی میز پر بیٹھ کر پسینہ سکھاتا ہے، میں کہتا ہوں باجی، میں اتنی مدت کے بعد آیا ہوں تمھارا چھوٹا بھائی ہوں، تم لوگوں سے ملنے کی حسرت لیے برسوں ہندوستان کے ایک شہر سے دوسرے شہر میں بھٹک رہا ہوں ——— تم میرا ایک پل بھی یہاں بیٹھنا گوارا نہیں کر سکتیں خدا قسم میں جتنی دیر یہاں رہوں گا، ایک پل کے لیے بھی آپ لوگوں کو اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دوں گا ———

انجم : یہی تو میں کہتی ہوں تم اٹھو، غسل کرو، پھر بیٹھ کر ———

رفعت : میں کہتا ہوں، میں ایک پل کے لیے بھی آپ لوگوں کو اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دوں گا۔ غسل خانے میں جانے کی تو بات ہی دور رہی۔

انجم : (بیزاری سے) ٹھنڈی ہو گئی چائے تمھاری باتوں میں۔

رفعت : گرم ہو جائیگی (نوکر کو آواز دیتے ہوئے) افضل ——— او افضل! یہ چائے فوراً گرم کر لاؤ۔ (ہنستا ہے) صرف چند لمحے گذرے ہیں مجھے یہاں آئے ہوئے اور کتنی جلدی تمھارے نوکر کا نام مجھے یاد ہو گیا ہے۔

انجم : کیا کرے گا نوکر چائے کا پانی گرم کر کے ——— پھر ٹھنڈا ہو جائے گا تم نہا تو لو۔

رفعت : میں کہتا ہوں ابھی چائے پینا بھی کوئی نماز پڑھنا ہے کہ ضرور غسل اور وضو کی ضرورت ہو، رات کا جگا اور تھکا ہوا ہوں، ذرا گرم گرم چائے ملاؤ۔ پھر جان میں جان آئے تو پھر غسل کی بھی دیکھی جائے گی۔

انجم : میں کہتی ہوں ناشتے کا وقت کب کا ہو گیا اور تم۔

رفعت : یہی تو میں کہتا ہوں جھٹ ناشتہ کر لیا جائے اور بس۔ سب لوگ بیٹھے رہیں ایسے بھئی آپ لوگ تو نہا کر بیٹھے ہیں میں نہ ہا کر نہ بیٹھا سہی (اچانک شاہ صاحب کی طرف مڑ کر) کیوں بھائی جان آپ کو کوئی اعتراض ہے۔

شاہ صاحب : (انجم کی طرف دیکھ کر) مجھے ——— ا ——— ا ——— ا ——— ———

رفعت : اور عطیہ تمھیں؟

عطیہ : (انجم کی طرف دیکھتے ہوئے) میں ——— یں ——— یں ———

رفعت : تو لایئے چائے پی جائے، مجھے خدا قسم غضب کی بھوک لگی ہوئی ہے (توس اور بسکٹ اٹھا کر کھاتے ہوئے) اور نہانے میں مجھے کم از کم ایک گھنٹہ صرف ہو جائے گا، میری عادت ہے کہ یا تو میں نہاتا نہیں اور اگر نہاتا ہوں تو برسوں کی کسر ایک ہی دن میں نکال دیتا ہوں آپ سب

لوگ بیٹھے رہیں گے میری خاطر۔

شاد صاحب : افضل! ذرا چائے کا پانی اور لاؤ ——— گرم ——— گرم ——— یہ تو ٹھنڈا ہو گیا ہوگا۔

رفعت : اور پھر میں سوچتا ہوں کہ گرم چائے پینے سے جتنا پسینہ نکلنا ہے نکل جائے، اس کے بعد غسل کروں اس لیے ہمیشہ نہانے سے پہلے ہی ناشتہ کرتا ہوں (چائے دانی کو چھوتا ہے) چائے تو کافی گرم ہے، بھائی جان (چائے بناتا ہے) آپ دودھ تو زیادہ نہیں لیتے (دودھ ڈالتا ہے) اور چینی؟

انجم : رفعت، تمھیں دسترخوان پر بیٹھنے کی تمیز بھی نہیں، ہٹو، میں بناتی ہوں چائے

رفعت : اسے باجی! میں تو ہمیشہ اپنی چائے آپ بناتا ہوں، خدا قسم دوسرا کوئی کام خود نہیں کرتا لیکن چائے، میں نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ یا تو میری بیوی آکر بنائے گی یا پھر میں ہی

انجم : (بھائی کی آمد کے خیال سے خوش ہو کر) تم کر لو بھی شادی، لڑکیاں تو ہزاروں ———

رفعت : (چائے پیتے ہوئے) ارے باجی شادی کے تصور میں جو مزا ہے وہ شادی میں ہرگز نہیں۔ (اچانک شاد صاحب کی طرف مڑ کر) بھائی جان سے پوچھ لو

انجم : کیوں انھیں کیا ——— ؟

شاد صاحب : نہیں بھائی میں تو ———

رفعت : واہ بھائی جان، خدا کو حاضر ناظر جان کر بتایئے شادی کے تصور میں زیادہ مزا ہے یا شادی میں؟ یاد ہے نا! انجو کی سگائی کے سلسلہ میں آپ سے ملنے آیا تھا، کتنا ہنستے تھے آپ؟ کتنا لاابالی پن اور کتنی بے پروائی تھی آپ کی طبیعت میں؟ جو جی چاہے کھاتے تھے (ہنستا تھا) اور اب ——— اتنی دیر سے بیٹھے ہیں اور ایک قہقہہ بھی آپ نے نہیں لگایا، خدا قسم! بھائی جان! آپ تو ہائیکورٹ کے جج معلوم ہوتے ہیں (ہنستا ہے) حالانکہ ابھی آپ ایڈووکیٹ بھی نہیں بنے ——— جب ایک وکیل جج نظر آنے لگے تو سمجھئے وہ بڈھا ہو

گیا، وکیل تو جوانی کی علامت ہے (ہنستا ہے) اور جج بڑھاپے کی، خدا قسم بھائی جان آپ کو شادی نے بڑھا کر دیا ہے (خود ہی زور سے قہقہہ لگاتا ہے) اور کیوں بھائی جان اپنا وعدہ تو آپ نہیں بھولے، پچھلی بار جب ہم ملے تو آپ نے وعدہ کیا تھا کہ ایک بار پھر دل کشا....

شاہ صاحب : (اس بات سے گھبراتے ہوئے کہ رفعت اپنی جھونک میں کچھ اور نہ کہہ دے) لو بھئی! مجھے تو دیر ہو رہی ہے، ایک مقدمہ ہے ضروری، میں لنچ پر آنے کی کوشش کروں گا، اسے نپٹا کر بس انتظار کرنا۔

(ہاتھ کے پیالے کو ایک ہی گھونٹ میں ختم کر کے اٹھتے ہیں اور جلدی جلدی چلے جاتے ہیں)

انجم : ہیٹ تو اپنا لیتے جائیے (ان کے پیچھے پیچھے چلی جاتی ہے)

(رفعت گنگنانا شروع کر دیتا ہے)

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی

بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

عطیہ : میں پوچھتی ہوں کیا آپ کسی طرح کے ادب آداب میں یقین نہیں رکھتے۔

رفعت : (ہنس کر) بالکل نہیں، ادب آداب ازدواج کی علامتیں ہیں جوں ہی شادی ہوئی کہ آپ کے گلے میں ان کا طوق پڑا ——— یہ آپ کی خوش دامن ہیں ——— ان کے سامنے سر نیچا کیجئے یوں مسکرائیے گویا آپ کے سب دانت جھڑ گئے ہیں، یہ آپ کی سلج ہیں۔ ان کے سامنے مسکینی کے ساتھ ایسے ہنسو، جیسے آپ کی ... موتیوں کی ہے، یہ آپ کی بیوی ہیں ——— ادب آداب کی خالہ ——— (خوب زور سے قہقہہ لگاتا ہے) اور میں شادی کا تصور ہی کیا کرتا ہوں۔ (اچانک عطیہ کی طرف مڑ کر) کیوں عطی! کیا تم بھی شادی وادی کرنا چاہتی ہو۔ یا تمھیں بھی میری طرح شادی سے خدا ... دیکھ لو ... پسند ہے۔

انجم : (واپس آتے ہوئے قدرے درشتی سے) چلو عطی اب چل کر ڈرائنگ روم میں بیٹھیں۔ (ذکر کو

آواز دیتی ہے) افضل یہ سب اٹھا کر لے جا ——— اور میں کہتی ہوں میز کو اچھی طرح صاف کر دینا ——— ساری چادر خراب کر دی تم نے رفعت! تم بچوں سے بھی گئے گذرے ہو گئے، ندو اپنی میز پر کھانا کھاتا ہے لیکن کیا مجال جو کبھی میز پوش خراب ہوا ہو، اور تم ایسے ہو کہ ——— ۔

رفعت : میں کہتا ہوں باجی تم ضرور فوج میں بھرتی ہو جاؤ، گرہستی نے تمہاری ساری صلاحیتوں کو دبا دیا ہے۔

انجم : مٹو بھی، چلو عطی ادھر ڈرائنگ روم میں چلیں۔

(عطیہ اٹھتی ہے)

رفعت : تم چلو، میں ذرا یہیں آرام کروں گا، گرم گرم چائے پینے سے پسینہ آ رہا ہے اور پنکھے کی ہوا بدن میں ٹھنڈی سرسراہٹ پیدا کر رہی ہے۔ ——— خدا قسم میں تو یہاں سے کہیں بھی اٹھ کر نہیں جا سکتا

انجم : ہم تو جاتے ہیں، تم بیٹھو یہاں، جتنی دیر تمہاری مرضی ———

(دونوں چلی جاتی ہیں، رفعت پتلون کی جیب سے سگریٹ نکال کر منہ میں رکھتا ہے، لیکن شاید دیا سلائی اس کے پاس نہیں، دوبارہ جیب کو ٹٹولتا ہے، پھر افضل کو آواز دینے والا ہوتا ہے کہ ندیم اپنے کمرے کے دروازے سے داخل ہوتا ہے۔

ندیم گیارہ بارہ سال کا بچہ ہے خاکی نیکر شرٹ اور سینڈل پہنے خوش شکل اور خوش اطوار ——— لیکن چہرے پر وہ شوخی نہیں جو بچوں کا خاصہ ہے، اس کی چال بھی اس بچھڑے کی سی ہے جس نے لگام کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا ہو)

ندیم : ماموں جان السلام علیکم!

رفعت : اخاہ ! بھانجے صاحب ہیں، سلام سلام، کھونٹ دو بیٹے ——— قلندری ہو نہ تم !

ندیم : جی ماموں جان !

رفعت : (گود میں سے کر) اپنے ماموں جان کے لیے ایک دیاسلائی کی ڈبیا تو لاؤ بیٹا۔

ندیم : بہتر ماموں جان !

(ندیم دیاسلائی کی ڈبیا لینے جاتا ہے، رفعت ٹانگیں میز
پر رکھ دیتا ہے اور دونوں بازو سر کے نیچے رکھ کر کرسی
پر جھولتا ہوا گنگناتا ہے)

لٹ اُلجھی سلجھا جا رے بالم
ماتھے کی بندیا بسر گئی ہے موری
اپنے ہاتھ لگا جا رے بالم
لٹ اُلجھی سلجھا جا رے بالم

(ندیم دیاسلائی کی ڈبیہ لے کر آتا ہے کچھ دیر کھڑا گانا
سنتا ہے پھر آگے بڑھتا ہے)

ندیم : لیجئے، ماموں جان !

رفعت : لاؤ بیٹا۔

(ندیم سے دیاسلائی لے کر سگریٹ سلگاتا ہے)

ندیم : ماموں جان میز پر ٹانگیں نہیں رکھا کرتے۔

رفعت : کس نے کہا تم سے ؟

ندیم : امی جان کہا کرتی ہیں ماموں جان !

رفعت : وہ تمھارے لیے کہتی ہوں گی، تم ابھی بچے ہو، جب تم بڑے ہو کر کسی کے ماموں بنو گے
تو تمھیں بھی میز پر ٹانگیں رکھ کر بیٹھنے کی اجازت مل جائے گی (ہنستا ہے) کھو کمر

جماعت میں پڑھتے ہو ؟

ندیم : پانچویں میں ماموں جان !

رفعت : پڑھ لکھ کر کیا بننا چاہتے ہو ؟

ندیم : ڈپٹی کمشنر ماموں جان !

رفعت : یہ تمہیں کس نے سیکھایا ؟

ندیم : امی جان نے ماموں جان !

رفعت : تم خود کیا بننا چاہتے ہو ؟

ندیم : میں ——— میں ماموں جان ———

رفعت : یہ تمہیں ہر فقرے کے ساتھ "ماموں جان" ماموں جان" کہنا کس نے سکھایا ؟

ندیم : امی نے کہا ہے کہ بڑوں کے ساتھ ادب سے ———

رفعت : تو ہو چکے ڈپٹی کمشنر ، اتنے ادب سے بات کرو گے تو سرکار تمہیں پٹواری بنا دے گی

اکڑ کر چلا کرو ، رعب سے بات کیا کرو اور ....

ندیم : میں تو کپتان بننا چاہتا ہوں ماموں جان !

رفعت : کپتان ؟

ندیم : کرکٹ کا کپتان .

رفعت : کرکٹ کھیلتے ہو ؟

ندیم : امی کہتی ہیں ، بڑا نکما کھیل ہے ، چوٹ لگ جاتی ہے .

رفعت : تو پھر تم بن چکے کرکٹ کے کپتان ، کتنے گھنٹے کھیلتے ہو ؟

ندیم : دو گھنٹے شام کو

رفعت : اور کتنا پڑھتے ہو ؟

ندیم : چھ گھنٹے .

رفعت : چھ گھنٹے کھیلا کرو اور دو گھنٹے پڑھا کرو

ندیم : ماموں جان میں کرکٹ کا کپتان بن سکتا ہوں ؟

رفعت : ضرور بن سکتے ہو، چھ گھنٹے کھیلا کرو اور دو گھنٹے پڑھا کرو ۔

ندیم : میں پاس کیسے ہوں گا ؟

رفعت : پاس ہونے کے لیے روز دو گھنٹے باقاعدگی سے توجہ کے ساتھ پڑھ لینا کافی ہے اور پھر تم پاس ہوتے رہنا چاہتے ہو یا کرکٹ کے کپتان بننا ؟

ندیم : کپتان بننا !

رفعت : تو جاؤ روز دو گھنٹے جم کر پڑھا کرو اور چھ گھنٹے ڈٹ کر کھیلا کرو، تمھارے ماموں جان دعا کرتے ہیں کہ انشاء اللہ تم بڑے ہو کر ضرور کرکٹ کے کپتان ہو گے اور ہندوستان تو کیا یورپ میں نام پاؤ گے ۔

ندیم : ماموں جان ۔

(رفعت کے گلے سے لپٹ جاتا ہے)

انجم : (دوسرے کمرے سے) ندیم !

ندیم : جی امی !

انجم : (کمرے میں داخل ہو کر) یہاں کیا کر رہے ہو ؟ ادھر چلو پڑھنے کا وقت ہو گیا ہے، ابھی ماسٹر صاحب آئیں گے ——— کام کر لیا تم نے کل کا ؟

ندیم : امی میں تو کھیلوں گا

انجم : (درشتی سے) کیا ——— آ ——— آ ——— (نرمی سے) چلو ندو بیٹے !

ندیم : چھ گھنٹے کھیلوں گا اور دو گھنٹے پڑھوں گا ۔

انجم : (درشتی سے) کیا کہتے ہو ! (نرمی سے) چلو بیٹا ! ابھی ماسٹر صاحب آنے والے ہیں ،

ندیم : میں کرکٹ کا کپتان بننا چاہتا ہوں ۔

انجم : (غصے کو روکتے ہوئے نرمی کے ساتھ) پاگل! سر پہ چڑھائے گا، کرکٹ کا کپتان بن کر؟
تجھے تو ڈپٹی کمشنر بننا ہے؟

ندیم : مجھے ڈپٹی کمشنر نہیں بننا، میں تو کرکٹ کا کپتان بنوں گا۔

انجم : (غصے کو روک سکنے میں بے قابو ہو کر) چل چل، بن لیا کرکٹ کا کپتان، اب چل کر پڑھ۔
ماسٹر صاحب آنے والے ہیں۔

(اُسے کان پکڑ کر لے جاتی ہے)

رفعت : ارے باجی، تم تو ننھے بیٹے کا کان اکھیڑ دو گی۔

انجم : (مڑ کر درشتی سے) چُپ کرو رفعت، تم چاہتے ہو کہ میرا بیٹا بھی تمھاری طرح آوارہ ہو جائے
(پھنکارتی ہوئی) نہ کام کے نہ کاج کے، اڑھائی سیر اناج کے۔

(بھری ہوئی چلی جاتی ہے اور جاتے جاتے میز پر سے
دیا سلائی کی ڈبیا لے جاتی ہے)

رفعت : ارے باجی! خدا قسم تم تو خواہ مخواہ گرہستی کی چکی میں اپنی جان کھپا رہی ہو، تمھیں تو کہیں فوج
میں کپتان یا چھوٹی موٹی لیفٹیننٹ ہونا چاہیے۔

ہنستا ہوا کرسی پر بیٹھ جاتا ہے، جیب سے پھر سگریٹ نکال
کر منہ میں رکھتا ہے لیکن ڈبیا تو انجم جاتے ہوئے ساتھ لے گئی ہے
اس لیے یوں ہی جیبیں ٹٹول کر رہ جاتا ہے)

(اپنے آپ سے) توبہ ہے —— باجی بھی (بیزاری سے سر ہلاتا ہے)
دیا سلائی کی ڈبیا بھی جاتے جاتے اٹھا کر لے گئیں۔

(ٹانگیں میز پر رکھ لیتا ہے اور نوکر کو آواز دیتا ہے "افضل!" افضل!!)

افضل : (دور سے) جی! (نزدیک آ کر) جی صاحب!!

رفعت : دیا سلائی کی ڈبیہ لاؤ۔

افضل: بہتر صاحب!

(چلا جاتا ہے، رفعت گنگناتا ہے)

یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں

یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

(رفعت کے گانے کے دوران ہی پردہ گر جاتا ہے کچھ
لمحوں تک گانے کی آواز آتی رہتی ہے اس کے بعد خاموشی چھا جاتی ہے۔)

پردہ

○

کچھ وقفے کے بعد پردہ پھر اٹھتا ہے

رفعت ڈائننگ ٹیبل پر جوتوں سمیت سویا ہوا ہے، میز کی چادر اس کا تکیہ بن رہی ہے، چونکہ میز اتنی لمبی نہیں، اس لیے ایک ٹانگ دوسرے گھٹنے پر ہے لیکن دونوں ٹانگیں ایک طرف کو جھکی ہوئی ہیں اور الگ ہوا چاہتی ہیں۔ میز کے پاس فرش پر ایک آدھا جلا سگریٹ پڑا ہے، کلاک میں بارہ بج رہے ہیں۔

پردہ گرتا ہے

○

(کچھ وقفے کے بعد پردہ اٹھتا ہے۔ گھڑی میں تین بج چکے ہیں رفعت
بدستور سویا ہوا ہے لیکن سر کے نیچے کی چادر فرش پر پڑی ہے اور
پاؤں بھی میز کے نیچے لٹک رہے ہیں۔ ڈرائنگ روم سے انجم
اور شاہ صاحب کے باتیں کرنے کی آواز آتی ہے)

انجم : لیجئے اب آئیے دکھاؤں رفعت کو۔ ڈائننگ ٹیبل پہ سویا ہوا ہے۔
شاہ صاحب : ڈائننگ ٹیبل پر! تم کہہ کیا رہی ہو۔
انجم : ہاں ہاں ڈائننگ ٹیبل پر، میں نے آپ کو اس لیے نہیں بتایا کہ صبح اس کی وجہ سے ناشتے
کو نو بج گئے تھے اب اگر بہانہ نہ بناتی تو لنچ کو چار بج جاتے۔
شاہ صاحب : لیکن جگایا نہیں تم نے اُسے؟

(اندر آجاتے ہیں)

انجم : جگایا، ہونہہ! میں نے تین بار جگانے کی کوشش کی، ایک بار اونہہ کر کے سو رہا، دوسری
بار صرف کروٹ بدلی، تیسری بار کندھے جھنجھوڑے تو بولا "باجی سو لینے دو۔ — رات
بھر جاگا ہوا ہوں، تھرڈ کلاس میں سفر کیا ہے، پل بھر کو بھی آنکھ نہیں لگی:
شاہ صاحب : (حیرت سے) تھرڈ کلاس میں؟
انجم : اور ہمارے نوکر تک انٹر میں سفر کرتے ہیں۔
شاہ صاحب : شاید سیکنڈ یا انٹر میں جگہ نہ ہو (پاس آکر) دیکھو تو سو کیسے رہا ہے کوئی
تکیہ ہی رکھ دیا ہوتا، اس کے سرہانے۔
انجم : بستر کھولا تھا کہ بچھاؤں، دیکھتی ہوں کہ چادر ہے نہ تکیہ ... وہ شیروانی اور پائجامہ جس کا

ذکر بڑے طمطراق سے ہو رہا تھا ندارد ہیں ۔

شاہ صاحب : لیکن اپنے تکیے تو تھے ۔

انجم : رکھتی کیسے ، میز کی چادر رکھی ہوئی تھی ، تکیہ بنا کر سرہانے ، شاید کروٹ لیتے وقت گر گئی دیکھئے یہ پڑی ہے ۔

شاہ صاحب : (رفعت کو جگاتے ہوئے) رفعت ، رفعت ، اٹھو بھئی !

(رفعت پہلے کروٹ بدلتا ہے پھر "اونھ" کرتا ہے پھر جمائی لے کر اٹھ بیٹھتا ہے)

رفعت : (آنکھیں ملتے ہوئے) اخاہ ! بھائی جان ہیں ، کیسے آگئے آپ ، میرا خیال ہے کہ میں کچھ پل سے یہیں سو گیا تھا ۔

انجم : کچھ پل کے لیے ، معلوم بھی ہے کیا وقت ہو گیا ہے ، تین بج چکے ہیں ڈرائنگ روم میں کھانا کھایا تمھارے وجہ سے ، یہاں تو میز پر تم سوئے تھے ۔

رفعت : خیال تھا کہ ناشتہ کر کے اطمینان سے ایک دو سگریٹ سلگاؤں گا ، لیکن جوں ہی میز پہ ٹانگیں پسار کر سگریٹ پینے کے موڈ میں بیٹھا کہ نیند آگئی ، خدا قسم بھائی جان وہیں کرسی پر نیند آگئی اور سگریٹ (اپنے ارد گرد دیکھتا ہے) سگریٹ ــــــــ وہ دیکھئے پڑا ہے ــــــ ذرا اٹھا ا باجی ــــــــ اسے یہ کوئی سانپ تو نہیں جو تمھیں ڈس لے گا (انجم کی جھجک کو دیکھ کر) افضل ــــــــ او افضل ــــــــ

افضل : (دور سے) جی صاحب !

رفعت : ذرا دیا سلائی کی ڈبیہ لانا (سگریٹ دیتے ہیں) بات در اصل بھائی جان ایک لمحہ بھر کے لیے بھی آنکھ نہیں لگی ۔ اس لیے کرسی پر بیٹھا تھا کہ اونگھ گیا ۔

نجمہ : لیکن تم تو میز پہ ــــ

رفعت : یہ کم بخت ڈرائنگ (ٹیبل) کی کرسیاں ــــــــ ذرا ایک طرف کو جھکا کہ الٹ گیا ۔

شاہ صاحب : لیکن بھئی بستر بچھوا لیتے۔

(افضل آتا ہے)

افضل : یہ لیجئے دیاسلائی کی ڈبیہ صاحب

رفعت : (وہیں بیٹھے بیٹھے سگریٹ سلگا کر ایک کش لگاتے ہوئے ہنس کر) لیکن اس میز پر کیسے سو گیا یہ مجھے بالکل معلوم نہیں ——— شاید کرسی سے گرنے کے بعد نیند کی جھونک میں۔۔

انجم : (تلخی سے) خوب جگہ نکالی ہے تم نے سونے کے لیے ———

رفعت : میں دراصل کبھی کبھی میز پر سو جایا کرتا ہوں، میں آتا ہوں باجی تمھیں یاد ہے نا، نانا ابا کی وفات کے بعد میں نے ایک روزانہ اخبار نکالنے کی حماقت کی تھی، اخبار کا منیجنگ ڈائرکٹر اور ایڈیٹر بھی میں ہی تھا، کئی بار جب رات کو لیڈنگ آرٹیکل لکھنے لکھاتے دیر ہو جاتی تو خدا قسم وہیں بیٹھے بیٹھے میز پر سو جاتا۔ دوسرے دن جب آنکھ کھلتی تو بارہ بجے کی شفٹ کام پر آ چلی ہوتی (ہنستا ہے) میں نے ہدایت دے رکھی تھی چپڑاسیوں کو کہ مجھے سوتے میں ہرگز نہ جگایا جائے ———

(انجم زور سے قہقہہ لگاتا ہے)

انجم : تمھیں نیند کیسے آجاتی ہے سخت کھری میز پر؟

رفعت : (ہنستے ہوئے) تم خوب جانتی ہو باجی تمھیں مخمل کے گدیلوں پر نیند نہ آتی تھی اور میں کھری چارپائی پر سویا کرتا تھا، تمھارے کمرے کے پاس سے بھی کوئی گذر جاتا تو تمھاری نیند اچٹ جاتی اور ہمارے کانوں کے پاس اگر ڈھول بھی بجتے تو خبر نہ ہوتی (ہنستا ہے) خدا قسم میں تو تھرڈ میں بھی سو جاتا۔ لیکن کم بخت بھیڑ اتنی تھی کہ ایک بار جا کر جو بیٹھا تو اٹھ کر نہیں آسکا۔

انجم : لیکن ایسی بھی کیا مصیبت پڑ گئی کہ سیکنڈ چھوڑ کر تھرڈ میں سفر کرنے لگے ہو، نانا ابا کا دیا کیا ———

رفعت: اب میں کیا بتاؤں باجی، میرے ڈبے میں تو سناٹا تھا، ساتھی مسافر تو تھے لیکن میرے لیے اُن کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا (ہنستا ہے) دونوں یورپین تھے، شاید انگریز ——— مجھ سے تو کیا لو یعنے بارہ گھنٹے کے سفر میں کمبختوں نے آپس میں بھی نظر نہ ملائی۔ میں تو اُکتا گیا وہاں بیٹھے بیٹھے، تبھی ایک اسٹیشن پر ——— نہ جانے وہ کون سا اسٹیشن تھا ——— چھوٹا سا کسی قصبے کا اسٹیشن! ——— خدا قسم غضب کی صورت دکھائی دی کیا بتاؤں بھائی جان! کتنی حسین تھی وہ لڑکی، شہروں کا حُسن بھی دیکھا ہے آپ نے (شرارت سے ہنستا ہے) زرد اور بیمار جیسے کھاتے کے اوقات کا خیال رہتا ہے کہ کھانا ہضم نہیں ہوتا ——— اور ایک وُہ لڑکی تھی ——— کندن کی طرح دمکتا ہُوا رنگ اور جوانی ——— خدا قسم سمندر کی طغیانی

(جوش میں میز سے نیچے اُتر آتا ہے)

انجم: (خشمناک لہجے میں) میں کہتی ہوں آپ رفعت ہی کی باتیں سنتے رہیں گے، کھانا کھا کر آپ کچھ دیر آرام کیجئے، پھر آپ کو جانا ہو گا۔

شاہ صاحب: (گھبرا کر) چلو ——— چلو

رفعت: (قہقہہ لگاتا ہے) واہ بھائی جان! آپ پر بھی انجو باجی کا جادو چل گیا۔ اجی صاحب اگر آپ کا جی باتیں سننے کو چاہتا ہے تو باتیں سنئے، سونے کو چاہتا ہے تو سو رہیے۔

انجم: چلیے، میں کہتی ہوں کہ اُس کی باتیں تو کبھی ختم ہی نہ ہوں گی۔ نانا ابا کہا کرتے تھے کہ آرام کے وقت ——— ———

رفعت: آرام کرنا چاہیئے اُسے باجی کبھی وقت مقرر کر کے بھی آرام کیا جاتا ہے آرام کیا جاتا ہے جب آرام کو جی چاہے، بھائی جان کے سونے کا وقت ہے اور میں ابھی سو کر اٹھا ہوں۔ سلا کر دیکھ لو ہمیں ساتھ ساتھ، کون زیادہ سوتا ہے۔

(زور سے قہقہہ لگاتا ہے)

انجم: اچھا ہم کہتے ہیں تم اٹھو اور نہا کر کھانا کھاؤ، آرام کا وقت ہے تو کر بھی کچھ دیر آرام کر لیں

(شاہ صاحب سے) چلئے۔

شاہ صاحب: تم بستر بچھوا دو انجو، میں آتا ہوں

انجم: بستر تیار ہے

شاہ صاحب: (وکیل ہیں نا آخر) تو پنکھا رکھوا دو اور فضل سے کہنا کہ خس کی ٹٹی پر ذرا پانی چھڑک دے۔ کمرہ ٹھنڈا نہ ہوا تو مجھے نیند نہ آئے گی۔

انجم: (جاتے ہوئے) جلدی آئیے گا، پھر آپ کو جانا ہوگا نا چار بجے!

(چلی جاتی ہے)

(شاہ صاحب کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے) میں کہتا ہوں کیا ہو گیا بھائی جان آپ کو؟ آپ تو خدا قسم بالکل بدل گئے ہیں کیا اب خیر باد کہہ دیا زندگی کی سب مسرتوں کو آپ نے؟

شاہ صاحب: (لمبا سانس بھر کر) ارے بھئی! سمجھوتہ کرنا ہی پڑتا ہے زندگی میں۔

رفعت: سمجھوتہ ہی کیا ہے نا آپ نے (شرارت سے آنکھ مارتے ہوئے ہنستا ہے) سمجھوتہ ضرور کرنا چاہیئے، تو پھر دلکشا کے وعدے کا کیا رہا؟ ایک شام تو بس رہو وہاں آج میرے چند دوست آرہے ہیں وہاں شام کو۔

شاہ صاحب: نہیں بھئی میں نے تو ——

رفعت: ارے بھائی جان! اب مجھ سے نہ اڑیئے، ضابطہ فوجداری کے وکیل اور پارسائی (ہنستا ہے) مجھ سے سمجھوتہ نہیں ہو سکتا، اتنی مدت کے بعد ملاقات ہوئی آپ سے۔

شاہ صاحب: لیکن بھئی انجو!

رفعت: اسے آپ سمجھائیے، نکالئے کوئی ترکیب۔

شاہ صاحب: (قدرے اور قریب ہو کر رازدارانہ انداز میں) لیکن بھئی اس لڑکی کا کیا ہوا؟

رفعت: کس لڑکی کا؟

شاہ صاحب: ارے وہی جو تمہیں کسی اسٹیشن پر ملی تھی اور جس کی خاطر تم تھرڈ کے ڈبے میں ——

رفعت : ارے بھائی جان! بس تو جب میں نے اسے دیکھا اپنا ڈبہ چھوڑ میں اس کے ڈبے میں جا سوار ہوا۔

(انجم ڈرائنگ روم کے دروازے سے جھانکتی ہے)

انجم : آپ ابھی تک یہیں باتیں کر رہے ہیں (نزدیک آ کر) چلیے۔

شاہ صاحب : (اُٹھ کر) چلو بھئی چلو (اس کے پیچھے جاتے ہوئے) چلو۔

(دونوں چلے جاتے ہیں)

رفعت : (اپنے آپ ہنستا ہوا) اس گھر کے لوگ بھی پُرزے ہیں، خدا قسم مشین کے پُرزے

(کرسی گھسیٹ کر بیٹھ جاتا ہے اور ٹانگیں میز پر رکھ لیتا ہے)

(آنگن کے دروازے سے مُنّی آتی ہے)

مُنّی : میاں کھانا کھا لیجئے، کب سے پڑا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔

رفعت : آپ ——— آپ ——— یعنی میرا مطلب ہے کہ آپ سے میرا تعارف نہیں، آ بیٹھے بیٹھیے کرسی پر۔

مُنّی : جی میں یہاں کی نوکرانی ہوں۔

رفعت : لاحول ولا قوۃ! میں سمجھا کہ تم انجو باجی کی نند ہو ——— کیا نام ہے تمھارا؟

مُنّی : جی مجھے مُنّی کہہ کر پکارتے ہیں۔

رفعت : ارے مُنّی تجھے ننھی مُنّی سی لڑکی کہتے ہیں، تم تو بخدا اب ننھی مُنّی نہیں رہی ہو، آؤ ذرا بیٹھو۔

(ٹانگیں میز کے نیچے کر لیتا ہے اور میز پر کہنیاں ٹکا کر منہ کو ہتھیلیوں پر رکھ لیتا ہے)

مُنّی : جی آپ کھانا کھا لیجئے۔

رفعت : اجی کھانے کا کیا ہے، کھائے لیتے ہیں، تم ذرا بیٹھو

مُنّی : آپ کھانا کھا لیجئے، ہم لوگوں کے آرام کا وقت ہے۔

رفعت : آرام کا وقت ! خدا قسم میں تو پاگل ہو جاؤں گا، اس گھر میں جس کو دیکھو، اس کے آرام کا وقت ہے، کسی پینے نیلے وقت میں آرام بھی کیا جا سکتا ہے کبھی ؟
اگر مجھ سے کہا جائے کہ اب ایک بج گیا ہے، تمھارے سونے کا وقت ہے سو جاؤ تاکہ دو بجے اٹھ سکو تو خدا قسم میری پلکیں بھی بھاری نہ ہوں ہیں کے کانوں میں ایک ہی بجے دو بجنے لگیں، نیند آتی ہے جب آتی ہے، چاہنے پر کبھی نہیں آتی، کیوں منی تمھیں بندھے وقت کا یہ آرام پسند ہے۔

منی : جی ہیں۔

رفعت : اور ہمارے گھر میں کسی طرح کی پابندی نہیں، اصل میں نانا ابا مرحوم نے انجو باجی کے دماغ کو بگاڑ رکھا ہے، وہ تھے بھی جابر، ہمیشہ اپنی رائے دوسروں پر لادا کرتے تھے ہمیشہ اپنی عادتوں کے مطابق دوسروں کو چلاتے تھے، ——— ہمارے گھر میں ایسا کرنا گناہ کبیرہ سمجھا جاتا ہے، خدا قسم تم چار دن ہمارے گھر میں رہ کر تو دیکھو، کتنی آزادی ہے وہاں، دن کے ہر وقت تمھیں کوئی نہ کوئی نوکر سوتا ہوا ملے گا (ہنستا ہے) جب مالک سوتے ہیں تو نوکر کیوں نہ سوئیں۔

منی : میاں آپ کھانا کھا لیجیے۔

رفعت : خدا قسم امی جان تمھیں بے حد پسند کریں گی، میں انجو باجی سے تمھیں مانگ لوں گا۔

منی : جی آپ کی مہربانی ہے، آپ

انجم : (ڈرائنگ روم سے) منی تم کیا کر رہی ہو یہاں ؟ چلو جا کر آرام کرو، پھر تمھیں شام کے ناشتے کا انتظام کرنا ہوگا، آج دوپہر کے کھانے ہی کو اتنی دیر ہو گئی ہے۔

منی : دولھن بیگم، میں رفعت میاں کو۔

انجم : (آتے ہوئے) تم جاؤ میں کھانا دیتی ہوں رفعت کو۔

منی : آپ آرام کیجیے دولھن ——میں ———

انجم : میں جو کہتی ہوں تم جاؤ آرام کرو، میں دیتی ہوں رفعت کو کھانا۔
امنی : بہت اچھا دلہن۔

(امنی چلی جاتی ہے)

انجم : خلاق تو تمھیں کچھ بھی نہیں گیا رفعت، میری نوکرانی ہی پر ڈورے ڈالنے لگے۔
رفعت : ایسے باجی، نوکرانی تو تمھاری خوب ہے خدا قسم اسے ہمارے ساتھ بھیج دو
انجم : شرم تو نہیں آتی، یہی سکھایا ہے امی اور ابا نے تمھیں شکر ہے نانا ابا نے مجھے گود لے لیا
رفعت : تمھیں نانا ابا کی قسم باجی! اس نوکرانی کو ہمارے ساتھ بھیج دو۔
انجم : (جھڑک کر) اٹھو رفعت! ابھی جی نہیں بھرا، اتنا وقت گنوا کر تمھارا ——— چلو اٹھو نہا لو، نہیں نہانے تو ہاتھ منہ دھولو۔
رفعت : مانو باجی! ایسی ہی سنوری نوکرانی رکھو گی، تو بھائی جان کبھی دل دے بیٹھیں۔ گئے آدمی ہیں آخر بہے جاتے۔
انجم : اچھا اٹھو یہاں سے، میں میز کی چادر تو بدل دوں آج ہی صبح نئی بدلی تھی میں کہتی ہوں تم نے اب تک یہ بھی نہیں سیکھا کہ دستر خوان کی چادر پر جوتے نہیں رکھے جاتے ——— اور چادر میز پر بچھانے کے کام آتی ہے، تکیہ بنانے کے نہیں (بڑی ملائمت سے) اٹھو میں لاتی ہوں، چادر بدل کر تم اتنے میں نہا دھو جاؤ۔

(چلی جاتی ہے)

(رفعت پھر میز پر ٹانگیں رکھ لیتا ہے اور گنگناتا ہے)

امید تو بندھ جاتی، تسکین تو ہو جاتی

وعدہ نہ وفا کرتے، وعدہ تو کیا ہوتا

(ماموں جان کو گاتے سن کر ندیم اپنے کمرے سے دبے پاؤں آتا ہے)

ندیم : (سرگوشی سے) ماموں جان!

رفعت : آؤ بیٹے، خوب وقت پر آئے ، سنو ہم گا رہے ہیں

(گاتا ہے)

ناکام تمنا دل اِس سوچ میں رہتا ہے،
یوں ہوتا تو کیا ہوتا، یوں ہوتا تو کیا ہوتا

کیوں بیٹے پسند آیا ہمارا گانا ؟

ندیم : آپ بہت اچھا گاتے ہیں ماموں جان اور سنایئے نا !

رفعت : بس بیٹے، ورنہ تم بیاہو گے کہ کرکٹ کا کپتان بننے کی بجائے میں گویا بنوں۔

(دونوں ہنستے ہیں)

ندیم : ماموں جان آپ سوئے نہیں ؟

رفعت : میں ابھی سو کر اٹھا ہوں۔

ندیم : میں سویا تھا، لیکن مجھے نیند نہیں آئی، ماموں جان، آپ امی سے کہہ دیجئے کہ مجھے کرکٹ کھیلنے کی اجازت دے دیں۔

رفعت : (اسے گود میں لیتے ہوئے) میں ضرور کہہ دوں گا، خدا قسم میں یہاں سے جاتے ہی تمھیں کرکٹ کا سب سامان بھیج دوں گا۔ بیٹ، وکیٹیں اور گیند سب —— تم روز کھیلنا اور اپنے ماموں جان کو دعائیں دینا، کیوں ندیم یاد رکھو گے نا اپنے ماموں جان کو۔

ندیم : (رفعت کے گلے سے لپٹ جاتا ہے) ماموں جان !

انجم : (دوسرے کمرے سے) ندیم کیا کر رہے ہو تم یہاں ؟ تمھارے تو سونے کا وقت ہے سوئے نہیں تم کیا۔

ندیم : نیند نہیں آتی امی !

انجم : (پاس آکر) چل کر لیٹ آ جائے گی، نانا ابا کہا کرتے تھے کہ نیند نہ آئے تو بھی کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر لیٹنا چاہیئے، چلو اپنے کمرے میں چل کر آرام کرو اور رفعت تم

ابھی یہیں بیٹھے ہو، جاؤ غسل خانہ میں سب کچھ رکھا ہُوا ہے۔ ——— نہالو اگر نہانا ہے، نہیں تو منہ دھولو، میں تولیہ لاتی ہوں۔

رفعت : مجھے کھانے کی بالکل خواہش نہیں۔

انجم : تو پھر کیا کھاؤ گے؟

(باہر گلی میں دہی بڑے اور چاٹ والا آواز دیتا ہے)

آواز : چاٹ چٹپٹی مصالحے دار، پانی کے بتاشے دہی بڑے

رفعت : میں خدا قسم دہی بڑے کھاؤں گا۔

آواز : دہی کے بڑے۔

رفعت : کیوں ندیم بیٹا کھاؤ گے دہی بڑے؟

ندیم : (چپ)

رفعت : آؤ تمھیں دہی بڑے کھلائیں (ڈرائنگ روم کے دروازے میں جاکر آواز دیتا ہے) او چاٹ والے لاؤ، ادھر دہی بڑے او چاٹ۔

ندیم : امی۔

(انجم کا دامن پکڑ لیتا ہے اور انجم جھٹک دیتی ہے)

رفعت : (مڑکر) اے باجی، ان قہر بھری نگاہوں سے بچے کی طرف کیوں دیکھ رہی ہو میں کہتا ہوں، سب کھائیں گے دہی بڑے (پھر زور سے مڑکر آواز دیتا ہے) او دہی بڑے والے لاؤ ادھر دہی بڑے اور پانی کے بتاشے۔

انجم : رفعت رہنے دو، اس کا معدہ خراب ہو جائے گا

رفعت : اگر تم نے بچپن ہی میں اس کا معدہ اتنا کمزور کر دیا تو خدا قسم بڑے ہوتے ہوتے ضرور خراب ہو جائے گا۔

انجم : میں کہتی ہوں دہی بڑے کوئی کھانے کی چیز ہے۔

رفعت : اس کے پاس پانی کے بتاشے اور مونگی کے لڈو بھی ہیں، چٹپٹے اور مصالے دار ۔
(نوکر کو آواز دیتا ہے) افضل ـــــ افضل ـــــ

افضل : (باہر سے) جی صاحب (اندر آکر) جی !

رفعت : خوانچے والا بیٹھا ہے باہر اس سے پانی کے بتاشے اور دہی بڑے لے آؤ (انجم سے)
آؤ باجی اُڑائیں دو دو، چار چار (افضل سے) اور سنو، مونگی کے لڈو بھی لے آنا۔
انجم باجی کے لیے ۔

انجم . مجھے نہیں کھانے پانی کے بتاشے اور مونگی کے لڈو، "نا" آپا کھاکرتے بچے کہ چاٹ

رفعت : نہایت بُری چیز ہے لیکن باجی کبھی کبھی بُری عادت بھی کر دیکھنی چاہیئے، بہت اچھائی
خدا کو پسند نہیں (ہنستا ہے) جس طرح خوبصورت بچوں کو نظرِ بد سے بچانے کے لیے انکے
ماتھے پر سیاہ ٹیکا لگا دیا جاتا ہے ۔ اسی طرح میں بھی اپنی بھلائی کو نظرِ بد سے بچانے کے
لیے بھی کبھار ایسی ویسی بُری بات کر لیا کرتا ہوں ۔

انجم . (طنز سے) بھلائی (مسکراتی ہے) کیا بات ہے تمھاری بھلائی کی، ـــــ تمھیں کو
مُبارک ہو یہ بھلائی ۔

شاہ صاحب : (آنگن کے دروازے سے جھانکتے ہیں) بھئی کیا بات ہے (پاس آکر) جھگڑ
کیوں رہے ہو ؟

انجم : رفعت نِدّو کو دہی بڑے کھلا رہا ہے ۔

رفعت : آیئے بھائی جان، دہی کے بڑے بکنے آئے ہیں ۔ پانی کے بتاشے ہیں اور چاٹ
ہے، آیئے کچھ ـــــ ۔

شاہ صاحب : بھئی میں نے تو چھ برس سے کبھی چاٹ کو منہ نہیں لگایا ۔

عطیہ : (آتے ہوئے ہنس کر) صرف دو نے دیکھے ہیں ۔

رفعت : خوب موقعے پر آئی ہو عطی، خدا قسم دہی بڑے آئے ہیں ـــــ فرسٹ کلاس

بھائی صاحب نے بھی چھ برس سے چکھ کر نہیں دیکھے اور مجھے بھی خدا جھوٹ نہ بلوائے برسوں
ہو گئے ہیں ان کی صورت دیکھے ——— آؤ بیٹھو (افضل کو آواز دیتا ہے)
قلفی لے آؤ اور دہی بڑے ۔

عطیہ : میں نہیں کھاتی دہی بڑے ۔

(باہر سے قلفی والے کی آواز آتی ہے)

آواز : قلفی ملائی کی برف

رفعت : لو قلفی کی بات کی اور قلفی ملائی والی (افضل کو آواز دیتا ہے) افضل بٹھاؤ قلفی والے کو ۔
——— اس لئے کہا ہے کہ زندگی کا مسالہ ہے ——— تو آئیے جس کی مرضی
ہو قلفی کھائیے، جس کی مرضی دہی بڑے، جس کی مرضی پانی کے بتاشے اور چاٹ
کیسے بھائی جان کیا کھائیں گے؟ ——— کچھ نہیں ——— ہاں ہاں کہہ
دیجئے، لاؤ بھئی افضل ۔

(افضل ایک ٹرے میں سب چیزیں رکھ کر لاتا ہے)

شاہ صاحب : (بے نیازی سے) میں پانی کے بتاشے ہی لے لوں گا

رفعت : تم ندو ؟

ندیم : میں قلفی لوں گا

انجم : پھر پڑے رہو گے بیمار ہیضہ سے کئی دن ۔

رفعت : (انجم کی بات کو سنی ان سنی کر کے) تم عطی ؟

عطی : میں مونگ کے لڈو لوں گی ۔

رفعت : ارے منّی اور دوسرے نوکروں کو بھی بلا لو، انھوں نے بھی کئی برس سے ان چیزوں کی شکل نہ
دیکھی ہوگی ۔ ——— کہو باجی تم قلفی لوگی، دہی بڑے کھاؤگی، مونگ کے لڈو یا چاٹ یا
سبھی چیزیں ۔

شاہ صاحب : کیوں کیوں بات کیا ہے۔

رفعت : مجھے چار بجے دلکشا ہوٹل پہنچنا ہے، دوست میرے آ رہے ہیں وہاں افضل میرا بستر اٹھاؤ تانگہ راستے میں پکڑ لیں گے۔

(دوسرا ادمی بڑا منہ میں رکھ لیتا ہے)

(افضل چلا جاتا ہے)

انجم : لیکن بستر کیا کرو گے ؟

رفعت : میں ادھر ہی اسٹیشن پر پہنچ جاؤں گا، سات بجے کی گاڑی پر سوار ہونا ہے مجھے۔

انجم : بستر تو میں نے کھول دیا۔

رفعت : اچھا تو افضل کے ہاتھ بعد میں بھجوا دینا، دلکشا ہوٹل میں۔

انجم : گندا تھا، پانی کے ٹب میں پڑا ہے۔

رفعت : (قہقہہ لگاتا ہے) ارے باجی! خیر جب دھل جائے جب بھجوا دینا، اب تو میں چلتا ہوں چار بجے مجھے ضرور پہنچنا ہے، دلکشا ہوٹل۔

انجم : مجھے کیا معلوم تھا کہ تم طوفان کی طرح آؤ گے اور آندھی کی طرح چلے جاؤ گے۔

رفعت : (ہنستا ہے) انشاء اللہ میں پھر آؤں گا انجو باجی! اور غبار کی طرح ٹک کر بیٹھوں گا، خدا حافظ!

انجم : ارے تو افضل کہاں ہے، تانگہ لائے (ادھر ادھر دیکھتی ہے) چلا گیا ہو گا، بستر لانے افضل —— افضل ——

(آنگن کے دروازے سے نکل جاتی ہے)

شاہ صاحب : (جب سب چاٹ کھانے میں مشغول ہیں رفعت کو ایک طرف لے جا کر سرگوشی میں) بھئی تو کیا سچ مچ جا رہے ہو؟

رفعت : (سرگوشی میں) ارے بھائی جان آج کون جاتا ہے، رات تو دلکشا میں کچھ تفریح رہے گی چلئے گا ؟

شاہ صاحب : اچھا بھئی بڑے استاد ہو، اور وہی بڑے کی طشتری یوں رکھ رہی جیسے بڑے لاٹ صاحب سے ملنے جا رہے ہو تم (اور بھی دھیرے سے) کچھ دو بھی ۔

رفعت : اور انجو باجی سمجھتی ہیں، بڑے برخوردار قسم کے خاوند ہیں آپ ۔

شاہ صاحب : اسے بھی سمجھوتہ کر ناہی پڑتا ہے، تم آ گئے ہو ورنہ (لمبا سانس لے کر) ہم اور آرزوئے وصال پری رخاں ۔

انجم : (آتے ہوئے) لیجئے تانگہ آ گیا ہے، خالی جا رہا تھا، آواز دے کر بلا لیا ۔

شاہ صاحب : اے ہم انجم میں ذرا رفعت کو سٹیشن تک پہنچا آؤں ۔

انجم : ہاں تو دیر کر کے نہ آئیے گا ۔

ندیم : ماموں جان !

رفعت : ہم ندیم بیٹے کے لیے کرکٹ کا سامان بھیجیں گے، باجی اسے کرکٹ کھیلنے کی اجازت دیدو، بڑا ہو کر کپتان بنے گا، آداب عرض (چلتے ہوئے) بھئی انجو باجی بھی خوب ہیں (ہنستا ہے) بھئی خوب ہیں انجو باجی بھی ۔

سب : آداب عرض ۔ آداب عرض ۔

(دونوں چلے جاتے ہیں)

ندیم : (خوشی سے) ماموں جان ہمارے لیے کرکٹ کا سامان بھیجیں گے ۔

انجم : (مڑ کر غصے سے) چل ہاتھ دھو اور کتابیں لے کر بیٹھ، بھیجیں گے تمہارے لیے کرکٹ کا سامان، ماسٹر آنے والے ہوں گے، چل جلدی ۔

ندیم : امی

انجم : میں کہتی ہوں چل، لے کے بیٹھ گیا قلفی کھانے، جیسے کبھی ملی ہی نہ ہو، کوئی چیز کھاتے کو عقل ذرا نہ ہو، ہاتھ دھلا دو اس کے اور بٹھاؤ اسے پڑھنے کی میز پر (کمرے میں چاروں طرف نگاہ دوڑاتی ہے) لاحول ولا قوۃ، کیا حال کر دیا کمرہ کا چند گھنٹوں میں (نوکر کو آواز دیتے)

مصوّر

احمد ندیم قاسمی

کردار

عباس

سیاس

شاہ

نوروز

راغب

پرویز

بلقیس

پہلا منظر

[دربار شاہی۔ عوامی ہجوم کا سرگرمیاں اتنی جاری رہتی ہیں اور پھر]

ایک آواز: عالی جاہ شہنشاہ کشور ... خاموش! وزیر اعلیٰ ستیاس اور وزیرزادہ عباس تشریف لا رہے ہیں۔

خاموشی کا مختصر سا وقفہ جو شہزادہ اور وزیرزادہ کے قدموں کی چاپ سے ٹوٹ جاتا ہے

عباس: شاہ خراسان نے ہماری بہادر طلبی کا کوئی جواب نہیں بھیجا ابّاجان۔

ستیاس: سرحد پار سے آنے والی خبر بتا رہی ہے کہ ہمارے ظفر... نے خراسانیوں کو لاجواب کر دیا ہے۔

عباس: شاہ ذی جاہ کو بھی تو بہادر طلبی کا ایک نیا ڈھنگ سوجھا ہے کہ خراسان چاہے اپنی سارا جسمانی اور روحانی دولتوں کو بروئے کار لے آئے۔ وہ ہم سے ظفر یاب قوم کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

ستیاس: مجھے تو کامیابی کا سوال تب پیدا ہوتا جب خراسانیوں کو ہمارے مقابل آنے کی ہمت ہوتی۔ مجھے یقین ہے کہ اب خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر ہی ملک ہماری سلطنت سے منسلک کر لیا جائے گا

عباس: میں سوچتا ہوں ابّاجان! اگر دنیا کی تمام سلطنتیں اپنے جھگڑوں کو اسی طرح فیصل کرنے لگیں۔ تو تلواریں اٹھانے کی ضرورت نہ پڑے اور انسانی خون کی ارزانی ایک داستان پارینہ بن کر رہ جائے۔

ستیاس: مصیبت یہ ہے عباس بیٹا کہ اس دنیا میں ایسے لوگ بہت کم ہیں جو فن کو تلوار پر فوقیت دینے کے قائل ہوں ہمارے داناؤں اور حکیموں نے کہا ہے کہ فن تلوار سے افضل ہے اس لیے جب مقابلہ ٹھن جائے تو سب سے پہلے فنی ہتھیار استعمال کرنے چاہئیں اور جب ان ہتھیاروں کی دھاریں ملول ہو جائیں تو پھر بے شک لوگ وحشت اور بربریت پر اتر آئیں لیکن ہمارے فلسفیوں کو یقین ہے کہ فن غیر فانی ہے اس لیے فنی ہتھیار کبھی بے کار نہیں ہو سکتے۔

عباس: ابّاجان داناؤں نے فنی ہتھیاروں کو اس قدر کیوں اچھالا ہے، جبکہ کہا جاتا ہے کہ تصوف روحانیت کا بلند ترین اور مقدس ترین مقام ہے اور فن ہر حال میں اس سے گھٹیا ہے۔

ستیاس: اپنا اپنا خیال ہے بیٹا! جب کسی ملکی مسئلہ کی گتھی سلجھانے سے نہ سلجھے تو جانتے ہو ہمارے عالی وقار شاہ طغران کیا کرتے ہیں۔

عباس: ستار سنتے ہیں۔

ستیاس: ہاں ستار سنتے ہیں یا رقص ملاحظہ فرماتے ہیں یا کسی سنگ تراش کا شاہکار منگوا بھیجتے ہیں یا کسی مصور کی ایک سادہ سی تصویر دیکھ لیتے ہیں اور آن کی آن میں اُن پر دُنیا جہاں کی تمام حقیقتیں عیاں ہو جاتی ہیں اسی لیے تو انھوں نے شاہِ غاسان کو کہلا بھیجا ہے کہ صوبہ ریاض پر حکومت کرنے کا حق صرف طغرانیوں کا ہے جو صدیوں کی کسی پرانی غلطی سے مملکتِ غاسان میں شامل ہے۔ تلوار نکالنے سے پہلے اس حق پر غور کرو اور اگر ہم سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتے ہو تو سب سے پہلے فنی لڑائی لڑو اور تین مہینوں کے اندر اندر اپنی فنی عظمت ثابت کر سکو تو کرو ورنہ صوبہ ریاض کو بزورِ شمشیر سلطنت طغران میں شامل کر لیا جائے گا۔

عباس: آقا جان! سنا ہے کہ غاسان کے مغنی جب اپنے سازوں کے تار چھیڑتے ہیں تو بادل ڑکھڑا کر زمین پر بچھ جاتے ہیں۔ اور پھول جھک کر اُوپر کی فضا میں معلق ہو جاتے ہیں۔

ستیاس: (ہلکے سے ہنس کر) یہ غلط ہے بیٹا! یہ جھوٹی افواہیں ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ شاہِ غاسان چند ہی روز میں مشہور مغنی ریحان کو ہمارے ہاں بھیجے گا۔ ہمیں فنی شکست دینے کے لیے۔

عباس: اور اس کے مقابلے میں آئے گا ہمارا سحر کار مغنی رحمان! ہماری فتح کا اعلان کرنے کے لیے۔

ستیاس: اور اگر شاہِ غاسان ابھی تک لاجواب نہیں ہوا تو رحمان کے ستار کے تار اسے اپنی تقدیر کا لکھا سنا دیں گے۔

(شاہ کی آمد کے اعلان کی خاطر سب سے اوّل کہیں دور دور سے طبل)

[پر چوٹیں پڑتی ہیں اور پھر دربار میں ایک جلال آمیز ساز کے سُر ابھرتے ہیں جو آخر کار بہت مدھم ہو کر شاہ طغران کے قدموں کی چاپ میں بدل جاتے ہیں]

ایک آواز: طغران کی نئی صبح اپنے شہنشاہ کے حضور میں نقرئی کرنوں، پو تلوں، پھولوں اور اَن گنت

خوشبوؤں کی ڈالی نذر کرتی ہے۔

شاہ : (تھکے ہوئے انداز میں) وزیر اعلیٰ سیاس!

سیاس : آقائے عالی وقار۔

شاہ : آج تمام رات ہمارا ذہن ایک عجیب سے خلفشار سے دوچار رہا۔ اور جب مشرق سے اُفق کی کمان نے شعاع کا پہلا چلّہ چڑھانا چاہا تو ہمارے دل میں تمنا پیدا ہوئی کہ کوئی ہماری بے خواب روح کو تھپکے۔ ایک بُت۔ ایک رقص۔ ایک شعر۔ ایک تصویر۔ ایک نغمہ ——— ہم قصرِ شاہی میں صبح صادق کے دھندلے اُجالے میں گھومتے پھرے۔ ہم نے فنونِ لطیفہ کے ہر شاہکار سے اپنی احتیاج ظاہر کی مگر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہمارا وجدان دم توڑ چکا ہے اور ہمارے باطنی جلال کا چاند گہنا گیا ہے۔

سیاس : من غیر فانی ہے عالی وقار!

شاہ : (ذرا تیزی سے جس میں بیزاری بھی ہے اور غصہ بھی) ہم نے فنا اور بقا کے اسرار کو سمجھنے کے لیے اپنی نیندیں لٹا دیں۔ لیکن بس یہی بات سمجھ میں آئی کہ سُوت کی اُنٹی سلجھانے سے اُلجھتی ہے اور سلجھ جائے تو کچے تار کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ دامن گیر ہو جاتا ہے۔

سیاس : شہنشاہ نے تو بے شمار الجھنیں سلجھائی ہیں۔

شاہ : اور شاید ابھی ہماری زندگی کا تار ٹوٹنے کو ہے۔

سیاس : (جلال سے) اپنے شہنشاہ کی حیات کو طویل سے طویل تر کرنے کے لیے موت تک کی ہنسی اڑا سکتا ہے۔

شاہ : تم آپے سے باہر ہو چلے سیاس۔ ہماری یہ گفتگو رازدارانہ تھی اور درباری چونک اُٹھے ہیں۔

(سرگوشیاں)

عباس : اگر غلام زادے کو اجازت مرحمت فرمائی جائے تو اُن تمام اُلجھنوں کا ایک علاج تجویز کرنے کی جرأت کرے۔

شاہ : تم غلام زادے نہیں عباس ، وزیر زادے ہو۔ ہمیں تمہارا علاج قبول ہوگا۔ بعض اوقات جوانیاں برف کے گالوں سے چنگاریاں اور آگ کے شعلوں سے پھول چن لاتی ہیں۔ ہمیں اس کا تجربہ ہے۔ تمہیں اجازت ہے۔

سیاس : (سرگوشی میں) عباس بیٹا کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھنا کہ عتاب شاہی نازل ہو۔

عباس : (سرگوشی میں) بے فکر رہیے ابا جان ——— (بلند آواز میں) رحمان مغنی کو حضور پُر نور کے قدموں میں بیٹھنے کی سعادت بخشی جاتی ہے۔

(ستار کا ایک نازک تن سے اس کا جواب بنتا ہے اور پھر رحمان کے قدموں کی چاپ ابھر کر ایک جگہ رک جاتی ہے)

شاہ : وزیر اعلیٰ سیاس ہم وزیرزادہ عباس کی دور اندیشی اور خوش مذاقی پر بنفس مرحبا کہتے ہیں۔

سیاس : مجھے آقائے عالی وقار کے اس ارشادات پر ناز رہے گا۔ —

عباس : اور مجھے حضور پُر نور کا یہ فرمان شمع راہ کا کام دیگا۔

شاہ : رحمان! کیا سوچ رہے ہو؟ تم اور راغب مصور ہی تو دو ایسی شخصیتیں ہو جن کو ہم نے شمشیر و سپاہ پر بھاری کر رکھا ہے۔ دیکھتے نہیں ستار کے تار تمہاری انگلیوں کے پوروں کو کیسی حسرت بھری نگاہوں سے تک رہے ہیں۔

(رحمان ستار بجاتا ہے اور جب اس کی انگلیوں میں والہانہ تیزی بھر جاتی ہے تو اچانک دربار کے پرلے سرے پر شور و غوغا بلند ہوتا ہے)

شاہ : (غصہ میں) ہمارے خیالوں پر برستی ہوئی نغموں کی پھوار کو کس نے چھینے کی جرأت کی ہے؟ کس نے ہمارے جذبات کے ہلکورے کھاتی ہوئی ڈالیوں پر ہاتھ ڈالنے کا حوصلہ کیا ہے ---- اس شور مچانے والے ہجوم کو فوراً ہمارے سامنے حاضر کیا جائے۔

(شور بہت قریب آجاتا ہے اور پھر رک جاتا ہے)

نوروز : غلام کورنش بجا لاتا ہے۔

شاہ : نوروز ! زندان کے مہتمم ہونے کے باوجود تمہیں اب تک ہجوم کو اپنی گرفت میں لانیکا سلیقہ نہیں آیا۔ کیوں؟

نوروز : غلام مجبور تھا عالی جاہ !

شاہ : مجبور ؟ تم نے اس ذلیل لفظ کو ہمارے سامنے دہرانے کی جرأت کیوں کی ؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہم نے شاہی فرمان سے طغران کی تمام فرہنگوں سے یہ لفظ خارج کر دیا ہے مجبوری ذلت ہے، بے دست وپائی ہے۔ محتاجی ہے اور ہم نہیں چاہتے کہ طغران کا کوئی باشندہ ہماری پناہ میں رہ کر اپنے آپ کو مجبور تصور کرے)

نوروز : غلام درگذر کا طالب ہے۔

شاہ : کہو ! یہ شور کیسا تھا ؟

نوروز : دربار عام میں اس حادثے کا ذکر کرتے ہوئے زبان رکتی ہے عالی جاہ ! اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو غلام کو خلوت میں تمام حالات عرض کرنے کی سعادت بخشی جائے۔

شاہ : نہیں ۔ ۔ ــــ ہم اُن کجکلاہوں میں شامل نہیں ہیں۔ جو لنگوٹی میں پھاگ کھیلا کرتے تھے۔ ہمارا ہر راز ہماری رعایا کا راز ہے۔ جب ہماری رعایا کے کسی فرد کی جبین پر کوئی شکن نمودار ہوتی ہے تو شاہی ملتھے پر شکنوں کا ایک جال بچھ جاتا ہے۔ ہمارے قہقہے رعایا کے قہقہوں سے عبارت ہیں اور رعایا کے آنسوؤں نے ہمیں خلوتوں میں اکثر رلایا ہے۔

نوروز : یہ معاملہ براہ راست ــــــــ (رک جاتا ہے)

شاہ : رک کیوں گئے ؟

نوروز : عالی جاہ ! یہ معاملہ براہ راست ۔ شاہ طغران کی نور نظر شاہزادی بلقیس سے تعلق رکھتا ہے۔

شاہ : بلقیس سے ، ہماری بیٹی سے ؟ ــــــــــ اور تمھارا خیال یہ ہے کہ ہماری رعایا کے لیے ہماری بیٹی ہمیشہ ایک راز ہے۔ رعایا شاہ کی معنوی اولاد ہے اور نوروز بلقیس صرف اسی لیے راز نہیں رہ سکتی کہ وہ ہماری بیٹی ہے۔ کھلے بندوں کہہ دو جو کچھ کہنا ہے۔

نوروز : عالیجاہ! میں اپنے گھر سے نکل کر زندان کی طرف جا رہا تھا کہ شاہی قصر کے مشرقی دریچے کے نیچے مجھے ایک ہجوم نظر آیا۔ قریب جا کر دیکھا تو عالی جاہ کے محبوب مصور راغب ایک آوارہ سے نوجوان کو تھامے کھڑے تھے۔ اور ہجوم اس نوجوان کی آنکھیں پھوڑ دینے کا تقاضا کر رہا تھا۔

شاہ : کیا راغب ابھی تک دربار شاہی میں نہیں آیا؟

راغب : کورنش بجا لاتا ہوں شاہ ذی جاہ۔

شاہ : راغب۔ نوروز سنی سنائی بات کہہ رہا ہے۔ ہم آنکھوں دیکھے واقعہ کو فوقیت دیتے ہیں۔ کہو کیا بات ہوئی۔

راغب : شاہ ذی جاہ میں آج طلوع آفتاب کا منظر دیکھنے کے لیے دریا کے کنارے چلا گیا تھا مگر اس نظارے سے اس قدر سرشار ہوا کہ دریا کی لہروں پر ———— آفتاب کی بکھری ہوئی قاشوں کا ناچ دیکھتے دیکھتے بہت دیر ہو گئی۔ چونکہ مجھے دربار شاہی میں حاضر ہونے کو لپکا اور جب قصر شاہی کے مشرقی دریچے کے قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک آوارہ نوجوان محل کے دریچے پر نظریں گاڑے دم بخود کھڑا ہے اور دریچے میں۔

شاہ : اور دریچے میں ———— ؟

ستیاس : دریچے میں کیا تھا راغب ؟

راغب : اور دریچے میں ————

شاہ : (غصے میں) کون تھا دریچے میں ؟

راغب : شاہزادی بلقیس۔

شاہ : بلقیس ؟

عباس : دریچے میں شاہزادی کھڑی تھیں۔

شاہ : اور بلقیس اس نوجوان کو دیکھ رہی تھیں ؟

راغب : نہیں عالی جاہ! نوجوان بلقیس کو دیکھ رہا تھا۔

شاہ : سچ سچ بتاؤ۔

راغب : عالی جاہ کے سامنے جھوٹ بولنے کی کسے جرأت ہو سکتی ہے ؟

شاہ : تو پھر کہاں ہے وہ نوجوان جس نے بجلی کو چابک سمجھ کر اسے ہاتھ میں لینا چاہا۔ جس نے شعلے کو پھول سمجھ کر اُسے سونگھنا چاہا۔ جس نے شاید یہ نہیں سنا کہ شاہِ طغران کی تیوری تلوار کا کام کرتی ہے اور اُس کے ہونٹوں کی ایک ذرا سی حرکت حکومتوں کے تخت الٹ دیتی ہے کہاں ہے وہ نوجوان ؟

عباس : کہاں ہے وہ نوجوان جس نے شاہزادی پر ناپاک نظریں ڈال کر مملکتِ طغران کی تمام بہو بیٹیوں کو گھورنے کا حوصلہ کیا ہے۔ اگر حضورِ پُرنور کی اجازت ہو تو عباس اسے اپنی یہ تلوار دے کر۔

(تلوار میان سے نکالنے کی آواز)

شاہ : ہماری میانوں سے تلواریں اتنی عجلت سے نہیں نکل آیا کرتیں وزیر زادے !

عباس : (تلوار کو آہستہ سے میان میں ڈالنے کی آواز) غلام درگذر کا طالب ہے۔

سیاس : عباس نوجوان ہے آقائے عالی وقار ! اور جوانی چڑھتا اور بڑھتا ہوا سورج ہے میں اپنی طرف سے اپنے آقا کی خدمت میں یہ درخواست پیش کرتا ہوں کہ اگر اس نوجوان کے انجام کا اعلان تلوار کی زبان سے ہونا قرار پائے تو عباس کی تلوار جو میان سے نکل کر اپنے بادشاہ کے خوف سے پھر میان میں دبک گئی اس اعزاز کے لیے چُنی جائے۔

شاہ : تمہاری یہ درخواست قبول کی جاتی ہے سیاس ! ہاں تو وہ نوجوان کہاں ہے ؟

راغب : نور وز اُسے لینے گیا ہے عالی جاہ۔

شاہ : مگر اس نے اتنی دیر کیوں لگا دی ہے ؟ کیا نور وز اس قدر نادان ہے کہ وہ ہمارے دل میں سُلگتے ہوئے جہنم اور ہمارے دماغ میں کڑکتی ہوئی بجلیوں کا اندازہ نہیں لگا سکا۔

راغب : وہ اس نوجوان کو دربارِ شاہی کے آداب بتانے گیا ہے عالی جاہ !

شاہ : (غصے میں) میں پوچھتا ہوں جس شخص نے بادشاہِ وقت کی عزیز ترین امانت کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ اسے دربارِ شاہی کے آداب سکھانے سے کیا فائدہ ؟ قتل کرنے والے کو یہ بتانا کہ دوسرے کے

منہ پر تھپڑ نہیں لگاتے۔ بے وقوفی ہے اور نوروز بے وقوف ہے ۔۔۔۔۔ حاضر کرو اسے۔

(خاموشی کا وقفہ ۔۔ کھسر پھسر شروع ہوتی ہے مگر دب جاتی ہے)

نوروز: (کراہ کر) کورنش بجا لاؤ ــــــــــ (خاموشی)

نوروز: کورنش بجا لاؤ ۔۔۔۔۔۔۔ (خاموشی)

شاہ: نوجوان! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔۔۔

پرویز: شاہ طغران

شاہ: کون ہو تم؟

پرویز: میں انسان ہوں

شاہ: کہاں کے رہنے والے ہو؟

پرویز: ساری دنیا میرا وطن ہے۔ ماہی گیروں کی ریت، میدان کا سبزہ اور پربتوں کی بھاری گھاٹیاں میرا بستر ہے اور تاروں بھرا آسمان میرا خیمہ ہے۔ یہاں وہاں ہر مقام میرا اپنا ہے۔ میں کائنات کا دولہا ہوں کیونکہ میں انسان ہوں۔

عباس: استعاروں میں باتیں کر کے ہمیں متاثر کرنا چاہتا ہے آوارہ

شاہ: خاموش عباس!

پرویز: (دھیرے سے ہنس کر۔ آوارہ: عباس نے اپنی طرف سے مجھے گالی دی ہے حالانکہ آوارہ میرا لقب ہے اور مجھے اس لقب پر فخر ہے کیونکہ فن آوارگی کے سوا میں نے کچھ نہیں پایا۔)

شاہ: نوجوان! سنبھل کر بات کرو اور یہ سمجھو کہ اس وقت تم شاہ طغران کے حضور میں مجرم کی حیثیت سے کھڑے ہو

پرویز: اور مجھے اس نامعلوم جرم کی سزا بھی مل چکی ہے۔ اگر میں اپنے سینے پر سے لبادہ اٹھا کر آپ کو تازہ زخم دکھا دوں تو کہیں یہ درباری آداب کی خلاف ورزی تو نہیں کروں گا۔

شاہ: تازہ زخم؟ تمہیں کس نے سزا دی؟

پرویز : یہ کسی کا نام ہے کہ اس پر عتاب شاہی نازل کرنے کا سبب نہیں ہوں گا کیونکہ میں نے شاہی ذہنیت کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے اور میں جانتا ہوں کہ بادشاہ چیونٹی کو مسل ڈالتے ہیں اور شیر کو بخش دیتے ہیں (طنزیہ ہنسی) بھولے بادشاہ!

شاہ : نوروز ——— اسے زندان کی تاریک ترین ——— مگر نہیں، یہ ہمارا قاعدہ نہیں ہم بھٹک چلے تھے ——— نوجوان کیا آج سویرے تم قصر شاہی کے مشرقی دریچے کے نیچے پکڑے گئے تھے؟

پرویز : مجھے یہ علم نہیں کہ وہ دریچہ مشرقی تھا یا مغربی، کیونکہ اس وقت شش جہات نے سمٹ کر ایک مرکز قبول کر لیا تھا لیکن ایک دریچے کے نیچے مجھے پکڑا ضرور گیا۔

شاہ : کس جرم میں؟

پرویز : ابھی تک مجھے اپنے جرم کی نوعیت معلوم نہیں ہو سکی۔

راغب : عالی جاہ! اجازت ہو تو میں کچھ عرض کروں۔

شاہ : ہمارے محبوب مصور راغب کو اجازت ہے۔

پرویز : مصور کیا تم بھی مصور ہو؟

راغب : جب تم کو دریچے کے نیچے سے پکڑا گیا تو اس وقت دریچے میں کون تھا؟

پرویز : ایک لڑکی تھی جس کی آنکھیں نیلے سمندروں کی پناہ گاہیں معلوم ہوتی تھیں۔

عباس : حضور پُر نور ——— یہ آوارہ گستاخی کا مرتکب ہو رہا ہے۔

شاہ : ہم اس سے غافل نہیں عباس لیکن مجرم کو مفصل بیان کا حق پہنچتا ہے۔

راغب : کیا تمہیں معلوم تھا کہ وہ لڑکی کون ہے؟

شاہ : نہیں یہ سوال بے ہودہ ہے مملکت طغران میں ہر لڑکی کی عصمت ہماری امانت ہے۔

راغب : عالی جاہ! ہو سکتا ہے کہ یہ نوجوان سلطنت طغران کا باشندہ نہ ہو تو سے معلوم ہونا چاہئے کہ یہ شاہزادی بلقیس پر نگاہیں ڈالنے کا گنہگار ہے۔

پرویز : مجھے معلوم نہ تھا کہ دریچہ قصرِ شاہی کا تھا اور دریچے والی شاہزادی طلقیس تھی

شاہ : اور اگر تمھیں یہ معلوم ہوتا تو پھر بھی تم یہ جرأت کر سکتے تھے ۔

پرویز : حسنِ جہاں بھی ملے اور جس صورت بھی ملے فن کار کا اثاثہ ہے ۔

شاہ : تم فن کار ہو ؟

پرویز : میں مصور ہوں ۔

راغب : تم بھی مصور ہو ؟

شاہ : اور کیا تم جانتے ہو کہ مملکتِ طغران میں مصوری کا معیار کتنا بلند ہے ؟

پرویز : فنی کمال کا کوئی آخری نقطہ مقرر نہیں کیا جا سکتا ۔

شاہ : تم نے آج ہمارے جلال کو بُری طرح جھنجھوڑا تھا لیکن تمھارے فنکارانہ بھولے پن سے ہم اس قدر متاثر ہوئے ہیں کہ تمھیں بخش دینے کے بغیر چارہ نہیں ۔

عباس : شہنشاہ !

سیاس : آقائے عالی وقار !

شاہ : ہم نے عباس کو جو لفظ استعمال کرنے سے روکا تھا وہی بار بار ہماری زبان کی نوک پر تڑپ رہا ہے ہم مجبور ہیں کہ اس نوجوان مصور کو بے گناہ سمجھ کر آزاد کر دیں ، تم کیا سوچ رہے ہو راغب ؟

راغب : عالی جاہ کی وسعتِ جو دوسخا کو اپنے ذہن میں سمو لینے کی ناکام کوشش کر رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں عالی جاہ ! اگر کہیں اس نوجوان نے شاہ طغران کی فنی قدر دانی سے ناجائز فائدہ تو نہیں اٹھایا ——— کیا یہ سچ مچ کا مصور ہے یا بہروپیا ہے ۔

شاہ : ہاں ! تمھارے پاس اپنے مصور ہونے کا ثبوت ہے ؟

پرویز : میرا سارا وجود میری ساری شخصیت ، میری رگ رگ اور نس نس اس امر کا ثبوت ہے کہ میں مصور ہوں

شاہ : کوئی مرئی ثبوت پیش کرو ——— جیتا جاگتا ——— ٹھوس ثبوت ۔

پرویز : فن کو ٹھوس ایسے کرخت بولوں سے آلودہ نہیں کرنا چاہیے ۔

نقیب : ملاحظہ فرمایا عالی جاہ نے : یہ نوجوان صرف بن رہا ہے ۔

شاہ : وزیر اعلیٰ سیاس تمھارا کیا خیال ہے ؟

سیاس : مجھے اس نوجوان کے بیان پر شبہ ہے ۔

عباس : اور مجھے بھی حضور پُرنور ——— اس کے ماتھے اور کانوں اور گردن پر پھولتی جتنا یئں ۔ اس کی ادھ کھلی خطرناک آنکھیں ۔ اس کے مضبوطی سے جڑے ہوئے ہونٹوں کی طنزیہ تڑپ ۔ اس کی گردن کا فرعونی خم یہ سب باتیں اس امر کی شاہد ہیں کہ یہ معصوم نہیں ۔ کوئی جاسوس ہے یا محض آوارہ ———

پرویز : عباس ! ہم تم ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں ۔ لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا ہے ۔ جیسے میں تمھیں برسوں سے جانتا ہوں ۔ میں تمھارے دل کی کتاب کا مطالعہ کر رہا ہوں ۔ تم کسی گہرے روحانی صدمے سے دوچار معلوم ہوتے ہو ۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے ۔

شاہ : (قدرے غصے سے) ثبوت پیش کرو ۔

پرویز : احوصلے سے ، سرانجو یز کیجیے ۔

شاہ : (اچانک حیرت سے) لیکن تمھیں ثبوت پیش کرنے سے انکار کیوں ہے ۔

پرویز : وہ بادشاہ جس کی سلطنت پر وہ حکمران ہے ۔ اگر ایک سچے فنکار کے چہرے پر فنی جلال نہیں دیکھ سکتا تو اسے چاہیئے کہ وہ انسانوں کی برائی ، وحشی اختیار کرے اور تلوار کو میان سے آزاد کر کے اپنی زمین پر انسانی لہو کے گل بوٹے بنا دے ۔

شاہ : تم اپنے جرائم میں اضافے پر اضافہ کرتے جا رہے ہو ۔ ہمارے ہاں تلوار کی حیثیت ثانوی سہی ۔ لیکن ابھی اس کی دھار کند نہیں ہوئی ہاں یہ وہی تلوار ہے جو ہمارے اجداد کی گرفت میں آ کر چٹانوں تک کے کلیجے میں اتر گئی ہے ۔

پرویز : میں اپنے جرم کی سزا چاہتا ہوں ۔

شاہ : شاید تم اس بات سے بے خبر ہو کہ تمھارا جرم ہولناک ہے اور اس لیے اس کی سزا بھی ہولناک ۔

ہوگی ۔

پرویز : (تلخی سے) مجھے ہولناک سے ہولناک سزا قبول ہے لیکن میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اتنے بد مذاقوں کے ہجوم میں میرا مذاق اڑایا جائے ۔

شاہ : ہمیں تمہاری زبان درازی نے مجبور کر دیا ہے کہ ہم پھر سے تمہارے جرم کو ابتدا سے سنیں ۔

پرویز : میں ہر جواب کے لیے تیار ہوں ۔ اس گھٹے گھٹے سے ماحول سے مجھ کو جلد چھٹکارا ملنا چاہیے ۔

شاہ : اور اگر تمہیں اپنی زندگی ہی سے چھٹکارا دلایا گیا تو ؟

پرویز : موت اور حیات کا فاصلہ فنکار کے نزدیک ایک قدم سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا ۔

شاہ : (کڑک کر) تم نے شاہزادی کو دیکھا ——— ہماری بیٹی کو ؟

پرویز : میں نے ایک دریچے میں ایک لڑکی کو دیکھا تھا ——— میرے لیے ایک شہزادی اور ایک دیہقانی لڑکی ——— دونوں ہم پایہ ہیں کیونکہ دونوں عورتیں ہیں ۔

شاہ : کیا شہزادی نے بھی تمہاری طرف دیکھا تھا ؟

پرویز : ایک مرتبہ دیکھا اور پھر دیکھتی رہ گئی ۔

شاہ : کسے ؟

پرویز : مجھے ۔

شاہ : یہ غلط ہے ۔

پرویز : مجھے اس الزام کا ثبوت چاہیے ۔

شاہ : ہم کہتے ہیں تمہارا بیان غلط ہے ۔

عباس : اس کا ثبوت ۔ اس کا ثبوت یہ تلوار ہے (تلوار نکالنے کی آواز) جو تمہارے ———

شاہ : نہیں عباس ۔ تم خاموش رہو ۔ اس کا ثبوت خود بلقیس مہیا کرے گی بلقیس کو ہمارے حضور حاضر کیا جائے ۔

سپاہی : کھلے دربار میں جہاں پناہ ؟

شاہ : ہاں ستیاس ، یُوں کہ انصاف خلاؤں میں نہیں نپپ سکتا ۔ بلقیس کو حاضر کیا جائے ۔

ستیاس : پیغام بھجوا دیا گیا ہے جہاں پناہ !

شاہ : اور بلقیس کے بعد ہم اس نوجوان سے اس کے دعویٰ کا ثبوت مانگیں گے یقیناً یہ مصور نہیں ۔

عباس : اور عالی جاہ ! اگر یہ مصور ہو تب بھی اس کے جرم کی شدت میں کمی نہیں آسکتی ۔

شاہ : ہمارا محبوب مصور راغب اس کی مصوری کو پرکھ لے گا ۔

راغب : غلام ہر حکم کی تعمیل کرے گا ، ویسے اس نوجوان کی باتوں میں رنگوں اور خطوں کی دلآویز آمیزش ضرور جھلک رہی ہے ۔

عباس : عالی جاہ کو اس کا ثبوت چاہئے ۔ جھلکیاں حقیقت نہیں ہُوا کرتیں ۔

راغب : ہر جھلک حقیقت ہے عباس ۔ یہ فن کا راز ہے تلوار کا نہیں ۔

شاہ : ہمارے دربار کے آج آداب مجلس سے بیگانہ ہو چکے ہیں ۔ عباس اور راغب آپس میں گفتگو کرنے کی کس نے اجازت دی ؟ (خاموشی) ——— یہ معمہ ایسا نہیں کہ اس کا حل ڈھونڈنے کے لیے تم سب آپس میں دلیل بازی کرنے لگو ۔

ایک آواز : شہزادی بلقیس باریابی کی اجازت چاہتی ہیں جہاں پناہ ۔

شاہ : اجازت ہے ۔

بلقیس : (کچھ دُور سے) آداب بجالاتی ہوں ابا جان !

شاہ : اس وقت تم بادشاہ کے حضور میں ہو ۔ جہاں ذاتی جذبہ حکومت نہیں کرتا ۔ سامنے آجاؤ (خاموشی) ہم کہتے ہیں سامنے آجاؤ ۔

بلقیس : (قریب سے ۔ ڈرتے ڈرتے) جہاں پناہ !

شاہ : تم آج طلوعِ آفتاب کے وقت قصرِ شاہی کے مشرقی دریچے میں گئیں ؟

بلقیس : گئی تھی حضور !

شاہ : اور یہ نوجوان نیچے سے گذرا ؟

بلقیس : جی ہاں حضور !

شاہ : پھر کیا ہوا ؟ (خاموشی)

شاہ : (گرج کر) پھر کیا ہوا ؟

بلقیس : (ڈرتی ہوئی آواز میں) وہ جانے جاتے رُک گیا اور میری طرف دیکھنے لگا ۔

شاہ : اور پھر ؟

بلقیس : اور پھر دیکھتا رہا ۔

شاہ : کب تک ۔

بلقیس : جب تک شاہی مصور راغب نے اسے پکڑ نہ لیا

شاہ : اس کے بعد ؟

بلقیس : اس کے بعد ہجوم نے اسے گھیر لیا ——— اور سب تقاضا کرنے لگے کہ اس کی آنکھوں کو پھوڑ دینا چاہئے ۔ اتنے میں زنداں کے مہتمم نوروز ، ہاں پہنچ گئے اور اسے زدوکوب کیا ۔

شاہ : کس کے حکم سے ؟

بلقیس : یہ میں نہیں جانتی ابا جان ——— (ڈرکر) جہاں پناہ

شاہ : کس کے حکم سے نوروز ؟

نوروز : میں ضبط نہ کرسکا عالی جاہ ——— میں جان بخشی کا خواستگار ہوں ۔

پہرہ دار : زنداں کے مہتمم سے ضبط کی امید نہیں کی جا سکتی ——— اگر میری وجہ سے اس پر عتاب نازل ہو رہا ہے تو میں اعلان کرتا ہوں کہ مجھے اس کے خلاف کوئی شکایت نہیں ۔

شاہ : لیکن ہمیں شکایت ہے نوروز سے ——— کہ اس نے ابھی تک ہمارے عزیز ترین قانون کا احترام نہیں سیکھا ۔ مگر یہ فیصلہ بعد میں ہوگا ۔ پہلے ہمیں بلقیس سے تمام حالات پوچھ لینے چاہئیں ۔ ہاں تو بلقیس ! تم نے بھی اس کی طرف دیکھا ؟

بلقیس : (ڈرکر) ایک مرتبہ دیکھا تھا جہاں پناہ !

شاہ: اور پھر ——؟

طفیس: وہ پریشان ہو گیا عالی جاہ

شاہ: بیٹی! اس کے دریچے کے نیچے سے گزرنے اور راغب کی آمد تک تم اس کی طرف دیکھتی رہیں،

شہزادی: ہاں ابا جان!

شاہ: (غصہ کے لہجہ میں) کیا تم بھول گئی تھیں کہ تم طغرانی نسل کی آبرو ہو؟ کیا تم بھول گئی تھیں کہ طغرانی حوروں سے غیر مردوں کی نگاہوں کی زد میں آ کر اپنے اور دیکھنے والے کے سینوں میں خنجر بھونک دیتی ہیں۔ کیا تم بھول گئی تھیں کہ تم نے اس ماں کا دودھ پیا ہے جس نے خاسان کی سرحد پر طغرانی سپاہیوں کو پسپا ہوتے دیکھ کر دشمنوں کی صفیں زمین پر بچھا دی تھیں؟

طفیس: میں نے صرف حیرت سے دیکھا تھا جہاں پناہ —— کہ اس عجیب سے نوجوان کو میری طرف دیکھنے اور دیکھتے رہنے کی جرأت کیسے ہوئی؟

سیاس: یہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے عالی جاہ۔

شاہ: سیاس!

سیاس: یہ ایک غیر شعوری عمل ہے جہاں پناہ!

شاہ: سیاس!

راغب: شہزادی بے قصور ہے شہنشاہ۔

پرویز: جی ہاں! شہزادی بے قصور ہے اور اگر کوئی قصوروار ہے تو صرف پرویز جس نے شہزادی کو نہیں فن کو دیکھا جس نے شہزادی پر فنکار کی پاکیزہ ترین نگاہ ڈالی جس نے شہزادی کے پیکر میں ایک شاہکار کے خاکے کو مجسم پایا۔ شہزادی نے حیرت سے پرویز کو دیکھا اور دیکھتی رہی اس لئے وہ قصوروار ہے۔ پرویز نے احترام سے شہزادی کی طرف دیکھا اور دیکھتا رہا۔ اس لیے وہ گردن زدنی ہے کیا یہی ہے شاہ طغران کا انصاف جس کے ڈنکوں نے دنیا بھر کے کانوں کو بہرا کر رکھا ہے؟

سیاس: نوجوان!

شاہ : ہم حیران ہیں کہ اس عجیب و غریب مجرم سے کیا برتاؤ کریں؟

راغب : عالی جاہ کی اجازت ہو تو غلام کچھ عرض کرے۔

شاہ : ہاں ہاں، کہو راغب اور بلقیس بیٹی ادھر آ جاؤ۔ تم سے مخاطب ہوتے وقت ہم نے اپنے وجود کو دو شخصیتوں میں تقسیم کر لیا ہے۔

بلقیس : (روتے ہوئے) ابا جان!

شاہ : (تسلی دیتے ہوئے) ہم سمجھ رہے ہیں، بادلوں میں کبھی بجلیاں بھی گر پڑتی ہیں بیٹی! ہاں تو راغب کیا تجویز ہے تمہاری؟

راغب : جہاں پناہ! مجھے اس مصور سے مقابلے کی اجازت دی جائے۔

شاہ : مقابلہ؟

عباس : عالی جاہ! یہ غلام آپ سے وعدہ لے چکا ہے کہ عباس ہی اپنی تلوار سے —

راغب : نہیں نہیں وزیر زادے! آپ کو غلطی ہوئی ہے۔ مقابلہ رنگوں کی آمیزشوں اور خطوط کے خموں کے زور پر ہوگا۔ اور مجھے یقین ہے کہ میرے موقلم کی ایک ذرا سی جنبش اس نوجوان پر اپنی عافیت واضح کر دے گی۔ میں نے تصویر کے لبوں کے گوشوں پر کیلیں ابھارنے کے لیے مہینے اور مہینے صرف کئے ہیں، آنکھوں کی ایک ایک پلک سنوارنے کے لیے میں نے اپنی شاداب ترین راتیں لٹائی ہیں اور اس لڑکے کا اس کا تجربہ ہی کیا ہوگا؟

پرویز : (غصے میں) مجھے یہ مقابلہ قبول ہے اور میں شاہ طغران سے التجا کرتا ہوں کہ وہ اپنے سامنے اسی وقت اس مقابلے کی ابتدا کا اعلان کریں۔

شاہ : کیا نام ہے تمہارا؟

پرویز : پرویز۔

شاہ : پرویز۔ یہ کیا بات ہے کہ پہلے تو تم حد درجہ سہل انگاری کا ثبوت دے رہے تھے اور اب یکایک چمک اٹھے ہو؟

پرویز : پہلے میری شخصیت زیرِ بحث تھی، اب میرے فن پر حملہ ہوا ہے مگر میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ ہجوم میں سے جس نے میری تلقی مجھ سے چھینی ہے وہ لائے۔ راغب اسی وقت یہیں آپ کے سامنے اپنا سامان منگوائے اور ہمیں چند ملوں میں کسی چیز کا خاکہ اتارنے کا حکم دیا جائے۔

شاہ : راغب ——— تمہارا کیا خیال ہے؟

راغب : میں حاضر ہوں جہاں پناہ! مگر عالی جاہ کو تکلیف ہوگی انتظار سے۔

شاہ : نہیں ہم اس دوران میں رحمان سے ستار سنیں گے۔ تلقی کہاں ہے پرویز کی ———؟

نوروز : یہ حاضر ہے جہاں پناہ!

شاہ : نوروز۔ یہ تلقی پرویز کے حوالے کردو ——— راغب اپنا سامان منگوا لیجیے۔

راغب : سب سامان یہیں دربار میں موجود ہے عالی جاہ!

شاہ : اور تم دونوں ایک۔ ایک۔ (رک کر) بلقیس بیٹی ان مصوروں کو کوئی موضوع سمجھاؤ۔

بلقیس : ایک ——— ایک حیران چہرہ ———

پرویز : حیران چہرہ ——— کس کا چہرہ شہزادی؟

بلقیس : کسی کا بھی ہو۔

راغب : (اپنے آپ سے) ایک حیران چہرہ۔ مگر کس کا؟

شاہ : بلقیس نے تمہیں موضوع بتا دیا ہے۔ ہم اس چہرے کا صرف خاکہ دیکھیں گے۔ صرف خطوط دیکھیں گے۔ صرف خطوط۔ چند ہی ثانیوں کے بعد ہم طلب کریں گے رحمان اس دوران میں ستار بجائے گا۔

(رحمان ستار بجاتا ہے۔ چند لمحے ستار بجتا رہتا ہے)

شاہ : تمہیں کس چیز کی ضرورت ہے پرویز ——— رحمان ستار بند کرو۔

(ستار بند ہو جاتا ہے)

پرویز : مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں صرف آپ کے بلاوے کا انتظار ہے

شاہ : اور حیران چہرے کا خاکہ ؟

پرویز : تیار ہے ۔

شاہ : تیار ہے!

راغب : اتنی جلدی ؟ تم فن کے حضور میں گستاخی کے مرتکب ہو رہے ہو پرویز ۔

شاہ : مگر راغب ۔ تم بے شک مکمل کر لو اپنا خاکہ ۔

پرویز : خاکے مکمل نہیں ہوا کرتے شاہ طغران ـــــــ خاکے بنیادیں ہوتی ہیں اور بنیادوں کو دیکھ کر ایوانوں کا تصور کر لیا جاتا ہے ۔

شاہ : اپنا خاکہ ادھر لاؤ ۔

پرویز : راغب کو میرا خاکہ دکھایا جائے اور مجھے راغب کا خاکہ ۔ کیونکہ اگر ہم دونوں سچے فنکار ہیں تو کوئی ذاتی دلچسپی ہمارے فیصلوں میں حائل نہیں ہو سکے گی۔

شاہ : تم اپنے خاکے آپس میں بدل سکتے ہو۔

راغب : مگر عالی جاہ ۔ میں تو ابھی ـــــــ

شاہ : نہیں راغب خاکے بدلو ـــــــ

(وقفہ)

پرویز : راغب ۔ وزیر زادہ عباس کے حیران چہرے کا خاکہ اتارنے میں تم نے نفاست کا ضرورت سے زیادہ ثبوت دیا ہے ۔ شاید اس لیے کہ یہ وزیر زادے کا چہرہ ہے اور تمھارے دماغ پر وزیر اعلیٰ کے عتاب کا خوف سوار تھا ۔

شاہ : راغب ! تم کیا سوچ رہے ہو ۔ (خاموشی) ـــــــ راغب !

راغب : جہاں پناہ !

شاہ : کیا بات ہے ؟

راغب : مجھے اس سحر کار نوجوان ، اس جادو گر مصور کی زندگی کی بھیک مطلوب ہے جہاں پناہ !

شاہ: کیا مطلب ہے تمھارا؟ ہم کچھ نہیں سمجھے!

راغب: پرویز کی جان بخشی فرمائی جائے۔

شاہ: لیکن آخر کیوں؟

راغب: کیونکہ اگر پرویز مر گیا تو فن مر جائے گا، حسن لٹ جائے گا۔ صباحت دم توڑ دے گی۔

شاہ: مگر راغب تمھاری حیرت کا باعث؟

راغب: پرویز نے ایک حیران چہرے کا خاکہ نہیں اتارا۔ ساری دنیا کو ——— ساری کائنات کو ——— حیرت کے بھنور میں چھوڑ دیا ہے۔ اس کے بے پروائی سے کھنچے ہوئے خطوط نے جہاں حیرت کی شدت کا اعجاز پیدا کیا ہے، وہاں حسن بھی ہے۔ شوق بھی ہے زندگی کی دھڑکن بھی ہے اور دہشت کی اعلیٰ ادائیں اور یہ چہرہ ہے ——— یہ چہرہ ہے ———

شاہ: کس کا چہرہ ہے؟

راغب: اور یہ چہرہ ہے عالی جاہ ——— شہزادی بلقیس کا ملاحظہ فرمائیے ———

(ہجوم کی سرگوشیوں کی سرسراہٹیں شروع ہو جاتی ہیں)

عباس: یہ گستاخی ہے۔ صریحاً گستاخی ہے۔

سیاس: پرویز نے اپنی موت بلائی ہے۔

نوروز: اس کا سر قلم کر دینا چاہیے (سرگوشیاں رک جاتی ہیں)

شاہ: آفتاب مشرق سے طلوع ہوتے ہی پلک جھپکتے مغرب میں غروب نہیں ہو جاتا۔ ستارے اپنے مسجود کا طواف یکدم راہیں چھوڑ کر نہیں کیا کرتے۔ جذباتی تیزی ہمت کی کمی اور حوصلے کی خامی ہے اور شاید ہم اسے درباری بھول گئے ہیں کہ روح کے آبگینہ پن اور خیالات کی پاکیزگی کا سب سے بڑا ذریعہ ہم نے فن کو قرار دے رکھا ہے۔ یہ تصویر ——— یہ شعبدہ ——— یہ اعجاز اس امر کا ثبوت ہے کہ پرویز نے بلقیس پر بری نظریں نہیں ڈالیں

اور ہم پرویز سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ہم سے کوئی فرمائش کرے ——— ہم اسے قبول کرکے پرویز پر کوئی احسان نہیں دھریں گے۔ اپنے ہی جذبات کو تھپکیں گے۔

پرویز : مجھے یہ خاکہ واپس مل جانا چاہیے۔

شاہ : یہ کیسے ہوسکتا ہے پرویز؟ یہ یادگار ہمارے قصر کی رونق بڑھائے گی۔

پرویز : مجھے یہ خاکہ واپس چاہیئے!

شاہ : لیکن آخر کیوں؟

پرویز : میں اپنی زندگی کی عزیز ترین متاع کو مرمریں ایوانوں کی زینت نہیں بناؤں گا۔

راغب : اور ہمارے ہاں کا یہ قاعدہ ہے پرویز! کہ جو تصویر دربار میں اتاری جائے وہ شاہی ملکیت ہوتی ہے۔

پرویز : مگر میں درباروں اور جھونپڑوں کی حدبندیوں سے بلند ہوں مجھے میری تصویر واپس چاہیئے۔

شاہ : (غصے میں) شاید تم نے آج تک کسی شاہی دربار میں حاضر ہونے کی سعادت حاصل نہیں کی؟

پرویز : مجھے میری تصویر چاہیئے۔

شاہ : تم کو ایک مہینے کی مہلت دی جاتی ہے۔ ان تیس دنوں کے اندر اندر تم اپنے آپ سے فیصلہ کرو کہ تمہیں اپنی زندگی عزیز ہے یا یہ خاکہ، اور جب تم فیصلہ کرلو گے تو تمہاری تقدیر کا لکھا تمہیں سنایا جائیگا

پرویز : مجھے میری تصویر چاہیئے، شاہ طغران میں زندگی اور فن کو ایک ہی میزان میں تولنے کا عادی نہیں ہوں یہ فن کی بے حرمتی ہے۔

شاہ : راغب! یہ تصویر پرویز کے حوالے کردو۔ ایک مہینے کے بعد ہم یا تو اس سے یہ تصویر لیں گے یا اس کی زندگی؟

راغب : مگر عالی جاہ!

شاہ : یہ ہمارا اٹل فیصلہ ہے۔ اس دوران میں پرویز کو زندان کے کھلے اور روشن کمرے میں رکھا جائے اس کی بیقی اس سے نہ چھینی جائے۔ اس سے اچھا برتاؤ کیا جائے تاکہ یہ خوشگوار ماحول میں اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کرسکے۔

پرویز : فنکار کی عدالت میں فیصلوں کی نگرانیاں نہیں ہوا کرتیں تم سے بادشاہ!

شاہ : اسے لے جاؤ۔

نوروز : جہاں پناہ ۔۔۔ [قدموں کی چاپ ——— طبل پر زور کی چوٹ ——— بھاری قدموں کی چاپ ——— قفل کھولنے اور آہنی دروازہ کھلنے کی آواز]

نوروز : ابھی تک جاگ رہے ہو پرویز؟

پرویز : میری آنکھوں سے نیندیں اُٹھ چکی ہیں نوروز۔ میری ساری زندگی کی بیداریاں اور خواب ایک نقطے میں جمع ہو کر کھل گئے ہیں (آہ بھر کر) لیکن تم ان باتوں کو کیا سمجھو گے۔ تم جو زندان کے مہتمم ہو۔ آہنی دروازوں پر قفل چڑھانے اور زندان کی پتھریلی دیواروں کو بلند تر کرنے کے عادی ہو۔ تم کیا سمجھو گے یہ باتیں!

نوروز : لیکن مجھے تم سے محبت ہے پرویز۔ مجھے تمھاری جوانی سے محبت ہے۔ مجھے تمھاری زندگی سے محبت ہے۔

پرویز : اور نوروز ——— مجھے تمھاری انسانیت سے محبت ہے ——— انسانیت جو شاہی ایوانوں میں بیوہ کی حیثیت رکھتی ہے اور غریبوں کے جھونپڑوں اور زندان کی تاریکی میں سہاگن کی۔ تمھارے وجود میں سہاگن انسانیت مجسم ہو چکی ہے ——— شہزادی بلقیس کے خاکے کو میری خواہش کے مطابق سرحد طغران پر پہنچا دینا کوئی معمولی کارنامہ نہیں تھا ——— اور نوروز۔ کاش میں تمھارے اس احسان کے عوض تمھیں کچھ پیش کر سکتا ——— کاش! ———

نوروز : جو احسان بدلہ لینے کی خواہش سے کیا جائے وہ احسان نہیں پرویز۔ تجارت ہے اور میں تاجر نہیں ہوں۔ میں انسان ہوں۔

پرویز : تم انسان ہو۔ تم سچے انسان ہو اور میں خوش ہوں۔ کہ اس ایک مہینے کی قید کی آخری رات جب دم توڑ رہی ہے تو تم میرے سامنے موجود ہو۔ میرے دوست۔ میرے ساتھی۔ میرے رفیق!

نوروز : وہ خاکہ ابھی تک تمھیں یاد ہے پرویز؟

پرویز ۔ وہ ایک بنیاد تھی جس پر میں چاہتا تھا کہ ایک ایوان اُبھاروں ۔ وہ خاکہ اگر اس وقت میرے پاس ہوتا۔

نوروز : اور اب صبح کو جب جہاں پناہ تم سے آخری فیصلہ سننے آئیں گے تو ؟

پرویز : تو میں یہ خاکہ شاہزادی جقیں کے قدموں میں رکھ دیتا اور کہتا کہ اسے وہ جس کے وجود میں حسن و جمال کی تمام رعنائیاں، تمام کمال، تمام رعنایتیں مجسم ہو گئی ہیں ایک بیچے فن کار سے یہ تحفہ قبول کر

نوروز : جہاں پناہ کے سامنے ؟

پرویز : ہاں ، شاہ طغران کے سامنے ۔ فن کے بہت بڑے قدر دان کے سامنے۔ میری تمنا تھی کہ میرے ہاتھوں میں وہ خاکہ ہوتا ، میرے لبوں پر یہی باتیں ہوتیں اور شاہ طغران کے ہاتھوں میں تلوار ہوتی —— اور زندگی اور موت کے بہاڑ آپس میں ٹکراتے تو پرویز کے ہونٹوں پر اطمینان کی مسکراہٹ ہوتی اور چہرے پر ایک شہید کا جلال۔

(اچانک دور سے آوازیں آتی ہیں)

عباس : نوروز ؟ نوروز کہاں ہیں ؟ ارے بھئی ہم نوروز سے ملنا چاہتے ہیں ہم وزیر زادہ عباس ہیں ہمیں زندان کے منتظم سے ایک ضروری بات کہنی ہے —— نوروز —— نوروز ۔

نوروز ۔ وزیر زادہ عباس اس وقت ؟ (بلند آواز سے) آنے دو وزیر زادے کو

قدموں کی چاپ —— اسی دوران میں پرویز بولتا ہے)

پرویز : دنیا میں یہ پہلا وزیر زادہ ہے جس کی آنکھ طلوع آفتاب سے پہلے کھلی !

(آہنی دروازہ کھلنے کی آواز)

نوروز : آداب بجا لاتا ہوں ۔

عباس : معاف کیجیے گا نوروز ، ہم بے وقت آئے لیکن ہمیں پرویز سے خلوت میں چند باتیں کرنا ہیں —— تم پر سلامتی ہو پرویز !

پرویز ۔ خدا کا شکر ہے کہ مخلص ہے دولت کے سرور میں زندہ و سلامت ہے ویسے تمھارے آنے سے مجھے خوشی ہوئی ۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے نہ جانے کیوں ؟

وز : میں اجازت چاہتا ہوں۔

ویز : مگر نوروز! کسی کو معلوم نہ ہونے پائے۔ یہ مجھ پر تمھارا احسان ہوگا۔

(دروازہ بند ہونے کی آواز)

ویز : کھوجاس، کیسے آنا ہوا؟ اتنی رات گئے۔

اس : پو پھٹ چکی ہے۔

ویز : خوب۔ تو پو پھٹ چکی اور نیا دن طلوع ہو چکا۔ مگر تمھاری محبوبہ کہاں ہے؟

اس : میری محبوبہ ——————— کیا مطلب ہے تمھارا؟

ویز : تمھاری تلوار۔ جو ذرا سی بات پر میان سے اچھل اچھل پڑتی ہے۔

اس : وہ زنداں کے محافظوں کے پاس ہے۔ وہ کسی شخص کو ہتھیار اندر نہیں لانے دیتے۔ میں بڑی مشکلوں سے یہاں تک پہنچا ہوں۔

ویز : اگر برداشت کر سکو تو یہ کھٹولا حاضر ہے اس پر بیٹھو۔

اس : (بیٹھتے ہوئے) شکریہ!

ویز : تکلیف فرمائی کا سبب؟

باس : پرویز میرے اجنبی دوست میں آج تم پر ایک ایسا راز منکشف کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ اگر کسی اور کو معلوم ہو جائے تو میں اپنی ہی تلوار سے اپنا کام تمام کر دوں گا۔

ویز : لیکن میں نے تم سے یہ راز طلب نہیں کیا۔ اگر ایسی ہی بات ہے تو تم اپنے پاس محفوظ رکھو۔

اس : میں مجبور ہوں کہ تمھیں اپنا ہمراز بناؤں (دردناک لہجے میں) میں دکھی ہوں پرویز۔ تم میری محبت کے چاند پہ گہن بن کے چھا گئے ہو۔ میں نے کانٹوں اور انگاروں پر چل کر جو تھوڑا سا فاصلہ طے کیا تھا وہ میرے پاؤں تلے سے نکل کر میری طویل مسافت میں مل گیا ہے اور اس وقت میں اپنی منزل سے اتنا ہی دور ہوں جتنا پہلے روز جب میں نے ——— جب میں نے

ویز : جب تم نے؟

عباس: جب مَیں نے شاہزادی بلقیس کو دریچے میں دیکھا تھا!

پرویز: تم نے؟

عباس: ہاں مَیں نے پرویز! اس وقت سورج طلوع ہو رہا تھا اور شہابی رنگ کی شعاعوں نے شہزادی کے چہرے پر گلال چھڑ رکھا تھا وہ مجھے ایک مجسم شعلہ نظر آئی۔ اور شاہزادی کے بال کھلے تھے اور وہ افق کو تک رہی تھی اور میں شاہزادی کو تک رہا تھا۔

پرویز: اس کے بعد؟

عباس: اس کے بعد مَیں نے شاہزادی کے قریب ہونا چاہا اور ہوتا کیا مگر اچانک کہیں سے تم آگئے اور یوں آئے جیسے نودمیدہ کلیوں کی پھلواری میں ایک بگولا گھس آئے۔ جیسے ننھے ننھے نقرئی چراغوں کے ہجوم میں ہوا کا ایک جھونکا ناچنے لگے۔

پرویز: مَیں تمھارا مطلب نہیں سمجھا عباس!

عباس: بلقیس ایک فن پرست انسان کی بیٹی ہے اور اس نے فن کی محبت وراثت میں پائی ہے اس نے مجھے صاف الفاظ میں بتا دیا ہے کہ وہ پرویز کی موجودگی میں، یا تمھاری موجودگی میں کسی دوسرے انسان کا تصور تک بھی نہیں کر سکتی۔

پرویز: مگر مَیں نے تو ————

عباس: ہاں ہاں! تم نے تو کچھ نہیں کیا۔ اپنے آپ ہو گیا یہ سب کچھ ———— لیکن پھر بھی میں تم سے بھیک مانگنے آیا ہوں۔ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں اور کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے مَیں تمھارے سامنے اپنا دامن پھیلاتا ہوں اور مجھے اُمید ہے کہ تم جو ہر انسان سے محبت کرنے کے دعویدار ہو، مجھے خالی ہاتھ نہیں لوٹاؤ گے۔

پرویز: لیکن مَیں کیا خدمت کر سکتا ہوں تمھاری؟ میرے پاس یہ چند مُوقلم ہیں یا یہ رنگوں کی پیالیاں!

عباس: وعدہ کرتے ہو؟

پرویز: وعدہ کرتا ہوں۔

عباس : وہ خاکہ بادشاہ کے حوالے کرنا۔

پرویز : مگر میں مرجاؤں اور تمہارے لیے میدان خالی کرجاؤں۔

عباس : نہیں ہماسے بادشاہ تلوار کا کم استعمال کرتے ہیں وہ تمہیں بخش دیں گے بس اتنا ہوگا کہ تمہیں مملکت طغران سے باہر چلے جانے کو کہہ دیں گے اور اس طرح میرے اجنبی دوست میری محبت کا چاند گہن سے نکل آئے گا اور جب یوں ہوگا (دور سے تیز تیز پاؤں کی چاپ) اور جب یوں ہوگا ———————

(چاپ، قریب آجاتی ہے)

نوروز : (سرگوشی میں) عباس ! عباس ! باہر آجاؤ ! نکل آؤ باہر۔ ورنہ تمہارا راز فاش ہوجائے گا۔ شہزادی بلقیس آرہی ہیں

عباس اور پرویز : شہزادی بلقیس ؟

نوروز : عباس کیا سوچ رہے ہو ؟

عباس : (ہوے ہوے دور جاتے ہوئے) شاہزادی بلقیس آرہی ہیں۔ یہاں ! زندان میں ! پرویز کے پاس ! شاہزادی بلقیس !

(دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز)

پرویز : اچھا تو بلقیس کو آخری وقت میرے پاس بھیج کر شاہ طغران میری موت کو ایک عذاب بنانا چاہتا ہے۔

(دروازہ کھلتا ہے)

پرویز : تشریف لائیے شاہزادی صاحبہ ——————— آیئے ! — (خاموشی)

پرویز : میں حیران ہوں کہ آپ سے اس مڑے تڑے کھٹولے پر بیٹھنے کے لیے کیسے کہوں ؟

بلقیس : پرویز !

پرویز : شاہزادی !

بلقیس: تم میرے مقروض ہو۔

پرویز: شاہزادی۔

بلقیس: تم میرے مقروض ہونا؛ تم نے میرے چہرے کو اپنے خاک کا پس منظر بنایا تھا؛

پرویز: پس منظر! آپ کا چہرہ وہی تو تھا جس نے اس خاک کو آسمان پر بٹھا دیا۔

بلقیس: تو پھر تم میرے مقروض ہونا؟

پرویز: مقروض ہوں؟

بلقیس: میرا قرض ادا کرو۔

پرویز: جی!

بلقیس: میرا قرض ادا کرو۔

پرویز: وہ کیسے؟

بلقیس: وہ خاکہ مجھے دیدو۔

پرویز: خاکہ؟

بلقیس: ہاں وہ خاکہ مجھے دیدو۔ کیونکہ پرویز ——— پرویز (آواز بھرا جاتی ہے) میں بھی یاد رکھوں گی کہ میرے آسمانِ زندگی پر بھی ایک چاند اُبھرا تھا۔

پرویز: خاکہ۔ شاہزادی؟

بلقیس: میں اسے اپنی امانت سمجھ کر اپنے سینے سے لگائے رکھوں گی ہمیشہ۔ کیونکہ پرویز ——— تم نے ——— تم نے ———

پرویز: میں لٹ چکا ہوں شاہزادی

بلقیس: کیا؟

پرویز: خاکہ میرے پاس نہیں۔

بلقیس: تمھارے پاس نہیں؟ تو پھر کس کے پاس ہے۔

پرویز : یہ نہیں بتا سکتا۔ لیکن مجھے دکھ ہے کہ وہ اس وقت میرے پاس کیوں نہیں۔ شاہزادی!
تم نے خزاں سے پھول طلب کئے ہیں تم نے صحرا سے پانی مانگا ہے۔

بلقیس : مگر آخر کہاں ہے وہ خاک؟ ———— وہ خاک جس سے مجھے تمہاری زندگی
خریدنا تھی جس سے مجھے اپنی اُمیدوں کے گلزار سجانا تھے جس کے بل بوتے پر مجھے تمہیں چھیننا
تھا موت کے ہاتھ سے۔ بادشاہت کے ہاتھ سے ——— ساری دنیا کے ہاتھ سے۔

پرویز : شاہزادی! ——— آداب شاہزادی ———!

بلقیس : آداب (دروازہ زور سے کھلتا ہے۔ بلقیس چیخ مارتی ہے)

(خاموشی)

شاہ : (گرج کر) بلقیس ——— سپنولی ——— کٹنی ——— تم یہاں ——— تم
یہاں۔ ہم نہیں جانتے تھے کہ ہم آستین میں سانپ پال رہے ہیں۔ ہمیں معلوم نہ تھا کہ جو پھول
ہمارے گلزار میں کھلا ہے وہ اصل میں زہر کی پڑیا ہے۔ تم نے ہماری صدیوں کی آبرو کو مٹی میں
ملا دیا۔ تم نے آلِ طغران کے ماتھے پر لعنتیں لکھ دی ہیں تم نے ہمارے ناموس کا گلا گھونٹ
دیا ہے۔

بلقیس : ابا جان ——— ابا جان ——— مَیں تو یہاں!

شاہ : ہم کچھ نہیں سننا چاہتے۔ ہم اپنی تلوار سے رعایا کے سامنے تمہاری گردن اُتاریں گے۔ تاریخ
بلبلا اُٹھے گی کہ ایک بادشاہ نے اپنی بیٹی کے خون سے ہاتھ رنگ لیے اور طغرانیوں کا سر
فخر سے اُونچا ہو جائے گا کہ ان کے ایک بادشاہ نے اُن کی آبرو اور عزت کی قربان گاہ پر اپنی
بیٹی کو بھینٹ چڑھا دیا ———

سیاس : مگر جہاں پناہ!

شاہ : ہم کچھ نہیں سننا چاہتے سیاس!

سیاس : جان بخشی چاہتا ہوں جہاں پناہ۔ شاہزادی سے زندان میں آنے کا سبب تو پوچھ لیا جائے۔

شاہ : جب سورج نکل آئے تو کسی سے یہ پوچھنا کہ اس وقت دن ہے یا رات - پچپن سے ہم اندھے نہیں :

سیاس : پھر بھی جہاں پناہ !

شاہ : بلقیس - سیاس پوچھتے ہیں تم یہاں کیوں آئیں ؟

بلقیس : انسانی زندگی کی قیمت مصوری کے ایک شاہکار اور شاعری کے ایک معجزے سے کہیں زیادہ ہے - جہاں پناہ - یہ سبق آپ ہی نے مجھے سکھایا تھا اور مجھے اس بے قصور نوجوان پر رحم آیا تھا اور میں اس سے التجا کرنے آئی تھی کہ وہ خاکہ میرے حوالے کر دے اور اپنی جوانی پر رحم کھائے - میں ایک انسان کو خودکشی سے بچانے آئی تھی ابا جان ! —— جہاں پناہ —— !

سیاس : شاہزادی بے قصور ہے جہاں پناہ !

شاہ : وہ خاکہ کہاں ہے ؟

بلقیس : میرے پاس نہیں -

شاہ : وہ خاکہ کہاں ہے پرویز ؟

پرویز : میرے پاس نہیں -

شاہ : تو پھر کس کے پاس ہے ؟

پرویز : میں نہیں جانتا - لیکن اگر وہ خاکہ اس وقت میرے پاس ہوتا تب بھی وہ آپ کو نہ ملتا -

شاہ : مگر وہ ہے کہاں ؟

پرویز : میں نہیں بتا سکتا !

شاہ : پرویز ! ہم نے میان سے تلوار نکالے بغیر سلطنتیں جیتیں - ہم نے خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر کروڑوں انسانوں کی قسمتوں کے فیصلے کئے - ہمارے ماتھے پر جب شکن آئی تو زمین کی طنابیں تن گئیں - اور جب ہم نے اپنا ہاتھ اٹھایا تو دنیا نے آسمان کے چیخنے کی آوازیں سنیں اور تم —— ایک آوارہ چھوکرے —— تم ہمارے منہ آتے ہو ؟

ذرہ طوفان کا مقابلہ کرتا ہے۔ قطرہ سمندر سے اُلجھ کر سر پٹک رہا ہے۔ زاغ شاہین پر جھپٹنے کو تلا ہوا ہے؟ ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے اور اب ہم فیصلہ کرتے ہیں کہ ہماری روحانی قوتیں تمھیں راہِ راست پر لانے میں ناکام رہیں اب جسمانی طاقت تمھاری زبان سے تمام رس چوس لے گی (تلوار میان سے نکالنے کی آواز) اب بتاؤ وہ خاکہ کہاں ہے؟

بلقیس: (چیخ کر) ابا جان!

سیاس: تلوار؟ شاہِ طغران کے ہاتھ میں تلوار!

شاہ: تم خاموش رہو سیاس۔ اس وقت ہمیں کسی صلاح کار کی ضرورت نہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ ایک سر پھرا چھوکرا ہمارے جاہ و جلال سے کھیلتا پھرے ——— وہ خاکہ کہاں ہے پرویز؟

پرویز: وہ میرے پاس نہیں!

شاہ: تو پھر کہاں ہے؟

پرویز: میں نہیں بتا سکتا۔ لیکن اگر میرے پاس ہوتا، تب بھی وہ اس ہاتھ میں نہیں دیا جا سکتا جس نے تلوار تھام رکھی ہے، وہ ایک اور شخصیت کا حق تھا جس نے اسے تخلیق کیا جس نے اس میں زندگی بھر دی اور اس وقت۔۔

شاہ: خاکہ لاؤ

پرویز: نہیں ہے!

شاہ: ہم کہتے ہیں خاکہ لاؤ!

پرویز: نہیں ہے شاہ طغران!

شاہ: ہم آخری حکم دیتے ہیں۔ خاکہ لاؤ!

پرویز: نہیں شاہ ———

(بادشاہ کی تلوار پرویز کو دوسرا لفظ نہیں کہنے دیتی اس کے گلے

(صورت کی خرخراہٹ کی آواز آتی ہے اور شاہزادی زور کی چیخ
مارتی ہے :)

بلقیس : ابّا جان ! آپ قاتل ہیں ۔ آپ خونی ہیں آپ ______

(بہت سے قدموں کی چاپ ۔ جو بھاگتے ہوئے آتے ہیں)

عباس : عالی جاہ ____ عالی جاہ ۔ شاہ خاسان کا ایلچی ابھی ابھی آیا ہے ۔ یہ صندوقچہ لیے وہ اتنی تیزی سے آیا ہے کہ جب اس نے گھوڑے کو روکا ، تو لڑھک کر دور جا گرا اور خود اس کا جسم ٹھنڈے پسینے سے شرابور ہو رہا ہے وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ شاہِ خاسان کا پیغام پہنچانے میں ایک لمحہ کی تاخیر بھی نہ ہو ۔

شاہ : سیاس ! اسے کھولو ، اور بتاؤ کہ وہ کیا کہتا ہے ۔

عباس : پرویز ! پرویز کو کس نے ذبح کر دیا ۔ کس نے مارا ہے پرویز کو ؟ میں پوچھتا ہوں کون قاتل ہے پرویز کا ؟

سیاس : خاموش رہو عباس ______ عالی جاہ نے خود ______ (انتہائی حیرت سے) ارے ______ ۔ جہاں پناہ یہ دیکھیے یہ دیکھیے !

شاہ : وہی حیران چہرے کا خاکہ ! یہ کیا ہو رہا ہے ۔ کائنات گھومنے لگی ہے ۔ ہماری آنکھیں اندھی ہو رہی ہیں ۔ ہمیں تھامو ۔ ہمیں تھامو !

بلقیس : ابّا میاں !

سیاس : شاہ خاسان لکھتے ہیں عالی جاہ !

شاہ طغران نے صوبہ ریاض کا فیصلہ کرنے کے لیے ہم سے فنی مقابلے کی ٹھانی ۔ شاید شاہ طغران کو یہ معلوم نہیں کہ ہمارے ہاں کے مُوقلم تلواروں کے سائے میں پروان چڑھتے ہیں اور اسی لیے ہم نے اپنے ایک نوجوان مصور پرویز ، ایک آوارہ فن کار کی صورت میں مملکت طغران پر فنی فتح حاصل کی ۔ اس کا ثبوت ہم اس نامہ کے ساتھ بھجوا رہے ہیں اور شاہِ طغران کو مشورہ

دیتے ہیں کہ وہ ہمارے فاتح کو زندان سے آزاد کرکے سو بیاض پر سے حریفانہ نگاہیں اٹھالے!

بلقیس: (چیخ کر) ابا جان! ——— ابا جان!

سیاس: کیا ہو گیا جہاں پناہ کو؟

شاہ: (انتہائی ماندگی سے) شاہ عاسان نے ہمارے منہ پر ایک زنانے کا تھپڑ مارا ہے اور خود اس سحر کار، اس جادوگر مصور کی جان لے کر ہم نے اپنی ہی انسانیت کا منہ نوچ لیا ہے ہم شکست خوردہ ہیں۔ ہمارا فن شکست خوردہ ہے۔ ہماری بادشاہت شکست خوردہ ہے ہماری آدمیت شکست خوردہ ہے

(تھکی ہوئی سانسیں)

نوروز: جہاں پناہ کا غلام نوروز اپنے شہنشاہ سے پرویز کی میت کی بھیک مانگتا ہے۔

شاہ: پرویز کو شاہی قبرستان میں ہمارے پہلو میں دفن کیا جائے۔

بلقیس: ابا جان! (روتی ہے)

شاہ: اب ہم تھک چکے ہیں۔ اپنے ہی ارادوں اور تمناؤں کی لاشوں کے بوجھ سے ہماری کمر ٹوٹ چکی ہے۔ ہم پر فن اور اس کی عظمت کا سورج غروب ہو چکا ہے۔ ہماری زندگی کی رات رنگین ہوتی آرہی ہے۔ جھٹپٹے سے پہلے ہمیں وہ خاکہ دکھاؤ ——— کہاں ہے وہ خاکہ ———

بلقیس: یہ آپ کے سامنے ہے ابا جان!

شاہ: اسے قریب لاؤ ——— اور قریب لاؤ ——— قریب لاؤ۔

(ساز کے دردناک سُر ابھر کر ہوے ہوے مدھم پڑتے ہوئے رک جاتے ہیں ——— !)

پردہ

چھوٹے میاں

اصغر بٹ

کردار

بڑے میاں :

نثار احمد : اُن کا لڑکا

سعید ہاشمی : نثار احمد کا دوست

چھوٹے میاں : سعید ہاشمی کا لڑکا

جُمّن : نثار احمد کا مُلازم

(شام کا وقت ہے۔ ایک کمرہ۔ دائیں اور بائیں جانب دروازے ہے۔
کمرے میں بائیں طرف پلنگ۔ کمرے کے درمیان ایک تخت جس پر نرم گدا اور
چاندنی دائیں جانب دو آرام کرسیاں اور اُن کے سامنے ایک چھوٹی سی میز
جس پر اُردو کا اخبار رکھا ہوا ہے۔ درمیانی تخت پر ایک سفید ریش بزرگ بیٹھے
پیچوان کے کش لگا رہے ہیں پرانی وضع کے آدمی معلوم ہوتے ہیں عمر کوئی پینسٹھ
برس کی ہوگی، لیکن صحت اچھی ہے اس وقت قدرے برہم ہو رہے ہیں۔ اٹھ کر
بائیں دروازے کی طرف جاتے ہیں)

بڑے میاں۔ (آواز دے کر) انجمن انجمن۔ کمبخت شام کے ساڑھے پانچ ہو گئے، چائے کب آئے گی؟

(دائیں جانب سے نثار احمد ہاتھ میں چائے کی ٹرے لیے داخل ہوتا ہے۔
عمر کوئی پینتیس برس ہوگی۔ سفید پتلون، کیلوں والا کالر اور کالی نکٹائی پہن رکھی ہے
معلوم ہوتا ہے ابھی ابھی کچہری سے آیا ہے)

نثار احمد: آداب اباجان۔ انجمن کو کنیزہ کی امی نے کسی کام سے باہر بھیجا ہے۔

بڑے میاں: (مڑتے ہیں) آؤ نثار۔

نثار احمد: میں نے ابھی ابھی چائے بنی ہے گرم ہی ہے۔

(چائے کی ٹرے درمیانی تخت پر رکھ دیتا ہے۔

بڑے میاں: میاں تم آج کل کے لونڈے جاتے بیویوں سے کیوں دبتے ہو تا، کنیزہ کی ماں نے باہر بھیجا، ہے تو میاں کنیزہ کی ماں سے کہا ہوتا، اب چائے کا وقت ہے ملازم کا باہر جانا ٹھیک نہیں۔

نثار احمد: میں ابھی ابھی کچہری سے آ رہا ہوں وہ میرے آنے سے پہلے جا چکا تھا اور مجھے گھر پہنچتے ہی چائے

مل گئی۔

بڑے میاں: اور میں چار بجے سے انتظار کر رہا ہوں۔

نثار احمد: تو منگوا لیتے آپ۔

بڑے میاں: یہ گھر والوں کو خود خیال چاہیئے، ذرا ذرا سی چیز اب مانگنے دوڑیں (آکر تخت پر بیٹھ جاتے ہیں) میاں تم بھی

(نثار تھکا ہوا دائیں جانب آرام کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

اس سے تو بہتر یہ تھا کہ میں اوپر کی چھت والا کمرہ لے لیتا، وہیں سے جمن کو آواز دی اور چیز منگوالی۔

(چائے کی چینک کو ہاتھ لگا کر دیکھتا ہے وہ اتنی گرم ہے کہ جلدی سے ہاتھ ہٹاتے ہی بنتی ہے پھر پیالی میں چائے انڈیلتا ہے)

نثار احمد: ابا جان! آج سعید ہاشمی آ رہا ہے۔

بڑے میاں: کون سعید ہاشمی؟

نثار احمد: کالج میں میرے ساتھ تھا آج کل راولپنڈی میں جج ہے۔

بڑے میاں: خوب بڑی خوشی کی بات ہے! (اطمینان سے چائے کا گھونٹ پیتا ہے)

نثار احمد: اس کا ایک مقدمہ ہے، میں اس کی پیروی کر رہا ہوں۔

بڑے میاں: مفت؟

نثار احمد: جی نہیں ہاشمی اس کے پیسے پیشگی دے چکا ہے۔

بڑے میاں: ایسے دوست آجکل کم ہی ملتے ہیں ورنہ دوستی میں لوگ لاکھوں کا کام نکلواتے ہیں نیک آدمی معلوم ہوتا ہے۔

نثار احمد: جی ہاں، اسی لیے میں نے اُسے اپنے ہاں ٹھہرنے کو کہا ہے۔

بڑے میاں: (چونک کر) کیا؟ اپنے ہاں؟

نثار احمد: جی ہاں، وہ اتنی دُور سے آ رہا ہے، مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ اُسے ہوٹل میں ٹھہرایا جائے۔
بڑے میاں: لیکن اپنے ہاں جگہ کہاں ہے؟
نثار احمد: میں سوچ رہا تھا کہ ________
بڑے میاں: میں جانتا ہوں اُوپر چھت پہ ایک کمرہ خالی ہے لیکن راستہ زنانخانے سے جاتا ہے غیر آدمی کو وہاں کیسے ٹھہرایا جاسکتا ہے۔
نثار احمد: جی نہیں، میرا خیال تھا ________
بڑے میاں: باقی رہ جاتا ہے تمہارا دفتر۔ اگر اس میں مہمان ٹھہراؤ گے تو کام کیسے چلے گا، بیسیوں ملاقاتیوں کا آنا جانا لگا ہی رہتا ہے۔
نثار احمد: جی ہاں ٹھیک فرمایا آپ نے، میرا خیال تھا کہ آپ اگر ________
بڑے میاں: کیا؟
نثار احمد: اُوپر والا کمرہ اچھا خاصہ ہوا دار ہے جس کو بُلانے میں بھی آسانی رہے گی۔ اور ________
بڑے میاں: میں اسی میں جاؤں، ہنونہہ! کیوں؟
نثار احمد: پھر انھیں کہاں ٹھہرایا جائے۔
بڑے میاں: اپنے دفتر میں ٹھہرا لو۔
نثار احمد: لیکن بیسیوں ملاقاتی۔ اور آنا جانا تو لگا رہتا ہے۔
بڑے میاں: ایسے ملاقاتی کون سے لیے انگریز کے بچے ہیں!
نثار احمد: لیکن اباجان دفتر میں انھیں ٹھہرانا مناسب نہیں وہ خود بھی بُرا مانیں گے میرے دوست سہی لیکن میجر ہیں اور میرے موکل بھی ہیں۔
بڑے میاں: تمھیں دوستوں کے بُرا ماننے کا خیال ہے اور بوڑھے باپ کا خیال نہیں کہ دن بھر سیڑھیاں چڑھتے اترتے کیا حالت ہوگی، پھر سیڑھیاں کمبخت ایسی خراب ہیں کہ اُس روز گرتے گرتے بچا۔
نثار احمد: اچھا تو ایک دن کے لیے آپ تکلیف کر لیجیے، کل سے میں انھیں کسی ہوٹل میں ٹھہرا دوں گا۔

بڑے میاں : میں ایک منٹ کے لیے نہیں جاؤں گا۔ تم ایک دن کو کہہ رہے ہو۔

نثار احمد : مصیبت یہ ہے کہ انھیں چار دن بعد کو آنا تھا۔ آج یکایک ان کا تار آ گیا کہ وہ آ رہے ہیں۔

بڑے میاں : لعنت ایسے دوستوں پر !

نثار احمد : اب شام ہو رہی ہے اور وہ آیا چاہتے ہیں۔

بڑے میاں : جہنم میں جائیں۔

(دوسرے کمرے میں گھنٹی بجتی ہے۔)

نثار احمد : یہ لیجیے وہ آ گئے ! (نثار احمد جلدی سے دائیں طرف نکل جاتا ہے)

بڑے میاں : جاؤ چلتا کرو انھیں، وہاں جان بہت دیکھے ایسے دوست !

(اطمینان سے چائے پیتا ہے اور پھر خالی پیالی ٹرے میں رکھ دیتا ہے)

(دائیں جانب سے نثار احمد اور سعید ہاشمی داخل ہوتے ہیں۔ سعید ہاشمی فوجی وردی میں ہے اور ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بیگ ہے قریباً نثار احمد کا ہم عمر ہے پیچھے پیچھے کوئی چودہ برس کا لڑکا داخل ہوتا ہے)

نثار احمد : (تعارف کراتے ہوئے) یہ ہیں ابا جان۔

سعید ہاشمی : میرا نام سعید ہاشمی ہے (بڑھ کر بڑے میاں سے ہاتھ ملاتا ہے جو بدستور تخت پر بیٹھے ہیں اور پھر لڑکے کی طرف اشارہ کر کے) اور یہ میرا لڑکا ہے۔

لڑکا سب کی طرف پیٹھ کیے اردو کا اخبار دیکھ رہا ہے قمیض اور نکر پہن رکھی ہے چھوٹی جرابیں سمٹ کر ٹخنوں پر اکٹھی ہو گئی ہیں، پاؤں میں فل بوٹ ہیں لمبی لمبی دبلی ٹانگیں، زرد رنگ، آنکھوں پر موٹا سا چشمہ، لڑکے کی ہیئت عجیب خبطی فلاسفروں کی سی ہے)

لڑکا : (مڑ کر) آداب !

بڑے میاں : کیا نام ہے تمہارا چھوٹے میاں؟

لڑکا: گھر میں مجھے سب ننھا کہتے ہیں ویسے چھوٹے میاں بھی ٹھیک ہے۔

(اخبار لے کر ایک آرام کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

بڑے میاں: جیتے رہو، جیتے رہو۔ (سعید ہاشمی سے مخاطب ہو کر) بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر، میاں معاف کرنا میں اٹھ نہیں سکتا، میرے ٹخنے میں موچ آگئی ہے۔

نثار احمد: (قدرے حیرانی سے) لیکن اباجان ابھی تو آپ کا ٹخنہ اچھا بھلا تھا۔

بڑے میاں: ہاں تم کمرے سے نکلے تو میں یہاں سے اٹھا کہ سعید صاحب کے لیے کمرہ خالی کر دوں بس اٹھنا قیامت ہو گیا ——— پٹھے پر پٹھا آگیا۔ اوئی۔ ———

(تکلیف سے سہلاتا ہے۔)

سعید ہاشمی: نہیں کوئی بات نہیں، آپ تشریف رکھیے، میں رات دیر میں سوتا ہوں، اس وقت تک ضرور ٹھیک ہو جائے گا۔

بڑے میاں: کبھی ٹخنے کے مریض رہے ہیں آپ؟

سعید ہاشمی: جی نہیں کبھی اتفاق نہیں ہوا۔

بڑے میاں: جبھی میاں یہ درد تو دونوں چلتا ہے مجھ سے پوچھو جو اکثر اس نامراد مرض کا شکار رہتا ہوں

سعید ہاشمی: اچھا!

بڑے میاں: بڑا موذی مرض ہے اوئی (نثار احمد تخت پر بیٹھ کر آہستہ آہستہ ٹخنہ سہلاتا ہے)

سعید ہاشمی: خدا بخشے ابا مرحوم کو لدھیانے میں ایک مرتبہ گھٹیا شروع ہوا تو ——— "

بڑے میاں: (یکایک) کون ہاشمی لدھیانے والے؟

سعید ہاشمی: جی ہاں ابا وہاں سکول ٹیچر تھے؟ آپ کی ملاقات تھی اُن سے۔

بڑے میاں: اسے وہ تو اپنے یار غار تھے۔ اکٹھے اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، ہنسنا بولنا، تو آپ ان کے نور نظر ہیں؟

نثار احمد: آپ کب گئے تھے لدھیانے اباجان؟

بڑے میاں : (نثار احمد سے) دیکھنا میاں ذرا ہٹیلے وہ مالش کا مرہم تو لانا۔ یہ درد! اُف!
نثار احمد : جی بہتر۔

(اُٹھ کر بائیں جانب سے نکل جاتا ہے)
(سعید ہاشمی تخت پر اُن کے قریب ہی بیٹھ جاتا ہے لڑکا کرسی پر بیٹھ کر
منہ کے سامنے اخبار تانے پڑھ رہا ہے۔)

سعید ہاشمی : پاؤں دباؤں آپ کا؟
بڑے میاں : جی نہیں شکریہ! دبانے سے یہ کمبخت کہاں ٹھیک ہوتا ہے۔
سعید ہاشمی : (لڑکے کی طرف دیکھتے ہوئے) ننھے ادھر آؤ، بڑے میاں سے ملے نہیں تم؟
بڑے میاں : بڑا ہونہار لڑکا معلوم ہوتا ہے جیتا رہے ماشاء اللہ! کیوں چھوٹے میاں کیا دیکھ رہے ہو؟
(چھوٹے میاں اخبار رکھ کر اٹھتے ہیں آنکھوں پر چشمے کو درست کرتے ہیں)
چھوٹے میاں : رشتوں کا کالم دیکھ رہا تھا۔
بڑے میاں : (چونک کر) کیا؟
چھوٹے میاں : ایک ضرورتِ رشتہ تھا۔ بڑی ہونہار لڑکی کے لیے۔ لڑکی کی عمر چودہ سال خانہ داری
میں طاق، ریڈیو لگا سکتی ہے، سینما دیکھ سکتی ہے، جہیز میں ریڈیو ملے گا۔ لڑکے کی طرف سے سینما
ملنا چاہیے (باپ کی طرف دیکھتے ہوئے) ڈیڈی آپ سینما دلوا سکتے ہیں ہیں؟
سعید ہاشمی : دیکھو ننھے اوٹ پٹانگ باتیں نہیں کرو۔ بڑے میاں ناراض ہوں گے تم نے یہاں آنے
سے پہلے وعدہ کیا تھا تم ایسی باتیں نہیں کرو گے؟
چھوٹے میاں : (گویا اکتا کر پھر اسی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) ڈیڈی یہ اُردو اخبار بڑے بور ہوتے ہیں۔
(نہایت بے پروائی سے اُردو کا اخبار لے کر پھر پڑھنا شروع کرتا ہے)
بڑے میاں : بڑا ہونہار بچہ ہے۔ بالکل اپنے دادا پر گیا ہے، ہاشمی لدھیانے والے، کیا کہنے
تھے اُن کے!

سعید ہاشمی : تعجب ہے اباجان نے کبھی تذکرہ نہیں کیا آپ کا

بڑے میاں : اجی صاحب! وہ باتیں فسانہ ہوگئیں کیا بتائیں اب۔ ہائے کیا زمانے تھے وہ بھی ہاشمی صاحب،
اور ہم اور ہاشمی صاحب،

سعید ہاشمی : (سوچتے ہوئے) اجی۔

بڑے میاں : آپ تو اپنے بچے ٹھہرے ہیں نے نشاط سے کہا کہ میاں بھائی کے دوست ہیں ٹھہرائو انہیں اپنے
یہاں، مکان تنگ ہو، دل تنگ نہیں ہونا چاہیئے، کیوں صاحب؛

سعید ہاشمی : جی ہاں بجا ارشاد ہُوا۔

بڑے میاں : اور آپ کے آنے سے پہلے میں یہ کمرہ خالی کرنے ہی والا تھا کہ ہُوا درد —— اُوئی۔

سعید ہاشمی : میں تختہ سہلا دوں ذرا؛

بڑے میاں : نہیں شکریہ۔ بھائی بڑھاپا ہے اٹھنے بیٹھنے سے لاچار ہیں۔ ہاں میں کیا کہہ رہا تھا؛

سعید ہاشمی : آپ اس ذکر کو چھوڑیے۔ آرام فرمایئے آپ۔

بڑے میاں : (چہرے کے سامنے سے اخبار ہٹاکر) آپ کہہ رہے تھے کہ آپ کمرہ خالی کر دیتے۔

سعید ہاشمی : (چُپ تھے)

بڑے میاں : نہیں نہیں، ٹوکو نہیں ماشاءاللہ بڑا ہونہار بچہ ہے۔ خیر تو یہ تختہ بھی حادثہ ہی ہوگیا، ورنہ
ہو جاتا کمرہ خالی، اب ہوٹلوں میں ——————

سعید ہاشمی : نہیں کوئی مضائقہ نہیں۔ نشاط آجائے میں ابھی چل کر کمرہ بک کرتا ہوں۔

بڑے میاں : مجھے آپ کی تکلیف کی بہت فکر ہے۔ آپ ٹھہرے ہاشمی کے نورِ نظر۔

سعید ہاشمی : نہیں نہیں، کوئی بات نہیں۔ آپ کی ذات گرامی میرے لیے اتنی ہی قابل احترام ہے جتنی کہ نشاط کیلئے۔

بڑے میاں : یہ عنایت ہے آپ لوگوں کی۔ لاکھوں میں ایک ہوتا ہے جس کے دل میں بزرگوں کی عزت
ہوتی ہے ورنہ، یہ زمانہ تو عجیب اوندھا آگیا ہے۔

سعید ہاشمی : سچ فرمایا آپ نے۔ ہماری اپنی اولاد ہے سامنے بیٹھ کر منہ چڑاتی ہے۔

بڑے میاں: (بے خیالی میں) ماشاء اللہ ماشاء اللہ (پھر چونک کر) ای معاف فرمائیے اللہ نہ کرے اللہ نہ کرے۔

چھوٹے میاں: (چہرے کے سامنے سے اخبار ہٹا کر) ڈیڈی میں نے پروفیسر فرائڈ کی ایک کتاب میں دیکھا تھا کہ بچپن میں ارسطو بھی پنے آبا کا منہ چڑایا کرتا تھا

بڑے میاں: (چین بہ جبیں) برخوردار مجھے ارسطو کے والد ماجد سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ لیکن یقیناً وہ گدی قسم کے بزرگ ہوں گے۔

(نثار احمد ہاتھ میں تھرمس کی شیشی لیے داخل ہوتا ہے)

نثار احمد: یہ لیجئے ابا جان!

بڑے میاں: لاؤ۔ میاں بس تسلی ہے دل کی۔ ورنہ میں جانتا ہوں کہ دانتوں میں نہیں جائے گا یہ موذی!

(پاس تخت پر رکھ دیتا ہے)

سعید ہاشمی: ہاں آپ اسے ذرا لگائیے اور میں نثار کے ساتھ جا کر ہوٹل وغیرہ میں کمرہ دیکھتا ہوں۔

بڑے میاں: جی معاف کرنا (اٹھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن پھر بیٹھ جاتا ہے) اوئی!

(ٹانگ تھام لیتا ہے)

سعید ہاشمی: نہیں نہیں آپ تشریف رکھیے۔ ہمیں کوئی تکلیف نہیں ہم ابھی آتے ہیں۔ ننھا آپ کے پاس رہے گا۔

بڑے میاں: شوق سے، شوق سے۔ ویسے آپ صاحبزادے کو کسی مقصد سے لائے تھے؟

سعید ہاشمی: جی ہاں یہاں کے ماہر نفسیات سے ملوانا ہے اس عمر میں بچہ ایسا ذہین ہوتا نہیں۔

بڑے میاں: ماشاء اللہ ماشاء اللہ!

نثار احمد: چلیے یہاں ہوٹلوں میں بے حد رش ہے اتنے کم نوٹس پر مشکل ہی ہے کمرہ۔

سعید ہاشمی: چلیے کوشش تو کریں۔

بڑے میاں: ابھی مل جائے گا؟

(سعید ہاشمی اور نثار احمد دائیں جانب سے نکل جاتے ہیں)

(چھوٹے میاں بدستور اخبار دیکھ رہے ہیں بڑے میاں ان کی طرف گھورتے ہیں چند لمحوں کے لئے بالکل خاموشی چھا جاتی ہے)

بڑے میاں: دیکھو میاں صاحبزادے بڑوں کی موجودگی میں یوں اخبار پڑھنا بدتمیزی ہے

(لڑکا اخبار پڑھ رہا ہے لیکن بڑے میاں کی طرف نہیں دیکھتا)

چھوٹے میاں: لیکن میں دادا ابا کے سامنے تو نہیں بیٹھ کر اخبار پڑھا کرتا تھا۔

بڑے میاں: سنو میاں تمہارے دادا ابا چھ تھے

چھوٹے میاں: اسوچتے ہوئے) میرا بھی یہی خیال ہے۔

بڑے میاں: (چونک کر) کیا؟

چھوٹے میاں: جب آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے تو وہ دادا ابا کی طرح ہو جاتا ہے۔

بڑے میاں: (غصے سے) کیا مطلب تم ہم پر فقرے چست کر رہے ہو؟

چھوٹے میاں: جی نہیں، میں تو آپ سے باتیں کرنے کی کوشش کر رہا ہوں آپ خود ہی تو کہتے ہیں اخبار نہ پڑھو۔

بڑے میاں: (نرم ہو کر) ہاں ٹھیک ہے اچھا یہ بتاؤ تم کون سی جماعت میں پڑھتے ہو۔

چھوٹے میاں: نویں جماعت میں۔

بڑے میاں: خوب اور تمہیں مطالعے کا بے حد شوق ہے۔

چھوٹے میاں: جی ہاں، میں نے کالج کی سب کتابیں پڑھ ڈالی ہیں

بڑے میاں: ایسی کیسی کتابیں؟

چھوٹے میاں: ہر قسم کی کتابیں۔

بڑے میاں: مثلاً فلسفے کی۔

چھوٹے میاں: جی ہاں!

بڑے میاں: اور ڈاکٹری کی؟

چھوٹے میاں : جی ہاں۔

بڑے میاں : اچھا بتاؤ، میرے نسخے میں کون سا درد ہے؟

چھوٹے میاں : یہ درد ڈاکٹری کی کتابوں میں نہیں ہے۔

بڑے میاں : کیا؟

چھوٹے میاں : میرا خیال ہے، یہ درد کا بہانہ ہے۔

بڑے میاں : کیا مطلب؟

چھوٹے میاں : یعنی جب تک ہم یہاں ہیں یہ درد ہے، ہم چلے گئے تو یہ درد بھی چلا جائے گا۔

بڑے میاں : تم سمجھتے ہو میں جھوٹ کہہ رہا ہوں۔

چھوٹے میاں : جی نہیں۔

بڑے میاں : پھر کیا مطلب؟

چھوٹے میاں : میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ آپ کو میری وجہ سے کوئی مجبوری نہ ہو، آپ اٹھ کر چلنا پھرنا چاہیں تو چل پھر لیں۔

بڑے میاں : (سوچتے ہوئے) تمھارا خیال ہے ضروری نہیں کہ درد کی ٹیس لگاتار رہے، بیچ میں ایسا وقت بھی آتا ہے کہ محسوس ہوتا ہے گویا درد ہے ہی نہیں۔ حکیم بوعلی سینا کے ایک پرانے نسخے میں بھی ایک ایسی ہی بیماری کا تذکرہ ہے۔ (چھوٹے میاں کی طرف دیکھ کر) دراصل کسی زمانے میں مجھے خود حکمت سے شغف رہا ہے۔ خیر تم کیا سمجھو گے ان باتوں کو، بچے ہو ابھی، لیکن سچ پوچھو تو میں محسوس کر رہا ہوں کہ میں چل پھر سکتا ہوں۔ (اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے، آواز دیتا ہے) جمن! جمن!

جمن : جی!

بڑے میاں : کہاں تھے اب تک؟

جمن : بی بی نے لخلخہ لانے کے لیے بھیجا تھا۔

بڑے میاں : لخلخہ؟ کس لیے؟

جمّن : کہہ رہی تھیں کل انھیں غش آئے گا۔

بڑے میاں : (حیرت سے) تو انھیں آج ہی سے کیسے علم ہوا؟

جمّن : آج مہمان آ رہے تھے نا!

بڑے میاں : چُپ احمق! چل یہ جوٹھے کے برتن اٹھا کے لے جا (چھوٹے میاں کی طرف دیکھ کر) کیوں میاں کچھ پیو گے؟

چھوٹے میاں : جی ہاں! اگر آپ کہتے ہیں تو!

بڑے میاں : ہاں ہاں شوق سے تکلف کی ضرورت نہیں کیا پیو گے؟

چھوٹے میاں : تھینچی سگریٹ منگا لیجئے۔

بڑے میاں : لاحول ولا قوۃ!

جمّن : (ہنستا ہے) ہی ہی ہی۔

بڑے میاں : (ڈانٹ کر) چپ رہ کیا بن مانس کی طرح دانت نکال رہا ہے۔ چل سمیٹ برتن اور دفعہ ہو جا۔

(جمن جلدی سے ٹرے اٹھا کر چلتا ہے) ہاں اور دیکھ کر چلم لے جا ٹھنڈی ہو گئی ہے۔

(جمن ٹرے میں ہی حقّے کی چلم رکھ کر نکل جاتا ہے)

چھوٹے میاں : آپ نے خواہ مخواہ زحمت کی، میں حقّہ نہیں پیتا۔

بڑے میاں : ارے کس احمق نے تمہارے لیے چلم منگائی ہے۔ (تخت پر دوبارہ بیٹھ جاتا ہے) میں تمبا کو نوشی کو بہت بُرا سمجھتا ہوں۔

چھوٹے میاں : آپ حقہ نہیں پیتے؟

بڑے میاں : میں تو پیتا ہوں میرا مطلب ہے کہ چھوٹوں کو نہیں پینا چاہیے۔

چھوٹے میاں : کیوں؟

بڑے میاں : کم از کم بڑوں کے سامنے نہیں پینا چاہیے۔

چھوٹے میاں : لیکن آخر کیوں؟

بڑے میاں: کم از کم بڑوں کے سامنے نہیں پینا چاہیے

چھوٹے میاں: لیکن آخر کیوں

بڑے میاں: (جھنجھلا کر) بدتمیزی ہے

چھوٹے میاں: اور جو بڑے چھوٹوں کے سامنے پیتے ہیں؟

بڑے میاں: میاں صاحبزادے تم نے پڑھ لکھ ڈالا ہے بڑے بڑے ہیں چھوٹے چھوٹے ہیں آداب محفل حفظ مراتب اخلاق و اطوار یہ بھی علم ہیں جن میں تم بالکل کورے ہو

چھوٹے میاں: ہم نے تو یہ پڑھا ہے کہ اگر کوئی چیز بری ہے تو سب کے لیے بری ہے اور اچھی ہے تو سب کے لیے اچھی۔ بڑے چھوٹے کا فرق نہیں ہے۔

بڑے میاں: تم نے غلط پڑھا ہے بالکل غلط پڑھا ہے۔

چھوٹے میاں: کیسے؟

بڑے میاں: مثلاً اب اگر پوچھوں کہ کیا پیو گے اور تم کہو وسکی تو منگوا دوں کیا؟

چھوٹے میاں: جی نہیں!

بڑے میاں: پھر؟

چھوٹے میاں: (کھڑے ہو کر سگریٹ سے انگڑائی لیتا ہے) یہ وقت نہیں ہے اس کا، میں وسکی کھانے کے بعد پیتا ہوں۔

بڑے میاں: (بھونچکا رہ کر) کیا کہا؟ تم اسکی بھی پیتے ہو؟

چھوٹے میاں: اپنے وقت پر

بڑے میاں: لاحول ولا قوۃ، ارے میاں تمہارے بڑوں نے تمہیں کیا تعلیم دی ہے

چھوٹے میاں: کچھ نہیں۔

بڑے میاں: وہ تو ظاہر ہی ہے۔

چھوٹے میاں: میں انہیں تعلیم دیتا ہوں۔

بڑے میاں: کیا کہا؟

چھوٹے میاں: اب ابّا جان کو پڑھا تا ہوں اس سے پہلے دادا جان کو پڑھایا کرتا تھا۔

بڑے میاں: تم دادا جان کو پڑھایا کرتے تھے؟

چھوٹے میاں: جی ہاں!

بڑے میاں: تم کیا پڑھاتے تھے اُن کو؟

چھوٹے میاں: مثلاً اقبال کا فلسفہ

بڑے میاں: تو کیا وہ خود پڑھے لکھے نہیں تھے؟

چھوٹے میاں: (معصومیت سے) تھے تو لیکن بس آپ جتنا۔

بڑے میاں: (تیزی سے) کیا کہا؟ یعنی تم ہمیں جاہل سمجھ رہے ہو؟

چھوٹے میاں: (طمانیت سے) جی ہاں۔

بڑے میاں: (چونک کر) ہیں؟ کیا کہا:

چھوٹے میاں: اچھا بتلایئے، اس شعر کا کیا مطلب ہے؟

جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا   وہ عالمِ پیر مر رہا ہے

بڑے میاں: (حقارت سے) اے میاں کے دانت ہیں تمھارے منہ میں؟ منہ سے دودھ کی بو آ رہی ہے

تم ہمارا امتحان کیا لوگے؟

چھوٹے میاں: دادا جان بھی یہی کہا کرتے تھے:

بڑے میاں: ارے کیا دادا جان دادا جان لگا رکھی ہے کیا تھے تمھارے دادا جان اور کیا ہو تم!

کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ؟

چھوٹے میاں: آپ غالباً ہمارے دادا جان کو نہیں جانتے۔

بڑے میاں: میں جاننا چاہتا بھی نہیں۔

چھوٹے میاں: لیکن آپ ابّا جان سے کہہ رہے تھے کہ آپ انکو جانتے تھے۔

بڑے میاں: (فوراً سنبھل کر) وہ کوئی اور ہوں گے، ہاشمی لدھیانے والے تمہارے دادا جان بھی اگر تمہاری طرح کے بزرگ تھے تو مجھے خوشی ہے کہ میں اُن سے نہیں ملا۔

چھوٹے میاں: جی نہیں، وہ میری طرح بالکل نہیں تھے وہ اَبّا جان کی طرح تھے، ایک فرق تھا۔

بڑے میاں: کیا؟

چھوٹے میاں: وہ اَبّا جان سے عمر میں ذرا بڑے تھے۔

بڑے میاں: تو کیا مطلب؟ وہ اپنے بیٹے سے چھوٹے کیسے ہو سکتے تھے یعنی عجیب بے معنی بات کر رہے ہو۔

چھوٹے میاں: آپ نے بات پُوری نہیں سُنی۔ میں کہنے والا تھا۔ لیکن عقل میں چھوٹے تھے۔

بڑے میاں: یہ بات بھی بے معنی ہے۔

چھوٹے میاں: آپ نے فارسی پڑھی ہے۔

بڑے میاں: کیوں کیا بات ہوئی؟

چھوٹے میاں: ایک مثل ہے "بزرگی بہ عقل است نہ بسال"

بڑے میاں: اجی سب لغو ہے۔ عمر تجربہ سکھاتی ہے اور تجربے سے عقل آتی ہے۔ کتابیں پڑھنے سے عقل نہیں آتی۔

چھوٹے میاں: (دوبارہ کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) اچھا آپ بتائیے آپ کو تجربے نے کیا سکھایا ہے۔

(بائیں جانب سے جمن ہاتھ میں چلم لیے داخل ہوتا ہے اور پیچوان پر رکھ دیتا ہے)

جُمن: جی۔ بی بی پوچھ رہی ہیں کہ یہ جو مہمان آئے ہیں ان کے لیے کمرہ خالی کر رہے ہیں آپ؟

بڑے میاں: چلو چلو جاؤ کام کرو اپنا۔

جُمن: لیکن بی بی سے کیا کہوں؟

بڑے میاں: کہہ دو میں خالی نہیں کر رہا کمرہ۔

(پیچوان کا کش لگاتا ہے)

جمن : تو پھر ان کو کہاں ٹھہرائیں گے ؟ اوپر والے کمرے میں ۔

بڑے میاں : جاؤ کیا مغز چاٹ رہے ہو ؟ مجھے نہیں معلوم !

جمن : لیکن اس کمرے کی سیڑھیاں تو زنان خانے سے جاتی ہیں ۔

بڑے میاں : (اُٹھ کر گرجتا ہے) جاتا نہیں یا بھی ۔

(جمن گھبرا کر ایک جانب سے نکل جاتا ہے ۔ بڑے میاں غصہ سے
ادھر اُدھر ٹہلتے ہیں)

بڑے میاں : کیا زمانہ آگیا ہے ! میرا ایسے غیرے کو جرأت ہوگئی ہے کہ بڑوں کے منہ آتا ہے ۔ اپنی اوقات
نہیں پہچانتا ۔ بزرگوں کا پاسِ ادب نہیں آنکھوں میں شرم نہیں ۔ حیا اُٹھ گئی ہے ۔

چھوٹے میاں : یہ حیا کیا چیز ہے ؟

بڑے میاں : (آنکھیں نکال کر) یہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن مجھے یہ معلوم ہے کہ بے حیائی کیا ہے ؟ اور وہ
تمہاری گفتگو میں صاف نظر آرہی ہے ۔

چھوٹے میاں : (بے نیازی سے) یہ تعریف منفی انداز کی ہے ۔ اس کا مثبت پہلو بتائیے ۔

بڑے میاں : ارے کیا ہے مثبت منفی ۔ جمع تفریق ! تم انسان ہو یا لگڑ بگڑ !

چھوٹے میاں : آپ کی غلط فہمی ہے ۔ یہ تمام انسان دراصل گوریلے کی ایک قسم سے بنے ہیں لگڑ بگڑ کوئی انسان
نہیں بنا ۔ مصیبت یہ ہے کہ آپ کی اکثر معلومات ناقص ہیں ۔ آپ نہ اقبال کا فلسفہ جانتے ہیں ، نہ
ڈارون کو جانتے ہیں ۔ اب آپ بتائیے آپ کا علم صحیح ہے یا میرا ؟ تجربے سے انسان دنیا میں
سب باتیں تھوڑے ہی سیکھ سکتا ہے ؟

بڑے میاں : (غصے کے گھونٹ پی کر بیٹھ جاتا ہے) تجربے نے کم از کم یہ سکھا دیا ہے کہ بے وقوفوں سے
بحث نہیں کرنی چاہئے ۔

(تھوڑی دیر خاموشی رہتی ہے ، پھر بڑے میاں پیچوان کا کش لگاتے
ہیں چھوٹے میاں جیب سے چاکلیٹ نکالتے ہیں)

چھوٹے میاں: (چاکلیٹ پیش کرتے ہوئے) کھائیے گا؟

بڑے میاں: (اکڑتے ہوئے) اُوں ہوں۔

چھوٹے میاں: (خود ٹکیہ منہ میں ڈال لیتا ہے) آپ نے کبھی چاکلیٹ کھائی؟ (بڑے میاں کی طرف سے خاموشی) بڑی لذیذ چیز ہے اور کم از کم اس میں ایک فائدہ ہے کہ نکوٹین کی طرح زہریلی نہیں، آپ جانتے ہیں نکوٹین کیا چیز ہے؟

بڑے میاں: (گھور کر) اسے میاں تم سے خاموش نہیں بیٹھا جاتا؟

چھوٹے میاں: میرا تو کچھ نہیں گیا، لیکن آپ بے چارے ابھی زہر پی گئے۔

(اخبار اٹھا کر دیکھنا شروع کر دیتا ہے)

بڑے میاں: (چونک کر) زہر ——

(چھوٹے میاں کی طرف سے خاموشی)

بڑے میاں: کون سا زہر؟

چھوٹے میاں: (اخبار رکھ کر پھر بڑے میاں سے مخاطب ہوتا ہے) یہ حقہ جو آپ پی رہے ہیں اس میں زہر ہے

بڑے میاں: تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ اس میں زہر ہے۔

چھوٹے میاں: ڈاکٹروں نے دریافت کیا ہے کہ تمباکو کے دھوئیں میں ایک چیز ہوتی ہے جس کو نکوٹین کہتے ہیں یہ ایک قسم کا زہر ہے جو آہستہ آہستہ پھیپھڑوں کو ناکارہ کر دیتا ہے۔

بڑے میاں: (قہقہہ لگا کر) ہاہا۔ ڈاکٹر! جاہل کہیں کے۔

(پیچوان کا کش لگاتا ہے، سانس اٹک جاتا ہے اور کھانستے کھانستے اٹھ کھڑا ہوتا ہے)

بڑے میاں: یہ زہر ہے!

چھوٹے میاں: (جل کر) جی نہیں آبِ حیات ہے۔

(بڑے میاں پیچوان اٹھا کر منہ کے قریب لے جاتے ہیں لیکن پھر سوچ کر رکھ دیتے ہیں۔ کچھ لمحے خاموشی)

بڑے میاں: (گویا اپنے آپ سے) پرانی کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک وزیر نے اپنے شہنشاہ کو تمباکو میں
زہر دے دیا۔ لیکن شہنشاہ ایک کشتہ کھایا کرتا تھا جس سے اس زہر کا اثر نہیں ہوا (کچھ سوچ کر چھوٹے
میاں سے مخاطب ہوتے ہیں) ہم نے سنا ہے کہ فرنگی ڈاکٹروں نے چند ایسے نسخے بنائے ہیں جن سے
بڈھے جوان ہو جاتے ہیں۔

چھوٹے میاں: جی ہاں انھیں بندر کے غدود لگا دیئے جاتے ہیں۔

بڑے میاں: (گھبرا کر) نہیں نہیں، میرا مطلب بندر کے غدودوں سے نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ بعض
دوائیاں وغیرہ ایسی ہیں جن کے کھانے سے ———— یعنی بڑھاپا اتنا محسوس کم ہوتا
ہے۔ ویسے مجھے ذاتی طور پر ان سے کوئی دلچسپی نہیں۔ بس تفریحاً پوچھ رہا ہوں۔

چھوٹے میاں: جی ہاں ایسی دوائیاں ہیں۔

بڑے میاں: (دلچسپی سے) تم نے کسی کتاب میں بھی دیکھا یا محض سنی سنائی بات ہے؟

چھوٹے میاں: جی ہاں، میں نے خود کتابوں میں ان کے نام دیکھے ہیں۔

بڑے میاں: (ذرا اشتیاق سے) مثلاً تمہیں کچھ یاد ہے۔

چھوٹے میاں: آپ کو اتنی دلچسپی کیوں ہے؟

بڑے میاں: (جلدی سے) نہیں نہیں نہیں۔ مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ جیسے ہی اپنے علم کے لیے پوچھ رہا
تھا (تخت پر بیٹھ جاتا ہے اور کچھ سوچ کر) کیا تمہارے دادا نے یہ دوائیاں خود بھی آزمائی تھیں؟

چھوٹے میاں: میں کہہ نہیں سکتا۔ دادا جان میں عقل کی کمی تھی۔

بڑے میاں: یعنی کیا؟ اس بات سے عقل کی کمی کا کیا واسطہ؟

چھوٹے میاں: مثلاً سب سے پہلی بات یہی تھی کہ وہ آپ کی طرح ایک بند کمرے میں بیٹھے رہتے تھے۔ تازہ ہوا
سے محروم رہتے تھے۔

بڑے میاں: میری طرح کیا مطلب؟ میں کون سے بند کمرے میں رہتا ہوں؟

چھوٹے میاں: (اٹھ کر ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاتا ہے) اب سوائے ان دو دروازوں

کہ اس کمرے میں نہ کوئی کھڑکی ہے نہ روشندان۔

بڑے میاں: تو پھر کیا ہُوا؟

چھوٹے میاں: (ناک سکیڑ کر سر کھجاتے ہوئے) چنانچہ اس کمرے میں کاربن ڈائی آکسائڈ زیادہ ہے اور آکسیجن کم۔

بڑے میاں: (کچھ بے یقینی سے ہنس کر) ارے بھائی سب ڈھکوسلے ہیں۔

چھوٹے میاں: (واپس اپنی کرسی کے قریب آکر کھڑا ہو جاتا ہے) اسی چیز کے بارے میں میں نے کہا تھا کہ عقل کی کمی ہے۔

بڑے میاں: (چونک کر) بڑے گستاخ ہو تم۔

چھوٹے میاں: یہ مجھے اس لیے کہنا پڑا کہ مغربی ڈاکٹروں نے جوان بننے کے نسخے لکھے ہیں اس میں آکسیجن ایک نہایت ضروری حصہ ہے۔ ورنہ آپ جانتے ہیں میں بڑوں کا بے حد ادب کرتا ہوں

بڑے میاں: (بے یقینی سے) ہاں یہ تو ہے اور آکسیجن کہاں ملتی ہے؟

چھوٹے میاں: اونچی جگہ پر۔

بڑے میاں: مثلاً پہاڑ پر؟

چھوٹے میاں: ہاں اور اُوپر کی چھت کے کمروں میں بھی مل سکتی ہے۔

بڑے میاں: (داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) خوب!

چھوٹے میاں: اور جوان بنانے کے علاوہ سب سے بڑی بات یہ کہ ہاضمے کو ٹھیک کرتی ہے۔

بڑے میاں: تو تمہارے دادا جان نے یہ نسخہ نہیں آزمایا۔

چھوٹے میاں: جی نہیں اور چنانچہ اُن کی عمر دس سال کم ہو گئی۔

بڑے میاں: دس سال۔

چھوٹے میاں: پورے دس سال۔ وہ اسّی برس کی عُمر میں فوت ہوئے۔ میں نے حساب لگایا اُن کی عمر نوّے سال تک آسانی سے جا سکتی تھی۔

بڑے میاں: تو انہیں آکسیجن کھانے پر کیا اعتراض تھا؟

المس

چھوٹے میاں: کوئی خاص اعتراض نہیں تھا، کیتے مجھے سیڑھیاں چڑھنے اترنے میں تھک جاؤں گا۔

بڑے میاں: واہ، یہ تو اُن کی نفوسی دلیل تھی۔

چھوٹے میاں: جی ہاں، لیکن ضد کا کوئی علاج بھی تو نہیں۔

بڑے میاں: اس سوچتے ہوئے، تو آکسیجن کے ساتھ کچھ اور دوا بھی کھانی پڑتی ہے۔

چھوٹے میاں: جی ہاں دوا کے بغیر تو کام نہیں چلتا۔

بڑے میاں: میں بھی سوچ رہا تھا کہ آکسیجن سے انسان کیسے جوان ہو سکتا ہے۔

چھوٹے میاں: (تائیدی مسکراہٹ) آپ کا خیال بالکل ٹھیک ہے۔

بڑے میاں: تم اپنے ساتھ وہ کتاب لائے ہو؟

چھوٹے میاں: لایا تو ہوں لیکن وہ لاطینی ہے؟

بڑے میاں: پھر تو بڑی دقت ہوتی ہوگی اُسے پڑھنے میں؟

چھوٹے میاں: اجی نہیں، (چٹکی بجاکر) ایسے پڑھتا ہوں۔

بڑے میاں: خوب! (اُٹھ کر) میں یہ سوچ رہا ہوں کہ مجھے میاں سے جن کو بلانے میں کافی تکلیف ہوتی ہے:

چھوٹے میاں: ظاہر ہے آپ کو گلا پھاڑ کر پکارنا پڑتا ہے، اور جتنا آپ گلا پھاڑتے ہیں اتنی ہی زیادہ اس کمرے کی کاربن ڈائی آکسائیڈ آپ کے پھیپھڑوں میں چلی جاتی ہے۔

بڑے میاں: تمھیں ہم نے گھر تو دکھایا ہی نہیں (چھوٹے میاں کو بازو سے پکڑ کر) چلو آؤ دکھاؤں!

چھوٹے میاں: چلیے!

بڑے میاں: اوپر کی چھت پر ایک کمرہ ہے ——————

(دونوں بائیں جانب سے نکل جاتے ہیں، تھوڑی دیر کے لئے کمرہ خالی رہتا ہے، پھر دائیں جانب سے تھکے ہوئے نثار احمد اور ان کے پیچھے سعید ہاشمی داخل ہوتے ہیں۔ نثار احمد تخت پر بیٹھ جاتا ہے اور سعید ہاشمی کرسی پر)

نثار احمد: مجھے تو پہلے ہی معلوم تھا کہ کمرہ نہیں ملے گا۔

سعید ہاشمی : لیکن تعجب ہے کہ بوڑھوں میں اتنا رش ہے۔

نثار احمد : (یکایک اِدھر اُدھر دیکھ کر) یہ ابا میاں کہاں گئے ؟

سعید ہاشمی : ننھے جی تو غائب ہے۔

نثار احمد : خیر اِدھر اُدھر ہو گئے ہوں گے ـــ کیا خیال ہے آپ کا بستر یہ برابر والے دفتر میں لگوا دوں۔

سعید ہاشمی : آپ کے دفتر کا کام چوپٹ ہو جائے گا اور پھر وہاں کوئی غسل خانہ بھی نہیں !

نثار احمد : ہاں یہ تو ہے ، اس کمرے کے ساتھ غسل خانہ بھی ہے۔ (یکایک چونک کر) اسے ابا میاں تو کہہ رہے تھے کہ ان کے ٹخنے میں موچ آگئی ہے وہ کیسے گئے ؟

سعید ہاشمی : ان سے واقعی اٹھا نہیں جاتا ؟ (کچھ سوچ کر) میرے لونڈے کی شرارت نہ ہو اس میں کہیں۔

نثار احمد : (حیرت سے) شرارت ؟

سعید ہاشمی : اوہ ! یہ بچہ ایک فتنہ ہے میرے دوست تو اس سے پناہ مانگتے ہیں۔

نثار احمد : لیکن بھائی ٹخنے کی موچ میں اس کی شرارت کیا کرے گی ؟

سعید ہاشمی : ارے بھائی ! وہ تو لنگڑوں کو نچوا دیتا ہے۔

نثار احمد : کیا مطلب ؟

سعید ہاشمی : کوئی ایک واقعہ ہو تو بتاؤں !

نثار احمد : مثلاً

سعید ہاشمی : مثلاً میرے ایک بزرگ ، عمر رسیدہ معزز قسم کے آدمی کافی عرصے کے بعد ملنے کے لیے آئے میں گھر پر نہیں تھا ، یہ برخوردار اُن کو اپنے کارنامے سنانے لگا کہ میں سگریٹ پیتا ہوں اور میرا مشغلہ یہ ہے کہ بوڑھوں کی جانیں لیتا ہوں۔

نثار احمد : ایں - !

سعید ہاشمی : جی ہاں ! وہ صاحب بغیر ہم سے بات کئے بھاگ کھڑے ہوئے ، بعد میں ایک لمبا خط لکھا تو واقعہ معلوم ہوا۔

نثار احمد : خطرناک لڑکا ہے۔

سعید ہاشمی : ایک خطرناک جیسا خطرناک۔ تمام شہر کی لائبریریوں سے کتابیں ڈھونڈھو کر لے آتا ہے۔ معلوم نہیں کیا کیا پڑھتا ہے اس کے استاد اس سے عاجز آ گئے تھے۔

نثار احمد : تمہیں کیسے معلوم ہے کہ وہ شراب نہیں پیتا ؟

سعید ہاشمی : ارے بھائی، اب تو ہم نے سکول سے بھی اسے اٹھوا لیا ہے چوبیس گھنٹے گھر میں رہتا ہے ایک منٹ کے لیے کہیں نہیں جاتا۔ ہم سے چھپ کے کیا کرے گا۔

نثار احمد : تو سب جھوٹ بولتا ہے گویا ؟

سعید ہاشمی : جھوٹ ایسی صفائی کا کہ جھوٹ لے دوسرا خواہ مخواہ بہک جاتا ہے۔

نثار احمد : (اٹھ کر) تو بھائی اس لڑکے کو تو دیکھو۔ کہیں ہمارے گھر میں کوئی ہنگامہ نہ کر دے۔

(باہر کوئی وزنی چیز گرتی ہے اور ایک چیخ کی آواز آتی ہے)

نثار احمد : یہ کیا ؟

سعید ہاشمی : (گھبرا کر کرسی سے اٹھتا ہے) بھائی جلدی جاؤ اندر۔

(نثار احمد بھاگ کر دائیں جانب سے نکل جاتا ہے۔ سعید ہاشمی پسینہ پونچھتا ہوا پھر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ چھوٹے میاں ہاتھ جھاڑتے ہوئے نہایت بے نیازی سے داخل ہوتے ہیں)

سعید ہاشمی : (فوراً لپک کر اٹھتا ہے) کیا ہوا تھا ؟

چھوٹے میاں : (بے پروائی سے) ہیلو ڈیڈی !

(اپنی جرابیں درست کرکے دائیں جانب بڑھتا ہے)

سعید ہاشمی : ارے میں کیا پوچھ رہا ہوں ؟

چھوٹے میاں : ڈیڈی آپ بہت جلد گھبرا جاتے ہیں۔

سعید ہاشمی : ارے منہ سے بھی کچھ پھوٹو گے ؟

چھوٹے میاں : مجھے تو کچھ نہیں ہوا۔

سعید ہاشمی : میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں۔

چھوٹے میاں : وہ جو بڑے میاں ہیں نا۔

سعید ہاشمی : ہاں ہاں ہاں!

(بڑے میاں نثار احمد اور جمن کے کندھے پر ہاتھ رکھے لنگڑاتے ہوئے داخل ہوتے ہیں)

سعید ہاشمی : کیا ہوا؟

بڑے میاں : پاؤں میں موچ آگئی۔

سعید ہاشمی : کیسے؟

بڑے میاں : سیڑھیوں کی کمبخت ایسی ہیں۔ ذرا جو پھسلا تو نیچے آن رہا۔

سعید ہاشمی : اوہو بڑا افسوس ہے۔ اسی پاؤں میں جس میں پہلے آئی تھی؟

بڑے میاں : تکلیف سے منہ بنا کر تخت پر بیٹھ جاتا ہے) جی نہیں دوسرے میں۔

نثار احمد : (حیرت سے) دوسرے میں۔

سعید ہاشمی : تو وہ پہلی ٹھیک ہو گئی؟

بڑے میاں : اجی پہلی گئی بھاڑ میں۔

نثار احمد : مالش کی شیشی دوں۔

بڑے میاں : ذرا جمن کو دینا مالش کرے۔

جمن : (مالش کی شیشی لیتے ہوئے) ابھی لیجیے، پانچ منٹ میں آرام آجائے گا۔

سعید ہاشمی : پانچ منٹ میں کیسے؟

بڑے میاں : اجی بڑا لاجواب مرہم ہے میرا خود کا بنایا ہوا ہے دیکھیے اسکے کرامات کل تک چلنے پھرنے نہ لگوں تو کہیے۔

سعید ہاشمی : خوب!

چھوٹے میاں : (دائیں دروازے کے قریب) آج کے دن ہمارے بستر دفتر میں لگوا دیجیے۔

(سب یکایک مڑ کر دیکھتے ہیں)

تنکے کا سہارا

امجد حسین

کردار

بڑی آپا : بیوہ عمر چالیس برس کے لگ بھگ۔ درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھتی ہے۔ لباس صاف ستھرا مگر سادہ۔

کریمی : اُدھیڑ عمر کی عورت۔ ادنیٰ طبقہ سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن لباس صاف ستھرا۔

گلشن : بڑی آپا کی اکلوتی بیٹی عمر تیئیس چوبیس برس۔ قبول صورت چہرے پر پژمردگی قطعاً نہیں۔

امتل : گلشن کی ہم عمر سہیلی۔

خالد : پچیس چھبیس برس کا نوجوان۔

(بڑی آپا کا کمرہ : نہایت سادہ مگر ضروری اشیاء سے آراستہ۔
دائیں بائیں جو دروازے ہیں وہ کھلے ہیں۔ بائیں جانب کے دروازے
سے اُدھر دیوار کے ساتھ بڑی سی الماری رکھی ہے۔ سامنے کی دیوار
کے ساتھ ایک پلنگ بچھا ہے۔ دائیں جانب ادھر دو کرسیاں رکھی ہیں
ان میں ایک پلنگ کے قریب کھینچ لی گئی ہے۔ اس پر اپنی چادر نیچے
دبائے کریمی بیٹھی ہے —— پلنگ کے بائیں جانب کے کونے
کے قریب بڑی آپا کھڑی ہے جونہی پردہ اٹھتا ہے بڑی آپا جوتا اُتار
کر پلنگ کے کونے پر بیٹھ جاتی ہے)

بڑی آپا: (قدرے مسکرا کر) اچھا کریمی! آج پھر کہاں کہاں کا دورہ کیا؟

کریمی: (اپنی چادر کے لٹکے ہوئے پلو کو اپنے نیچے دباتے ہوئے) دورہ کیا بڑی آپا! یہی پل بھر کے لیے حکیموں کے ہاں گئی تھی وہاں سے اُٹھ کے حشمت کے ہاں چلی گئی اسے دوا لا کے دی اور اب تمہارے ہاں آ گئی۔

بڑی آپا: اسے ہاں کیسی ہے حشمت اب؟ میں تو اس بے چاری کو دیکھنے ہی نہیں گئی اب بھی بخار آتا ہے اُسے؟

کریمی: ہاں! لیکن ہلکا ہلکا بنتا ہے۔

بڑی آپا: ہر روز کہتی ہوں آج ضرور جاؤں گی، نہیں جا پاتی —— اور جاؤں بھی کیسے۔ گلشن کے پاس کوئی رہے تو گھر سے نکلوں نا۔

کریمی: ہاں اس بے چاری کو اکیلے چھوڑ ابھی نہیں جا سکتا۔

بڑی آپا : اور وہ بھی مجھے کہاں جتا دیتی ہے !

(دُور سے گلشن کی آواز آتی ہے ——— " اماں اماں ")

دیکھا ۔ پل پل بعد کو بلاتی رہتی ہے ۔

(بائیں جانب کے دروازے کی طرف دیکھتی ہے اور پھر

آواز دیتے ہوئے) آئی گلشن آئی ۔

(گلشن کی آواز دُور سے آتی ہے ——— اماں !

مجھ پر دھوپ آگئی ۔ میری چارپائی سایے میں کر دو نا)

بڑی آپا : (بائیں جانب کے دروازے کی طرف دیکھ کر جواب دیتے ہوئے) آئی بیٹا آئی ——— (کریمی سے)

جھلا اٹھی ہے ۔ میں ہی کا ہی آؤں اُس کی چارپائی ۔

کریمی : میں بھی آؤں ، ساتھ اٹھا دوں ۔

بڑی آپا : (بائیں جانب کے دروازے کے قریب پہنچ کر) نہ نہ تم بیٹھو ۔ میں گلشن کے سب کام اکیلے ہی کرتی

ہوں (ذرا سا مسکراتی ہے) اور تم جانتی رہو ——— (ابھی فقرہ مکمل نہیں کر پاتی کہ گلشن

کی پھر آواز آتی ہے) اماں ——— " اور بڑی آپا " بس آگئی " کہتی ہوئی دروازے سے

نکل جاتی ہے)

کریمی : ہائے — — بے چاری ——— واہ اللہ میاں تیرے کام ہیں نا ——— یہ گورا

چٹا رنگ ، چاند سا مکھڑا ——— یہ آنکھیں لیکن ٹانگیں ہیں کہ ان میں جان ہی نہیں ———

تیرے رنگ بھی کیا نیارے ہیں ۔

(چپ ہو جاتی ہے)

بڑی آپا : (بائیں دروازے میں داخل ہوتے ہوئے) بیچی تھی ، آدھی چارپائی پر دھوپ آگئی تھی (اسی جگہ

پر بیٹھتے ہوئے) لیکن تم کیا سوچ رہی ہو ؟

کریمی : اے ——— کچھ نہیں ——— اسے بس یہی سوچ رہی تھی کہ کس طرح بے چاری چارپائی

پر پڑے پڑے گزار دیتی ہے اور کھڑکی میں سے باہر دیکھتی رہتی ہے۔

بڑی آپا : اور کرے بھی کیا ؛

کریمی : ہئے ہئے ——— تو نے بیر اسی شکل دی تھی تو ٹانگیں بھی رہنے دیتا ——— اس کے بھید ہیں وہی جانے ۔

بڑی آپا : کریمی اس نے جو بیماری کاٹی ہے وہ کوئی بیماری سی بیماری تھی ۔ اس کی ایک نہ ایک نشانی تو رہنا ہی تھی نا ؛ پر بیٹا تو ایمان ہے اس کا کوئی کام بہتری سے خالی نہیں ہوتا ——— ہاں۔ ——— میں تو کہتی ہوں چلو ٹانگیں جاتی رہیں جان تو بچ گئی نا ۔ میری آنکھوں کے سامنے تو ہے ۔

کریمی : اسے کسی کو دکھایا بھی ؟ ——— میرا مطلب ہے ، علاج معالجہ ہو جاتا تو ——— شاید ۔

بڑی آپا : (بات کاٹ کر) مجھ سے جو کچھ بھی ہوا میں نے کیا ——— پر تم جانتی ہو یہ کام تو مردوں کے ہوتے ہیں ۔ گھر میں کوئی ہوتا تو کرتا ۔ اللہ کا یوں فضل ہے لیکن میں اسے کہاں اٹھائے اٹھائے پھرتی ۔ اس کا باپ ہوتا تو سب کچھ کرتا ۔ ——— اور میں ———

کریمی : پھر بھی کچھ نہ کچھ تو ہونا چاہئے تھا نا (گفتگو کے دوران میں بڑی آپا دروازے کی جانب دیکھتی ہے)

بڑی آپا : میں نے کہا نا ——— جو کچھ ہوا میں نے کیا ——— دو ایک ڈاکٹروں کو بھی دکھایا تھا انھوں نے امید ہی نہ دلائی ۔ کہنے لگے دونوں ٹانگیں مر چکی ہیں ——— سوچا جب جان ہی نہ رہی تو اور علاج کیا کرے گا ۔

کریمی : (وہ بھی دروازے کی جانب دیکھتی ہے) بے چاری کے نصیب ——— زچ زچ زچ یہ تو اب عمر بھر کا روگ ہو گیا ۔

بڑی آپا : اور کیا ——— پر ایک بات ہے کریمی ——— گلشن ہے بڑی ہمت والی (مسکرا کر) اس روز کہہ رہی تھی " بیماری یہ حال نہ کر جاتی تو اچھا تھا ——— ذرا چپ رہنے کے بعد کہنے لگی چلو ٹانگوں ہی میں سے جان گئی ہے باقی جسم میں تو ہے "

کریمی : ماشاء اللہ میں واری ——— پر بڑی آپا ——— اسے بیاکھیال ہی لے ڈوبے ۔

بے چاری گھر کے اندر تو چل پھر لے، اس کی محتاجی کچھ تو گھٹے۔ قدم قدم چل کر کچھ تو اپنا کام کر لے گی۔

بڑی آپا : کیا کرے گی بیساکھیاں لے کے ——— نہ ——— مجھے اچھی نہیں لگتیں ——— اب تو ایک جگہ پڑی رہتی ہے، جیسے بیماری میں پڑی رہتی تھی۔ بیساکھیوں کے سہارے جب ادھر سے اُدھر جائے گی تو مجھ سے دیکھا نہ جائے گا (وقفہ کے بعد لہجہ بدل کر) لیکن میں جو ہوں۔ اسے بیساکھیوں کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ان سے انسان کو اپنی محتاجی کا زیادہ احساس ہو جاتا ہے۔

کریمی : لیکن یہ بھی دیکھو تو اس کے سامنے کس طرح بندھ گئی ہے۔ کہیں آ جا بھی تو نہیں سکتی حشمت بھی یہی کہہ رہی تھی ——— (کوئی جواب نہ پا کر) اور شاید تم کہیں آنا جانا چاہتی بھی نہیں

(بڑی آپا چپ رہتی ہے اور گردن جھکائے پلنگ پر بچھی چادر کی سلوٹیں درست کرتی ہے)

بڑی آپا : (وقفہ کے بعد) مجھے خود پتہ نہیں، ایسا کیوں ہے جس وقت بھی میں گلشن سے دور ہوتی ہوں۔ مجھے ہول آنے لگتا ہے میرے دل میں یہی وہم رہتا ہے کہ میرے لوٹنے تک وہ وہاں ہو، نہ جانے کیوں ——— حالانکہ وہ بے چاری کہاں جا سکتی ہے (کریمی کی طرف دیکھتے ہوئے) بس ہر وقت یہی وسوسہ رہتا ہے، کوئی گلشن کو مجھ سے چھین نہ لے جائے بہتیرا اپنے آپ کو سمجھاتی ہوں پر نہیں (وقفہ) سوچا جائے تو گلشن تو اب فقط میری بیٹی ہی نہیں میری عمر بھر کی ساتھی ہے وہ کہاں جائیگی۔ مجھے چھوڑ کے کہاں جائے گی (اپنے آپ کو یقین دلانے کے لہجے میں) ٹھیک ہے نا کریمی؟

کریمی : ہاں بڑی آپا ——— یہ روگ تو عمر کا روگ ہے تم تو بس اسی کی ہو گئی پھر :

بڑی آپا : (سنی ان سنی کرتے ہوئے) مجھے تو اس گھر میں اکیلے رہتے ڈر آتا ہے (کریمی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر) ایسا محسوس ہوتا ہے جونہی میں اکیلے رہی (آس پاس دیکھتے ہوئے) یہ دیواریں مجھے کھا

جائیں گی۔ (مسکرا کر) میں جانتی ہوں یہ وہم ہے، پر کیا کروں؟

کریمی : یہ وہم ہی تو ہے۔

بڑی آپا : سچ مچ ایسا لگتا ہے ——— (ہنس کر) اور مانے گا بھی کون ——— ایسا لگتا ہے الٹا میں گلشن کی محتاج ہوں۔ (وقفہ) بعض دفعہ تو گلشن کو بھی گلشن ہونے لگتی ہے۔ منہ سے تو کچھ نہیں کہتی پھر بھی کبھی کبھی مجھے احساس ہوتا ہے کہ یہ سوچتی ہو گی میں کیا ہر وقت اس کے ساتھ چمٹی رہتی ہوں مجھے کبھی تنہا بیٹھنے ہی نہیں دیتی۔ ——— ایسے خیال اسے ضرور آتے ہوں گے ——— اور تو اور ——— تو بھی کہے گی میں کیسی باتیں کر رہی ہوں ——— اگر اس کی کوئی سہیلی اس کے پاس آن بیٹھے تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ میرا جی چاہتا ہے وہ جلد سے جلد چلی جائے بس یہی کہ کے چپ ہو جاتی ہوں وہ اپنی ہم جولیوں سے ہنس کھیل لے ——— اے کریمی چپ رہتی ہے، تم کیا سوچ رہی ہو؟

کریمی : (فوراً جواب نہ دیتے ہوئے) اسے یہی کہ ——— کب تک گلشن کو گلے کا ہار بنائے رکھو گی ——— جوان ہے ——— ایک نہ ایک دن ——— آخر کو کوئی نہ کوئی ———

(بڑی آپا یکایک اٹھتی ہے اور دروازے کی طرف بڑھتی ہے)

کیا ہوا ——— کہاں چلی؟

(گھبراہٹ میں بڑی آپا دروازے میں باہر نکل جاتی ہے اور فوراً بعد ہی واپس آجاتی ہے)

بڑی آپا : (داخل ہوتے ہوئے) مجھے بھی جانے کیا ہو گیا ہے ——— ایسا ہوا جس طرح گلشن نے مجھے بلایا ہے۔ (خفت میں ہنس دیتی ہے) اچھا خیر (لہجہ بدل کر) ہاں تو کیا کہہ رہی تھی کریمی؟

(پلنگ کے دوسرے کونے پر کریمی کے قریب بیٹھ جاتی ہے)

کریمی : میں کہہ رہی تھی ——— آخر گلشن بھی بیاہی جائے گی، پھر کیا؟

(دُور سے برتن کی آواز آتی ہے)

بڑی آپا: وُہ دیکھا!

(بڑی آپا جلدی سے اٹھتی ہے اور "کیا ہُوا؟ کیا ہُوا، گلشن" کہہ کر بائیں دروازے میں سے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے نکل جاتی ہے۔ وقفہ کے بعد لوٹ آتی ہے اس دوران میں کریمی دروازے کی جانب دیکھتی رہتی ہے۔)

گلشن کی آواز: (دُور سے) کئی بار کہا ہے صراحی کا سٹول دور نہ رکھا کرو ——— پاس پڑا ہو تو خود ڈال لوں۔ لیکن نہیں۔

بڑی آپا: (واپس آتے ہوئے) (کریمی سے) کئی بار کہا ہے کوئی کام خود مت کیا کر، پانی پینے لگی تھی گلاس گر گیا ہے ——— میں کس لیے ہوں جو تو خود کام کرتی ہے ——— تمھیں کیا بھلا صراحی کا سٹول دُور ہو یا نزدیک ——— ٹھیک ہے نا کریمی!

(بیٹھ جاتی ہے)

کریمی: ہُوا کیا۔ صراحی کا سٹول قریب ہی رکھ دیا ہوتا، خود ہی پانی ڈال لیتی۔

بڑی آپا: اچھا تو باتیں ہم کیا کر رہی تھیں۔

کریمی: یہی کہہ رہی تھی تو کب تک اسے بٹھائے رکھو گی؟

بڑی آپا: (مصنوعی ہنسی سے) ہاں ——— لیکن اسے بیاہے گا کون؟ کون اٹھائے گا اس بوجھ کو ——— یہ بوجھ ہی تو ہے۔ اور اگر . . . کسی نے اٹھا بھی لیا تو کب تک ——— سوچنے کی بات ہے۔ آج نہیں تو کل گرا دے گا۔ (لہجہ بدل کر) سچ پوچھو تو کریمی مجھے یہ قبول نہیں کوئی گلشن پر ترس کھائے۔ اسے محتاج اور یتیم جان کر اسے بیاہے ——— نہ ——— نہ میں یہ نہیں چاہتی۔

کریمی: اس میں ترس کھانے کی کیا بات ہے؟

بڑی آپا: اور کیا۔ اس زمانے میں کسی کو کیا پڑی ہے جو کوئی اپاہج سے شادی کرے اور عمر بھر اسے پلنگڑی میں

اٹھائے اٹھائے پھرے۔ اچھا اگر کسی نے اسے گود لے لیا یا کوئی رشتہ دار اس کی پرورش کرنے پر آمادہ ہو گیا تو کیا ضمانت ہے کہ اسے ہمیشہ سینے سے لگائے رکھے گا۔ وہ ضرور اکتا جائے گا اور پھر جو اس کا حال ہوگا وہ مجھ سے نہ دیکھا جائے گا۔ وہ پیاسی تڑپے گی اور کوئی اُسے پانی دینے والا نہ ہوگا ——— پھر اس سے چھٹکارا پانے کی ترکیبیں کی جائیں گی ——— بے چاری کا مُردہ خراب ہوگا (چپ ہو جاتی ہے اور کرمی کی جانب تکتی رہتی ہے، کیوں آپا ٹھیک نہیں کہہ رہی؟)

کرمی: ہوں ——— پر کیا پتہ ایسے ایسا میاں ملے جو تم سے زیادہ اس کی دیکھ بھال کرے۔

بڑی آپا: (چونک کر) مجھ سے زیادہ (زیر خند) ہوں (گویا طنز یہ انداز میں) مجھ سے زیادہ کوئی اس کی دیکھ بھال کیا کرے گا؟ (وقفہ) ایسا میاں ملنا بھی تو قسمت کی بات ہے۔ قسمت ہی ہوتی تو یہ حال ہی کیوں ہوتا!

کرمی: تو اس کے کھیل ہیں بڑی آپا۔ اس میں نہ تیرا ہاتھ نہ میرا ———

(دونوں چپ ہو جاتی ہیں۔ بڑی آپا گردن جھکا لیتی ہے گویا اس بات سے وہ زیادہ پریشان ہوئی ہے)

بڑی آپا: (گردن اٹھا کر کرمی کی جانب دیکھتے ہوئے مسکراتی ہے) اچھا! جب بھی میں کبھی اس سے یہ بات کرتی ہوں تو وہ جواب ہی نہیں دیتی اور کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگتی ہے اور مسلسل دیکھتی رہتی ہے۔

(بڑی آپا چپ ہو جاتی ہے)

کرمی: میں سوچتی ہوں، اگر یہ کھڑکی نہ ہو تو گلشن کی زندگی اجیرن ہو جائے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے وہ اپنی زندگی کی کمی اس کھڑکی سے پوری کرتی ہے۔

بڑی آپا: ایک روز مجھ سے کہتی تو تھی، اماں اگر یہ کھڑکی نہ ہو تو میں باہر کی دنیا سے بالکل بے تعلق رہوں۔ اب میں اس میں سے دیکھتی ہوں۔ لوگ چلتے پھرتے بھاگتے نظر آتے ہیں۔ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے میں خود چل پھر اور بھاگ رہی ہوں۔

کرمی: ہائے میں واری! کیسے کیسے خیال بے چاری کے دل میں آتے ہیں کس طرح اپنے روگ کو بھلانے کی

کوشش کرتی ہے ۔

بڑی آپا: لاکھ بلا سے رنگ تو ہے۔ میں تو کہتی ہوں تو کھڑکی میں سے نہ جھانکا کر۔ کسی روز کڑھنے لگے گی بلکہ میں تو کبھی کبھی نظر بچا کے کھڑکی بند کر دیتی ہوں۔ لیکن پھر کھول لیتی ہے۔ اب بھی دیکھ لے تکیہ کا سہارا لیے اپنے کے جا رہی ہوگی۔

(بڑی آپا اٹھ کر بائیں جانب کے دروازے میں جا کھڑی ہوتی ہے اور جگہ سے کریمی کو اشارہ کرتی ہے کہ وہ آ کے خود دیکھ لے ۔

کریمی بھی اس کے قریب جا کھڑی ہوتی ہے)

بڑی آپا: دیکھا؟ ——— میں نے جو کہا تھا ہر وقت باہر دیکھتی رہتی ہے ——— اسے دیکھا — وہ پہچانتی ہو — (کریمی سر ہلاتی ہے) کون ہے؟ ——— میں اُسے اکثر یہیں کھڑا دیکھتی ہوں

(دونوں واپس آ جاتی ہیں)

کریمی: یہ مکان تو خان بہادر کا ہے انہی میں سے معلوم ہوتا ہے ——— کیوں؟

بڑی آپا: کچھ نہیں، یونہی ——— (گلشن کی آواز آتی ہے ، اماں ———)
(آواز سننے ہوئے) آئی گلشن ۔

کریمی: (کریمی کھڑی ہو جاتی ہے۔ چادر جھاڑتی ہے) اچھا بڑی آپا! میں بھی چلی۔

بڑی آپا: کیوں بیٹھو!

کریمی: ابھی منگلوں کے ہاں جانا ہے ——— اسے میں نے تمھیں بتایا ہی نہیں۔ زینب نے ہاں کر دی ہے اب سعیدہ کو بتانے جا رہی ہوں۔

بڑی آپا: اچھا! ——— یہ کام تم نے ٹھیک کیا ہے۔ لڑکا بھی کھاتا پیتا ہے اور زینب کی بیٹی بھی شکل و صورت کی اچھی ہے

(——— گلشن کی آواز آتی ہے ———)

ہائے آؤ بھئی ———

کیا ہُوا ، ابھی آتی ہوں ——— اچھا کریمی پھر کسی روز آنا ضرور !

کریمی : ہاں ہاں ——— کسی روز آوں گی ۔

(چادر اوڑھ کر دائیں دروازے میں سے نکل جاتی ہے اور

اس کے ساتھ ہی گلشن کی پھر آواز آتی ہے ———

"اماں" ——— اور بڑی آپا "آئی" کہہ کر

بائیں دروازے کی جانب جانے کے لیے مڑتی ہے

اور پردہ گرتا ہے

پردہ

○

دوسرا منظر

[برآمدہ۔ سامنے کی دیوار میں ایک کھڑکی جس کے دونوں پٹ
کھلے ہیں اس کھڑکی کے نیچے ایک چارپائی پر گلشن بیٹھی ہے گاؤ
تکیہ سے ٹیک لگائے۔ بستر صاف ستھرا ہے۔ پاس چارپائی
سے ذرا ہٹ کر سٹول پر صراحی اور گلاس رکھے ہیں ایک
طرف ایک آرام کرسی رکھی ہے جس کے قریب امتل کھڑی ہے
پردہ اٹھتا ہے تو گلشن بیٹھے بیٹھے ہاتھوں سے اپنا آپ سنوارتی
ہے اور امتل کی طرف دیکھ کر مسکراتی بھی ہے]

گلشن : (اپنے آپ کو سنوارتے ہوئے اور امتل کی جانب دیکھے بغیر) امتل ——— (پھر سنوارتی ہے) میری مانگ ٹیڑھی تو نہیں؟

امتل : (گلشن کے پوچھ لینے پر غور سے دیکھتی ہے) ایسی ٹیڑھی تو نہیں، اب تم نے پوچھا ہے ——تو کچھ کچھ ٹیڑھی دکھائی دینے لگی ہے۔

گلشن : (بالوں کو بانتے ہوئے) آج اماں نے میرے بال ہی تو ٹھیک سے نہیں بنائے (پہلوؤں کو دباتے ہوئے) یہاں سے دیکھو کیسے کھنچے کھنچے ہیں۔ بہت دبا کے کنگھی کرتی ہے تیل بھی زیادہ ڈال دیتی ہیں۔

امتل : (بیٹھ جاتی ہے) بتا دیا کرنا۔

گلشن : کئی بار کہا ہے۔ مجھے تیسے چپے بال اچھے نہیں لگتے۔

امتل : میں پھر سے بنا دوں؟

گلشن : (امتل کی جانب دیکھتے ہوئے) ——— ہاں ——— پھر سے بنا دو۔ ——— انھیں پہلے

تو پیسے سے رگڑ لو ——— ہیں ——— تیل نکل جائے گا۔

امتل : (شرارت سے) بالکل ایسے ہی جیسے ———

گلشن : (ہنستی ہے، دوپٹہ کو کندھے اور سینے پر ڈالتے ہوئے) اچھا یہ بتا، یہ دوپٹہ اس قمیض پر چلتا ہے ہے، اوں —— ہوں —— نہیں چلتا نا ———

امتل : آں —— کچھ —— فرق ہے رہی۔

گلشن : مجھے پہلے ہی پتہ تھا۔ عجیب لگتا ہے۔ مجھے اس کا رنگ بھی پسند نہیں نہ سرخ نہ گلابی جانے کیا رنگ ہے ———

امتل : دوپٹہ پر سفید پھول ہوں، تو قمیض کا رنگ اُبھرے۔

گلشن : اماں بھی کمال ہی کرتی ہیں۔ میں نے کہا بھی جارجٹ کا دوپٹہ نکال دے، کہنے لگی یہی ٹھیک ہے (ناک چڑھاتے ہوئے) اوں، اچھا، دیکھ اندر کے صندوق میں سے جارجٹ کا دوپٹہ لے آ۔ (امتل دونوں ہاتھ کرسی کے بازوؤں پر رکھتی ہے گویا اُٹھنے لگی) —— لیکن ٹھہر! امی باہر جا رہی ہے وہ جائے پھر لانا، اتنی دیر میں بال ہی سنوار دے۔

امتل : کنگھی ہے؟

گلشن : (آئینہ کے نیچے سے نکالتی ہے) یہ لے۔

امتل : گلشن تمہارے بال کتنے پیارے ہیں کالے اور گھنگھریالے اور لمبے بھی ——— یہ بڑی بڑی بڑی لہریں اُبھرتی ہی نہیں۔

گلشن : جبھی تو مجھے اس طرح بنائے ہوئے بال پسند نہیں۔

(بڑی آپا دائیں جانب سے داخل ہوتی ہے۔ امتل کو بال بناتے دیکھ کر مسکراتی ہے۔)

بڑی آپا : اوہو! میرے بنائے ہوئے بال پسند نہیں آئے۔ (قریب آکر) ہاں بھئی ہم ٹھہرے دقیانوسی قسم کے لوگ ہم کیا جانیں، نئی طرز کے بال بنانا (امتل اور گلشن ہنستی ہیں) اچھا گلشن میں ذرا حشمت

نے؟ اس سے ہو آؤں بے چاری کو بخار ہے کئی روز سے۔

گلشن : ہاں!

بڑی آپا : اسے تیرے پاس انتل تو ہے ہی۔ کیوں انتل؟

انتل : (بال بناتے ہوئے) ہاں خالہ میں ہوں۔

بڑی آپا : میرے آنے سے پہلے جانا مت بیٹا، میں بس پندرہ بیس منٹ میں لوٹ آؤں گی۔

گلشن : تم اطمینان سے آؤ اماں انتل میرے پاس رہے گی۔

بڑی آپا : (بائیں جانب جاتے ہوئے) نہیں میں بہت جلد آ جاؤں گی۔

(گلشن اور انتل بڑی آپا کو جاتے ہوئے دیکھتی ہیں۔ انتل بال بنا کر اٹھتی ہے اور دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکراتی ہیں ——)

گلشن : اب دوپٹہ تو نکال لا —— یہ دیکھ اماں نے آج پھر چھوٹے پائیوں کی چارپائی بچھا دی ہے میں ٹھیک طور سے (پیر چھپانے کی کوشش کرتی ہے) باہر دیکھ ہی نہیں سکتی اسے تو بدل دے۔

انتل : کون سی بچھاؤں؟

گلشن : باہر صحن میں ایک ہی گول پائیوں والی —— وہ — لیکن رہنے دو، تم یہاں کرسی لا کے رکھ دو ہاں کرسی ٹھیک رہے گی۔ اور اس کے اوپر مجھے بٹھا دینا، یہ بہت اچھا ہے۔

انتل : (گلشن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر) تاکہ تم اس کے جھروکے سے بالوں ——

گلشن : ہٹ۔

انتل : ابھی لائی کرسی۔

گلشن : (دائیں جانب کے دروازے کی طرف اشارے کرتے ہوئے) اس کمرے میں جو سب سے اونچی کرسی ہے وہ لانا ایک سب سے اونچی ہے۔

(انتل دائیں جانب کے کمرے میں اندر چلی جاتی ہے۔ جب تک

متل غائب رہتی ہے۔ گلشن اپنی قمیص کے آگے شکنیں وغیرہ درست
کرتی ہے۔ دوپٹہ کو شانوں پر ڈال کے دیکھتی ہے مسکراتی ہے
پھر سر ہلاتی ہے گویا اپنے آپ سے سوال و جواب کر رہی ہو۔

متل : (دور سے) تو دوپٹہ نیلے بکس میں ہے نا؟

گلشن : ہاں نیلے بکس ہی میں ——— (جواب دینے کے بعد پھر ویسی ہی حرکات کرتی ہے۔)

(متل کرسی اٹھائے اور دوپٹہ شانوں پر ڈالے داخل ہوتی ہے)

ہاں یہ ٹھیک ہے لیکن اسے کہاں رکھوں گی۔ پہلے چارپائی کو سر کا دے۔

متل : اچھا (کرسی کو رکھ دیتی ہے اور چارپائی کو ادھر کھینچتی ہے اور کھڑکی کے عین قریب کرسی رکھ دیتی ہے۔

گلشن : یہاں اس طرح ٹھیک (بچوں کی طرح بازو اٹھاتے ہوئے) مجھے اس پر بٹھا دو۔

متل : ہاں آؤ۔

(بازوؤں سے اٹھا کر متل گلشن کو چارپائی سے کرسی پر بٹھا دیتی ہے
اور اس پر بیٹھتے ہی گلشن کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔)

گلشن : اب مجھے اچھی طرح نظر آرہا ہے (خوش ہو کر) میں بہت کچھ دیکھ سکتی ہوں اب میں کرسی پر بیٹھا کروں گی
چارپائی اٹھا دوں گی۔

متل : گلشن۔ (وقفہ اور اس وقفہ میں گلشن جو باہر دیکھ رہی ہے متل کی جانب دیکھنے لگتی ہے) آج تم کس قدر
سج دھج رہی ہو، بہت پیاری لگ رہی ہو۔

(یہ فقرہ کہہ کر متل گلشن کے قریب آتی ہے اور اپنے ساتھ
لگا لیتی ہے۔)

گلشن : پتہ ہے اس وقت میرا جی کیا چاہتا ہے؟ ——— ہائے میرا جی چاہتا ہے کہ اگر میری ٹانگیں نہیں
چلتیں تو میں ہاتھوں کے بل ہی اس تک پہنچ جاؤں (ہاتھوں کی جانب دیکھتے ہوئے) ٹانگوں میں
جان نہیں ہاتھوں میں تو ہے۔

(چونک کر) کوئی آ رہا ہے ——— وہی ہوگا، خالد ہی ہوگا ———

امتل : تم کہ جاؤ میں بڑھ کے کھڑکی میں سے دیکھتی ہوں، تم مت دیکھو اسے !

(گلشن امتل کے منع کرنے کے باوجود کچھ ابھر کر باہر دیکھنے کی کوشش کرتی ہے اور اسی کوشش میں کرسی ہل جاتی ہے اور وہ گر جاتی ہے۔)

امتل : ہائے میں مر دں ——— دیکھا میں نہ کہتی تھی ———

گلشن : مجھے اٹھاؤ، جلدی سے اٹھاؤ۔

امتل بڑھ کر اسے اٹھاتی ہے اور پھر کرسی پر بٹھا دیتی ہے۔

امتل : چوٹ تو نہیں آئی ؟

گلشن : وہی ہے۔

امتل : (باہر جھانکتے ہوئے) ہاں (بائیں جانب جاتے ہوئے) لمبی بات نہ کرنا، خالہ آ جائے گی۔

گلشن : باہر دیکھتی رہنا اور مجھ کو ہاتھ سے اشارہ کر دینا۔

(امتل بائیں دروازے میں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ گلشن کے چہرے پر مسکراہٹ ہے، خیر مقدم کی مسکراہٹ مدھم مردانہ آواز آتی ہے "گل ——— شن ———")

گلشن : خالد ———

(کھڑکی میں سے ایک نوجوان مردانہ چہرہ ظاہر ہوتا ہے)

خالد : (مسکراتے ہوئے) آج تم اس قدر اونچی کس طرح بیٹھی ہو ؟

گلشن : (ہنستی ہے) میں آج چارپائی پر نہیں ہوں۔ کرسی پر۔

خالد : کیوں، کرسی پر کیوں ؟

گلشن : کیوں ——— اس لیے ——— اس لیے کہ میں تمہیں پوری طرح دیکھ سکوں ———

پوری طرح اور میں ——— میں تمھیں چھو سکوں — (ہنس کر) اسے — ایسے

(اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر)

اور میں محسوس کر سکوں کہ تم ——— تم واقعی میرے ——— قریب ہو، ہاں خالد —

خالد : گلشن !

(گلشن نے جو ہاتھ خالد کے شانے پر رکھا ہے خالد اپنا ہاتھ اس ہاتھ پر رکھ دیتا ہے)

گلشن : اور میں ——— میں تمھارے بالوں میں ہاتھ پھیر سکوں

(گلشن اپنا ہاتھ نرمی سے سرکا کر خالد کے بالوں میں پھیرنے لگتی ہے)

مجھے معلوم نہ تھا، تمھارے بھورے خشک بال جتنے چمکیلے ہیں اتنے ہی ملائم بھی ہیں۔

خالد : گلشن میں بھی آج پہلی مرتبہ تمھیں زیادہ قریب سے دیکھ رہا ہوں۔ آج مجھے زیادہ احساس ہے کہ تم کتنی پیاری لگتی ہو

گلشن : جھوٹ !

خالد : مجھے خود بھی یہ جھوٹ معلوم ہوتا ہے لیکن ہے سچ۔ بالکل سچ (دونوں ہنستے ہیں) ایک بات کہوں ؟

گلشن : سچی یا جھوٹی ؟

خالد : سچی نہ جھوٹی، دل لگتی (ہنستے ہیں) سنو۔ تو ہمیشہ سرخ کپڑے پہنا کرو، ہوں۔

گلشن : تمھیں اچھے لگتے ہیں ؟

خالد : مجھے سرخ کپڑے تو ویسے اچھے نہیں لگتے لیکن آج تم نے پہنے ہیں تو زیادہ اچھی لگ رہی ہو۔

گلشن : اب مذاق بھی اڑانے لگے ہو (خالد یقین دلانے کے لیے فقط سر ہلا دیتا ہے اور مسکراتا ہے) خالد ! آج تم نے بالوں میں تیل کیوں ڈالا ہے ؟

خالد : نہ ڈالا کروں ؟

گلشن : نہ (سر ہلاتی ہے)

خالد : (خالد کا ہاتھ پکڑ کر) اچھا گلشن یاد ہے اُس روز میں نے تم سے کچھ باتیں پوچھی تھیں، تم سے پوچھا تھا وہ بیماری کیا تھی، جس سے تمھاری ٹانگیں مر گئیں وہ کتنا عرصہ رہی۔ کیسے شروع ہوئی۔ سب کچھ پوچھا تھا۔ (گلشن بغیر کچھ کہے سر ہلاتی ہے) میں نے تمھیں بتایا نہیں وہ سب تفصیل میں نے کراچی بھیج دی تھی۔ اپنے ایک دوست کے پاس۔

گلشن : کیوں ؟

خالد : میں نے اسے لکھا تھا وہ کسی ڈاکٹر سے مشورہ کرے۔ کیا تمھاری ٹانگوں میں پھر سے جان پیدا ہو سکتی ہے (گلشن چپ ہو جاتی ہے) معلوم کرنے میں کیا حرج ہے۔

گلشن : تو ؟

خالد : اس کا جواب آیا ہے ؟

گلشن : کیا جواب آیا ہے —— کیا جواب آیا ہے ؟

خالد : جواب ؟ —— ہاں —— اس —— نے —— (جیسے شرارت سے جواب چھپا رہا ہو)

گلشن : بتاؤ بھی —— بتاؤ کیا لکھا ہے انھوں ؟

خالد : (مسکراتا ہے) بتاؤں ؟

گلشن : بے تابی سے، ہٹیے خالد۔

خالد : اچھا، تو بتا ہی دے۔

گلشن : دیکھو ستاؤ نہیں۔ بتا دو۔

خالد : اس کا جواب آیا ہے (گلشن کے چہرے پر بے تابی سی ہے) ایک ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اگر باقاعدہ علاج کیا جائے۔

گلشن : تو ؟

خالد : تو کیا۔ یہی کہ ٹانگوں میں پھر سے جان آ سکتی ہے۔

گلشن : سچ ــــ (خالد تصدیق کرنے کی غرض سے سر ہلاتا ہے) ــــ میں ــــ میں ــــ

(اپنی لٹکتی ٹانگوں کی طرف دیکھتی ہے)

خالد : (فوراً) بالکل چلنے لگو گی۔

گلشن : (فوراً) کیا؟

خالد : اس ڈاکٹر نے دو ایک ایسے ہی مریضوں کو صحت مند بھی کیا ہے۔ ان کی ٹانگیں بھی اسی بیماری سے جاتی رہی تھیں۔

گلشن : میں کیسے مانوں خالد ــــ میں کیسے مانوں کہ ! جسم میں پھر جان پڑ جائے، مجھے یقین نہیں آتا۔

خالد : یقین کرنا ہی ہوگا۔

(گلشن چپ رہتی ہے لیکن خالد کی طرف اس طرح دیکھتی ہے گویا پوچھ رہی ہو کہ یہ کیسے ہوگا)

میں تمہیں کراچی لے جاؤں گا ــــ جب جہاز یہاں سے جائے گا تو بس پہلا کام یہی کروں گا، باقاعدہ علاج کراؤں گا۔

(گلشن بدستور خالد کی طرف دیکھے جا رہی ہے اور پھر یکایک اپنے ہاتھوں میں منہ چھپا لیتی ہے۔)

ارے تمہیں کیا ہوا؟ سسکیاں! اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ گلشن ــ گلشن!

(گلشن سسکیاں لیتی رہتی ہے)

گلشن : خالد ــــ (سسکیاں)

خالد : بولو ــــ ہاں [illegible]

گلشن : اماں کہتی تھی ــــ (پھر چپ ہو جاتی ہے)

خالد : کیا کہتی تھی اماں ــــ جو ہوتا ہے ــــ کہ کبھی یقین ــــ [illegible]

(گلشن سر اٹھاتی ہے اور اس کی آنکھیں پونچھتا ہے)

گلشن : (بھرائی ہوئی آواز میں) اماں ایک روز کہہ رہی تھی — (وقفے کے بعد) میں گلشن کا بیاہ اس لیے نہیں کرتی کہ گلشن بوجھ ہی تو ہے۔ اس بوجھ کو جو اٹھائے گا وہ آدھے رستے ہی میں چھوڑ دے گا

خالد : آواز بھرا جاتی ہے) جب تم بیاہ کا نام لیتے ہو، مجھے اماں کی بات یاد آ جاتی ہے۔

(وقفہ جیسے ضبط کرنے کی کوشش کرتی ہے) اور میں سوچنے لگتی ہوں کہیں — کہیں اماں کی بات سچی نہ ہو جائے — (پھوٹ پڑتی ہے) —

خالد : ہے — تم میرے بارے میں کیوں اس طرح سوچتی ہو؟

گلشن : خالد! میں بوجھ تو ہوں نا اور اس بوجھ کو اٹھاتے اٹھاتے تم تھک گئے تو — !

خالد : لیکن تم بوجھ رہو گی کیوں — یہ تم نے نہیں سوچا۔ تمھاری ٹانگیں بالکل ٹھیک ہو جائیں گی مجھے پورا یقین ہے میرا دل گواہی دیتا ہے — اور (ہنس کر) جب تک تم بوجھ ہو اس وقت تک اسے میں اٹھاؤں گا۔

گلشن : اگر تم مجھے کراچی لے گئے اور علاج کے بعد بھی میری ٹانگوں میں حرکت پیدا نہ ہوئی (ٹانگوں کی طرف دیکھتے ہوئے) یہ اسی طرح بے جان رہیں — تو — تو —

خالد : تو کیا؟

گلشن : (خالد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر) تو خالد — یہ بوجھ — یہ تمھارے لیے عمر بھر کا بوجھ ہو جائے گا نا — پھر بھی تم اسی طرح مجھ سے — پیار کرو گے جس طرح اب کرتے ہو — ایسے ہی؟

خالد : آج تم کیسی باتیں کر رہی ہو، تمھیں ہوا کیا ہے؟

گلشن : میں چاہتی ہوں ایسی باتیں میرے ذہن میں نہ آئیں، پر مجھے اماں کی بات بھولتی ہی نہیں۔

(گلشن چپ ہو جاتی ہے اور اپنا سر کرسی کی پشت پر ٹیک دیتی ہے۔)

گلشن : (خاموشی کے بعد اسی طرح سر ٹیکے ہوئے) مجھے تو یہ محسوس ہوتا ہے — گویا تمھیں معلوم ہی نہیں میری ٹانگیں

بے جان ہیں۔ اور کچھ ایسے کہ تم نے میرے ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ رکھے ہیں اور تمہارے ہاتھ
کے سہارے کھڑی ہوں ——— جیسے کوئی اس بچے کو انگلیوں کے سہارے کھڑا کر دے جس نے خود
کھڑا ہونا نہ سیکھا ہو۔ (خاموش رہنے کے بعد) اور میں ڈر رہی ہوں کہ ایسا نہ ہو تمھیں پتہ چل جائے کہ
میں اپنی ٹانگوں کے سہارے کھڑی نہیں ہو سکتی اور تم ——— تم ——— (سر اٹھا لیتی ہے) فوراً
اپنے ہاتھ کھینچ لو گے اور میں دھڑام سے نیچے آ گروں گی

خالد : گلشن مجھے کانٹوں میں نہ گھسیٹو۔

گلشن : تم اپنے ہاتھ کھینچ لو گے۔

خالد : گلشن! تمھیں یہ وہم کیوں ہو رہا ہے؟

گلشن : مجھے خود معلوم نہیں۔ میں اپنے آپ کو بہت سمجھاتی ہوں اتنا سمجھاتی ہوں کہ مجھے یقین نہیں آتا۔

(پھر رونے لگتی ہے)

جس دن سے اماں نے یہ بات کی ہے مجھے اپنے آپ پر بھروسہ ہی نہیں رہا۔

خالد : میں تمھیں کیسے سمجھاؤں ——— اچھا یہ بتاؤ جب میں نے تم سے شادی کی بات کی تھی۔ مجھے معلوم نہ
تھا ان میں جان نہیں ہے؟

(گلشن خاموش رہتی ہے)

گلشن : لیکن جب تم پہلی بار مجھے ملے تھے۔ تمھیں اس وقت کب معلوم تھا میں اپاہج ہوں۔ تم مجھے دور سے
دیکھا کرتے تھے۔ تمھیں صرف میرا چہرہ نظر آتا تھا اس وقت تمھیں کیا خبر تھی میں کھڑی نہیں ہو سکتی
اور مجھے یاد ہے جب تمھیں پہلی بار معلوم ہوا تھا، تو تم چونک اٹھے تھے اور مجھ پر ترس کھانے لگے تھے

خالد : میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو چونک اٹھتا گلشن، مجھے ——— واقعی مجھے ———

گلشن : (بات کاٹ کر) میں نے وہ بات بھلا دی خالد ——— بالکل بھلا دی ہے تم تو مجھے اب اس حالت
میں جانتے ہو نا۔

خالد : بالکل ——— بلکہ ——— قبول کرتا ہوں۔ میں نے اپنے ہاں اعلان بھی کر دیا ہے۔

گلشن: خا ـــــ لد ـــــ پھر! (چونک جاتی ہے)

خالد: میں نے اُن سے کہہ دیا ہے۔

گلشن: انھوں نے کیا جواب دیا ہے؟

امتل: (دُور سے سرگوشی کے انداز میں) گلشن کوئی آ رہا ہے۔ گلشن، گلشن!

خالد: کون آ رہا ہے۔ (خالد پریشان سا ہوتا ہے)

گلشن: تو بتاؤ نا انھوں نے کیا کہا؟

خالد: میں پھر آؤں گا ـــــ پھر آ جاؤں گا۔ ـــــ کوئی آ رہا ہے۔

(اوجھل ہو جاتا ہے)

گلشن: (آگے جھک کر) بتا تو جاؤ خالد ـــــ خالد (خالد کی آواز ـــــ "بتاؤں گا")

امتل: (بائیں دروازے سے تیزی سے داخل ہوتی ہے) ٹھہر ٹھہر گلشن پھر گر جائے گی، میں تمھیں چارپائی پر بٹھاتی ہوں۔

(امتل گلشن کو اُٹھاتی ہے اور چارپائی پر گاؤ تکیہ کے سہارے
بٹھا دیتی ہے ـــــ دُور سے کریمی کی آواز آتی ہے
"بڑی آپا" ـــــ)

گلشن: کون ہے؟

گلشن: اسے کہہ دو آپی گھر پر نہیں ہے۔

امتل: لیکن وہ چلی آ رہی ہے۔

گلشن: یہ کرسی اُٹھا کے یہاں رکھ دو، تم خود اس پر بیٹھ جاؤ میری ٹانگوں پر چادر ڈال دو۔

(امتل جلدی سے کرسی اٹھا کر رکھ دیتی ہے اور ابھی ٹانگوں
پر چادر ڈال رہی ہوتی ہے کہ کریمی بائیں جانب سے داخل
ہوتی ہے)

کریمن : گلشن بی بی ۔ ـــــ

گلشن : خالہ کریمن ۔ اماں تو پھوپھی حشمت کے ہاں گئی ہیں۔ ذرا دیر سے آئیں گی۔

(امتل گلشن کی چارپائی درست کرنے میں مصروف رہتی ہے۔)

کریمن : اچھا، کب گئی ؟

گلشن : تمھارے آنے سے ذرا ہی پہلے۔

کریمن : (امتل کی جانب دیکھتے ہوئے) تو لا بی بی امتل گھونٹ پانی ہی دیلا۔ اس صراحی میں سے دیدے۔

گلشن : گلاس اندر سے لے آ۔

(امتل دائیں جانب جاتی ہے۔)

کریمن : (کرسی پہ بیٹھتے ہوئے) اسے اس کھڑکی میں کتنی ٹھنڈی ہوا آتی۔ اچھا کرتی ہے اسے کھلا رکھتی ہے۔

(امتل گلاس لاتی ہے اور صراحی میں سے پانی ڈال کر دیتی ہے
اور خود گلشن کی چارپائی کی پائنتی پہ بیٹھ جاتی ہے۔ کریمن پانی پینے
کے بعد گلاس زمین پہ رکھ دیتی ہے اپنی چادر سے منہ پونچھتی
ہے۔)

میں تیری اماں کا انتظار کر لیتی ہوں۔ پھر کسے گی جھانک کے چلی گئی۔

گلشن : پر خالہ وہ تو ۔۔۔۔۔

کریمن : اے جب بیٹی کہاں گھر جاؤں اور واپس آؤں ـــــ یہیں کمر سیدھی کر لیتی ہوں ـــــ صبح کی گھر سے نکلی ہوں پل بھر کے لیے بیٹھ کے نہیں دیکھا ـــــ میں تیرے پاس ہی جا پائی بچھا لیتی ہوں ـــــ آ امتل بی بی چارپائی اٹھا لائیں

(امتل گلشن کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھتی ہے)

پردہ گرتا ہے

○

تیسرا منظر

(بڑی آپا کا کمرہ۔ وہی ترتیب جو پہلے منظر میں تھی۔ تبدیلی فقط یہ
ہے کہ کریمی اپنی چادر دبائے پلنگ کے ایک کونے پر بیٹھی ہے۔
اور بڑی آپا پاس کرسی پر بیٹھی ہے)

بڑی آپا: تو بات کرتے کرتے رک کیوں گئی؟ کیا کہنے لگی تھی؟

کریمی: کچھ نہیں۔ بی بی میں کل خان بہادروں کے ہاں گئی تھی۔ وہاں ——— اے — گلشن کی بات ہو رہی تھی۔

بڑی آپا: گلشن کی؟ انھیں اس سے کیوں؟

کریمی: وہ جو اس دن تم نے ایک لڑکے کو سرخ مکان کے قریب کھڑے دیکھا تھا۔ تمھارا ماتھا ٹھیک ہی ٹھنکا تھا۔

بڑی آپا: کیا مطلب؟

کریمی: وہ خان بہادر کا چھوٹا لڑکا ہے۔ سنا ہے اس نے گلشن کی بات خود ہی گھر میں چھیڑی ہے۔

بڑی آپا: اس کا گلشن سے کیا واسطہ؟

کریمی: سنو تو ——— مجھ سے خان بہادر کی بیوی نے پوچھا، بتاؤ لڑکی کیسی ہے۔ ——— سنا ہے صورت کی اچھی ہے۔

بڑی آپا: تو؟

کریمی: تو کیا، میں نے جی کھول کر تعریف کی۔ کہا اس میں کیا شک ہے، چاند کا ٹکڑا ہے۔

بڑی آپا: لیکن تمھیں معلوم تو ہے کریمی ——— پھر بھی ———

کریمی: اس نے پوچھا، سنا اس کی ٹانگیں خراب ہیں۔ میں نے کہہ دیا، ہاں، جھوٹ کیوں بولتی، میں نے

بتا دیا بیماری سے مرگئیں تھیں، علاج ہو تو ٹھیک ہو جائیں۔

بڑی آپا: کریمی ——— (کچھ کہنا بھی چاہتی ہے، کہہ بھی نہیں سکتی) تم ——— تم نے (چُپ ہو جاتی ہے) تمہیں معلوم تو ہے اس کی ٹانگیں مر چکی ہیں ——— بالکل مر چکی ہیں ——— اب ان میں جان کہاں پڑ سکتی ہے ——— علاج کرایا تو تھا۔ ڈاکٹروں نے کہہ تو دیا ——— (بات کھل کے نہیں کرتی)

کریمی: تم سے کیا چھپاؤں آپا! میں نے گلشن کی بہت تعریف کی۔ میں نے کہا اس بے چاری کو بیماری نے آلیا ورنہ ایسے سلیقہ کی لڑکیاں تم نے کم دیکھی ہے حسین ہے اچھے خاندان کی ہے، اللہ کا دیا سب کچھ ہے وہ تو اس کا باپ نہیں ورنہ

بڑی آپا: (بات کاٹ کر) پر تمہیں ضرورت ہی کیا تھی ایسی باتیں کہنے کی (کچھ پریشان خاطر ہوتی ہے) کیا ضرورت تھی؟ تم نے ——— کیوں کہا، اس کی ٹانگیں علاج سے ٹھیک ہو جائیں گی ——— اگر نہ ہوں ——— اور وہ تو ٹھیک ہو ہی نہیں سکتیں میں نے تمہیں بتایا تو تھا ڈاکٹر طبیب سے پوچھ لیں۔ جیسا ایک ڈاکٹر ویسا ہی دوسرا اس ڈاکٹر نے یہاں تک کہہ دیا کہ مُردہ ہوئیں مُردہ مُردہ جسم میں کوئی کیا جان ڈالے گا ——— ٹھیک تو ہے ——— لیکن تم ———

کریمی: لیکن ایک یہاں ہی تو ڈاکٹر نہیں اور شہروں میں اچھے سے اچھا پڑا ہے۔

بڑی آپا: انہیں کیا ——— کوئی علاج کرائے نہ کرائے ——— لیکن میں کہتی ہوں تم نے یہ بات چھیڑی ہی کیوں؟

کریمی: میں نے کہاں چھیڑی۔ میں جب اُن کے ہاں گئی وہ پہلے ہی سے یہ باتیں کر رہی تھیں۔ خان بہادر کی بیگم کہہ رہی تھیں جو نے اس لڑکے خاندان کو کیا ہو گیا ہے ——— اس کا نام خوار ہے نا وہ اور اس کی بڑی بیٹی آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ اس کی بیٹی کہنے لگی، اتنی خوبصورت ہے، اگر بے چاری کا علاج ہو جائے تو زندگی سنور جائے۔ میں نے بھی ان میں ہاں ملا دی۔

بڑی آپا: خان بہادر کے خاندان کو گلشن پر ترس آ گیا۔ یہی نا، بے چاری تسنیم اپاہج پر۔

کریمی: تم جو چاہو سوچو۔ لیکن میں کہتی ہوں اس میں حرج ہی کیا ہے؟

بڑی آپا: کریمن۔

کریمن: جی بڑی آپا۔

بڑی آپا: نہیں کریمن نہیں۔ میں جانتی ہوں اس کا بوجھ کوئی نہیں اٹھا سکتا۔ میں اس کی ماں ہوں۔ میں بھلائی برائی نہیں سوچ سکتی کیا ہے اور کیا نہیں۔ بیاہ کر گلشن بیاہے جانے کے بعد خوش رہے گی ہاں مجھے معلوم ہے وہ خوش نہیں رہ سکتی ——— یہی ہوگا وہ وہاں دکھی رہے گی بے فریاد کے مرے گی اور میں یہاں اکیلی رہوں گی ——— چارپائی پر بٹھا کر سوا کون اس کے پاؤں دھوئے گا کون اسے کھلائے گا۔ اچھا تو ہوگا۔ میرے سوا کوئی نہیں کر سکتا ——— کوئی نہیں کر سکتا —— کسی کو کیا پڑی ——— (وہ اپنے آپ سے کیا پڑی ہے۔ اچانک چپ ہو جاتی ہے اور پھر کریمن کی جانب دیکھتی ہے) اور میں ——— میں کیا کروں گی۔ مجھے تو اس تصور سے وحشت ہوتی ہے ——— نہیں ——— میں اس چار دیواری میں گھر کر پاگل ہو جاؤں گی ——— پاگل ہو جاؤں گی۔

کریمن: لیکن بڑی آپا ——— ہرج ہی کیا ہے اگر ———

بڑی آپا: کیا؟

کریمن: گلشن سے اشارے میں ——— آگے میں سنبھال لوں گی ———

بڑی آپا: (چونک کر) کریمن! مجھے سب معلوم ہے ——— اس نے ہاں کر دی لیکن خان بہادر نے نہ کر دی تو وہ نہیں نہیں کریمن یہ بات ہی مت چھیڑو۔ گلشن کو سننے دو ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو (چونک کر دائیں جانب کے دروازے کی جانب دیکھتی ہے اور اٹھتی ہے) ہائے میں تو باتوں باتوں میں بھول ہی گئی ——— گلشن کی چارپائی میں نے سائے میں کی نہیں ——— (جاتے ہوئے) گلشن جان ——— ہائے میں تو بھول ہی گئی تم دھوپ میں ہو۔

(تھوڑے عرصہ کے بعد واپس آتی ہے)

زلیخا دیکھو! دھوپ میں بیٹھی رہی۔ کھڑکی بند نہیں کی ——— بس کھڑکی کو ہاتھ لگایا نہیں تو برہم — کیا کروں ———

کریمی: اچھا بڑی آپا میں چلوں ——— حکیموں کے ہاں جانا ہے، سلطانہ نے بلا رکھا ہے۔

(چادر نیچے سے نکال کے جھاڑتی ہے)

بڑی آپا: جمیلہ کے بیاہ کے لیے گی اور کیا۔

کریمی: ہاں!

بڑی آپا: سلطانہ بے چاری کو بھی جمیلہ کا بخار ہے۔

کریمی: جوان بیٹیوں کا بخار سبھی کو ہوتا ہے۔

بڑی آپا: لیوں نہیں کوئی اچھا سا رشتہ تلاش کر دیتی۔ تیرے ہاتھ میں کئی ہوں گے۔ حکیم صاحب خاندانی ہیں جاتے
پیتے ہیں، جمیلہ کی شکل صورت بھی اچھی ہے تعلیم یافتہ بھی ہے۔ حکیم صاحب وضع دار قسم کے لوگ ہیں۔
بیٹی کو تو ہاتھوں ہی ہاتھ کریں گے کوئی برابر کا ڈھونڈ رشتہ۔

کریمی: ہاں جاتی ہوں تو بات کر کے آؤں گی۔ گھر تو دو ایک میری نظر میں ہیں کچھ نہ کچھ کروں گی

(دونوں اٹھتی ہیں)

بڑی آپا: اچھا کریمی سنا ہے حکیم صاحب اور خان بہادر کی بہت دوستی ہے بیشتر وقت ایک ساتھ گزارتے ہیں

کریمی: سیر کو تو ہر روز اکٹھے ہی نکلتے ہیں کبھی حکیم صاحب خان بہادر کو لینے آتے ہیں کبھی خان بہادر حکیم صاحب
کے ہاں آ جاتے ہیں سلطانہ کہتی ہیں بچپن کے بیلی ہیں۔

بڑی آپا: اچھا ——— جمیلہ آنا ملا ب، بہت ٹھیک ——— ہوں ——— اچھا سلطانہ سے کہنا میں
کسی روز آؤں گی ——— کل یا پرسوں ——— میرے ذہن میں ایک ہیں۔

کریمی: میں ابھی کہے دیتی ہوں۔

بڑی آپا: اور سن ——— خان بہادر کے ہاں اگر گلشن کی بات ہو ——— تو ——— کہہ دینا ———
اسے ——— ہاں کہہ دینا اس کی ٹانگیں بے جان ہیں۔ سب ڈاکٹر جواب دے چکے ہیں دم کیسے ہیں
کوشش بیکار ہے ان میں حرکت پیدا نہیں ہو سکتی۔ (کریمی دائیں جانب کے دروازے کی طرف جاتی ہے بڑی آپا
کی نظریں دروازے تک اس کا تعاقب کرتی ہیں)

پردہ

چوتھا منظر

(برآمدہ۔ وہی ترتیب جو دوسرے منظر میں تھی سوائے اس کے
کہ گلشن کی چارپائی کھڑکی سے ذرا ہٹ کے ہے گلشن لیٹی ہے۔
مضمحل ہے اس کی مٹھی میں کاغذ کا گولا سا ہے امتل اس کے قریب
کرسی پر بیٹھی ہے جونہی پردہ اٹھتا ہے۔ کھڑکی ہوا کے زور سے
کھلتی ہے)

گلشن: امتل پھر کھل گئی یہ کھڑکی۔ پھر کھل گئی (کھڑکی کی جانب دیکھتے ہوئے) اسے زور سے بند کر دے
زور سے۔

امتل: میں بہتیرا زور سے بند کرتی ہوں پھر بھی کھل جاتی ہے۔ (بند کرتی ہے)

گلشن: جب یہ جھٹ سے کھلتی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے جس طرح یہ مجھ پر قہقہے لگاتی ہے میرا مذاق اڑاتی
ہے۔ منہ موڑ لیتی ہے) ــــ رونے لگتی ہے) اسے زور سے بند کر دے اچھی طرح بند کر دے۔

امتل: (کھڑکی بند کرنے کے بعد گلشن کی چارپائی پر بیٹھ جاتی ہے) رومت میری پیاری گلشن رومت۔ (آواز بھرا
جاتی ہے) دیکھ میرا بھی جی بھر آیا ہے۔

(دونوں خاموش ہو جاتی ہیں)

گلشن: تمھیں یاد ہے (بھرائی ہوئی آواز میں) میں نے کہا تھا تیرے سامنے ہی تو کہا تھا کہ خولہ یہ بوجھ تجھ سے
نہیں اٹھ سکے گا۔ یہ بہت بڑا بوجھ ہے، اس کا اٹھانا آسان نہیں ــــ لیکن اُسے بڑا مان تھا

(چُپ ہو جاتی ہے)

امتل یہ بوجھ کوئی نہیں، کوئی نہیں اٹھا سکے گا۔

(رونے لگتی ہے۔)

امّل : تو تو بڑی بہادر ہے جس طرح تو اس روگ سے لڑتی رہی ہے اور تو نے اس سے ہار نہیں مانی، یہ تیری ہمت تھی کوئی اور ہوتا تو وہ اوروں پر بھی جینا عذاب کر دیتا اپنے روگ کی وجہ سے دوسروں کے لیے خود روگ بن جاتا۔ سچ کہتی ہوں گلشن تو نے اپنے آپ کو محسوس ہونے نہیں دیا کہ تو روگی ہے۔

گلشن : بس آج مجھے سچ مچ احساس ہوا میں روگی ہوں۔ (آواز بھرا جاتی ہے) سچ مچ اپاہج ہوں۔

امّل : آج تک تو نے اسے مات دی ہے اب کیوں ہمت چھوڑ بیٹھی ہو۔

گلشن : میں نے بڑی کوشش کی امّل۔ یہ روگ مجھے روگی نہ بننے دے لیکن آج مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ جیت آخر اسی کی ہوگی تم ٹھیک کہتی ہو، میں ہمت چھوڑ بیٹھی ہوں۔ (خاموش ہو جاتی ہے پھر یکایک لہجہ بدل کر) نہیں میں اس کی جیت نہیں ہونے دوں گی، میں آخر بدستور لڑتی رہوں گی۔

(بانہوں کے سہارے اٹھ کر گاؤ تکیے سے ٹیک لگا لیتی ہے)

میں خالد کی شرط پوری کروں گی: میں ضرور پہلے علاج کراؤں ـــــ ضرور کراؤں گی، میں خود کراچی جاؤں گی اور جب صحت مند ہو جاؤں گی تو خالد سے کہوں گی خالد ـــــ (چپ ہو جاتی ہے) ـــــ (پھر افسردگی کے لہجے میں) لیکن امّل ـــــ (وقفہ کے بعد) اگر پھر بھی میری ماں ہوئی تو ـــــ پھر بھی میری ٹانگیں بے جان رہیں)

(امّل خاموش رہتی ہے وہ اس کی جانب دیکھتی ہے)

پھر کیا ہوا ـــــ بولتی کیوں نہیں؟

امّل : گلشن!

گلشن : اور پھر یہ شرط خالد کی بھی نہیں ـــــ خان بہادر کی ہے۔

(مٹھی میں بھینچے ہوئے کاغذ کے گولے کو کھولتی ہے اور پڑھتی ہے)

"اگر تم پہلے اپنا علاج کرا لو، تو ابا کی شرط پوری ہو جائے گی اور میں پھر انہیں رضامند کر لوں گا ـــــ اس معاملے میں ان کی رضامندی ضروری ہے۔"

(رونے لگتی ہے)

امتل: میں خدا کی خاطر سب کچھ کرنے کو تیار ہوں ــــــ یہاں سے چلے جانے سے پہلے اُس نے مجھے کیوں نہ بتایا؟ میں اب اس سے کچھ پوچھ بھی تو نہیں سکتی ــــــ میں اور وعدے بھی لے سکتی ــــ امتل بولتی کیوں نہیں ـــ ـــ اچھا اگر میں چپ ہو جاؤں وہ مجھے بلا لیگا بول امتل بول بھی ـ

(اُسے جھنجھوڑتی ہے)

امتل : گلشن (روتے ہوئے) اس خواب کو بھول جا۔ بھول جا پیاری گلشن ـ

گلشن : ہاں بھول جاؤں گی ــــ بالکل بھول جاؤں گی ــــ اپنی اس شکست کو بھی بھول جاؤں گی

امتل : میری پیاری ــــــ (چپ ہو جاتی ہے)

گلشن : چپ کیوں ہو گئی

امتل : (بھرائی آواز میں) کچھ نہیں

گلشن : میری طرف دیکھ ــــــ اِدھر دیکھ ــــــ تمھیں کچھ کہہ رہی تھیں ــــ بول تیرے دل میں کیا ہے۔ تجھے بھی مجھ پر ترس نہیں آتا ـ

(امتل گلشن کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے ــ کھڑکی اور زور سے کھل جاتی ہے)

گلشن : (کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے) یہ میری جان لے لیگی۔ اسے بند کر دو۔ زور سے بند کر دو ـ

امتل : (کھڑکی بند کرتے ہوئے) میری جان گلشن ! میں سچ کہتی ہوں۔ علاج بہانہ ہے، فریب ہے اس فریب میں مت آؤ ـ

گلشن : امتل ! (امتل کو بازوؤں سے پکڑ لیتی ہے) نہیں وہ مجھے فریب نہیں دے سکتا (امتل کو جھنجھوڑتی ہے) وہ مجھے فریب نہیں دے سکتا۔ ایسی بات نہ کہو ـ

(گاؤ تکیہ پر امتل کے بازوؤں کو چھوڑ کر گر پڑتی ہے اور چھت کی طرف دیکھنے لگتی ہے۔)

امتل : لیکن اس کے بس کی بات ہی کہاں ہے ـ

گلشن : خدا کے لیے مجھے پہیلیاں مت بجھاؤ — التجا ہے، مجھے بتا دو امتل، مجھے بتا دو۔ —

امتل : (اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) میری بھولی گلشن۔ خان بہادر نے خالد کو ٹالا ہے اور اُدھر

(چُپ ہو جاتی ہے)

گلشن : اُدھر کیا؟

امتل : (جلدی سے) خالد کی بات جگنو کے ہاں پکی کر دی ہے۔ جمیلہ سے۔

(امتل کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اپنے مُنہ پر رکھ لیتی ہے)

گلشن : امتل — (سسکیاں) نہیں — نہیں میں نہیں مان سکتی، یہ نہیں ہو سکتا — خالد —

امتل : مان جاؤ — مجھے معلوم ہے اب تو بیاہ کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی ہے — وہ اسے نہیں ٹال سکتا

وہ خان بہادر کی ناراضی مول نہیں لے سکتا۔

گلشن : امتل مجھ اپاہج پر کسی نے ترس نہیں کھایا۔ کسی نے ترس نہیں کھایا۔

امتل : خان بہادر کو بتایا گیا کہ تمھاری ٹانگیں بالکل مر چکی ہیں۔ یہ لاعلاج ہیں، ان میں جان نہیں پڑ سکتی

خان بہادر کو بتایا گیا ہے گلشن۔ ڈاکٹر جواب دے چکے ہیں، سب ڈاکٹر جواب دے چکے ہیں —

گلشن : یہ کس نے کہا — یہ میرا دردمند کون تھا (روتی ہے) بتلا دو، یہ بھی بتلا دو۔

امتل : سازش ہوئی ہے سازش۔

گلشن : میں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ میں نے کسی کا کیا کھویا ہے۔ بتاؤ وہ کون ہے۔

(زور سے رونے لگتی ہے)

بڑی آپا : (زور سے) گلشن بٹیا۔ گلشن!

گلشن : بتاؤ امتل!

امتل : میں کیسے بتاؤں — نہ گلشن نہ — تو بس بھول جا — اس سے کچھ حاصل نہیں۔

(کھڑکی زور سے کھلتی ہے)

گلشن : (کھلی کھڑکی کی پرواہ کیے بغیر) امتل میری جان نکلی جا رہی ہے میں اس سے پوچھتی ہوں —

(آنکھیں بند کر لیتی ہے) تُو نے میری ٹانگیں چھینی تھیں، سانسیں میری آنکھیں، میرے کان میری زبان بھی چھین لی ہوتی ـــ ہتل میری چارپائی یہاں سے اٹھوا دو ـــ اور اس کھڑکی کو اتنی زور سے بند کر دو، یہ چاہے بھی تو کھل نہ سکے۔ نہیں اُسے کھلی رہنے دو میں اس سے بھی لڑوں گی ـــ بتا ہتل! وہ کون ہے، وہ کون ہے میرا دشمن بتا۔ دیکھ میرا صبر زیادہ مت آزما۔

ہتل : میری جان گلشن۔

گلشن : دیکھ میں تیری منت کرتی ہوں۔

بڑی آپا : گلشن بیٹیا (دُور سے، لیکن آواز قریب آتے ہوئے) گلشن!

گلشن : بتا ـــ بتا ہتل، بولتی کیوں نہیں۔

ہتل : اے ـــ (رُک جاتی ہے)

گلشن : بول

ہتل : اے ـــ بڑی آپا نے، بڑی آپا نے۔

گلشن : (چیخ کر) آآں ـــ آآں! نہیں نہیں نہیں ہتل نہیں!

ہتل : ہاں خالہ آپا نے کریمی کی معرفت رشتہ کرایا ہے سبھی یہی کہتے ـــ تاکہ تیرا رشتہ وہاں نہ ہو سکے۔

(آپا تیزی سے دائیں جانب کے دروازے میں سے نکل کر آتی ہے اور گلشن کو پکڑ لیتی ہے اور اپنے دونوں بازوؤں میں اپنا منہ چھپا لیتی ہے ـــ)

(گلشن زور سے رونے لگتی ہے)

بڑی آپا ہتل تُو نے غضب ڈھایا ہے تُو نے ظلم کیا، بہت بُرا کیا۔

گلشن : (روتے ہوئے) میں نے تیرا کیا گنوایا تھا ماں ـــ میں نے تیرا کیا گنوایا تھا!

(ہتل سر جھکائے کھڑی رہتی ہے)

بڑی آپا: اس طرح دکھ دینی والی باتیں نہ کرو۔

گلشن: مجھے معلوم نہ تھا اپنے بوجھ کے ساتھ تیرا بھاری پتھر بھی بندھا ہے جس نے میرے بوجھ کو پہاڑ بنا دیا ہے۔

بڑی آپا: گلشن میں تیرا روتا دیکھ لوں گی۔ تیری سب باتیں سن لوں گی پر مجھ سے تیرا دکھ نہ سہا جاتا جو تجھے اس وقت پہنچا جب وہ تمہیں آدھی راہ میں بے سہارا چھوڑ جاتا ــــ وہ تمہیں ضرور چھوڑ دیتا (گلشن سسکیاں لیتی ہے) وہ تمہارا بوجھ نہیں اٹھا سکتا تھا وہ اس کے بس کا روگ نہ تھا وہ تمہیں فریب دے رہا تھا۔

گلشن: جھوٹ جھوٹ ہے۔

بڑی آپا: مجھے معلوم ہے گلشن۔

گلشن: غلط بالکل غلط! ــــ (زور سے روتی ہے)

بڑی آپا: ہاں بیٹیا ــــ اور یہ بھی سوچ (آواز بھرا جاتی ہے) اگر تو مجھے چھوڑ جاتی تو میرا کون تھا تمہیں اپنی اس بوڑھی بے آسرا اماں کا دھیان نہ آیا ــــ میں کس کے سہارے یہاں رہتی میرا تیرے بغیر کون ہے؟ ۔ میں اس چار دیواری میں گھٹ کر پاگل ہو جاتی ــــ پاگل ہو جاتی ــــ

(کھڑکی زور زور سے بار بار بجتی ہے)

گلشن: اماں ــــــــ

بڑی آپا: میری جان ــــــــ

گلشن: اس کھڑکی کو بند کر دو یہ مجھے اپنی شکست یاد دلاتی ہے اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دو اس میں اینٹیں چن دو تاکہ اس کا نشان تک مٹ جائے اس میں کوئی روزن باقی نہ رہے جس میں سے باہر کی ہوا مجھے چھو سکے اسے بند کر دے ــ اسے بند کر دے اور نہیں تو مجھے اندھا، گونگا اور بہرا بھی کر دے ماں ــــ

(رونے لگتی ہے اور اپنے بازوؤں میں منہ چھپا لیتی ہے اور ذرا توقف کے بعد بڑی آپا اٹھ کر کھڑکی بند کر دیتی ہے اور چٹخنی چڑھا دیتی ہے)

پردہ

باشندے

انتظار حسین

کردار

جگو بابا: شہر کا سب سے پُرانا اور نابینا فقیر

شالی: انتہائی جہاندیدہ اور لمنگڑا فقیر

گجریا: جگو بابا کی خوبصورت لڑکی

ٹھیکیدار: سائبان کا محافظ، ظالم و جابر

سائبان کے چند فقیر۔

نوجوان نمبر ۱۔

نوجوان نمبر ۲۔

مقام

ایک عام گذرگاہ

پہلا منظر

(شہر کا یہ پرانا سائبان آج تک اس کی صحیح عمر کا اندازہ کوئی نہیں لگا سکا۔ مُدت سے اسی طرح کھڑا ہے۔ رات اور دن میں اس کے نیچے سے مختلف شکلوں کے ہزاروں انسان گزر جاتے ہیں۔ روتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے، اور یہ سائبان ان تمام جذباتی شکلوں سے بے حس سب کو اپنے نیچے سے گذر جانے دیتا ہے۔ یہ سائبان ایک عام گذرگاہ کے اوپر ہے جس کے دونوں رخوں پر اندھے مفلوج اور لنگڑے فقیر بیٹھے ہوئے ہنستے روتے اور مسکراتے انسانوں سے بھیک مانگا کرتے ہیں۔ سوال کرتے ہوئے ان کی آوازیں بھی مفلوج اور مردہ بن جاتی ہیں۔ یہ قہقہوں اور مسکراہٹوں کے پیچھے دوڑ کر انھیں اپنی غربت اور بھوک کا احساس دلانا چاہتے ہیں اور اکثر حالتوں میں ان کے دراز پھیلے ہوئے ہاتھوں پر کچھ ڈال دیا جاتا ہے۔ ہنسی گریہ کو خیرات کرتی ہے۔ ہنستے اور مسکراتے ہوئے لوگ گزر جاتے ہیں۔ مفلوج اور اندھے فقیر چیخا چلایا کرتے ہیں اور یہ بے حس سائبان اور اس کے نیچے کی خاموش گزرگاہ یہ تماشا دیکھا کرتی ہے۔ پھر جب لوگ اس پر سے گذرتے ہیں، تو تمام فقیر ایک ساتھ صدا لگانا شروع کرتے ہیں۔

"اللہ کے نام پہ ایک پیسہ بابوجی، خدا روزی برقرار رکھے آج جمعرات کا دن ہے سرکار، خدا ہر آفت ہر مصیبت سے بچائے۔ لنگڑے محتاج کو ایک پیسہ بابو صاحب۔ اندھے محتاج کو،

دولہا کی خیر، بچوں کا صدقہ، جان و مال کی خیرات ہو"
لوگ گزر جاتے ہیں آوازیں ڈوب جاتی ہیں پھر چند قہقہے فضا
میں گونج کر ختم ہو جاتے ہیں۔)

گجریا : باجی ہیں کا یہ معاشی ہنستا ہوا چلا گیا۔ اللہ تجھے بھی ہماری طرح محتاج اور بے بس کرے

شالی : (ہنس کر) اسے یہ ہنستے اور مسکراتے ہوئے انسان انھیں تو میں اسی سائبان کی طرح مردہ اور بے حس سمجھتا ہوں، اول تو میں لنگڑا ہوں، ہر ایک کے پاس دوڑ کر پہنچ نہیں سکتا، دوسرے میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ ان کے دل میری ٹانگ سے زیادہ بے حرکت ہیں اور ان میں کوئی تڑپ پیدا نہیں ہو سکتی، ان کے سینوں میں دل کی جگہ پتھر رکھا ہوا ہے اور اسی لیے میں ان قہقہوں اور مسکراہٹوں کے پیچھے نہیں دوڑتا۔

گجریا : موئے تم بڑے بے حیا ہو شالی، روزانہ کم پیسے وصول کرنے پر ٹھیکیدار کی مار کھاتے ہو اور تمھیں شرم نہیں آتی۔

شالی : پگلی! میں نے دنیا میں بہت کچھ کھو کر یہ بے حیائی سیکھی ہے اور وہ غریب ٹھیکیدار مجھے مار ہی کہاں پاتا ہے یہی دو چار دس گھونسے۔ مجھے تو ایسا پتہ چلتا ہے کہ دن بھر کی محنت کے بعد کوئی میٹھا مزا بدن داب رہا ہے۔

گجریا : مگر مجھ سے تو نہیں دیکھا جاتا۔ خدا کے لیے اس سائبان کو چھوڑ دو، کہیں اور چل کر رہو، وہ کمینہ تجھے تو گھنٹوں دبا دبا کر مارتا ہے اور تم بیٹھے دیکھا کرتے ہو۔

شالی : بیٹی اتنی عمر میں، میں نے نہ جانے کیا کیا دیکھ ڈالا۔ اچھے دن بھی میں نے دیکھے اور اب یہ دن بھی دیکھ رہا ہوں، تمھارے ساتھ بیٹھ کر تھوڑی دیر پیار و محبت کی باتیں کر لیتا ہوں۔ مگر میں تمھارا عاشق واشق نہیں ہوں۔ تم سے زیادہ مجھے اپنے خالی پیٹ اور اس سائبان سے محبت ہے۔

گجریا : تو پھر میں اکیلی کہیں چلی جاؤں گی تم اپنے خالی پیٹ کو لیے اس سائبان کے نیچے بیٹھے رہنا

شالی : خفا ہو گئی (ہنس کر) تو کس قدر بھولی ہے گجریا! اری پگلی! یہ محبت ہمارے لیے نہیں

پیدا ہو گئی۔ تجھے کیسے سمجھاؤں تو تو بچپن سے اکدم جوانی میں پھاند گئی، تو نے سائبان کے باہر دنیا نہیں دیکھی ورنہ ایسی باتیں نہ کرتی۔

گجریا: اور تم وقت سے پہلے بوڑھے ہو گئے، میری قسمت سے۔

شالی: ہاں! میں بچپن سے اکدم بڑھاپے تک پھاندا، میں نے دنیا خوب دیکھی اور اس لیے پیار و محبت کی باتوں پر یقین نہیں کرتا۔ تو فضول اپنے دماغ کو مت پریشان کیا کر۔ ہم لوگ اندھے، لنگڑے اور معذور ہیں۔ نہ ہم سے کسی نے محبت کی اور نہ ہم کسی سے محبت کرتے ہیں۔ تیرا تندرست اور خوبصورت جسم اگر محبت مانگے تو کسی اور کو تلاش کر۔

گجریا: تو پھر مجھے یہاں سے چلا جانے دو۔ اس پرانے سائبان کے نیچے میرا اب دل نہیں لگتا۔

شالی: جہاں بھی جاؤ گی وہاں کوئی نہ کوئی سائبان ہوگا۔ جو حس قدر آمدنی اس سائبان کے نیچے ہوتی ہے کہیں اور نہ ہوگی، تجھے نہیں معلوم ہمارے لیے کچھ پابندیاں ہیں۔ اتنی بڑی زمین پر ہم ہر جگہ نہیں رہ سکتے۔ ہم اس کے جسم کے پھوڑے ہیں۔

گجریا: نہ جانے تم کیسی باتیں کرتے ہو، میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔

شالی: (ہنس کر) میری ایک بات مانے گی؟

گجریا: کیا؟

شالی: ٹھیکیدار کی نظروں پر چڑھ جا۔

گجریا: نظروں پر کس طرح چڑھوں؟

شالی: اونہہ! نظروں چڑھنا بھی نہیں جانتی۔ پاگل کہیں کی! جب وہ شام کو آیا کرے تو اس سے ہنس کر بولا کر، بس نظروں پر چڑھ جائے گی۔ اور یہ مار پیٹ کا سارا جھگڑا ابھی ختم ہو جائے گا۔

گجریا: (منہ بنا کر) مگر وہ تو بوڑھا ہے شالی! مجھ سے یہ نہ ہوگا۔

شالی: وہ ہم سے اور تم سے زیادہ تندرست اور جوان ہے۔ تازے پھل، دودھ، دہی اور عمدہ کھانے ہر بوڑھے کو جوان بنا دیتے ہیں۔ اور جہاں یہ چیزیں نہیں وہاں جوانی بڑھاپے سے بدتر ہے۔

(وقفہ)

گجریا : وہ کیا آتو رہے ہیں ٹھیکیدار۔ آج شام سے پہلے ہی آگئے۔ مگر میں اس سے محبت نہیں کر سکتی اس کے بال ایک تو سفید ہو گئے ہیں۔

شالی : پاگل مت بن، ہٹ جا میرے پاس سے۔ ورنہ کلی کی طرح دونوں کی مرمت کرے گا تو آج میرے کہنے سے اس سے ہنس کھیل کر دیکھ۔

ٹھیکیدار : (وزنی آواز کے ساتھ) کیا ہو رہا ہے بدنصیبو؟

(وقفہ)

آوازیں : ٹھیکیدار سلام، ٹھیکیدار سلام، ٹھیکیدار بندگی۔

ٹھیکیدار : (ایک فقیر سے) کیا وصول کیا تو نے؟

فقیر ۱ : چار آنے ٹھیکیدار۔

ٹھیکیدار : (تھپڑ مار کر) بے ایمان سچ بتا۔

فقیر ۱ : سچ کہتا ہوں ٹھیکیدار! آج بہت کم لوگ سائبان کے نیچے سے گذرے۔

ٹھیکیدار : کیوں؟ مسافروں کو سانپ سونگھ گیا تھا، یا ہیضہ کی بیماری کھا گئی تھی، چور کہیں کا، کھڑا ہو جا ایکدم سے، بدھا تلاشی دے۔

فقیر : شوق سے دیکھ لو ٹھیکیدار۔ میں نے تم سے جھوٹ نہیں کہا۔

ٹھیکیدار : (سب طرف ٹٹولنے کے بعد) ہوں ——— منہ تو کھول اپنا۔

فقیر ۱ (منہ کھولتا ہے) آ - آ - آ - آ

ٹھیکیدار : یہ چونی تالو میں چھپائے ہوئے تھا بدمعاش! (ہنس کر) داڑھ سے پربٹ چرا رہا ہے۔

(دو چار تھپڑ اور مارتا ہے)

اور تمھیں کیا ملا جگو بابا!

جگو بابا : نو پیسے ملے ہیں ٹھیکیدار! جس میں سے پورے پانچ ڈبل تم لے جاؤ۔

ٹھیکیدار : بڑھاپے میں تمھارا بھی پیٹ بڑھانے کو جی چاہتا ہے، سچ سچ بتاؤ، ورنہ پڑتا ہے تھپڑ۔

جگّو بابا: (گلوگیر آواز کے ساتھ) یہ ایک دونی اور ہے۔ میں اندھا ہوں، ہر ایک کے پیچھے دوڑنے
سے رہا، اس لیے بھیک کم ملتی ہے۔

ٹھیکیدار: تو پھر تم اس سائبان کے نیچے سے نکل جاؤ، ہم تمھاری جگہ پہ کوئی دوسرا فقیر بلالیں گے۔

گجریا: (آگے بڑھ کر) ٹھیکیدار! انھیں پڑا رہنے دو۔ یہ چلے جائیں گے تو ہم میں سے ایک کم ہو
جائے گا۔ یہ جو کچھ کہتے ہیں، ٹھیک ہے، ان کی کمی ہم لوگ چندہ کر کے تمھیں دے دیں گے۔

ٹھیکیدار: (ذرا سا خوش ہو کر) اچھا اگر تو کہتی ہے تو میں مانے لیتا ہوں۔ مگر دیکھ —— ہاں سمجھ
گئی، میری بھی ایک بات ماننا پڑے گی۔

گجریا: میں مان لوں گی، مگر تم سائبان کے نیچے سے کسی کو نکالو نہیں۔

شالی: (وقت اور موقع سے فائدہ اٹھا کر) ٹھیکیدار! آج ہمارے پلے کچھ بھی نہیں ہے اور نہ ہم کچھ
تمھیں دیں گے۔

ٹھیکیدار: شالی؟ کہاں تھا بے تو لنگڑے۔

شالی: سڑک پہ کھڑا کسی ایسے مسافر کی راہ تک رہا تھا جو راستہ بھول گیا ہو، راستہ جاننے والا تو کبھی
کچھ دے کر نہیں جاتا۔

ٹھیکیدار: (ڈانٹ کر) آج کیا وصول کیا تو نے؟

شالی: وصول کیا کرتا؟ کسی پر میرے باپ کا قرضہ تھا؟ وصول تم کرتے ہو، ہم تو بھیک مانگتے ہیں ٹھیکیدار!
قسم پروردگار کی، دن بھر میں آج پیسے ڈبل ملے، جس کے آگے ہاتھ پھیلاؤ وہی کہتا ہے: تجھے نہیں اب
لڑائی کو دیں گے۔ میں نے تو اب مانگنا ہی چھوڑ دیا ہے، بس خدا سے بیٹھا یہ دعا مانگتا ہوں کہ اگلے جنم میں
مجھے پیدا کیجیو تو لڑکی بنا کر۔

ٹھیکیدار: (ہنس کر) مسخرہ کہیں کا، بدمعاش! اچھا لا مجھے کیا دیتا ہے؟

شالی: گجریا سے مانگو، آج بہت کچھ پا گئی ہے۔

ٹھیکیدار: اسے وہ مانگنا جانتی ہے، کس باپ کی بیٹی ہے، جانتے ہو؟ جگّو بابا سائیں کی، شہر کا مشہور

فقیر: ٹھیک ہے نا گھریا؟

گھریا: سونے سے نے ٹھیکیدار! مگر تم نے انھیں اس وقت مارا یہ برا کیا!

ٹھیکیدار: پاگل لڑکی! اگر پہلے ہی تو ہم سے اس طرح باتیں کرتی تو میں کیوں کبھی تیرے اوپر ہاتھ اٹھاتا، اور جگیا! وہ تو میرے بندگی ہیں، سے یہ پیسے انھیں واپس کر دے ——— اب تجھے معلوم ہوا کہ میں تجھے کس قدر چاہتا ہوں۔

گھریا: ہاں! (ہنسنے لگتی ہے)

ٹھیکیدار: تو پھر گھر بیٹھے گی میرے؟

گھریا: بابا سے کہو، میں کیا جانوں۔

شالی: آج انعام لیں گے ٹھیکیدار جی ہم پینے کی خاطر صبح سے بیٹھا گھریا کو سمجھا رہا ہوں تب جا کر راضی ہوئی ہے۔

ٹھیکیدار: کیوں ری گھریا؟ کیا کہہ رہا ہے شالی۔

گھریا: ٹھیک کہہ رہا ہے ٹھیکیدار۔

شالی: اب تو میرا انعام پکا ہو گیا نا؟ بس دے ڈالو ٹھیکیدار، مجھے اٹھنی، ایک پھر دیکھنا تمھاری شادی کے لیے کیسی جان توڑ کوشش کرتا ہوں۔

ٹھیکیدار: مگر تو نے تو آج کا منافع نہیں دیا اور انعام الٹا مانگ رہا ہے۔

شالی: تمھارے ہی بھلے کے لیے مانگ رہا ہوں اور نہیں تو جانے دو۔

ٹھیکیدار: (عاجز آکر) اچھا رے بھائی سے، مگر مرد کی زبان ایک۔

شالی: (آواز پر زور دے کر) ایک، مار دو ہاتھ پہ ہاتھ۔

ٹھیکیدار: شام ہو گئی اور مجھے بہت دور جانا ہے، ورنہ آج ہی اس قصہ کو ختم کر کے جاتا۔

شالی: میں سب کچھ ختم کر دوں گا، تم جاؤ۔

آوازیں: سلام ٹھیکیدار، ٹھیکیدار سلام، بندگی ٹھیکیدار۔

گھریا: تم نے بغیر بابا سے پوچھے ہوئے وعدہ کیسے کر لیا؟

شالی: (ہنس کر) کھوری کیسی؟ چڑھ گئی نالنظروں پہ۔ وعدہ نہ کرتا تو اٹھنی کہاں سے ملتی۔

گھریا: بڑے چالاک ہو تم شالی۔ مگر بابا اس وقت بہت خاموش بیٹھے ہیں شاید تمھاری بات نہ مانیں

شالی: جگو بابا (سرد آہ کھینچ کر) یہ اب ٹھیکیدار کی مار نہیں برداشت کر سکتے، مگر جھوٹے بھی تو بولتے ہیں۔ اس وقت ایک دو تی سے پیچھے مار کھائی، چلو چل کر انھیں یہ خبر سنائیں۔

(وقفہ)

گھریا: بابا یہ لو پیسے۔ آج سے ٹھیکیدار ہماری آمدنی کا آدھا حصّہ نہیں لیا کرے گا۔ اس کا ہمارا سمجھوتہ ہو گیا ہے۔

جگو بابا: (خوش ہو کر) گھریا؟ آ میری بچی میرے سینے سے لگ جا۔ خدا تیری کمائی میں برکت دے

(شالی ہنستا ہے)

کیوں؟ ہنس کیوں رہے ہو شالی؟

شالی: تمھارے دعا دینے پہ ہنسی آگئی۔ فقیر نے فقیر کو دعا دی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ایک حجام دوسرے حجام کے بیٹھا ہوا بال کاٹ رہا ہے

جگو بابا: باپ نے بیٹی کو دعا دی ہے۔ تم نہ جانے کیسی باتیں کرتے ہو شالی؟ پاگلوں کی سی۔

شالی: اچھا ہوگا جگو بابا۔ چھوڑو، ان باتوں کو سا جھا کرنے ہو۔

جگو بابا: کیسا ساجھا؟

شالی: چرس میں آج کی خوشی چرس پی کر کیوں نہ منائی جائے۔

جگو بابا: کیسی خوشی؟

شالی: تمھاری لڑکی بالغ ہو گئی ہے اور اب اس کی شادی ٹھیکیدار کے ساتھ ہو جائے گی۔

جگو بابا: (تعجب سے) کیا کہہ رہے ہو شالی؟

شالی: میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں، بس اب تو مزے ہی مزے ہیں (گانے لگتا ہے)

سنیاں بیٹھے کوتوال اب ڈر کا ہے کا

گجریا : (سنجیدہ بن کر) یہ لو ایک اٹھنی بابا کی طرف سے ملا لو، آج یہ بھی تمھارے ساتھ چرس پی گئے ہیں تو زندگی میں بابا کو کبھی ہنستے نہیں دیکھا شاید آج تمھارے ساتھ چرس پی کر ہنسیں۔

(وقفہ)

(سائبان کے نیچے سے کچھ لوگ گزرتے ہیں)

شالی : لنگڑے محتاج کو ایک پیسہ بابو صاحب۔

نوجوان : وہ لونڈیا کدھر ہے ؟

(شالی سیٹی بجا کر گجریا کو اشارہ کرتا ہے)

گجریا : بے بس غریب کو ایک پیسہ بابو جی۔

نوجوان : ایک روپیہ لے گی ؟

گجریا : نہیں۔

نوجوان : میرے ساتھ چلے گی ؟

گجریا : نہیں۔

نوجوان : چل تجھے مٹھائی خرید دوں۔

گجریا : نہیں۔

نوجوان : (اکڑ کر) نہیں، نہیں، تو پھر کیا پیسہ مفت کا ہے جو دیدوں چل ہٹ یہاں سے۔

(وقفہ)

شالی : پاگل کہیں کی روپیہ کیوں نہ لے لیا۔

گجریا : مگر وہ تو ساتھ لے جانے کو کہہ رہا تھا ؟

شالی : تو پھر چلی کیوں نہ گئی، تھوڑی دیر میں مٹھائی اور روپیہ لے کر واپس آجاتی۔

گجریا : واہ بابا کو پتہ چل جاتا تو مجھے زندہ زمین میں گاڑ دیتے۔

شالی : (ہنس کر) وہ اندھے ہیں۔ انہیں پتہ کہاں سے چلتا۔ دنیا کی ہر بات کی طرف سے اب ان کی آنکھیں بند ہو چکی ہیں۔ ان آنکھوں کی ساری طاقت اب تمھاری آنکھوں میں آگئی ہے۔ تم دنیا کو دیکھو اور سمجھو۔ اس سائبان کے نیچے اندھے اور لنگڑے لولے فقیروں کے درمیان تمھارا خوبصورت اور تندرست جسم اچھا نہیں لگتا۔

گجریا : تو پھر میں اس خوبصورت جسم کو کہاں لے جاؤں ؟ ٹھیکیدار کے گھر چلی جاؤں گی۔ تمھاری آنکھوں میں تو ہر وقت کھٹکا کرتی ہوں۔

شالی : میں تو تیرے ہی بھلے کے لیے کہتا ہوں۔ مگر دیکھ ٹھیکیدار جو کچھ مجھ سے وصول کرے وہ بعد میں مجھے واپس کر دیا کرنا۔

گجریا : توبہ توبہ کس قدر مطلبی ہو تم۔ ہر وقت اپنا فائدہ سوچتے ہو ——— مگر شالی ! مجھے ٹھیکیدار کے گھر میں دیکھ کر تمھیں تکلیف نہ ہوگی۔

شالی : نہیں مجھے تکلیف نہیں ہوتی۔ میرا پیٹ بھرتا ہے۔ مجھے سب کچھ دیکھنا منظور ہے۔ ہاں تو میرے پیسے مجھے واپس کر دیا کرے گی۔

گجریا : (جل کر) کون جانے وہ واپس کرے گا یا نہیں ؟

شالی : وہ واپس نہیں کرے گا تو عاشق کیسا ؟

گجریا : (بگڑ کر) مجھے نہیں معلوم عاشق واشق کیسے ہوتے ہیں۔ آنکھ کھول کر میں نے تمھیں کو دیکھا مگر تم تو بڑے نکھٹو نکلے۔

شالی : (ہنس کر) تو بگڑنے لگتی ہے بڑی ناسمجھ ہے ——— اچھا سُن ایک اور بات تجھے بڑے پتہ کی بتاؤں۔

گجریا : کہو۔

شالی : سائبان کے نیچے سے ہر جانے والے کی نظر تیرے اُوپر پڑتی ہے۔

گجریا : کیوں ؟

شالی : حسن جو ہے تیرے پاس اور جو تیری ذات برادری کا محتاج نہیں، تو بھکارن ہے اور ایک فقیر کے گھر میں پیدا ہوئی، تیرا حسن بڑا قیمتی ہے۔ پہلے اس کی قیمت ڈھول کر لے پھر ٹھیکیدار کے گھر چلی جانا

گجریا : تم نے زمیرا راج خراب کر دیا ہے شالی! میں تو چاہتی تھی تم میرے ساتھ رہتے، ہم دونوں کسی گاؤں میں چل کر کچا مکان بنا لیتے، کھیت بوتے، اس پیشہ کو چھوڑ کر محنت مزدوری کرتے اور زندگی کے دن گذارتے۔

شالی : یہ سب کچھ ہو جائے گا، میں موجود ہوں ٹھیکیدار بھی کہیں بھاگ نہ جائے گا، مگر اس سائبان کے نیچے سے بھاگتے ہوئے لوگ پھر نہ ملیں گے۔

گجریا : مگر یہ سب کچھ مجھ سے نہ ہو گا شالی۔

شالی : مگر تو سب کچھ میں دوں گا

گجریا : اور پھر ٹھیکیدار تمہیں زندہ چھوڑ دے گا۔

شالی : (ہنس کر) پگلی، اسے پتہ کس طرح چلے گا، رات کے اندھیارے میں نہ جانے کیا کچھ ہوتا ہے اور دنیا نہیں جانتی۔

گجریا : آج تمہیں بغیر پئے ہوئے نشہ ہو گیا ہے شالی! یہ دونوں اٹھنیاں مجھے دیدو، میں جا کر چرس کی پڑیا خرید لاؤں۔

شالی : ہاں جاؤ، دکاندار تمہیں چرس زیادہ دے گا۔

گجریا : یہ کیوں؟

شالی : یوں ہی، زندگی کا ہر سودا جوان عورتیں اچھا خریدتی ہیں۔

گجریا : (گھبرا کر) تم نے پھر بکواس شروع کر دی، اچھا میں جا رہی ہوں۔

(وقفہ)

شالی : جگو بابا تنے خاموش کیوں ہو؟ گجریا چرس لینے بازار گئی ہے آج خوب پئیں گے اور قہقہے لگائیں گے۔

جگو بابا : مگر تم نے گجریا کو اکیلے بازار بھیج دیا؟

شالی : تو کیا ہُوا، وہ جوان ہے، دنیا میں قدم رکھ چکی ہے تم اسے کب تک بنا کے رکھو گے ؟

جگو بابا : میرا یہ مطلب نہیں شالی، شاید ٹھیکیدار بُرا مان جائے۔

شالی : ہوں بُرا مانے تو مانا کرے، ابھی تو گجریا پر ہمارا ہی حق ہے۔

جگو بابا : تم جانو، میں نے تو اب ہر بات تم پر چھوڑ رکھی ہے، بس ضرور چاہتا ہوں کہ اس کا کوئی قدم اونچا نیچا نہ پڑے۔

شالی : دنیا میں میں نے بہت ٹھوکریں کھائی ہیں مجھے ان راستوں کا پتہ ہے، جہاں انسان ٹھوکر کھا کر گرتا ہے

میں چاہتا ہوں کہ وہ تمام راستے گجریا کو دکھا دوں مگر ایک اجنبی سے اس کی انگلی پکڑ کر۔

جگو بابا : شاباش بیٹا۔

شالی : اچھا چپ رہو، سامنے سے کچھ لوگ سائبان کے نیچے آ رہے ہیں، اپنے ہاتھوں کو سامنے پھیلا لو۔

(لوگ سائبان کے نیچے سے گزرتے ہیں، ایک کار اندر آ کر

رُک جاتی ہے)

شالی : لنگڑے محتاج کو ایک پیسہ بابو صاحب !

نوجوان ۲ : ادھر آؤ لنگڑے میاں یہ لو

شالی : (دعائیں دیتا ہُوا بڑھتا ہے) حضور کا اقبال بلند ہو، خدا کمائی میں برکت دے، بچوں کا صدقہ !

نوجوان : (دھیمی آواز سے) وہ لونڈیا کہاں گئی ؟

شالی : ذرا کام سے گئی ہے آتی ہوگی۔

نوجوان : تو پھر کیا ارادہ ہے ؟

شالی : جو حکم ہو۔

نوجوان : وہ بات یاد ہے تمہیں ـــــ ایک دن تم نے کہا تھا ؟

شالی : جی ہاں : زندگی میں وہی ایک بات تو یاد رہ گئی، باقی سب کچھ بھول گیا۔

نوجوان : (ہنس کر) آدمی ذہین معلوم ہوتے ہو، تو پھر کیا کہتے ہو۔ میں رُکوں یا چلا جاؤں ؟

شالی : ذرا سا گھوم کر لوٹ آیئے، تب تک اندھیرا بڑھ جائے گا۔ آپ تو جانتے ہیں سرکار، اندھیرا

گناہ کے لیے تاریکی پہلی شرط ہے۔

نوجوان : (ہنستا ہے) میں تھوڑی دیر میں آؤں گا، اور یہ لو اپنا انعام۔

(کار چلی جاتی ہے)

جگو بابا : کیا ملا شالی؟

شالی : (بیدلی کے ساتھ) ارے وہ تو کوئی بدمعاش تھا، ملا کیا۔ بھیک تو گجریا کے صدقے میں ملتی ہے، وہ تھی نہیں۔ اس لیے کسی کو کچھ نہیں ملا۔

جگو بابا : تو تم نے اپنے شوق کے پیچھے سب کا نقصان کیا۔

شالی : شوق میں نقصان تو ہوتا ہی ہے جگو بابا، چرس پینے کے بعد یہ نقصان یاد نہیں رہے گا، ہماری زندگی کا دوسرا نام ہی نقصان ہے۔ تم نے اپنی آنکھیں کھو دیں، میں نے اپنی ایک ٹانگ، اب اس سے زیادہ اور کیا نقصان ہوگا۔

جگو بابا : تم بے کار باتیں بہت کرتے ہو شالی! گجریا کو بہت دیر ہوئی، کہاں بھیجا تم نے؟

شالی : تم بھی تو بے کار باتیں کرتے ہو، سمجھ لو کہ گجریا تمھارے سامنے بیٹھی ہے۔ اگر ہوتی بھی تو تم اسے نہ دیکھ سکتے۔

جگو بابا : (ہنس کر) تم اتنے عقل مند ہوتے ہوئے بھی بعض باتیں بڑی بے وقوفی کی کرتے ہو، شاید تمھیں نہیں معلوم ہے اسے اپنی اندھی آنکھوں سے بھی دیکھا کرتا ہوں۔ خیر چھوڑو اس قصہ کو، یہ بتاؤ کہ ٹھیکیدار کیسا آدمی ہے، میری گجریا کو خوش رکھ سکے گا؟

شالی : وہ دل و جان سے فدا ہے اس پر، خوش کیوں نہ رکھے گا۔

جگو بابا : (عقیدت کے ساتھ) میں تمھارے اس احسان کو عمر بھر نہ بھولوں گا شالی! تم نے گجریا کی آبرو بچا لی۔ وہ اپنے گھر چلی جائے تو مجھے چین ہو۔

(گجریا آتی ہے)

گجریا : لو بھی اپنی چرس کی پڑیا، شاید کچھ زیادہ ہو۔

شانی : ہاں زیادہ ہے، دیکھو جگو بابا!

جگو بابا : مگر اس پڑیا کی بدولت کئی مسافر جو چھوٹ گئے۔

شانی : ابھی جسے لاکھ کی غرض ہوگی، وہ پھر دوبارہ آکر گجریا کو بھیک دے جائے گا۔ اچھا اب چرس کے دم لگیں۔

جگو بابا : چلے کہاں بیٹھو۔

شانی : اپنی جگہ پر جاکر چلم بناؤں گا۔ وہاں آگ اور تمباکو سب کچھ ہے، تم یہیں بیٹھو، میں تمھیں چلم بنا کر گجریا کے ہاتھ بھیجتا ہوں۔ ادھر آ گجریا میرے ساتھ آ۔

(وقفہ)

شانی : جب تک میں تمباکو اور چرس ملا کر چلم تیار کروں تو ایک گانا سنا۔

گجریا : گانا؟ کون گانا سنو گے؟

شانی : تجھے کیا دو چار گانے آتے ہیں۔ ایک ہی تو گانا جانتی ہے۔ وہی جو دلّی کا ایک بڈھا فقیر تجھے سکھا گیا تھا، وہاں گانا۔ اس وقت آسمان پر کچھ بھولے بھٹکے بادل بھی آگئے ہیں۔

گجریا : (بغیر سازوں کے گاتی ہے) ؎

تہمتیں چند اپنے ذمہ دھر چلے — آئے تھے کیا کرنے اور کیا کر چلے

شمع کے مانند ہم اس بزم میں — چشم نم آئے تھے دامن تر چلے

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے — ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

(ظفر)

شانی : (چلم کا ایک لمبا کش لینے کے بعد کھانستے ہوئے) لے گا ایک لمبا کش تو بھی، یہی کرنے اس دنیا میں ہم آئے تھے، چرس پینے اور بھیک مانگنے۔

گجریا : پہلے بابا کو پلا آؤں، وہ انتظار کرتے ہوں گے۔

شانی : ارے جلدی سے دم تو لگا ایک پگلی!

گجریا : (ملکاکش سے کر کھانستی ہے) ہائے اللہ دھواں چڑھ گیا دماغ پر !

شالی : بس اب جا کر جگو بابا کو دے آ، اور پھر میرے پاس آ کر بیٹھ۔

(لمبا وقفہ)

گجریا : لو بابا چلم۔

جگو بابا : شالی پی چکے ؟

گجریا : ہاں ! اب دوسری چلم وہ تمہارے ساتھ آکر پئیں گے۔

جگو بابا : (ہلکا سا کش لگا کر کھانستا ہے) رات زیادہ ہو گئی ہے۔ اب تو جا کر سو رہ، صبح دن چڑھے تک سویا کرتی ہے اور سارے مسافر نکل جاتے ہیں۔

گجریا : ہاں ! میں سوتے جا رہی ہوں بابا۔

(وقفہ)

شالی : تو پھر کر لے تیاری آج رات کے لیے میں نے سب کچھ طے کر دیا ہے۔

گجریا : (گھبرا کر) کیا طے کر دیا تم نے ؟

شالی : سب کچھ طے کر دیا۔ آج کی رات تو ملکہ بنے گی۔ ایک ہنستا اور مسکراتا ہوا انسان تجھے اپنے ساتھ لے جائے گا۔ آج کی رات تو اچھے اچھے کپڑے پہنے گی، عمدہ عمدہ کھانے کھائے گی آج تجھے بہت روپے ملیں گے۔

گجریا : (آبدیدہ ہو کر) مجھے ڈر لگتا ہے شالی !

شالی : ضرور لگتا ہوگا۔ ہر نئے کام میں پہلے ڈر ہی لگا کرتا ہے مگر یہ ڈر موٹر پر بیٹھتے ہی غائب ہو جائیگا۔

گجریا : (تعجب سے) موٹر ؟ نہیں نہیں شالی، میں موٹر پر نہ بیٹھوں گی مجھے موٹر پر بیٹھا ہوا دیکھ کر یہ لوگ کیا سمجھیں گے۔

شالی : موٹر اس سائبان کے نیچے نہیں آئے گا وہ سڑک پہ آکر رکے گا۔ بس اب تیار ہو جا (آواز بھاری ہو جاتی ہے) آج میں ہمیشہ کے لیے تجھے اس سائبان کے نیچے سے نکال دوں گا تیرا تندرست اور

خوبصورت جسم ان لولے لنگڑے اور اندھوں کے درمیان مجھے بہت بُرا لگتا تھا۔

گجریا: مگر تم رو کیوں رہے ہو شالی:

شالی: کبھی کبھی اپنی محتاجی اور بے بسی پر روتا ہوں بس ایسے کہ ایک انسان ہوں بخیر مجبور بُد ان باتوں کو (موٹر کا ہارن سنائی دیتا ہے) (چونک کر) بس اب چل وہ ہنستا اور مسکراتا ہوا انسان آگیا۔

گجریا: (عاجز آکر) کہاں چلوں تم نہیں چاہتے تو مجھے کیوں اس سائبان کے نیچے سے نکالتے ہو۔

شالی: اس لیے کہ مجھے تم سے محبت ہے تمہارے خوبصورت اور تندرست جسم سے محبت ہے چلو جلدی کرو۔

گجریا: مجھے ڈر لگتا ہے شالی!

شالی: یہ ڈر بھی تیری طرح خوبصورت ہے امیر سے ساتھ ساتھ آ۔ موٹر پر بیٹھی ہے کبھی۔

گجریا: اور کہاں لے جائے گا وہ مجھے؟

شالی: جہاں بھی لے جائے، میں کچھ نہیں جانتا (موٹر کا ہارن بجتا ہے) بس اب جلدی کر چل آمیرے ساتھ۔

(لمبا وقفہ ——————— خاموشی)

نوجوان: لے آئے۔

شالی: جی ہاں!

نوجوان: بٹھا دو، ذرا اس کا منہ اوپر اٹھاؤ (ہنس کر) اس وقت پیسہ کیوں نہیں مانگتی چل اوپر بیٹھ آکے۔

(خاموشی)

شالی: بیٹھتی کیوں نہیں، بیٹھ جا بڑی بات ہے شرایا نہیں کرتے۔

نوجوان: جلدی کرو، رات زیادہ ہو رہی ہے۔

شالی: چل بیٹھ، بات یہ ہے سرکار، گھر سے پہلا قدم ہر لڑکی شرما کر اٹھاتی ہے یہ سائبان اس کا گھر ہے ایک عام گزرگاہ یہ اس کے نیچے پیدا ہوئی، اتنی بڑی ہوئی اور اب جا رہی ہے۔

(دروازہ بند ہو جاتا ہے اور موٹر سٹارٹ ہو کر چل دیتا ہے)

(لمبا وقفہ)

نتالی : کیا سو گئے جگو بابا۔

جگو بابا : جاگ رہا ہوں، کیا دوسری چلم پیو گے؟

نتالی : ہاں اور آج تو یہی سطے ہوا تھا کہ خوب بیٹھیں گے اور خوب قہقہے لگائیں گے۔ ابھی تو کچھ مزا نہیں آیا۔

جگو بابا : بس پھر دوسری چلم بھرو، مزے سے بیٹھے لیٹے پئیں گے۔ سچ کہتا ہوں نتالی آج بہت وقفہ کے بعد اطمینان ملا ہے اور وہ بھی تمھاری بدولت۔ اس وقت سے تمھیں دل ہی دل میں دعائیں دے رہا ہوں۔

نتالی : (ہنس کر) اس عمر میں مجھے تمھاری دعا کی ضرورت نہیں، تمھارے مٹی گئی دو چار دعائیں ہیں وہ تم دوسروں کے لیے رکھو، مالدار ہونے سے رہا، مقدر سدھرنے سے رہا۔ عمر بڑھاؤ گے تو مصیبتیں بڑھیں گی مجھے دعا مت دیا کرو۔

جگو بابا : تم تو نہ الٹی مانتے ہو نہ سیدھی۔ عجیب دماغ کے آدمی ہو، مگر میں تو جو کچھ کہتا ہوں تمھیں اپنا چھوٹا سمجھ کر۔ اب یہ بتاؤ کہ کل ٹھیکیدار سے گھر یا کے متعلق کیا باتیں ہوں گی؟

نتالی : کل کی بات کل پر رہی، تو اب تازی چلم کا پہلا کش تم لگا لو۔

جگو بابا : پہلے تم۔

نتالی : پہلے تم، تم بڑے ہو میں چھوٹا۔

جگو بابا : (ہلکا کش لینے کے بعد کھانستے لگتا ہے) بڑے مزے کی چلم ہے۔ اب تم ایک لمبا کش مارو۔

نتالی : (لمبا کش لگا کر) لو اب تم مزے سے لیٹے لیٹے پیو میں چلا۔ نیند آ رہی ہے۔

جگو بابا : ہاں سو رہو۔

گھر یا کو بھی میں نے آج جلدی سلا دیا، صبح جس وقت مسافر گذرتے ہیں تم لوگ پڑے سویا کرتے ہو۔

نتالی : اجی ہم کیا سویا کرتے ہیں، زندگی سویا کرتی ہے، مقدر سویا کرتا ہے اور اگر جاگتے بھی رہیں تو

دیتا کون ہے، بھیک گجریا کو ملتی ہے اور وہ ملتی رہے گی، مگر اب آج سے تو یہ جھگڑا ابھی ختم ہو گیا۔

جگو بابا: ہاں اور کیا۔ کل وہ اپنے گھر کی ہو جائے گی اور پھر ٹھیکیدار اسے بھیک کیوں مانگنے دیگا۔

شالی : گجریا تو چلی گئی۔

جگو بابا : (گھبرا کر) کہاں ؟

شالی : یہ تو میں بھی نہیں بتلا سکتا۔ مگر اب وہ اس سائبان کے نیچے نہیں ہے (سنجیدہ ہو کر) اس کا خوبصورت اور تندرست جسم ہم مفلوج اور لنگڑے، اندھوں کے درمیان مجھے ہمیشہ سے کھٹکتا رہا۔ اور اس لیے میں نے اسے پکڑ کر نکال دیا (ہنس کر) تمھاری گجریا کی فرمائش تھی کہ ہم دونوں چرس پی کر خوب قہقہے لگائیں۔ مگر ہمارے قہقہوں کی شکلیں دوسری ہیں، ہماری زندگی کا دوسرا نام نقصان ہے، ہمارے ہنسنے کا دوسرا نام رونا ہے جگو بابا ! دل کھول کر رو لو، تمھاری گجریا اس سائبان سے نکل گئی۔ اسے ایک ہنستا اور مسکراتا ہوا انسان یہاں سے لے کر چلا گیا۔

جگو بابا : (تھرتھرائی ہوئی آواز کے ساتھ) اسے ایک انسان لے گیا، ایک انسان، میں اُسے ڈھونڈ نکالوں گا وہ مجھے مل جائے گی۔ میری گجریا مجھے مل جائے گی۔ (پاگلوں کی طرح سے چلانے لگتا ہے) گجریا۔ میری بچی۔ میری گجریا۔ گجریا۔ گجریا۔

(لمبا وقفہ ——————— آثار صبح)

جگو بابا : (بیٹھے ہوئے گلے کے ساتھ) اٹھو صبح ہو گئی شالی، یہ مسافروں کے آنے کا وقت ہے اٹھو سنو شالی، رات بھر میں اپنے ان ہاتھوں سے سائبان بھر میں گجریا کو ٹٹولتا پھرا مگر وہ مجھے کہیں نہیں ملی، آخر وہ کہاں گئی ؟

شالی : میں نے تو تم سے پہلے ہی کہہ دیا کہ وہ یہاں نہیں ہے۔

جگو بابا : پھر تمھیں ضرور معلوم ہوگا کہ وہ کہاں گئی (غصہ میں چلا کر) اُسے تم نے نکال دیا۔ تم میری لڑکی کو نکالنے والے کون تھے۔ تم خود کیوں نہ اس سائبان کے نیچے سے نکل گئے۔ (خوشامدانہ) میں تمھارے

ہاتھ جوڑتا ہوں شالی! میری گجریا مجھے واپس دے دو، میں اسے خود لے کر کہیں چلا جاؤں گا
شالی میری ضعیفی پر رحم کھاؤ۔

شالی: اور اب بھی وہ کسی سائبان ہی کے نیچے سو رہی ہوگی۔ رات بھر کی جاگی ہوئی صبح ہوتے ہوتے سوئی ہوگی۔ تو گھبراتے کیوں ہو جھگو بابا۔ اس دنیا میں مرجانی کے لیے سیکڑوں سائبان ہیں، اس بوسیدہ سائبان کے نیچے اس کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔

جھگو بابا: (بگڑ کر) تم دلال ہو شالی! ضرور تم نے میری گجریا کو کسی کے سپرد کر دیا۔ تمھیں نے اُسے بازار بھیجا، تمھیں نے اس کے حسن کی قیمت بتلا کر اسے ورغلایا۔ اور اب میں اپنی گجریا کو تمھیں سے لوں گا۔ (بے تاب ہو کر) بولو شالی میری گجریا کہاں ہے؟ تم نے اسے کس کے سپرد کر دیا۔ تم خود کیوں نہ اس سائبان کے نیچے سے نکل گئے بولو شالی میری کسی بات کا تو جواب دو۔ تم نے میری دعائیں لینے سے انکار کیا تھا میں اب تمھیں بددعائیں دیتا ہوں سچ کہتا ہوں آسمان تمھارے اوپر گر پڑے گا، زمین تمھارے قدموں کے نیچے سے نکل جائے گی بولو شالی بولو میں نے بددعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیے خداوندا، غفور الرحیم!

(ایک کار سائبان کے اندر داخل ہوتی ہے)

فقیرانہ صدائیں: جان و مال کی خیر، عزت آبرو کا صدقہ، اللہ کے نام پر کچھ خیرات، بیگم کی سلامتی، دولھن دولھا کی خیر۔

شالی: لنگڑے محتاج کو خیرات۔ بیگم صاحبہ کی سلامتی۔

بیگم: (ڈوبی ہوئی آواز میں) میں تو تمھاری دی ہوئی بھیک ہوں مجھ سے کیا مانگتے ہو؟

شالی: (تعجب سے) گجریا! میں نے واقعی تجھے نہیں پہچانا۔

گجریا: میرے بابا کہاں ہیں؟

شالی: وہ سامنے بیٹھے مجھے بددعائیں دے رہے ہیں۔ چلو، انھیں چل کر یہ خوشخبری سنائیں۔

(وقفہ)

جگو بابا: اندھے محتاج کو ایک پیسہ جان و مال کی خیرات!

گجریا: بابا یہ لو روپے۔ آج سے تم بھیک نہ مانگا کرو۔ اب ہمارا سمجھو ہنستی ہوئی اور مسکراتی ہوئی زندگی سے ہو گیا ہے۔

جگو بابا: (جوش میں) گجریا! میری بچی آ سینے سے لگ جا۔ خدا تیری کمائی میں اور برکت دے۔

شالی: (شرماتا ہوا) ساجھا کرتے ہو جگو بابا۔ بہ خوشی چرس پی کر کیوں نہ منائی جائے۔

گجریا: اب ہم اس سائبان کے نیچے نہیں رہیں گے۔ بازار میں کوئی کمرہ لیں گے۔ تم بھی رہو گے ہمارے ساتھ شالی؟

شالی: تم جاؤ۔ مجھے اس سائبان سے محبت ہے۔ دوسرے میں سمجھتا ہوں یہ اتنی بڑی دنیا ایک سائبان ہے اور زندگی ایک ایسی گزرگاہ جس کے دونوں رخوں پر ہنستے اور مسکراتے ہوئے انسان بیٹھے بھیک مانگا کرتے ہیں۔

(پردہ گرتا ہے)

مایا

انتظار حسین

کردار

سلیمہ

طاہر — سلیمہ کا بیٹا

مولوی صاحب

بانو تائی }
چھمو } دو پڑوسنیں

پہلا منظر

سلیمہ جن کی آواز میں گھبراہٹ کی کیفیت ہے۔ آواز دیتی ہوئی داخل ہوتی ہے

سلیمہ : (گھبرائی ہوئی آواز میں) طاہر تو گیا تھا؟ کیا کہا مولوی صاحب نے؟

طاہر : کہہ آیا ہوں۔ ابھی آتے ہوں گے (رک کر) مگر میں پوچھتا ہوں آخر بات کیا ہے اتنی گھبراہٹ کی؟

سلیمہ : (گھبرا کر دبی ہوئی آواز میں) کچھ نہیں۔

طاہر : مگر پھر آپ اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہیں؟

سلیمہ : گھبرائی ہوئی؟ نہیں تو۔ تمہارے باولا ہوا ہے میں کیوں گھبرائی ہوئی ہوتی (مصنوعی سی سادگی کے لہجے میں) میں نے تو مولوی صاحب کو یونہی بلایا تھا کہ لاؤ ان سے تیرے لیے کوئی تعویذ ہی مانگ لوں اللہ کرے تو جلدی نوکر ہو جائے (آواز میں رفتہ رفتہ پیدا ہو جاتی ہے) نہ جانے میری پریشانی کب دور ہوگی اے اللہ وہ کون سا دن ہوگا کہ میرا طاہر نوکر ہوگا اور میں اطمینان سے بیٹھوں گی۔

طاہر : مگر بوا جی آپ نے تو حد کر رکھی ہے۔ نوکری اللہ نے چاہا تو مل جائے گی مگر آپ جو پریشان ——

سلیمہ : نوکری اللہ نے چاہا تو جلدی ہی مل جائے گی۔ آخر اللہ ہماری کب تک نہ سنے گا۔ الٰہی میرے طاہر کو حکومت کی نوکری ملے۔ اس کے گھر لکھ لٹیں دولت سرا دے بہر جائے۔ میرے آگے نوکر لگیں (رک کر سوچتے ہوئے) میں نے کل ایک خواب دیکھا تھا کہ جیسے طاہر نوکر ہو گیا ہے ایک حویلی ہے اور اس میں بیبیاں بھری پڑی ہیں۔ ڈومنیوں کے گیت۔ تھالی میں سلامی کے روپوں کی ڈھیری طاہر کے سر سہرا بندھا ہے۔ رخصتی ڈولی میں دولھن کا سرخ جوڑا پہنے میں بیٹھی (بولتے بولتے رک جاتی ہے۔ لہجہ سرگوشی کا سا ہو جاتا ہے) عجیب خواب تھا ۔۔۔۔۔۔

طاہر : اچھا تو تھا۔ شادی ہوتے دیکھی۔

سلیمہ : (سرگوشی کے سے انداز میں جس میں گھبراہٹ بھی شامل ہے) نہیں —— خواب میں بیاہ دیکھنا

اچھا نہیں ہوتا۔ (آواز تھوڑی سی اونچی ہو جاتی ہے) کمبخت طرح طرح کے وہم آتے ہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔

طاہر: ہوتا کیا۔ آپ کو ہر وقت ایک ہی فکر رہتی ہے۔ دماغ پراگندہ نہ ہو گا تو کیا ہو گا۔

سلیمہ: مجھے تو بھیا اس گھر سے بھی وحشت ہووے۔ اکیلا ڈھنڈار گھر۔ تو تو باہر چلا جاتا ہے۔ اکیلے پڑے پڑے طرح طرح کے خیال آتے ہیں۔ خفقان سا ہونے لگتا ہے (بولتے بولتے رک جاتی ہے اور پھر لہجہ بدل کر) طاہر تو نوکر ہو جاوے تو سب سے پہلا کام یہ کریو کہ ٹوٹے ہوئے کوٹھے کو بنانا

طاہر: ہاں یہ جگہ بے کار پڑی ہے اسے تڑوا کے کمرہ بنوائیں گے۔

سلیمہ۔ اور یہ کمبخت بیری بھی بے کار پڑی ہے۔ اب اس میں بیر وِیر کیا آئیں گے۔ اسے بھی کٹوا دیں گے اس پوری جگہ میں بڑا اسا کمرہ بن جائے گا۔

طاہر: بُوا جی! مرمت تو سارے گھر کی ہو گی۔ دیواروں کو دیکھو کیسی خستہ ہو گئی ہیں اور چھتوں کی منڈیریں تو بالکل ہی ادھڑ گئی ہیں۔

سلیمہ: (لہجہ میں پھر گوشی کی کیفیت آ جاتی ہے) ہاں سارے گھر ہی کی مرمت ہو گی ——— میں نے ایک روز کیا خواب دیکھا کہ ——— کہ گھر کی ساری چھتیں گر پڑی ہیں۔ بس دیواریں کھڑی رہ گئی ہیں (سکوں کی بہت مدھم جھنکار ہوتی ہے۔ سلیمہ چونک اٹھتی ہے) طاہر ——— طاہر سنا ؟

طاہر: (حیرانی اور سادگی سے) کیا ؟

سلیمہ: (ٹالتے ہوئے) کچھ نہیں میں سمجھی ——— میں سمجھی کہ مولوی صاحب ہیں۔ مولوی صاحب کی سی آہٹ ہوئی تھی۔

طاہر: آ جائیں گے مولوی صاحب۔ آتے ہی ہوں گے۔ بُوا جی! یہ بیری واقعی بے کار کھڑی ہے اسے کٹوا دینا چاہیئے اور یہ پھاوڑا اس کے نیچے کیوں ڈال رکھا ہے۔

سلیمہ: (چونک کر) پھاوڑا ؟ (جلدی سے بات بناتے ہوئے) اچھا وہ پھاوڑا۔ ارے وہ تو تندور کھودنے کے لیے منگایا تھا۔ مجھے فرصت ہی نہ ملتی ہے کہ کھود لے ——— (سکوں کی مدھم سی جھنکار پیدا ہوتی ہے

(سلیمہ چونک اٹھتی ہے) طاہر ـــــ طاہر سنا ؟

طاہر : (تعجب سے) کیا ؟ کیا سنا ؟

سلیمہ : (لہجہ بدل کر بناوٹی سادگی سے) کچھ نہیں میرے ہی کان بجتے ہیں۔ میں سمجھی کہ مولوی صاحب نے آواز دی ہے ارے مولوی صاحب نے کب آنے کو کہا ہے ؟

طاہر : بوا جی آپ تو حد کرتی ہیں۔ ابھی کہہ کے آیا ہوں۔ آخر آتے ہی آئیں گے۔

سلیمہ : ہاں آں اور کیا سب سے پہلے تھوڑا ہی بیٹھے ہیں اور کام بھی تو ہیں انھیں۔ مگر کمبخت میں تو ذرا سی بات پر ہولا جاتی ہوں۔ صبح بھی کوئی بات تو نہ تھی۔ بس مجھے یونہی شک پڑا تھا کہ کتنے کتے ۔ک جوتی ہے۔ بات بدل کر) اللہ کرے تو نوکر ہو جائے بس کوٹھے کو پھر بنوا ڈالیں گے۔ جیسا میری وہمی طبیعت ہے۔ طرح طرح کے خیال آتے ہیں۔ برسوں ہو گئے یونہی بند پڑا ہے۔ بس جب سے تیری دادی۔ اللہ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، گذری ہیں۔ یونہی بند پڑا ہے۔ طاہر تجھے اپنی دادی یاد ہیں ؟

طاہر : یاد کیوں نہ ہوتیں، جب ان کا انتقال ہوا ہے تو میں کوئی ایسا بچہ تھوڑا ہی تھا۔ اس کوٹھے میں جنگلے کے برابر ان کی چارپائی بچھی ہوئی تھی۔

سلیمہ : ہاں جنگلے کے برابر ہی ان کی چارپائی بچھی رہتی تھی جنھیں کبھو کب کے قصے سنایا کرتی تھیں رات کو بھیں نیند تو بہت کم آتی تھی۔ بارہ بارہ بجے رات تک پرانے قصے سناتی رہتی تھیں (آواز میں خواب کی سی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے) کہا کرتی تھیں کہ اس کوٹھے کی دیوار کے پیچھے جو خالی میدان پڑا ہے وہاں پہلے ایک بنئے کا گھر تھا کمبخت کے اولاد نہیں تھی۔ اور پیسہ الغار دل تھا۔ بدنصیب نے کیا کیا کہ ساری جمع جتھا دیگ میں بھر کے زمین میں گاڑ دی اور اس پہ سانپ کے دو پتلے آٹے کے پتلے، بنا کے رکھ دیئے۔ آٹے کے وہ تو اس کے مرنے کے بعد سچ مچ کے سانپ بن گئے یہ کالے کالے لمبے لمبے سانپ ـــــ کوٹھڑی میں کسی نے قدم رکھا اور وہ پھن اٹھا کر کھڑے ہو گئے۔

طاہر : بوا جی ! آپ بھی کیسی دقیانوسی باتیں کرتی ہیں۔ آٹے کے پتلے سچ مچ کے سانپ بن گئے حد ہو گئی۔

سلیمہ : بوا دسنو جھوٹ تھوڑی ہے۔ تیری دادی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

طاہر : دادی ماں تو پرانے وقتوں کی تھیں۔ بس ایسے ہی قصے کہانیاں سنایا کرتی تھی۔

سلیمہ : پرانے وقتوں کی تھیں یہ بھی ایک ہی رہی۔ نیم والی گلی کا حال تو بھیا ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ بدنصیب کے تین پوت تھے۔ تینوں اسی بس گئے (آواز بہک کر پھر خواب آگیں لہجہ اختیار کر لیتی ہے) اسے بیٹے کیسی آواز آتی تھی۔ چھن چھن چھن چھن۔ بابا سے لے بیٹیا دیدے۔ بابا سے لے۔ بیٹیا دیدے —— (پاب آنگن کے بیچے کھنکتی ہوئی اس کونے سے اُس کونے تک اس کونے سے اس کونے تک آتی۔ ایک دن سنا۔ دو دن سنا۔ کمبخت ماری کی آخر نیت بگڑ گئی۔ دیگ نکال لی اشرفیوں سے لبالب بھری ہوئی دیگ —— بس دیگ کا نکلنا غضب ہو گیا۔ ایک بیٹا گیا۔ دوسرا بیٹا گیا۔ تیسرا گیا۔ —— ہری ہری تھے آئے اور ختم۔ دکھیا کے تینوں پوت دیکھتے دیکھتے چٹ پٹ ہو گئے۔

(دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ مولوی صاحب کی آواز)

طاہر کی ماں !

سلیمہ : (چونک کر) مولوی صاحب۔ اجی آ جائیے مولوی صاحب۔

(قدموں کی چاپ۔ مولوی صاحب اندر آتے ہیں)

کیوں بی بی ؟ خیر تو ہے اچھے ہو نا ؟

سلیمہ : اجی خدا کا شکر ہے۔ (لہجہ بدل کر) طاہر اسے مولوی صاحب کے لیے پان نہیں ہیں جا ذرا پان لے آ۔

طاہر : ابھی لایا۔ بوا جی۔ (جاتے ہوئے قدموں کی آواز)

سلیمہ : اجی مولوی صاحب ! میں نے طاہر کی نوکری کیلئے ایک وظیفہ پڑھا تھا۔ صبح کی نماز کے بعد پڑھنے بیٹھ جایا کرتی تھی۔ آج آخری دن تھا (لہجہ میں اضطراب پیدا ہوجاتا ہے) مگر وہ —— وہ بگڑ —— اجی مجھے شک سا پڑے ہے کہ پورا نہیں ہوا۔

مولوی صاحب : آخر کیوں شک پڑا ہے جی

سلیمہ: ابھی ابھی ہوا ہے کہ آخری تسبیح پر میرا دھیان بٹ گیا۔

مولوی صاحب: مگر تسبیح تو پوری کر لی تھی؟

سلیمہ: (اضطراب آمیز لہجہ میں) تسبیح تو پوری کر لی تھی ——— شاید پوری نہ کر پائی تھی۔ ابھی مجھے کچھ یاد نہیں۔ تسبیح پھیرتے پھیرتے جھپکی سی آ گئی۔ یہ ہمارا پرانا کوٹھا جو ہے ——— یا شاید بیری کے پیچھے چھپا کا ہوا ——— اور بیری کی جڑ میں ایک کالا سانپ پھن پھیلائے ——— پھر ڈر گئی۔

مولوی صاحب: (سمجھانے کے لہجہ میں) ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے محض وسوسہ تھا شک نہیں کرنا چاہئے۔

سلیمہ: (خوفزدہ لہجہ میں) مگر مولوی صاحب مجھے سچ مچ وہم سا ہو رہا ہے۔

مولوی صاحب: خواہ مخواہ کا وہم نہیں کرنا چاہئے۔ تمہارا وظیفہ جلالی تو تھا نہیں کہ کوئی خطرے کی بات ہو جلالی وظیفہ اگر کا پڑ جائے تو پھر واقعی جان تک یہ نوبت آ جاتی ہے اور دیوانہ ہوتے تو ہم نے کئی کو دیکھا ہے۔ حافظ جی تھے نہیں۔ خدا انھیں غریق رحمت کرے۔ ان کا جلالی وظیفہ کا پڑ گیا آخری دانے پر جو پہنچے تو ایسا تھا کہ سانپ منہ میں جا رہا ہے گھگھیا کے تسبیح ہاتھ سے چھوڑ دی۔ اور ہاتھ منہ کی طرف اُٹھ گیا۔ لو صاحب سارے نفس کشی پر پانی پھر گیا۔ ہر وقت ہاتھ منہ پر رہتا تھا۔ جیسے کوئی چیز منہ سے باہر کھینچ رہے ہوں۔ رات بھر ڈکارتے تھے۔ اسی میں مر گئے۔ (ٹھنڈا سانس بھر کے) اخیر میٹی خراب ہو گئی۔ خدا جنت نصیب کرے۔ مگر بی بی تم کیوں فکر کرتی ہو۔ تمہارا وظیفہ تو جلالی نہیں تھا۔

(ٹھنڈا سانس لے کر چپ ہو جاتے ہیں)

سلیمہ: (دہشت زدہ آواز میں) جلالی تو نہیں تھا مگر مولوی صاحب مجھے طرح طرح کے خیال آتے ہیں۔ صبح سے دم ہوا الٹا ہوا جا رہا ہے۔ گھر کاٹ کھانے کو آتا ہے۔ پرانا کوٹھا ——— بیری کا پیڑ۔ (آواز خواب کی کیفیت اختیار کر لیتی ہے) جیسے زنجیر چھنک رہی ہو۔ دیگ چھنک رہی ہو

سکوں کی بہت مدھم سی پُراسرا جھنکار ایک دم سے پیدا ہوتی ہے اور گم ہوجاتی ہے۔)

سلیمہ ۔ (گھبراکر) مولوی صاحب۔ مولوی صاحب۔ سنا آپ نے؛

مولوی صاحب : (تعجب سے) تمھیں کیا ہُوا جارہا ہے؟

سلیمہ : (سنبھلتے ہوئے) کچھ نہیں۔ کچھ نہیں ——— یونہی مجھے وسوسہ سا ہوتا ہے۔

مولوی صاحب : بی بی! یہ وسوسے دل میں نہ لاؤ۔ کسی دن تم کہتی ہو کہ میں نے یہ خواب دیکھا ہے کسی دن تمھیں در و دیوار پر شک ہوتا ہے کبھی کہتی ہو وظیفہ بگڑ گیا ہے اس قسم کے وہم اچھے بھلے آدمی کو دیوانہ کر دیتے ہیں۔ یہ باتیں دماغ سے نکال دو۔

سلیمہ : (خوفزدہ آواز میں) مولوی صاحب۔ وہ خواب——— وہ ——— وہ خواب جو میں نے اس روز آپ سے بیان کیا تھا۔ بس ویسی ہی آواز ——— جھنکار سی ——— میں دہل گئی۔

مولوی صاحب : بی بی! وہ کوئی خواب واب نہیں تھا۔ آدمی جب پریشان ہوتا ہے تو رات کو وہی پریشان خیالات خواب میں نظر آ جاتے ہیں۔ ایسے خواب محض وسوسے ہوتے ہیں۔ جب ہی تو یاد نہیں رہتے۔ اُن کی تعبیر کچھ نہیں ہوتی۔ پریشان خیال کی کیا تعبیر ہو سکتی ہے۔

سلیمہ : (رونی آواز میں) پریشانی تو میرے دم کے ساتھ ہے۔ اللہ کرے طاہر جلدی نوکر ہوجائے اب تو اس کی نوکری کے بعد ہی پریشانی ختم ہوگی (دعا مانگنے لگتی ہے) اے پروردگار! اس رانڈ دکھیا کی مصیبت کے دن کب کٹیں گے۔ کب میرا بچہ روزگار سے لگے گا۔ الٰہی میرا بیٹا ڈپٹی کلکٹر ہو۔

مولوی صاحب : مگر طاہر کی ماں۔ پریشان ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے جب وہ وقت آتا ہے تو کام خود بخود ہوجاتا ہے۔

سلیمہ : ہاں یہ تو سچ ہے۔ مگر کمبخت اپنے دل کو کیا کروں۔ ہر وقت ذہن میں بس یہی چرخی چلتی رہتی ہے رات کو سوؤں تو یہی خیال۔ دن کو جاگوں تو یہی خیال۔ (رقت بھری آواز میں دعا مانگنے لگتی ہے) الٰہی میرے طاہر کو اپنے حفظ و اماں میں رکھیو۔ میرا ایک بچہ ہے اس پر رحم کیجیو۔ واسطہ تجھے اپنے پیارے حبیب کا

محمد و آلِ محمد کے صدقے میں میرے بچے کی جان کی خیر رکھیو۔ الہٰی اس کی سو برس کی عمر ہو۔ سہرا باندھے۔ بچوں کی بہاریں دیکھے۔ (مولوی صاحب سے مخاطب ہوتی ہے) مولوی صاحب میرے طاہر کے لیے کوئی تعویذ دیدو۔ مجھے شک آ رہے ہے۔

مولوی صاحب: تعویذ کی ضرورت نہیں ہے۔ قُل کا ورد کیا کرو۔ قل کا ورد سب سے بڑا تعویذ ہے اس کے کلام میں بڑی برکت ہے۔

(قدموں کی چاپ۔ بانو تائی اور چھبوں داخل ہوتی ہیں)

بانو تائی: اری سلیمہ اچھی ہے؟

سلیمہ: سلام بانو تائی۔ اجی آپ چھبوں کو کہاں سے پکڑ لائیں اس نے تو میرے گھر آنے کی قسم کھائی ہے۔

چھبوں: اے لو سلیمہ آپا۔ یہ آپ نے اچھی تہمت لگائی۔ میری بھلا آپ سے کیا لڑائی ہے۔ بس یوں کہو کہ گھر سے نکلنا ہوا ہی نہیں کہ آپ کے گھر ——————

مولوی صاحب: (بات کاٹتے ہوئے) اچھا طاہر کی ماں۔ میں چلا

سلیمہ: اچھا مولوی صاحب۔ اجی آپ کو میں نے بڑی تکلیف دی

مولوی صاحب: (بات کاٹتے ہوئے) تکلیف وکلیف کوئی نہیں۔ اللہ جو کرے گا اچھا کرے گا۔

(قدموں کی چاپ — مولوی صاحب جاتے ہیں)

بانو تائی: اری! میں نے سنا ہے کہ طاہر کو نوکری مل گئی؟

سلیمہ: خدا آپ کی زبان مبارک کرے مگر ابھی تو کچھ ہوا نہیں ہے۔

چھبوں: سنیں ہیں کہ آپ کے دیور نے کوشش کی ہے اور بڑی آمدنی کی نوکری مل رہی ہے۔

سلیمہ: بی بی! کوشش تو ہو رہی ہے مگر ابھی کچھ خبر نہیں۔ پرسوں خط آیا تھا کہ انتظام ہونے ہی والا ہے۔ خبر لگتے ہی تار بھیجوں گا۔ میری تو دروازے پر نگاہیں لگی ہوئی ہیں کہ اب تار آیا اور اب تار آیا۔

چھموں : اللہ نے چاہا تو نوکری مل ہی جائے گی۔ بس سلیمہ آپا اب بیاہ کا انتظام کرو۔

سلیمہ : (حسرت بھرے لہجے میں) اری بی بی تجھے ابھی سے بیاہ کی پڑ گئی۔ دلہن آئے گی تو کیا دیکھے گی۔ گھڑے پر کٹور ابھی نہیں ہے۔

بانو تائی : گھڑے پر کٹورا ابھی ہو جائے گا۔ اور کٹورا نہ بھی ہو تو کیا ہے۔ تیرا تو لونڈا ہیرا ہے۔

سلیمہ : (جذباتی انداز میں) ہیرا میرا لال ہے ـــــ ہیرا ہی دولہن لاؤں گی۔ اپنے چاند کے ٹکڑے کے لیے چاند کا ٹکڑا لاؤں گی کہ اجالا ہو جائے۔ مجھے اب اور کیا دیکھنا رہا ہے۔ (لہجہ میں خواب کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے) بس اب تو یہی حسرت ہے کہ اللہ جلدی سے وہ گھڑی لائے کہ میرے لال کے سہرا بندھے اور میرے آنگن میں شادی کا باجہ بجے اور ڈمنیوں کے گیت ہوں۔ دولہن کا ڈولا دروازے پہ آئے۔ ـــــ طاہر کی دولہن۔ میرا طاہر میرا لال حاکم بنے گا۔ ایسی دھوم کا بیاہ کرونگی کہ میری ساری اگلی پچھلی حسرتیں پوری ہو جائیں گی۔ اپنے ہاتھ سے سہرا باندھو گی اور ـــــ

ـــــ (سکوں کی مدھم اور مبہم جھنکار۔ چونک اٹھتی ہے) بانو تائی۔ بانو تائی۔

بانو تائی : اری باؤلی گھبرانے کی کیا بات ہے اللہ نے چاہا تو دھوم ہی سے بیاہ ہوگا تیری ساری حسرتیں پوری ہوں گی۔ اللہ کرے نوکری جلدی مل جائے۔

سلیمہ : (رونے لگتی ہے) ابھی میری ایسی قسمت کہاں ہے۔ کہ میں اپنے ہاتھ سے اس کا سہرا باندھوں۔

بانو تائی : اری باؤلی ہوئی ہے بدشگنی آواز منہ سے نکالتی ہے اللہ نے چاہا تو اب نوکری ملی اور اب

سلیمہ : (حسرت آمیز لہجے میں) نوکری۔ بے باپ کے بیٹے کی کوشش کرنے والا کون ہے۔ آجکل تو نوکریاں اوڑا ہو رہی ہیں۔ گڑا ہوا خزانہ تھوڑا ہی ہے کہ ٹھوکر مارے سے نکل آئے۔

بانو تائی : بہنوں میری، یہ تو قسمت کی بات ہے۔ بعضوں کو نوکری ایسی دھری سی مل جائے جیسے گڑا ہوا خزانہ نکل آیا۔

سلیمہ : (حسرت سے) ہاں قسمت والوں کو تو۔ نوکری پہ کیا ہے گڑا ہوا خزانہ بھی مل جاتا ہے۔

چھموں : اجی چلو۔ رہنے دو یہ تو سب کہنے کی باتیں ہیں، گڑا ہوا خزانہ ہم نے تو کسی کو ملتے نہ دیکھا۔

سلیمہ : تو نے نہ دیکھا ہو گا۔ بی بی قسمت والوں کو خزانے ملے ہی ہیں کیوں بانو تائی ؟

بانو تائی : ہاں ہاں! کیوں نہیں۔ چھوٹی حویلی والوں ہی کو دیکھ لو۔ پہلے کیا تھے۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے بنے ہیں۔ گھر کی ایک دیوار برسات میں ڈھے گئی وہاں چھنکا ہوا۔ انھوں نے راتوں رات دیوار کی نیو کھودی اور ساری دولت نکال لی۔

سلیمہ : (حسرت سے) دیکھو اسے کہتے ہیں قسمت۔

چھمو : (حسرت سے) ہاں اپنا اپنا نصیبا ہے ہمارا جب گھر بن رہا تھا تو نیو کھودتے کھودتے ایک سانتھ چھن سی ہوئی۔ مزدور دوڑے دوڑے آپا جی کے پاس آئے۔ آپا جی نے جلدی جلدی زمین کھدوائی گسلا بار بار دیگ سے ٹکرائے اور کھن کھن بولے۔ سب کو یقین کہ اب خزانہ نکلا۔ بی بی دیگ تو نکل آئی۔ مگر اس میں کوئلے بھرے ہوئے تھے۔

سلیمہ : (حسرت سے) اشرفیاں کہاں گئیں؟

چھمو : (حسرت سے) بس قسمت میں نہ تھیں۔

بانو تائی : اری اچھا ہی ہوا، یہ دولت منحوس ہوتی ہے راس نہ آتی۔ کمبخت بھینٹ لیتی ہے۔

(چند لمحوں کا سکوت)

سلیمہ : (سوچ بھرے لہجہ میں) مگر بانو تائی ——— یہ چھوٹی حویلی والے ہیں انھیں تو خوب راس آئی۔

بانو تائی : اری بیٹی۔ سو میں ایک کو راس آ گئی تو کیا! (خاموش ہو جاتی ہے اور پھر دھیرے سے بڑبڑانے لگتی ہے) غدر کے بعد کیسی جوان جوان موتیں ہوئی ہیں ——— غدر میں سیٹھوں ساہوکاروں نے اپنی اپنی دولت زمین میں گاڑی اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ دولت سرک کے کہیں کی کہیں پہنچی ——— ان دنوں راتوں کو دیگیں کھنکنے کی آوازیں آتی تھیں

(خاموشی۔ پھر بلی کی میاؤں میاؤں کی آواز آتی ہے)

سلیمہ : بلی بلی!

(جوتی کو زمین پر پٹخاتی ہے)

(چند لمحوں کے لیے پھر خاموشی چھا جاتی ہے۔)

سلیمہ : (آہستہ آہستہ) کمبخت پھر کوٹھے میں گھس گئی۔ رات کو بُری طرح روتی ہے۔ مجھے تو ڈر لگنے لگتا ہے۔

(کوّوں کی دُور سے آتی ہوئی آواز تیز ہوتی جاتی ہے اور پھر

دو ہوتی ہوئی معدوم ہو جاتی ہے۔ دور سے اذان کی مدھم آواز)

بانو تائی : آئے ہئے مغرب کا وقت ہو گیا۔ چھموں اُٹھ۔

(چارپائی سے اٹھنے کی آواز۔ قدموں کی چاپ)

چھموں : (چلتے چلتے رک جاتی ہے آواز قدرے دُور سے آتی ہے) اے سلیمہ آپا۔ تم نے بھاوڑا منگا کے ڈال لیا ہے کھود دو گی کب؟

سلیمہ : (چونک کر) کیا؟ (پھر لہجہ سنبھلتا ہے) تندور، تندور کو کہہ رہی ہے ہاں بی بی فرصت نہیں ملی مجھے۔

چھموں : اجی جلدی بنا تندور۔ تندوری روٹی کھانے کو بڑا جی چاہ رہا ہے

سلیمہ : خیر اب تو شام ہو رہی ہے کل بیٹھوں گی کھودنے۔

چھموں : اجی تم تو کل کل کرتی رہو گی۔ لاؤ میں بسم اللہ کروں۔

(قدموں کی چاپ)

سلیمہ : (گھبرا کر) نا بی بی (قدموں کی چاپ۔ سلیمہ بڑھتی ہے) نا بی بی! میں اس کو اس وقت نہ کھودنے دونگی دونوں وقت ملتے ہیں۔ کل دیکھا جائے گا۔

چھموں : اچھا کل نہ کھودو گی تو سلیمہ آپا میں آکے خود کھودونگی

سلیمہ : ہاں ہاں کل آئیو۔ اب تو جا۔

(جاتے ہوئے قدموں کی چاپ)

(وقفہ)

سلیمہ : (آپ ہی آپ بڑبڑاتی ہے) چھموں چلی گئی ـــــ مگر شام ہو رہی ہے ـــــ اچھا کل

(سکوں کی جھنکار کی ایک مدھم سی آواز آتی ہے جو قدرے تیز ہوتی ہے اور ایکا ایکی معدوم ہو جاتی ہے)

(گھبرائی ہوئی آواز میں) اللہ خیر! اللہ خیر۔ الٰہی خیر! (آہستہ آہستہ اٹھتے ہوئے قدموں کی چاپ) شام ہو گئی تو کیا ہُوا؟ کھودنا شروع تو کر دوں۔ نہیں تو کل چھپوں خود (پھاوڑے کی کچی زمین سے ٹکرانے کی آواز ——— دوسری آواز ——— آنگن کے دروازے کے کنوارٹے ذرا ہلتے ہیں سلیمہ چونک پڑتی ہے) کون چھپوں؟ (سرگوشی میں) کوئی نہیں ہے۔ چھپوں چلی گئی۔ وہ تو اب کل (پھاوڑا پھر کچی زمین سے ٹکراتا ہے۔ آہستہ آہستہ اور پھر بٹ سے ٹکرانے کی آواز پیدا ہوتی ہے سلیمہ کی ہچکی کی آواز نکل جاتی ہے) ایں (منہ ہی منہ میں) اینٹ ہے میں ڈر گئی (پھر وہی پھاوڑے کی آواز۔ ہوا سے بیری کے پتوں میں دھیما سا شور اٹھتا ہے)

سلیمہ: (پھر چونکتی ہے اور حلق سے ایک ہلکی سی آواز نکلتی ہے۔ مگر پھر منہ ہی منہ میں کہتی ہے) ہوا۔ ہوا تیز ہو گئی ہے۔ آندھی آئے گی کیا؟

دروازے پر قدموں کی آہٹ ہوتی ہے سلیمہ کے منہ سے آہستہ سے نکلتا ہے "طاہر!" پھاوڑا زمین پر گرنے کی آواز)

طاہر: (آواز دیتا ہوا آگے بڑھتا ہے) بُوا جی چچا جان کا تار (کہتے کہتے رک جاتا ہے) یہ کیا کر رہی رہو اس وقت؟

سلیمہ: (گھبرائی ہوئی آواز میں) کچھ نہیں تن دور ——— ہاں تندور کھودنے بیٹھ گئی تھی۔

طاہر: آپ کو بھی بے وقت کام کی سوجھتی ہے (ایک لحظہ رک جاتا ہے حیران ہو کر) مگر آپ کو یہ ہو کیا رہا ہے۔ ساری پسینے میں بھیگ رہی ہو۔ طبیعت خراب ہے اور کام کرنے بیٹھ جاتی ہیں چلئے اندر چلئے۔

(قدموں کی چاپ)

(سلیمہ اور طاہر اندر داخل ہوتے ہیں سلیمہ کے چارپائی پر لیٹنے کی آواز)

سلیمہ: (اکھڑی ہوئی دھیمی آواز میں) دِل ——— دل پنکھے کی طرح ہل رہا ہے۔

طاہر: آپ کو اختلاج کی شکایت ہے۔ اچھا میں خمیرہ مروارید لاتا ہوں۔ اُسے کھاتے ہی طبیعت ٹھہر

جائے گی۔

(قدموں کی چاپ۔ طاہر چل کھڑا ہوتا ہے۔ سلیمہ گھبرا کر آواز دیتی ہے)

طاہر ——۔ طاہر !

(طاہر واپس آتا ہے)

طاہر : کیوں کیا بات ہے ابھی آیا۔

سلیمہ : (حالت وحشت آمیز آواز میں) نا بیٹا جا بیٹے مت میرے پاس بیٹھ جا۔ آ میرے پاس بیٹھ جا۔ مجھ سے لگ جا۔

(رونے لگتی ہے روتے روتے دم اکھڑ جاتا ہے)

(وقفہ)

(رات کا وقت سناٹا۔ کتوں کے بھونکنے کی دُور سے آتی ہوئی
مدھم آوازیں۔ کبھی کبھی قریب سے کسی کتے کے رونے کی آواز آتی ہے)

سلیمہ : (آہستہ سے) طاہر ! طاہر ! سو گیا ؟ (منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہے) طاہر سو گیا۔ آنکھ لگ گئی۔

وقفہ

(چارپائی سے اٹھتی ہے۔ چولیں آہستہ سے ہلنے کی آواز۔ بہت
دھیرے دھیرے اٹھتے ہوئے قدموں کی چاپ۔ بلی کے رونے
کی آواز)

بڑبڑاتی ہے

بلی —— کوٹھے میں نحوست نے بچے دیئے ہیں۔ (قدموں کی چاپ۔ ٹوٹے کوٹھے کی طرف بڑھتی ہے سرگوشی میں) ہرشت بلی —— (بلی کی میاؤں میاؤں کی مسکین آواز۔ قدموں کی چاپ۔ پھر ایک دم رک جاتی ہے اور خوفزدہ آواز میں سرگوشی کے لہجے میں) بیری کی جڑ میں یہ کیا ہے ؟ کالی رسی —— مری ہوئی ہے ؟ (بہت گہرائی سے سکوں سے بھری دیگ کے کھنکھنے کی مدھم آواز آتی ہے وہ آہستہ آہستہ تیز

ہوتی ہے۔ پھر ایک ساتھ بجلی کی تیزی سے اُبھرتی ہے اور آواز آتی ہے "بابا لے لے بٹیا دیدے"
اور ایک ساتھ دیگ کا منہ جیسے کھل جائے اور سکّے زمین پر بکھر جائیں۔)

(سلیمہ کی چیخ کی آواز)

طاہر: (چونک کر) کون؟ (جاگ کر) بُواجی؟

(بھاگتے ہوئے قدموں کی چاپ سلیمہ کے پاس آتا ہے)

بُواجی، بُواجی! کیا ہوا آپ کو؟

تیزی سے دم گھٹنے کی آواز

—— وقفہ ——

(رات کی خاموشی۔ دُور سے آتی ہوئی کتوں کے بھونکنے کی مدھم آوازیں
کبھی کبھی پہرے دار کی صدا "جاگتے رہو")

سلیمہ کی غشی میں بڑبڑانے کی آوازیں "اوئی ہاں تو اندھیرا ہے
بہت اندھیرا ہے —— رسی، کالی سی رسی (آواز میں
گھبراہٹ پیدا ہو جاتی ہے) طاہر! پیری سے ہٹ جا۔ کالی رسی")

—— وقفہ ——

نہیں دوں گی —— نہیں —— ہشت بلی۔ بلی۔ بلی!

(دفعتہً) نہیں دوں گی۔ نہیں —— بھینٹ نہیں دوں گی۔

(زور سے چیختی ہے) بھینٹ نہیں دوں گی۔ بھینٹ نہیں دوں گی۔

طاہر: (گھبرا کر) بُواجی۔ بُواجی! کیا بات ہے؟

سلیمہ: (غشی سے چونک کر) طاہر!

طاہر: جی! کیا بات ہے بُواجی؟

سلیمہ: تو باہر کیوں نکلا تھا؟

طاہر : نہیں بواجی میں تو آپ کے پاس بیٹھا ہوں ؛

سلیمہ : (غنودہ آمیز آوازیں) ہوں اوں !

(سلیمہ پھر غشی میں چلی جاتی ہے)

(غشی میں بڑبڑانے کی آوازیں) ہر وقت ہاتھ منہ پر رہتا تھا ۔

منہ پر جیسے کوئی جنیز منہ سے کھینچ رہے ہوں ——— ہری تھے ؛

اچھا ؛ ——— ہشت تی بی ——— میٹے آٹے کے سانپ

کے بیپے بنا کے رکھ دیئے (ہنستی ہے)

وقفہ

گڑیا کو ٹھا گر گیا ——— طاہر اسے کو ٹھا گر گیا ۔

——— وقفہ ———

(ایک ساتھ چیختی ہے ۔) نہیں نہیں نہیں نہیں دوں گی ۔ ہینڈٹ نہیں دوں گی ۔

طاہر : بواجی ! بواجی !

سلیمہ (غشی سے چونک پڑنے کی آوازیں) طاہر !

طاہر : جی بواجی !

سلیمہ : غنودہ آمیز آوازیں) بیٹیا ! باہر نکل ۔ کوئی کپڑا و پڑا

(پھر غشی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے)

(غشی میں بڑبڑانے لگتی ہے) اری ابٹنا ل دیا ؛ مہندی ——— ہاں ——— مہندی

(آواز رک کر ذرا بلند ہوتی ہے) بی بی ! برات تیار کھڑی ہے ؛ مجھے اس وقت سو بدھا یاں ؛

. ارے بھئی ڈولا آ گیا ——— دلہن آ گئی ! بسیول کرو طاہر ڈولے کے ساتھ ۔

نہیں ہے ؟ (آواز پھر ڈوبتی چلی جاتی ہے) لال جوڑا ۔ نا بی بی ! میں لال جوڑا نہ پہنوں گی ۔ مجھے

دولہن بنا رہا کوئی ——— (ہنستی ہے) لو بی بی ! میں دولہن بن گئی ۔ (ہنستی ہے ۔ پھر

گانا شروع کردیتی ہے)

آئے براتی سب رنگ کے، لوگ کہیں سب ہنس ہنس کے
چا سب نے گھر سے نکلے ، اور کے گھر میں جائے ڈھیلی

آواز تیز ہو جاتی ہے

ہے کے پیچے دو ساتھ اب اپنے کماکر تو نہیں بس کی اپنے
سکھی پیا کے ساتھ گئی ہیں ایسی گئی پھر وہیں رہی میں
جیا پیا کل، روت انکھیاں، کہاں گئی سب سنگ کی سکھیاں
شوک رنگ گڑیاں تاک میں رکھیاں نہ وہ گھر ہے نہ وہ حویلی
(رونے لگتی ہے ——— ہچکیوں کی آواز ———)

طاہر : بواجی ! بواجی ! کیا بات ہے ؟

ہچکیوں کی آواز مدھم پڑتی چلی جاتی ہے ۔

——— وقفہ ———

(پھر بڑبڑانے کی آواز) ڈولا ؟ ڈولا کھڑا ہے ؟ نا بی بی ۔ میں نہ بیٹھوں گی (ڈر کر) اس پہ تو بھین مڑ رہا ہے (وقفہ سرگوشی میں) ہشت بلی ——— نحوست نے ٹوٹے ۔ ۔ ۔ ۔ کوٹھے میں بچے دیئے ہیں ——— میرے بھی کان بجتے ہیں ۔ نا بابی ! میں نہ روں گی ۔ صدقے واری کر دوں اس پہ سے ۔ خود صدقے ہو جاؤں گی ۔ اے نہ (آواز ڈوب جاتی ہے ۔ ایک ساتھ گھبرا کر) نا بی بی نا ! میں نہ ڈوں گی (بھیانک آواز سے چیختی ہے) نہیں دوں گی ۔ جینٹ نہیں دوں گی ۔

طاہر : (گھبرا کر) بواجی ! بواجی !

وقفہ

(آہستہ آہستہ پھر بڑبڑانا شروع کر دیتی ہے) نا بی بی ! یاں بہت اندھیرا ہے کوئی کپڑا اوڑھا ——— تو جا بی بی ! میں خود کھو دوں گی نا بی بی ! یہ وقت نہیں ہے کھودنے کا ۔ دونوں وقت ملتے ہیں ۔

کل آئیو —— آئی بڑی کوسنے والی میرے بیٹے کو۔ یہ کوستا تو ہوا ہی (سا آواز گھبراہٹ چیخ ہو جاتی ہے) طاہر! ارے طاہر! بیری کے پاس مت (وقفہ) سنا بیٹا مجھے شک آتا ہے۔ (ایک ساتھ چیختی ہے) نہیں نہیں نہیں! دامن! نہیں دوں گی۔ — — —

طاہر: (گھبرا کر) بواجی!

(بڑبڑانے کی آواز دھیمی پڑ جاتی ہے اور ڈوبتی چلی جاتی ہے) ۔۔

سلیمہ: نہیں —— نہیں —— نہیں ——————

—— وقفہ ——

(ایک کتے کے رونے کی دور سے آتی ہوئی آواز، بہرے دل کی آواز بلند ہو کر خاموشی میں گم ہو جاتی ہے۔ گھڑی کی آواز ٹن ٹن چار بجتے ہیں)

طاہر: (آہستہ آہستہ اپنے آپ سے) چار بج گئے۔ بس صبح ہونے والی ہے۔ خدا خدا کر کے رات کٹی۔۔ (آہستہ سے آواز دیتا ہے) بواجی! (پھر اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا ہے۔) بخار تو بہت ہلکا پڑ گیا ہے۔ پسینہ آ رہا ہے۔ اُتر جائے گا —— نبض —— ذرا اکڑی اکڑی سی ہے (پھر آہستہ سے آواز دیتا ہے) بواجی!

سلیمہ: (غشی سے جاگتے ہوئے نقاہت زدہ آواز میں) طاہر! کیا وقت۔۔۔ (نقاہت سے جملہ پورا نہیں ہوتا)

طاہر: بواجی! صبح ہو گئی۔ اُجالا ہو چلا ہے؟

سلیمہ: (نقاہت زدہ آواز میں بڑبڑاتی ہے) ہاں صبح ہو گئی۔

طاہر: (بواجی! آپکو ایک خوشخبری سناؤں؟ رات آپکی حالت بگڑ گئی کہ میں کہہ نہ سکا۔ مجھے نوکری مل گئی ہے۔ گرمجوشی سے) چچا جان کا تار آیا ہے لکھا ہے کہ

سلیمہ: (بڑبڑانے لگتی ہے) تار آیا ہے تار؟ صبح ہو گئی طاہر! (سانس ٹوٹنے لگتا ہے۔) تیرے دادا آ گئے ہیں مجھے لینے۔

طاہر: (گھبرا کر) بواجی! آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں بہکی بہکی سی۔ دیکھئے صبح ہو گئی۔ اب میں ڈاکٹر کے جاؤں گا اور ابھی۔ (چونک کر) بواجی! بواجی! کیا ہوا آپکو (وقفہ روتے ہوئے) بواجی!

(ہچکیوں کی آواز)

پردہ

بخت آور

سید انصار ناصری

کردار

فہیم
قدرت مرزا
انجینئر
بیگم
بختاور
اندھا فقیر
بیٹا
باورچی
رشید
پروفیسر

(دروازہ کھٹ کھٹانے کی آواز)

فہیم : (اندر سے) کون ہے بھئی علی الصبح کون صاحب آن وارد ہوئے۔ ان لوگوں کو سوائے دوسرے لوگوں کی زنجیر کھڑکانے کے اور کوئی کام ہی نہیں۔

(قدموں کی آواز)

کون صاحب ہیں؟ ارشادِ گرامی!

قدرت مرزا : (ڈرتے ہوئے لہجے میں) مَیں مَیں مَیں۔ جی وہ مَیں تھا۔ مَیں مَیں مَیں ہوں۔ مَیں!

فہیم : خوب آپ تھے۔ آپ ہیں اور آپ ہی ہیں۔ فرمائیے کارِ خدمت؟

قدرت مرزا : میں میں۔ وہ یہ بات تھی کہ مجھے۔ مجھے۔ بیگم صاحبہ نے بلوایا تھا۔ مَیں یہاں پڑوس میں قریب ہی رہتا ہوں۔ بیگم صاحبہ نے جی ہاں۔ جی ہاں۔

فہیم : خوب۔ تو گویا آپ عنقریب ہی رہتے ہیں۔ آپ کا نام اسم

قدرت مرزا : میرا نام میرا نام۔ قدرت مرزا ہے۔

فہیم : فطرت مرزا؟

قدرت مرزا : جی نہیں قدرت مرزا

فہیم : اچھا اچھا قدرت مرزا۔ فطرت اور قدرت میں زیادہ فرق نہیں جانتا ہوں۔ مڈل تک تعلیم پائی ہے آئیے اندر تشریف لائیے۔

قدرت مرزا : (اندر آتے ہوئے) جی ہیں۔ بڑی مہربانی۔ بڑی مہربانی۔ بیگم صاحبہ سے کہئے کہ آپکا خادم جان و مال کو دعا دینے والا غلام حاضر ہوا ہے۔ کیا بتاؤں۔ مصیبت میں سوائے ان کے اور کسی کا آسرا نہیں۔ انھوں نے مجھے بڑی بڑی آفتوں سے بچایا ہے۔ میری رگ رگ میں ان کا نمک بسا ہوا ہے

آج پھر انہی کے در کا آسرا لینا پڑا ۔ بے یار و مددگار ہوں ۔ سوائے ۔ سوائے ان کے میرا کوئی آسرا نہیں ۔ اُفوہ !

(چھینک کی آواز)

فہیم : اے ! قدرت صاحب ۔ کدورت نہ کیجئے آپ تو آپ تو قدرت مرزا ۔

قدرت مرزا : (زور سے ناک صاف کرتا ہے)

فہیم : ارے ۔ ارے ارے ۔ آپ تو بالکل ہی ریشہ خطمی ہو گئے ۔ میں ابھی بیگم صاحبہ کو آپ کے تشریف لانے کی ۔ آپ کی حاضری کی اطلاع کرتا ہوں ۔

قدرت مرزا : ذرا ٹھہریئے ۔ ذرا ذرا ۔ میرا سانس قابو میں نہیں ۔ ابھی مجھ میں بولنے کی بھی طاقت نہیں اُف ! آہ ۔ افوہ ۔ اُف میری بیٹا ! آپ نہیں جانتے بھائی آہ میری حالت بیان سے باہر ہے دردِ دل کو کون جان سکتا ہے ۔

فہیم : لیکن میں تو جان گیا ۔ میں تو جان گیا ۔ مڈل تک پڑھا ہوں بھائی صاحب ۔ صورت ہبین حالت پرس یعنی کہ ۔ ابھی فارسی بولا نہیں ہوں ۔

قدرت مرزا : ہاں بھئی (زور سے ناک صاف کرتے ہے)

فہیم : اے مرزا صاحب ! عرض ہے کہ آپ ذرا برابر والے کمرے میں تشریف رکھیں یہ کمرہ صاحب کا ہے وہ آتے ہی ہوں گے وہ علی الصبح ملاقاتیوں سے نہیں ملتے ۔

قدرت مرزا : ہاں ہاں آپ کی مہربانی ہیں ۔ جو نہیں چاہتا کہ صاحب مجھے دیکھیں اس حال میں ان کے سامنے آتے شرم آتی ہے ۔ لیکن بیگم صاحبہ ۔ غریب پرور بلکہ قدم چومنے کو میرا دل ۔ آہ میرا دل اُفوہ ! چلیئے کون سا کمرہ ہے ؛

فہیم : اِدھر تشریف ارزانی فرمائیے ۔ اس طرف ۔ جی ہاں ۔

(قدموں کی آواز ——————— تیز قدموں کی آواز

انجینئر زیر لب گنگناتے ہوئے " وہ کہیں اور سنا کرے کوئی "

کانفرنس کی گھڑ بڑ۔ کبھی چُپ ہو جاتے ہیں۔ کبھی پھر گنگناتے ہیں۔
کبھی پُورا مصرعہ کبھی آدھا چند سے۔ رفتار رہتی ہے)

فہیم : (جلدی جلدی آتے ہوئے) جی ؟

انجینئر : (چونک کر) کون ہے ؟

فہیم : مَیں ہوں فہیم !

انجینئر : ہوں — کہئے ؟

فہیم : مَیں آگیا ہوں صاحب !

انجینئر : یہ تو مَیں دیکھ رہا ہوں۔ مقصد کہئے ؟

فہیم : آپ نے بُلایا تھا نا ؟

انجینئر : نہیں ! مَیں نے نہیں بُلایا۔

فہیم : لیکن مَیں نے تو گھنٹی کی آواز سُنی تھی ؟

انجینئر : تمہارے کان بجنے لگے ہیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے !

فہیم : قصور ! ہی ہی ہی۔ قصور تو میرا بھی نہیں صاحب !

انجینئر : کیوں قصور۔ آپ کا کیوں نہیں ہے۔ صاحب کان آپ کے ہیں یا میرے ؟

فہیم : کان تو میرے ہی ہیں لیکن آواز گھنٹی کی تھی حضور !

انجینئر : اب ختم کرو گے اس بحث کو یا مَیں خودکشی کر لوں۔

فہیم : ہائیں۔ نہیں نہیں۔ خدانخواستہ۔ حضور معاف کیجئے حضور ! مَیں جا تا ہوں صاحب !

انجینئر : جا چکو۔ مگر اسے دیکھو دیکھو !

فہیم : جی !

انجینئر : یہاں کون آیا تھا ؟

(چند سے خاموشی)

فہیم : جناب عرض یہ ہے کہ اگر میں اُس سوال کا صحیح درست جواب دونگا جیسا کہ چاہئے جیسا کہ آپ چاہتے ہیں اور جبکہ میں خود چاہتا ہوں تو براہ کرم ذرا اس کی توضیح فرما دیجئے کہ آپ کا اشارہ ماضی قریب کی طرف ہے یا ماضی بعید کی طرف !

انجینیر : کیا بکواس کر رہے ہو میں پوچھتا ہوں یہاں ابھی ابھی کون آیا تھا ؟

فہیم : اوہ ! ابھی ابھی کون آیا تھا، تو گویا آپ کا اشارہ ماضی قریب کی طرف ہے جی ہاں ! یہاں ابھی ابھی ایک صاحب آئے تھے ۔

انجینیر : ایک صاحب آئے تھے ؟

فہیم : جی ہاں !

انجینیر : ابے بھائی یہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ وہ صاحب کون تھے ۔ کیسے تھے ۔ کیوں آئے تھے کہاں گئے ؟

فہیم : صاحب گذارش یہ ہے کہ ایک سانس میں اتنے سوالوں کا جواب دینا بہت مشکل ہے تاہم میں سعئ پیہم کروں گا ۔ وہ صاحب کیسے تھے اس کے متعلق کچھ عرض کرنا تحصیل کو حاصل کرنا ہے یعنی کہ نہ وہ بہت لمبے تھے اور نہ بہت چھوٹے ۔ نہ بڈھے تھے نہ جوان ۔ انھیں موٹا کہنا بھی ٹھیک نہیں اور دُبلا کہنا بھی ٹھیک نہیں تاہم اس میں کلام نہیں کہ تھے بلے چارے کوئی مصیبت زدہ گردش کے شناکر ۔

انجینیر : گردش کے شناکر ؟ کیا خوب ۔ ہوں !

فہیم : کیوں آئے تھے ۔ اس کے متعلق ان صاحب کا حلفیہ بیان یہ تھا کہ بیگم صاحبہ نے انھیں بلوایا تھا ۔ میں خود از سر تا پا حیرت میں ہوں کہ بیگم صاحبہ نے انھیں کیوں بلوایا تھا ۔ خیر اب رہا نام کا معاملہ تو اک ذرا مجھے سوچنے دیجئے ۔ دیکھئے شاید ان کا نام کثرت مرزا تھا یا شاید عزت مرزا ۔ نصرت مرزا ، شرارت مرزا بہرحال کچھ ایسا ہی ملتا جلتا نام تھا ۔

انجینیر : ہوں ۔ قدرت مرزا تو نہیں ۔

فہیم : جی ہاں ! قدرت مرزا ۔ قدرت مرزا ہی نام تھا !

انجینیر : تو گویا قدرت مرزا میں اور نصرت مرزا اور شرارت مرزا میں کوئی فرق ہی نہیں ہے ۔ کیوں ؟

فہیم : جی کیوں نہیں جناب ، خوب جانتا ہوں ۔ مڈل تک پڑھا ہے ۔ ان سب کی املا و انشا میں زمین و آسمان کا فرق ہے ۔ لیکن میں نے عرض کیا تھا کہ ایسا ہی ملتا جلتا نام تھا ۔

انجینئر : خیر خیر چھوڑو ۔ اس تقریر کو وہ گئے کہاں ؟

فہیم : بیگم صاحبہ کی بیٹھک میں ہیں ۔

انجینئر : تم سے کس نے کہا تھا کہ اُسے گھر میں گھُسنے دو ۔

فہیم : بیگم صاحبہ کا حکم ۔

انجینئر : ہوں خیر جاؤ ۔ اور دیکھو جب وہ چلا جائے تو ہمیں اطلاع دو ۔ کمبخت نے گھر دیکھ لیا ۔

فہیم : بہتر حضور ۔

(جاتا ہے)

انجینئر : عجیب نامعقول نوکر ہے ۔ دماغ چاٹ گیا ۔ مڈل تک پڑھا ہے ۔ خوب ۔

(خفیف ہنسی ــــــ دروازہ کھلنے کی آواز)

بیگم : (آتے ہوئے) ادہو ! آپ آ گئے ۔ میں سمجھی ابھی غسل ہو رہا ہے ؟

انجینئر : ارے بھئی بیگم ! یہ کیسا نوکر تمھارے بھائی نے ہمارے سر مار دیا ہے کمبخت لیکچر بازی کرتا رہتا ہے ہر وقت ۔

بیگم : (خفیف ہنسی کے ساتھ) ادہو اپنا آدمی ہے ۔ عادتوں سے واقف نہیں ، سب ہو جائے گا پڑھے لکھے نوکر ایسے ہی ہوتے ہیں ۔

انجینئر : بھاڑ میں جائیں ایسے پڑھے لکھے نوکر ۔ خیر ہے دیکھو تو کیا تم نے قدرت مرزا کو بلوایا تھا ؟

بیگم : واہ میں کیوں بلواتی ۔ وہ تو خود ہی آیا مصیبت کا مارا ــــــ میں آپ کے کام میں مخل تو نہیں ہوئی ؟

انجینئر : نہیں ۔ ہاں ایک حد تک ۔

بیگم : آپ کام کر رہے ہیں ؟

انجینیر : ہاں جانتا تو ہوں۔ خیر کہیئے ؟

بیگم : میں ایک بات کہنا چاہتی تھی۔

انجینیر : میں جانتا ہوں تم کچھ کہنا چاہتی ہو اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو ؟

بیگم : یہ کیسے جانا آپ نے ؟

انجینیر : کچھ مشکل نہیں جب وہ نالائق موذی گھر میں گھس آتا ہے تو میں نہایت آسانی سے سمجھ جاتا ہوں کہ تم مجھ سے کیا کہو گی۔

بیگم : ارے ارے ایسا نہ کہیئے بے چارہ کوئی بھیک منگا تھوڑی ہے۔

انجینیر : (نقل اتارتے ہوئے) بیگم صاحبہ بڑی سخی داتا ہیں۔ میں بے یار و مددگار ہوں سوائے آپ کے میرا کوئی نہیں۔ میں آپ کا غلام ہوں۔ آپ کے قدم چومتا ہوں۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔

بیگم : آپ نے ضرور سن لیا ہے۔

انجینیر : بالکل نہیں۔ مجھے تو اس کا پورا سبق یاد ہے۔ بدمعاش۔ اچکا کہیں کا۔

بیگم : آپ زیادتی کر رہے ہیں۔ خدا کے غضب سے ڈرنا چاہیئے۔ وہ کوئی بھکاری تھوڑی ہے۔

انجینیر : میں کب کہتا ہوں کہ وہ بھکاری کبھی ہمارے ہاں مانگنے نہیں آتا۔ لیکن حیرت تو یہ ہے کہ بغیر کچھ لیے واپس نہیں جاتا۔

بیگم : اگر آپ اس کی حالت دیکھتے تو کبھی ایسا نہ کہتے۔

انجینیر : معاف کیجیے۔ میں اس کی شکل دیکھنے کا روادار نہیں ہوں

بیگم : غریب کے چیتھڑے لگے ہوئے تھے۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ دو دن سے گھر بھر نے کچھ نہیں کھایا۔ ایک بچے کو نمونیہ ہے۔ دوسرا طاعون میں پڑا ہے۔ بڑھیا ماں گٹھیا کے سبب اپاہج ہے۔ بھوکے کتے نے کاٹ لیا ہے اور اندیشہ ہے کہ کتا کہیں پاگل نہ ہو۔ پچھلے مہینے مکان میں آگ لگ گئی۔ سارا اثاثہ جل گیا اب دو وقت کے فاقے ہیں اور

انجینیر : ارے بس کرو۔ بابا تم تو پورا اخبار سنانے لگیں۔

بیگم : کیا آپ کا خیال ہے کہ باتیں سچی نہیں ہیں؟
انجینیر : خیال - یہ یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ ان میں ایک بھی بات سچی نہیں جھوٹ ـــ کور جھوٹ۔
بیگم : ممکن ہے اس میں کچھ مبالغہ بھی ہو، لیکن بالکل جھوٹ تو نہیں ہو سکتا
انجینیر : اے بیگم! تم نہیں جانتیں اس کو - بڑا مکار ہے - دھوکا باز - فریبی اُسے کہو کہ ایکٹر کا کام کیوں نہیں کرتا بڑا اچھا ایکٹر بنے گا۔
بیگم : آپ تو مذاق کر رہے ہیں - خدا کے خوف سے ڈرنا چاہئے - بتائیے اگر خدانخواستہ ہماری بھی ایسی حالت ہو جائے کہ نہ پیٹ کو روٹی ہو - نہ تن کو کپڑا اور نہ سر چھپانے کو کوئی پناہ تب کیسی ہے؟
انجینیر : بیگم تم ضرورت سے زیادہ نرم دل ہو، شاید میں بھی ایسا ہی ہوں ہم دونوں ضرورت سے زیادہ نرم دل ہیں۔
بیگم : ہاں! اس میں شک نہیں کہ خدا نے ہمیں غریب محتاجوں کی مدد کرنے کی توفیق دی ہے۔
انجینیر : اور اس میں بھی کلام نہیں کہ خدا نے غریب محتاجوں کو بھی بھیک مانگنے کی خوب توفیق دی ہے میں نے تو اب طے کر لیا ہے کہ جب تک تحقیق نہ ہو جائے کہ واقعی حاجت مند ہے میں کسی کو ایک پیسہ نہ دوں گا۔ غضب خدا کا جسے دیکھئے زمانے کا بھیک منگا جو ہے وہ اٹھائی گیرا۔ آج ہی کی ڈاک سے یہ دیکھو اتنے خط آئے ہیں۔

(کاغذوں کی کھڑبھڑ ـــ چند سے خاموشی)

انجینیر : یہ دیکھئے ایک صاحب نہایت نفیس اور خوشبودار کاغذ پر لکھتے ہیں گویا نامہ محبت فرماتے ہیں (پڑھتا ہے) میں ایک غریب و نادار طالب علم ہوں گو فی الحال ایک قلعی گر کے ہاں برتن مانجھتا ہوں۔ لیکن تعلیم حاصل کرنے کا بے حد شوق ہے۔ اگر آپ میرا کوئی وظیفہ مقرر کر دیں تو میری تعلیم کا بندوبست ہو جائے۔ آپ کے سوائے میرا کوئی نہیں۔
بیگم : افسوس!
انجینیر : ہاں افسوس اس بات کا ہے کہ میں نے زمانہ بھر کی تعلیم کا ٹھیکہ کیوں لے رکھا۔

(کاغذوں کی کھڑ بڑ)

انجینئر: یہ ایک اور صاحب ہیں۔ غالباً کوئی خدائی فوجدار ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے (پڑھتا ہے) قوم کے یتیموں کی ناگفتہ بہ حالت کو دیکھتے ہوئے یتیم خانہ حجت اسلام ظہور میں آیا۔ جو پندرہ سال سے بیش بہا خدمات انجام دے رہا ہے۔ کچھ دن سے یتیم خانے کی مالی حالت ٹھیک نہیں۔ آپ کے اخلاق کریمانہ سے امید ہے کہ اپنے پیارے بچوں کے صدقے میں ان یتیموں کی امداد فرمائیں گے۔ آپ لوگ ہی ان بے سہارے بے آسرا معصوموں کے ماں باپ ہیں۔

بیگم: افسوس!

انجینئر: ہاں! افسوس اس لیے کہ خدا نے ہمیں کوئی اولاد نہیں دی ورنہ ہم ضرور یتیموں کی مدد کرتے بلکہ اگر ہم ان یتیموں کے جمعدار صاحب کی ضرور مدد کرتے۔

(کاغذوں کی آواز)

انجینئر: یہ کوئی بڑی بی ہیں۔ کسی سے لکھوا کر بھیجتی ہیں "میرا اکلوتا بیٹا راج گیری کا کام کرتا تھا۔ چار دن ہوئے ایک مکان کی چوتھی منزل سے گر کر شہید ہو گیا۔ اسی دن سے میں بخار میں پڑی رہوں۔ پانی کی بوند کو ترس رہی ہوں کمانے والا مر گیا۔ تم سے جو کچھ راہ خدا امداد ہو سکے کر دو تو میرا آخری وقت ٹھیک سے گذر جائے۔

بیگم: افسوس!

انجینئر: ہاں افسوس اس لیے کہ خدا نے ہمیں اتنا روپیہ نہیں دیا کہ ہم ان ڈھونگ بازوں کی فرمائش پوری کر سکتے بیگم یقین جانو ان میں سے ایک بھی سچا نہیں۔ میں نے بہت دھوکے کھائے ہیں اب خوب تجربہ ہو گیا ہے۔ سب مکار ہیں۔

بیگم: ممکن ہے۔ لیکن پھر بھی یقین کے ساتھ کون کہہ سکتا ہے۔

انجینئر: اور پھر انھیں پر موقوف نہیں ذرا باہر نکل کر دیکھو۔ بیسیوں چمٹ جاتے ہیں کسی کا بچہ بیمار ہے دوا کے لیے پیسے نہیں۔ کوئی بڈھے باپ کو رو رہا ہے کہ کفن کہاں سے آئے لاش ہسپتال میں

پڑی ہے۔ تیسرے صاحب ہسپتال کے لیے چندہ جمع کرتے پھرتے ہیں تاکہ لوگ خوب مریں چوتھے صاحب یلیں سامان بھول گئے۔ وطن جانے کے لیے بے قرار ہیں۔ غرض کون ہے جو نہیں حاجتمند کس کی حاجت روا کرے کوئی" اس طرح تو لکھ دیتی ہو تو کھڑا لیٹ جائے۔ اب تم خود ہی سوچو میں ایک بے چارہ معمولی انجینیر سارے زمانے کے دکھ درد تو مٹا نہیں سکتا۔ ایک شخص کس کس کی مدد کر سکتا ہے اور پھر جو بے چارے سچ مچ مدد کے مستحق ہیں وہ غیرت کے مارے فاقے جھیلتے ہیں اور کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔ پھٹے پرانے کپڑوں کو چھپانے کے لئے گھر سے باہر نہیں نکلتے "کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا" نہ کہ اس موذی قدرت مرزا کی طرح جو اپنی غریبی کا اشتہار دیتا پھرتا ہے۔

بیگم : ٹھیک ہے۔ ہمیں ذرا سختی برتنی چاہئے۔ لیکن اس مرتبہ تو واقعی وہ غریب آنسو بہا رہا تھا اور مجھ سے کسی کے آنسو نہیں دیکھے جاتے۔

انجینیر : کمزور دل والوں کی یہی نشانی ہے۔

بیگم : میں جانتی ہوں لیکن اس جرم میں آپ بھی شریک ہیں۔ خیر میں نے ابھی تک آپ کو تازہ ترین مصیبت تو بتائی نہیں۔

انجینیر : فرمایئے۔

بیگم : بات یہ ہے کہ اس کے مکان دار نے اتنی سختی کر رکھی ہے کہ اگر شام تک کرایہ نہ دیا تو گھر سے نکال دیا جائے گا۔

انجینیر : خدا کی مرضی۔

بیگم : اس لیے غریب مصیبت کا مارا محلہ بھر میں در در کی ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہے کہ کچھ میاں سے کر کرایہ مکان دار کو دیدے۔

انجینیر : اسی لیے آپ کے میاں سے بھی ملنا چاہئے۔ ہے نا ؟

بیگم : ہاں میں چاہتی تو ہوں۔ اگر کچھ ہو سکے تو۔ ————

انجینیر : ہوں (قدرے خاموشی) اچھی بات ہے تم جانو۔ دیدو پانچ روپے۔ لیکن ایک شرط پر۔

بیگم : ہوں !

انجینیر : یہ آخری قسط ہے جو قدرت مرزا صاحب کو دی جارہی ہے اس کے بعد وہ چاہے جتنا سر ٹپکیں ایک پیسہ بھی نہ دیا جائے گا۔

بیگم : اچھی بات !

انجینیر : اور سنو ! ایک اور شرط اس مہینے کی آخیر تک اور کسی کو بھی ایک پیسہ نہیں دیا جائے گا منظور ؟

بیگم : منظور

انجینیر : وعدہ کرتی ہو

بیگم : وعدہ کرتی ہوں

انجینیر : اچھی بات ہے جائیے۔ اسے دفعان کیجئے (قدموں کی آواز) مجھے بہت کام کرنا ہے۔

(چند سے خاموشی ——— فہیم دوڑتا ہوا آتا ہے)

فہیم : حضور ! پرنور۔ فیض گنجور۔ گذارش یہ ہے کہ فدوی کی ایک کر

انجینیر : بک چکو جلدی کیا کہنا ہے ؟

فہیم : (جلدی سے) فدوی یہ ہے گذارش کی۔ کہ کوئی صاحب انجینیر در کھڑا کار ہے ہیں۔ اگر وہ کل والے صاحب ہوں تو کیا فرمایا جائے۔

انجینیر : کل والے صاحب کون تھے ؟

فہیم : اگر میرا حافظہ غلط فہمی نہیں کرتا۔ تو کل والے صاحب وہ تھے جو ذرا چھوٹے حال لمبے قد آور۔

انجینیر : نحتاور ؟

فہیم : جی ہاں وہی قد آور نحتاور جن سے حضور کل نہیں ملے تھے۔

انجینیر : میں ان سے آج بھی نہیں ملوں گا۔ بہت کام ہے ظاہر ہے نہیں مل سکتا سمجھے ؟

فہیم : جی ہاں حضور ! اتنی معمولی بات کا سمجھنا کیا۔ ظاہر ہے (خاموشی) لیکن حضور اگر وہ پرسوں والے صاحب ہوں تب ؟

انجینئر: اُف توبہ۔ تم نے تو جینا دوبھر کر دیا فرمایئے پہیوں والے صاحب کون تھے؟

فہیم: پہیوں والے صاحب وہ تھے۔ وہ موٹے سے سرخ ناک والے۔ سوٹ بوٹ ڈانٹے بیگ دار کیبٹی کے بیگ۔ ببر کے ببر کے ببر کے بیگ رہے

انجینئر: سکرٹری؟

فہیم: جی ہاں۔ جی ہاں سکرٹری، سرکٹی، سرکٹی صاحب آن۔ تب ہی ظاہر ہے۔

انجینئر: کیا ظاہر ہے؟

فہیم: جی کر بہت کام کرنا ہے اور آپ نہیں مل سکتے۔ ظاہر ہے۔

انجینئر: ارے نامعقول ان سے تو مجھے ضرور ملنا ہے فوراً بلاؤ۔

فہیم: جی ہاں جی ہاں کیوں نہیں، کیوں نہیں میرا بھی قصور یہ تھا۔ کہ

انجینئر: سمجھ گئے یا نہیں؟

فہیم: ہاں صاحب۔ کیوں نہ سمجھوں گا۔ اتنی سی بات کا ذہن نشین کرنا کیا۔ اگر پہیوں والے صاحب ہوئے تو کام کرنا ہے ظاہر ہے (یاد کرتے ہوئے) اگر کل والے صاحب ہوں تو فوراً

انجینئر: ارے احمق یہ کیا کہہ رہا ہے؟

فہیم: ذرا ذرا ٹھہریئے میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ ذرا سا عقل سلیم پر زور ڈالا اور عقدہ کشائی ہو گئی دیکھئے نا اگر پہیوں والے صاحب ہوں تو ظاہر ہے۔ اگر کل والے صاحب ہوں تب بھی ظاہر ہے۔ بس اب بالکل ٹھیک ہو گیا۔

انجینئر: ارے جاتے ہو یا میرا مغز چاٹ جاؤ گے؟

فہیم: جاتو۔ جاتا ہوں صاحب (قدموں کی آواز) اگر کل والے صاحب ہوں تو ظاہر ہے اور اگر

(چند سے خاموشی ... دو آدمیوں کے قدموں کی آواز)

فہیم: آیئے تشریف لایئے۔ سرکار وہ صاحب جو کل تشریف لائے تھے۔

[illegible]: آداب عرض!

انجینئر : ہائیں! فہیم میں نے تجھ سے کہا تھا ؟

فہیم : آپ نے جو کچھ ارشاد گرامی کیا تھا وہ میں نے صمیم قلب سے سنا تھا۔ مڈل تک تعلیم پائی صاحب!

انجینئر : ختم کرو اس مڈل کو۔ کیا میں نے صاف صاف نہیں کہا تھا کہ میں ان سے ملنا نہیں چاہتا۔

فہیم : جی ہاں حضور! لیکن کیا کروں۔ ان کی عاجزی پر مجھے رحم آ گیا۔ دل کا نرم ہوں کیونکہ مڈل تک پڑھا ہے۔

انجینئر : عقل کے بھی کم ہو۔ کیونکہ مڈل تک پڑھا ہے جاؤ منہ کالا کرو۔

بختاور : کیا جناب نے مجھ سے فرمایا ہے ؟

انجینئر : نہیں ان عقل کل سے۔ جاتے ہو یا ———

فہیم : جاتا ہوں حضور! لیکن ایک گذارش ہے۔ میرے کانوں میں ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی ہے اگر پرسوں والے صاحب ہوں تو کیا فرمایا جائے ؟

انجینئر : توبہ! تم نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ کوئی بھی ہوں کہہ دو کہ میں لندن گیا ہوا ہوں۔ بس ختم کرو اس جھگڑے کو۔

فہیم : جو حکم سرکار

(جاتا ہے)

انجینئر : نامعقول کہیں کا (قدرے خاموش) ہاں صاحب فرمایئے۔

بختاور : میرا خیال ہے شاید۔ میں سمجھتا ہوں۔ شاید آج آپ مجھ سے ملنا نہیں چاہتے تھے۔

انجینئر : ہاں! بات یہ ہے کہ آج بہت مصروف ہوں۔

بختاور : تو مجھے اجازت دیجیے میں پھر کسی دن حاضر ہوں گا۔

انجینئر : نہیں نہیں اب آپ آ ہی گئے ہیں تو ———

بختاور : آپ کی بڑی مہربانی۔

انجینئر : بیٹھ جائیے۔ تشریف رکھیے۔

بختاور : لیکن میں آپ کا ہرج کر رہا ہوں۔

انجینئر : (کھانسی سے) کوئی مضائقہ نہیں۔

بختاور : جی نہیں میں آپ کے کام میں مخل ہو رہا ہوں۔ پھر کسی دن حاضر ہوں گا۔ پھر کسی دن۔ لیکن پھر
کسی دن آپ سے ملنا دشوار ہوگا تاہم اجازت دیجئے۔

انجینئر : میرے خیال میں بہتر ہوگا اگر آپ ابھی فرمائیں۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟

بختاور : آپ کی بڑی مہربانی! میں میں میں پہلے تو پہلے تو میں آپ کے سامنے اس پھٹے ہوئے
لباس میں آنے کی معافی چاہتا ہوں، کیونکہ —— کیونکہ لیکن سچ یہ ہے کہ میرے پاس اور
کپڑے ہی نہیں

انجینئر : خیر خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ فرمائیے جی!

بختاور (گلا صاف کرتا ہے) میں۔ میرا نام بختاور ہے۔

انجینئر : خوب۔

بختاور : میں اور آپ کے والد ایک ہی دفتر میں ملازم تھے۔ میں ان کا ماتحت تھا۔

انجینئر : مجھے معلوم ہے آپ کا خط مجھے مل گیا تھا مجھے سب حالات معلوم ہیں۔

بختاور : جی جی۔ جی۔ ہاں جی ہاں! آپ کے والد صاحب خدا انھیں جنت نصیب کرے میرے بڑے
کرم فرما تھے۔ مجھ پر ان کے بڑے بڑے احسانات ہیں اور آپ پر میرا سوائے اس کے اور کوئی
بھی زور نہیں اب مجھے ملازمت سے علیٰحدہ ہوئے چار برس ہو گئے ہیں، اس کا حال تو آپ کو معلوم ہوگا۔

انجینئر : ہاں ہاں مجھے سب معلوم ہے آپ فرمائیے اب آپ کیا چاہتے ہیں؟

بختاور : کام۔

انجینئر : کام کس قسم کا کام

بختاور : کسی قسم کا کام۔ اصولاً میں کلرک ہوں۔ بیس برس تک کلرکی کی ہے۔ بک کیپنگ جانتا ہوں۔
ڈبل اکاؤنٹ رکھ سکتا ہوں۔ لیکن ان چار سالوں میں دنیا کا شاید ہی کوئی کام ایسا ہوگا جو میں نے

نہ کیا ہو۔ کچھ دن تک اینٹیں بھی ڈھوئیں ہیں۔ لیکن میں سر پر ٹوکری رکھ کر سیڑھی پر نہیں چڑھ سکتا کبھی نہیں چڑھ سکتا۔ چنانچہ ایک مرتبہ گرا اور اور مرتے مرتے بچا۔

انجینئر : ہوں۔ آپ کا مطلب یہ ہے کہ اس قسم کام کے عادی نہیں ہیں۔

بختاور : جی نہیں۔ عادی وادی کا سوال نہیں۔ میں ڈرتا ہوں صاحب۔ سچی بات ہے میں ذرا ڈرپوک واقع ہوا ہوں۔ ایک مرتبہ مجھے ایک گودام کی چوکیداری کرنی پڑی۔ جہاں کئی مرتبہ چوری ہو چکی تھی خدا ہی جانتا ہے۔ میں نے وہ وقت کس طرح گذارا۔ لیکن جو لوگ میرے محتاج ہیں ان کو میں فاقوں سے مرتا کیسے دیکھ سکتا تھا۔ خیر یہ سب کچھ میں نے ظاہر کرنے کے لیے عرض کیا کہ میں اب بھی دنیا کا ہر کام کرنے کو تیار ہوں۔ ہر ایک کام۔

انجینئر : ہوں : اچھا میں خیال رکھوں گا۔ میں کوشش کروں گا۔ فی الحال تو میں کوئی کام تجویز نہیں کر سکتا۔ لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں کوشش کروں گا۔"

بختاور : آپ کی بڑی مہربانی! میں شرمندہ ہوں کہ اس طرح آپ کے کام میں حارج ہوا۔ لیکن شاید آپ کے بچے تو ہوں گے؟

انجینئر : نہیں میرے یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

بختاور : تب تو آپ نہیں سمجھ سکتے۔

انجینئر : آپ کے بچے ہیں؟

بختاور : جی ہاں دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ہم میاں بیوی تو خیر کسی طرح گذارا ہی لیتے ہیں۔ لیکن ان دو جانوں کیلئے روٹی تلاش کرنی پڑتی ہے دن دن بھر اور رات رات بھر ......

پیسے پیسے دو دو پیسے کی مزدوری کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہوں پھر بھی ان کا پیٹ نہیں بھر سکتا یقین جانیئے۔ کئی کئی راتیں آنکھوں میں کٹ گئیں۔ اسی فکر میں کہ کل کا دن کیسے کٹے گا روٹی کی مار بڑی مشکل ہوتی ہے۔ جناب خیر۔ مجھے آپکو پریشان کرنے کا کوئی حق نہیں۔

انجینئر : جی نہیں۔ کوئی بات نہیں۔

بختاور : دُنیا میں اُولاد سے بڑھ کر انسان کسی چیز سے محبت نہیں کرتا لیکن محبت سے پیٹ نہیں بھر سکتا ہم چاہے ان سے کتنی محبت کرنے لگیں۔ لیکن کیا کبھی اس جرم کی تلافی کر سکتے ہیں کہ ان کو دنیا میں لاکر فاقوں سے تڑپا رہے ہیں۔ (چند سے خاموشی۔ ہچکی کی آواز) معاف کیجیے۔

(خفیف وقفہ)

انجینئر : (ہمدردی سے) آہ۔ اس طرح رنج نہ کیجیے۔ گھبرائیے نہیں۔ خدا مددگار ہے۔ جلد سے جلد کوئی بندوبست کر دوں گا۔

بختاور : خدا کرے جناب جلد کوئی ذریعہ تجویز کر دیں۔ کیونکہ اب یہ حالت ہے کہ مجھے کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ لیکن میری بیوی پڑوس میں آگ مانگنے بھی نہیں جا سکتی۔ کیونکہ اس کے پاس تن ڈھانکنے کو چادر نہیں ہے۔ گھر کا ایک ایک تار بک چکا۔ برتن بھانڈے۔ سامان وغیرہ سب قرض خواہوں کی نذر ہو چکے اور اب کوئی چیز باقی نہیں جسے بیچ کر ایک وقت کی روٹی کا سہارا ہو سکے۔

انجینئر : میں آپ کے لیے جلد ہی کوئی کام تلاش کروں گا آپ فکر نہ کیجیے۔

بختاور : آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لائق میرا منہ نہیں۔ خدا آپ کو اس کا اجر دے گا (چند سے خاموشی) لیکن میں چاہتا تھا کہ ———

انجینئر : فرمائیے کیا ؟

بختاور : مجھے کہتے ہوئے شرم آتی ہے کیونکہ میں نے آج تک کبھی ——— کیا عرض کروں و

انجینئر : اوہو ! اچھا آپ کا مطلب ہے کہ فی الحال یعنی جب تک کام نہ ملے گذارہ کرنے کے لئے کچھ

بختاور : جی جی۔ جی ہاں۔ اگر آپ آسانی سے کچھ مدد کر سکیں تو ———

انجینئر : ہاں ! (خاموشی) نہیں نہیں ! معاف کیجیے بختاور صاحب میں فی الحال کوئی مدد نہیں کر سکتا۔

بختاور : جی

انجینئر : بختاور معاف کیجئے گا۔ میں کوئی مالدار آدمی نہیں ہوں میرے پیچھے بھی سینکڑوں خرچ لگے

ہوئے ہیں۔ گنجائش نہیں۔ میں آپ کو کوئی مالی امداد نہیں دے سکتا۔ البتہ میں آپ کے لیے مزید کوئی کام تلاش کروں گا۔

بختاور: کوئی مضائقہ نہیں۔ آپ کی بڑی مہربانی۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ میرا کوئی حق نہیں ہے میں تہِ دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں ایک آدھ دن میں پھر حاضر ہوں گا۔

انجینئر: (ہراساں) ایک ہفتہ بعد۔ بہت اچھا آپ کا بہت بہت شکریہ آداب عرض۔

(جاتا ہے ——— آہستہ قدم)

انجینئر: چلا گیا بے چارہ۔ واقعی مدد کا مستحق معلوم ہوتا ہے (قدموں کی آواز) فہیم۔۔۔۔۔!

فہیم: حضورِ عالی!

انجینئر: کون تھا ٹیلیفون پر؟

فہیم: سکریٹری صاحب جو پرسوں آئے تھے۔

انجینئر: کیا کہتے تھے؟

فہیم: کہتے تھے آپ کا چیک تیار رکھا ہے اگر حضور اندرونِ خانہ ہوں تو وہ آئیں۔

انجینئر: (دانت پیس کر) اُف۔ بدمعاش تُو نے خون پی لیا۔ ابھی نکلو یہاں سے۔ فوراً۔ خبردار۔ جو مجھے اپنی شکل دکھائی۔

فہیم: پر حضور میرا قصور؟

انجینئر: یہی کہ تم نے مڈل تک تعلیم پائی ہے۔

پردہ

۹

دُوسرا منظر

(بازار — دُور سے موٹروں تانگوں کی آوازیں قریب سے قہقہے ۔
ناچ رنگ احباب دو ایک بار " یار قدرت مرزا " پکارتے ہیں ۔ ایک اندھا فقیر
اپنے بچے کے ساتھ رباب بجاتا ہوا قریب آتا ہے ۔ قہقہوں کی آوازیں ذرا
مدھم ہوتی ہیں ۔ قریب آکر رباب بند کر دیتا ہے)

فقیر : یہاں کیا ہو رہا ہے بیٹا —— !

بیٹا : بہت سارے آدمی بیٹھے بابا کچھ پی رہے ہیں ؟

فقیر : کچھ پی رہے ہیں ؟

بیٹا : ہاں بابا !

فقیر : تو چلو بیٹا یہاں سے ۔ یہ جگہ ٹھیک نہیں ۔ یہ سب خدا کو بھولے بیٹھے ہیں ۔ آگے چلو ۔

(قدموں کی آواز —— قہقہے بند)

بیٹا : یہ جگہ ٹھیک ہے بابا ۔ یہاں بیٹھ جاؤ ۔ دیوار سے لگ کر ۔

فقیر : اچھا بیٹا (بیٹھ کر) ہائے اللہ پیالہ میرے پاس رکھدے اور تو جا بیٹا روٹی کھالے ۔ پھر یہاں سے دوسری جگہ چلیں گے ۔ میں اتنے میں یہیں بیٹھتا ہوں ۔

(چند سے خاموشی)

(ایک طرف سے تیز ہوں اور دوسری طرف سے آہستہ)

قدرت مرزا : اے بھائی نجھا تار صاحب !

نجھادر : (دُور سے) اوہو ۔ قدرت مرزا صاحب ہیں (قریب سے) آداب عرض ہے بھائی ۔

قدرت مرزا : (خفیف نشے کی حالت میں) تم تو عید کا چاند ہو گئے ہو ملتے ہی نہیں کیا حال چال ہے ۔

بختاور : بُری حالت ہے۔

قدرت مرزا : بہت دبلے ہو گئے کیا بات ہے کیا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔

بختاور : ہاں کچھ زیادہ ہضم نہیں ہوتا

قدرت مرزا : دیکھو میں تم کو خوش رہنے کا راز بتاتا ہوں غور سے سنو۔ خوب کھاؤ اور خوب پیو۔ بس کیا۔

بختاور : مگر بھائی۔ کھاؤں تو جب ۔جب کھانے کو ملے۔

قدرت مرزا : کیوں کیا اب دفتر میں ملازم نہیں ہے ؟

بختاور : آج سے ؟ چار برس ہو گئے۔ بھائی۔ چار برس۔

قُدرت مرزا : کیا نکال دیا ؟

بختاور : ہوں ۔

قدرت مرزا : کیوں ؟

بختاور : قسمت ۔

قدرت مرزا : مگر تم تو قسمت والے ہو۔ بختاور ہو معلوم نہیں تمھارے ماں باپ نے تمھارا نام بختاور کیوں رکھا ؟

بختاور : اس لیے کہ میری اور قسمت کی نہیں بنتی ۔

(چندے خاموشی)

قُدرت مرزا : اچھا دیکھو دوست تمھیں ایک ترکیب بتاتا ہوں ۔ میرے گھر کے قریب جو صاحب رہتا ہے اُسے جانتے ہو ؟

بختاور : کون ۔ وہ انجینئر صاحب ؟

قدرت مرزا : ہاں ہاں ! وہی ۔ بڑی نرم آسامی ہے ۔ تم ذرا ایک بار وہاں جاکر تو دیکھو۔ پھر کچھ لائیے

بختاور : ہاں وعدہ

قدرت مرزا : اوہو ! تو شاید اسی لیے کہ تم سے تھوڑی دیر پہلے میں وہاں گیا تھا ؟

بختاور : تم ؟

قدرت مرزا : ہاں !

بختاور : پھر کچھ لائے ؟

قدرت مرزا : ارے انھوں نے ایک نہ دو اکٹھے پانچ روپے زبردستی سر منڈھ دیئے

بختاور : پانچ روپے ! لیکن دوست تم آخر ترکیب کون سی کرتے ہو۔ کہتے کیا ہو ؟

قدرت مرزا : یہ ہمارا خاص ہنر ہے۔ خداداد بات ہے۔ سکھانے سے نہیں آسکتا۔ میں بوسے جاتا ہوں بوسے
جاتا ہوں اور شکل بنا لیتا ہوں مُردوں کی سی اور پھر رو دیتا ہوں۔

بختاور : کیا تم جب بھی چاہے رو سکتے ہو ؟

قدرت مرزا : ارے صرف رونا۔ میں اس فن میں یہاں تک مہارت رکھتا ہوں کہ ایک آنکھ سے روؤں اور دوسری
آنکھ سے ہنسوں اور پھر معمولی ایک آدھ آنسوؤں سے لے کر دریا اور سمندر تک بہا سکتا ہوں ——

بختاور : لیکن یہ تو ——— یہ تو

قدرت مرزا : مکاری ہے۔ دھوکہ ہے نا۔ میں بھی جانتا ہوں پھر کیا کیا جائے۔

بختاور : میں تو ایسا کبھی نہیں کر سکتا ۔

قدرت مرزا : نہیں کر سکتے تو دیکھ لو۔ آج میرے پاس کھانے کو ہے اور تمھارے کچھ نہیں سنو اگر نوکری نہ ملے تو
آدمی کیا کرے بھیک مانگے اور جب بھیک بھی نہ ملے تو پھر چوری ڈاکہ، سمجھے ؟

بختاور : لیکن بھائی یہ تو ناممکن ہے ؛

قدرت مرزا : ناممکن ہے تو خدا کی مرضی۔ اچھا سنو۔ ہم تو دوستی کا حق نبھاتے ہیں اگر بھوکے ہو تو آؤ کچھ
کھا لو اور چاہو تو پی بھی سکتے ہو۔

بختاور : بھوک تو مجھے بڑے زور کی لگ رہی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں مجھے کچھ کھانے کا حق نہیں جب کہ میرے
بچے میری راہ میں بھوکے بیٹھے ہوں گے۔

قدرت مرزا : اچھی بات ہے۔ خدا حافظ !

بختاور: خدا حافظ بھیا!

(قدرت مرزا گنگناتا ہوا جاتا ہے)

قدرت مرزا: بدمعاش سڑے لوتا پھرتا ہے ادھر میں میں عزت آبرو کے خوف سے نہیں اپنی شرافت کے ڈر سے مارا مارا پھر رہا ہوں پیسے پیسے کو محتاج ہوں لیکن آخر کب تک؟ آخر کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا مجھ سے بھیک بھی نہیں مانگی جا سکتی۔ لیکن سوائے اس کے اب اور کیا کر سکتا ہوں۔ یہ کون عورت آ رہی ہے

(دور سے قدموں کی آواز)

(قدموں کی آواز قریب)

بختاور: آداب عرض ہے۔

عورت: (تندہی سے) کون ہے۔ کیا ہے؟

بختاور: میں جی! جی میں۔ میں نے کہا۔ میں نے کہا۔ آداب عرض۔

عورت: کیا ہے۔ کیا کہتے ہو۔

بختاور: میں جی۔ میں یہ کہہ رہا تھا۔ آپ ذرا سنیں تو؟

عورت: سن تو رہی ہوں، کہو جلدی کیا کہتے ہو!

بختاور: میں نے کہا کہ۔ کہ۔ کیا آپ بتا سکتی ہیں۔ اس وقت کیا بجا ہوگا؟

عورت: خوب عجیب آدمی ہے اکیلی عورتوں کو چھیڑتا ہے۔ بدمعاش! میں ابھی پولیس کو بلاتی ہوں۔

بختاور: جی نہیں ——— میں تو — — میں تو ——— !

عورت: دور ہو یہاں سے۔

(بڑبڑاتی ہوئی جاتی ہے)

بختاور: اُف وہ۔ کیسے کروں۔ یوں تو کام نہیں چلے گا۔

(دور سے قدموں کی آواز)

پھر کوئی آیا اس مرتبہ ہمت کرنی چاہئے۔ ارے یہ تو بڈھے کے پیالے میں کچھ ڈال رہا ہے۔ ادھر بھی

آئیے۔

(قدموں کی آواز قریب سے)

(بختاور تیز قدموں سے اس کے پاس آرہا ہے)

بابوجی!

بابوجی : یہ لو ایک اور آن موجود ہوا ہے۔ کیا ہے۔ کیا کہتے ہو ؟

بختاور : بابوجی! میں بال بچے دار آدمی ہوں ——— خدا کی راہ میں . . .

بابوجی : ہاں ہاں! وہی پرانی کہانی ہے ——— ایک کو پیسہ دو۔ تو تم سب ٹپٹ جاتے ہو۔
پیسہ ——— چلو ——— ہٹو ——— معاف کرو۔

بختاور : بابوجی! میں بھیک منگا نہیں ہوں۔ میں نے اس سے پہلے کبھی بھیک نہیں مانگی۔

بابوجی : بہت اچھا کیا۔ آئندہ بھی کبھی نہ مانگنا ——— اندھے ہو ——— لولے ہو ——— اپاہج
ہو؟ ہٹا کٹا مضبوط آدمی ہو۔ بھیک مانگتے شرم نہیں آتی؟ کوئی کام کیوں نہیں کرتے؟

بختاور : کوئی کام نہیں ملتا۔

بابوجی : تم جیسوں کو کام کیوں ملنے لگا۔ مفت کی روٹیاں لگ گئی ہیں کھانے کو۔ بلا جائے کمانے کو۔
چلو ——— بھاگو ——— یہاں سے جاؤ۔

(تیز قدموں سے جاتا ہے)

بختاور : نہیں ہو سکتا۔ نہیں ہو سکتا۔ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ بھیک مانگنا بڑی ہمت کا کام ہے۔
پھر اب کیا کروں۔ چوری کروں دو ہی باتیں ہیں ——— چوری یا فاقہ ——— فاقہ تو ہو ہی رہا ہے۔
چوری کرنی پڑے گی۔ پر کہاں اور کیسے ———

(چند سے خاموشی)

اوہ! یہ بڈھا سو رہا ہے۔ بالکل سو رہا ہے۔ اس کے پہلو میں پیسے پڑے ہیں۔ ——— کون دیکھتا
ہے۔ کسی کو شک بھی نہ ہوگا ——— پیسے بہرحال خیرات میں ہی دیئے گئے ہیں۔ میں اس اندھے سے

نہ یادہ ضرورت مند ہوں ۔ ۔ میرا حق ہے ۔۔۔ ہاں ۔۔۔

(آہستہ قدموں کی آمد رفت)

(چند سے خاموشی)

بختاور : (تیز قدموں سے آتے ہوئے) کسی نے نہیں دیکھا ۔ کسی نے نہیں دیکھا ۔ اوہ ایک ۔ دو ۔ تین ۔ چار

پیسے ہیں ۔ کوئی تو نہیں رہا ۔ چار چار پیسے ۔

(تیز قدموں کی آواز)

(خوف زدہ) یہ کون آرہا ہے ۔ کہیں سپاہی تو نہیں ۔ کہیں مجھے گرفتار کرنے نہ آتا ہو ؟

(قدموں کی آواز)

اندھا فقیر : بیٹا مخرو ۔ تو آگیا بیٹا ؟ کون ہے بیٹا ؟

بختاور : یہاں کوئی نہیں ہے ؟

اندھا فقیر : (پیشہ ورانہ آواز میں) خدا آپ کا بھلا کرے بابو جی ۔ سنتے رہو جب تک بچے بھوکے ہیں ۔

کچھ اللہ کی راہ میں ملے گا بابو جی ۔

بختاور : (بڈھے کے قریب جاکر) تمہارے کتنے بچے ہیں بڑے میاں ؟

اندھا فقیر : جی بابو جی ! میرے چھ بچے ہیں دو میرے بھائی کے ہیں اور ایک بیوہ بہن ہے بابو جی !

سکھی رہیں ۔ خدا جانے کیسے دن دھکیل رہے ہیں ۔ بھیک بھی نہیں ملتی بابو جی ۔ جھوٹے بھکاریوں

نے سب کا اعتبار کھو دیا ۔ خدا تمہارا بھلا کرے گا بابو جی ۔ ہو جائے حکم اللہ کی راہ میں اندھے

کا بیٹا بابا ۔

اندھا فقیر ۔ تو آگیا بیٹا ؟

بیٹیا : ہاں بابا !

اندھا فقیر : روٹی کھائی بیٹا ؟

بیٹا ۔ روٹی پکی نہیں تھی بابا ۔ ماں نے کہا گھر میں مٹھی بھر بھی چون نہیں ۔ بابا آئیں گے تو روٹی پکے گی ۔ (لاڈ سے)

دیر ہو رہی ہے بابا چلو اب گھر چلو کب چلو گے ؟

اندھا فقیر : پر بیٹا ! ابھی تو ایک پیسہ بھی نہیں ملا ۔ گھر کیسے جائیں ۔ دیکھو تو پیالہ خالی ہے

بیٹا : خالی پڑا ہے بابا ۔

اندھا فقیر : تو بیٹا ۔ کچھ مل جائے تو گھر چلیں ۔

بیٹا : اوں اوں اوں !

اندھا فقیر : زیادہ نہیں ۔ چار ہی پیسے مل جائیں ۔ اچھا دیکھو چار پیسے ہوتے ہی چلیں گے ہیں ۔

بختاور : لو بابا یہ چار پیسے لو اور گھر جاؤ ۔

اندھا فقیر : (جوش کر) ہیں ہیں ہیں ۔ آپ کی بڑی مہربانی بابوجی ! ہیں ہیں ہیں سلامت رہو بابوجی ۔
(پیالے پر پیسے بجاتے ہوئے) خدا ہمیشہ خوش رکھے ۔ گھڑی گھڑی کی بلائیں دور ہوں چل بیٹا ۔
اب چل اور دیکھ ان بابوجی کو سلام کر ۔ آج ان کی دیا سے تم سب کے پیٹ روٹی پڑے گی ۔

بیٹا : سلام بابوجی !

بختاور : (انتہائی ضبط کے ساتھ) خوش رہو بیٹا ۔

(بڈھا باپ بجاتا ہوا جاتا ہے)

پردہ

○

تیسرا منظر

(دور سے بس کھٹ کھٹ ۔ (جیسے کوئی بڑھئی کام کر رہا ہے)

(قدموں کی آواز)

بختاور : پروفیسر گڈوانی کا یہی بنگلہ ہے ؟

رشید : ہاں کیا چاہتے ہو ؟

بختاور : میں ان سے ملنا چاہتا ہوں ۔

رشید : آپ کا نام ؟

بختاور : مجھے بختاور کہتے ہیں ؟

رشید : ابھی خبر کرتا ہوں ۔آپ یہاں برآمدے میں بیٹھئے ۔

(جاتا ہے ۔ خاموشی)

بختاور : (آہ سرد کے ساتھ) ہا ۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے ۔خدا مالک ہے ۔کوئی نہ کوئی ضرور رکھ لیا ہوگا ؟

(قدموں کی آواز)

رشید : ابھی آتے ہیں (خاموشی) شاید آپ نوکری کی تلاش میں آئے ہیں ؟

بختاور : ہاں آیا تو ہوں ؟

(خاموشی)

بختاور : آہ !

رشید : کیوں کیا کوئی دکھ ہے ؟

بختاور : ہاں ! زندگی کا دکھ ۔

رشید : ہاں ——— یہ دکھ تو سب کو ہے ؟

بختاور : کیوں تمہیں بھی کوئی دکھ ہے ؟

رشید : بہت سے (خاموشی) (دونوں ایک ساتھ) آہ (خاموشی)

بختاور : پروفیسر صاحب کس قسم کا ملازم چاہتے ہیں ؟

رشید : معلوم ہو جائے گا ۔

بختاور : کوئی بہت مشکل کام تو نہیں ہے ؟

رشید : نہیں ۔ کچھ مشکل نہیں ۔ شاید آپ کو شاکر کی جگہ ملے گی ۔

بختاور : شاکر ؟

رشید : ہاں بے چارہ شاکر !

بختاور : بے چارہ شاکر !! کیا ہوا ؟ کیا مر گیا ؟

رشید : ہاں ۔

بختاور : کیسے ؟

رشید : گولی ماری تھی ۔

بختاور : خود اپنے آپ !

رشید : کہتے تو یہی ہیں ۔ مگر مجھے یقین نہیں آتا ۔ ضرور کچھ نہ کچھ دال میں کالا ہے ؟

بختاور : دال میں کالا کیا ؟

(تیز قدموں کی آواز)

رشید : صاحب آ گئے ۔

بختاور : آداب عرض ہے جناب ۔

پروفیسر : ول ۔ مسٹر بختاور ۔ رشید دیکھو ۔ بڑھئی نے شیر کا پنجرہ ٹھیک کر دیا ۔ اگر کر رہا ہو تو چھوٹے شیر کو اس پنجرہ میں کر دو اور دوسرا پنجرہ بھی ٹھیک کرا لو سمجھ گئے ۔

رشید : بہت اچھا حضور ——— (جاتا ہے)

پروفیسر : بیٹھو مسٹر بختاور

بختاور : شکریہ ! جناب ۔ (کھنکارتا ہے) (کھٹ کھٹ کی آواز بند)

پروفیسر : مجھے ایک اسسٹنٹ کی ضرورت ہے کیا تم اسی لیے آئے ہو ؟

بختاور : ہاں ہاں ! اسی سلسلے میں حاضر ہوا ہوں ۔ مجھے عرصہ سے کام کی تلاش تھی ۔ آج اتفاقیہ طور پر معلوم ہوا کہ آپ کو ملازم کی ضرورت ہے ۔ میں ہر طرح آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہوا ہوں مجھے آپ ہر کام کے لیے مستعد پائیں گے ۔ میں نوکری ڈھونڈنے کے لیے ۔ زمین کھودنے کے لیے پتھر توڑنے کے لیے تیار ہوں ۔ اگر آپ حکم دیں گے تو میں اپنے پنجے سے ۔ اپنے ۔ اپنے ۔ اپنے دانتوں سے زمین کھود دوں گا ۔ مشکل سے مشکل کام کر دوں گا اگر ۔ اگر میرے بچوں کو روٹی ملے تو ۔

پروفیسر : اچھا ۔ تمہارے بچے بھی ہیں ۔ کتنے بچے ہیں ؟

بختاور : دو بچے ہیں

پروفیسر : ہوں ۔ ۔ ۔ اچھا یہ بتاؤ ۔ کیا تم آرٹسٹ ہو ۔

بختاور : جی نہیں ۔ جی ہاں ۔ یعنی کچھ زیادہ نہیں جانتا ۔ لیکن کوشش کروں گا ۔ اصل میں کلرک ہوں ۔ شروع سے کلرک ہی رہا ۔

پروفیسر : ہوں ۔

بختاور : کیا آپ آرٹسٹ ہیں جناب ؟

پروفیسر : آرٹسٹ ؟ ارے کیا تم مجھے نہیں جانتے ؟

بختاور : جی ہاں ۔ ایں ۔ کیوں نہیں لیکن ۔

پروفیسر : میں پروفیسر گڈوانی بلائے آسمانی ہوں ۔

بختاور : بلائے ناگہانی کیوں نہیں ۔ کیوں نہیں آپ کا چہرہ آپ کی آواز ۔

پروفیسر : بلاشبہ ۔ بے شک ۔ ۔ ۔ ۔ اس وقت دنیا میں کوئی میرا ثانی نہیں ۔ کوئی میرا مقابلہ نہیں کر سکتا ۔ ہم لوگ خاندانی آرٹسٹ ہیں ۔ اور آرٹ ہی پر جان نثار کرتے ہیں ۔

بختاور: کیوں نہیں، کیوں نہیں بے شک (چہرے سے خاموشی) کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ مجھ سے کیا خدمت لی جائے گی۔

پروفیسر: بہت معمولی کام، بچہ بھی کر سکتا ہے۔

بختاور: بہت اچھا میں ہر طرح حاضر ہوں۔

پروفیسر: پہلے میں تمہارا امتحان کروں گا۔

بختاور: بڑی خوشی سے، میرا خط بہت صاف ہے، بک کیپنگ سے بھی واقف ہوں، اچھی انگریزی لکھ سکتا ہوں۔

پروفیسر: (کُدر سے) جی! (قدموں کی آواز متواتر)

رشید: فضول باتیں نہیں چاہئیں — واہ ارے یہ کھٹیں چار چار بندوقیں۔ بھائی رشید صاحب ذرا بتا دو کہ یہ پروفیسر صاحب کرنے کیا ہیں۔

رشید: ارے جانتے نہیں کہ ایک نمبر نشانہ باز ہیں۔

(قدموں کی آواز)

بختاور: نشانہ باز! خدایا خیر!

پروفیسر: (دور سے) ہاں بس بس یہیں رکھ دو۔ ٹھیک ہے (قریب سے) ادھر آؤ۔ بختاور۔

بختاور: جی کہاں۔ حاضر ہوں۔

پروفیسر: وہ دیکھو وہ نشانہ ہے۔ اسے ٹارگٹ کہتے ہیں۔ تم وہاں کھڑے ہو ٹارگٹ سے لگ کر۔

بختاور: ٹارگٹ سے لگ کر۔

پروفیسر: کچھ کرنا نہیں ہے خالی چپ چاپ کھڑے رہنا ہے۔ بغیر ہلے جلے اور موم بتی ادھر لاؤ۔ ہوں اور لو۔ یہ لو۔ اسے یوں ہاتھ پھیلا کر مضبوطی سے کھڑے رہو۔ بس۔

بختاور: لیکن آپ کریں گے کیا؟

پروفیسر: کریں گے کیا۔ ہم اسے بجھا دیں گے۔

بختاور: لیکن جناب یہ تو بڑی آسانی سے بجھائی جاسکتی ہے اسے (شوٹ) یہ دیکھئے بجھ گئی۔

پروفیسر۔ کیا کہتے ہو۔ ڈر لگتا ہے ؟

بختاور: جی نہیں لیکن پھر بھی ذرا۔ ڈر کی تو بات ہے ہی صاحب ؟

پروفیسر: جانتے ہو یہ کہہ کر تم نے میری کتنی بے عزتی کی ہے۔ زبردست انسلٹ لیکن تم نہیں جانتے نہیں میرے کمال کو نہیں جانتے اسی لیے معافی کے قابل ہو۔ ادھر آؤ میں تم سے اپنا انٹروڈکشن کراؤں۔ ادھر آؤ۔ (دور ایک قدم) دیکھو تمھاری آنکھیں ٹھیک ہیں صاف دکھائی دیتا ہے دور تک

بختاور: جی جی ہاں۔ جی ہاں۔

پروفیسر: وہ دیکھو سامنے ایک درخت ہے۔

بختاور: جی ہاں۔

پروفیسر: اس کی چوٹی پر وہ چھوٹی سی ٹہنی کے قریب ایک پھول ہے۔

بختاور: جی !

پروفیسر: دکھائی دیا ؟

بختاور: جی ہاں۔ وہ ہے۔

پروفیسر: اس کی کتنی پتیاں ہیں گنو۔

بختاور: جی۔ ایک دو تین چار۔ چار ہیں۔

پروفیسر: اچھا تو دیکھو۔ اس کی ایک ایک پتی اڑاتا ہوں ہوشیار۔

(بندوق کی آواز)

پروفیسر: اب کتنے ہیں ؟

بختاور: تین۔

پروفیسر: (شوٹ) اب ؟

بختاور: دو۔

پروفیسر : (شوٹ) اب ؟

بختاور : ایک !

پروفیسر : (شوٹ) اب ؟

بختاور : ایک بھی نہیں !

پروفیسر : کہو کیا کہتے ہو ؟ ہے کچھ کمال ؟

بختاور : ہے کیوں نہیں جناب۔ کیوں نہیں۔ زبردست کمال ہے واقعی۔

پروفیسر : اب تو تمھیں ڈر نہیں لگے گا ؟

بختاور : گنجائش تو نہیں ہے۔ جناب لیکن !

پروفیسر : جاؤ تو پھر کھڑے ہو ٹارگٹ کے سامنے۔ موم بتی جلاؤ رشید۔

بختاور : لیکن جناب ایک گذارش ہے۔ اگر آپ اس موم بتی کو کسی بوتل کے منہ میں لگا کر پھر شوٹ کریں تو
کیسی تجویز ہے ؟

پروفیسر : اس طرح بجھانا کون سا کمال ہے ؟

بختاور : لیکن موم بتی رہی کی وہی رہے گی۔ ایک ہی بات ہے۔

پروفیسر : ارے بختاور۔ ایک ہی بات کیسی رہے گی تم تو نرے بے وقوف ہو۔ اس طرح بجھانے میں
رسک (Risk) کیا ہے۔ رسک جانتے ہو کسے کہتے ہیں۔ ڈر یا اندیشہ سمجھے۔ زیادہ
سے زیادہ رسک یہی ہے کہ بوتل ٹوٹ جائے گی۔ لیکن جب موم بتی تمھارے ہاتھ میں ہو یا تمھارے
سر پر رکھی ہو۔ اس طرح اگر ایک ذرا میرا نشانہ چوکے تو گولی تمھارا بھیجہ اڑا دے۔ یہ ہے رسک
اسی کو لوگ دیکھتے ہیں۔ اسی رسک کی قیمت ہے کرتب خود کوئی چیز نہیں اصلی چیز ہے رسک
جتنا زیادہ رسک اتنا ہی بڑا کمال سمجھے۔

بختاور : جی ہاں یہ تو سمجھ گیا۔

پروفیسر : تو چلو پھر ٹارگٹ پر۔

بختاور : بہت بہتر !

(قدموں کی آوازیں —— خاموشی)

پروفیسر : (نشانہ باندھتے ہوئے) ہاتھ اور پھیلایئے اور —— اور —— بس اب ٹھیک ہے۔ ہلنا مت۔ ورنہ گولی لگ جائے گی۔ بالکل سیدھے ہو مت۔ دیکھو ہلو مت۔ ہلو مت۔ ہوشیار۔

بختاور : (گھبرا کر) نہیں نہیں مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ میں نہیں کر سکتا۔ میرے بس کا نہیں۔ معاف کیجئے معاف کیجئے میرا دم گھٹنے لگا۔

پروفیسر : اب بھی ڈرتے ہو۔

بختاور : اجی ڈر کی تو ایسی تیسی لیکن اس کمبخت کا کیا کروں ؛ معاف کیجئے۔

پروفیسر : جاؤ تو پھر دفع ہو۔ نکلو یہاں سے تم تو کوڑی کے نہیں۔ تم نے میری یہاں تک ... بے عزتی کی کہ میرا بھروسہ نہیں کیا۔ میرے نشانے کا بھروسہ نہیں کیا۔ اس نشانے کا جس نے دنیا کو حیرت میں ڈال رکھا ہے۔ جانتے ہو۔ بیس برس سے یہ کام کرتا ہوں اور آج تک ہزاروں آدمیوں پر پریکٹس کی ہے کسی کو بال برابر بھی نقصان نہیں پہنچا۔ تم جیسے ڈرپوکوں کا کیا علاج اور یہ تو کیا ہے میں سپریڈ ایگل (SPREED EAGL) کرتا ہوں جانتے ہو سپریڈ ایگل کسے کہتے ہیں۔ ایک آدمی کو تختہ کے سامنے کھڑا کرتا ہوں اور بندوق سے اس کے ارد گرد اس طرح سوراخ بناتا چلا جاتا ہوں جیسے پنسل سے خط کھینچ دیا ہے۔ پانچ ہزار مرتبہ سپریڈ ایگل کا کرتب اپنی پیاری ماں کے ساتھ کیا ہے جو مجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے اور جب وہ تختے پر سے اتر آتی تھی تو جانتے ہو کیا ہوتا تھا۔ لوگ خوشی کے مارے دیوانے ہو جاتے تھے۔ تالیوں سے پنڈال سر پر اٹھا لیتے تھے۔ اور مجھ پر تمغوں کی، روپوں کی روپلوں اور اشرفیوں کی بارش ہوتی تھی۔ بارش سمجھے۔ شٹ تم ڈرپوک ہو۔ کام چور ہو۔ جاؤ نکلو یہاں سے اور آئندہ کسی سے مت کہنا کہ میرے نیچے مجھ کے ہیں تم خود ان کو اپنا نہیں چاہتے۔ اپنی جان بہت پیاری ہے۔ جاؤ۔ نکلو۔ بزدل۔ ڈرپوک۔

بختاور : (افسردہ لہجے میں آپ ہی آپ) میرے بچے ہیں خود ان کو اپنا نہیں چاہتا۔ میں ڈرپوک ہوں کام چور ہوں۔

شعلہ ہوں۔

پروفیسر: کیا کہتے ہو؟

بختاور: ہاں! میں ڈرپوک ہوں۔ بچپن سے ڈرپوک ہوں۔ لیکن میں کروں گا۔

پروفیسر: کیا ہے؟

بختاور: (بتدریج آواز کو بڑھاتے ہوئے) میں کروں گا۔ (دوڑ کر ماگٹ کے پاس جا کر) میں کروں گا میں تیار ہوں سپرڈ انگل کرو جلدی مجھے سپرڈ انگل کرو۔ چلو۔

پروفیسر: شاباش۔

بختاور: شاباش نہیں، پروفیسر! میرے بچوں کو روٹی ملے گی۔

پروفیسر: ہاں ہاں! مست جتنی تم کھو شاباش ریڈی رہو مت۔

(شوٹ)

بختاور: ارے کر، اُوف!!

پروفیسر: ڈرو نہیں۔ ڈرو نہیں، اسٹیڈی!!

(شوٹ)

بختاور: میرے بچوں کو روٹی ملے گی؟

پروفیسر: اسٹیڈی

بختاور: (دیوانہ وار زور سے ہنستا ہے) ہاہاہا۔ ہاہاہا۔ میرے بچوں کو روٹی ملے گی؟

پروفیسر: (STEADY) (زور سے) (SHOT)

بختاور: ہاہاہا۔ ہاہاہا میرے بچوں کو روٹی ملے گی

پروفیسر: زور سے اسٹیڈی (STEADY)

بختاور: میرے بچوں کو روٹی — میرے بچوں کو روٹی ہاہاہا۔ ہاہاہا۔ ہاہاہا۔ ہاہاہا۔ ہاہاہا۔ ہاہاہا۔

پردہ

○

گدھوں کے سائے

انور جلال

کا عادی ۔

مزدور : ایک عام تندرست اور درمیانے قد کا آدمی معمولی میلے اور پھٹے ہوئے پنجابی لباس میں جو اپنا لب و لہجہ اور تہمد کا پلو ایک ہی سانس جب درست کرتا ہے ۔

بڈھا : ایک عمر رسیدہ آدمی چہرے پہ جھریاں، کنپٹیوں کے گرد سفید بال، جس کے لہجے میں رقت اور آنکھوں میں وحشت ہے یہ کمپنی کی حکومت کے زمانہ کا لمبا کوٹ پہنے جیسے شیروانی ہے کا رنگ تغرق ہوتے ہوتے رہ گیا ہو، شلوار اور انگریزی جوتا پہنے ہوئے اور پتلی ناک پر ایک چشمہ جمائے ہے جس کا سیاہ دھاگا اس نے کان کے گرد لپیٹ رکھا ہے ۔

سرائے کی مالکن : ایک نوجوان عورت خوش رنگ اور خوش شکل آواز میں تیزی اور آنکھوں میں چمک ہے داہنے کان پر عموماً ادھ بجھا سگریٹ جمائے رکھتی ہے ہر لمحہ اس کی آواز بدلتی رہتی ہے جذباتی اور جلدباز سرحدی قسم کے لباس میں ۔

مصور : ایک نوجوان اور چھوٹے قد کا درمیانے جسم کا مصور جس کے لبوں پر ہنسی سوچتی ہے اور آنکھوں سوچ مسکراتی ہے لمبے کان اور لمبے ہاتھ جو بات کم کرتا ہے اور ہاتھ زیادہ ہلاتا ہے بعض اوقات گفتگو کے دوران میں اس کے ہونٹ ساکت ہوتے ہیں اور ہاتھ زور زور سے ہلتے ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ہاتھوں سے بول رہا ہے

پردہ

○

پہلا منظر

اسٹیج کا پردہ اٹھتا ہے۔ درمیان میں ایک چٹان نما انسانی قسم کا پتھر دکھائی دیتا ہے جو خود تو ہلکی تاریکی میں ہے مگر اس کے دونوں طرف روشنی پھیلی ہے۔ پتھر پر سفید رنگ سے بڑا سا لفظ جوانی اور اس کے نیچے صفر لکھا ہے۔ اس کے نیچے اسی طرح لفظ بڑھاپا اور اس کے نیچے پچیس لکھا ہے۔ دائیں ہاتھ ایک پرانا بڑ کا درخت ہے جو پتھر پر جھک کر سایہ سا کئے ہے۔

چند سکنڈ کے بعد بائیں جانب سے ایک لڑکی ہنستی گاتی اور ناچتی کودتی پتھر کی طرف بڑھتی ہے مگر بھاگ کر پردے کے پیچھے چلی جاتی ہے کچھ دیر بعد اسی لباس میں ایک عورت ناچتی ہوئی پتھر کی طرف بڑھتی ہے پتھر کو دیکھ کر جھجک سی جاتی ہے اور شرم و حجاب سے سمٹ کر پتھر کے قریب بیٹھ جاتی ہے۔

درخت کے پتے ہلتے ہیں اور لڑکا جھانک کر ایک قہقہہ لگاتا ہے عورت پہلے تو اس کا قہقہہ سن کر سمٹ جاتی ہے پھر لڑکے کو دیکھ پتھر کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے مگر حجاب اس کا ہاتھ روک لیتا ہے اور لڑکا پتوں میں چھپ جاتا ہے

اسٹیج کی بائیں جانب سے ذرا سی روشنی پھیلتی ہے اور شاعر پتھر کی طرف بڑھ کر عورت کو دیکھتا ہے عورت اپنا سر اوجھل کر لیتی ہے اور شاعر ٹھٹک کر بڑبڑاتا ہے

شاعر: (مدھم آواز میں) حیران ہوں کہ پتھر میں حرکت کیوں کر ہوئی؟

عورت: (سر گھٹنوں میں چھپا کر) اوہ

شاعر: (تعجب سے) پتھر میں زندگی تو ممکن ہو سکتی ہے مگر یہ آواز، کانوں نے وہ سماعت بھی پائی جو پتھر کی زبان

سن سکے (رک کر) اور وہ ذہن بھی (درخت کی طرف اُوپر دیکھ کر) جو اسے سمجھ سکے

لڑکا : (پتوں سے سر نکال کر) ہا ہا ہا ہا

شاعر : آہا (مسکرا کر) تو گویا بندر اپنی دُم کی تلاش میں درخت چھان رہا ہے۔

لڑکا : (درخت سے چھلانگ لگا کر شاعر کے بالکل سامنے آ کھڑا ہوتا ہے شاعر ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹتا ہے لڑکا اس کی طرف بڑھتا ہے عورت سر اٹھا کر دونوں کو دیکھتی ہے)

لڑکا : (پیار سے) ڈرو نہیں، یہ تو لکڑی کا ہے

شاعر : (نرمی سے) مگر لکڑی بھی تو کاٹ سکتی ہے

لڑکا : (شاعر کو غور سے دیکھ کر) میرا خیال ہے تمہاری بینائی کمزور ہے۔ اس لیے تم واضح طور پر نہیں سوچ سکتے اور انہی الجھنوں نے غالباً تمہیں شاعر بنا دیا ہے۔

شاعر : (پیار سے) ننھے میاں تمہاری باتیں اس عمر کا ساتھ نہیں دے رہیں کہیں تم اپنے ابا کا ذہن تو نہیں چُرا لائے۔

لڑکا : ہا ہا ہا! شاعر تم کل کے آدمی ہو اور آج کی باتیں سُن کر بوکھلا رہے ہو؟

شاعر : (عورت کی طرف دیکھ کر) تو گویا پتھر دیکھ بھی سکتا ہے (لڑکے کی طرف دیکھ کر) تم کیا کہہ رہے تھے؟

لڑکا : میں نہیں، تم کہہ رہے تھے میں سُن رہا تھا۔

شاعر : ہاں تو ننھے میاں! تم یہاں کیسے پہنچے ہو؟

لڑکا : جیسے تم نہیں پہنچ سکے۔

شاعر : (سوچتے ہوئے) ہوں (عورت کی طرف اشارہ کر کے) یہ کون ہے؟

لڑکا : ایک عورت! جسے شاید تم شاعری کے موڈ میں پتھر کہہ رہے تھے۔

شاعر : بڑے ہو کر تم بھی اسے پتھر ہی کہو گے۔

لڑکا : میرا خیال ہے تمہاری نگاہ کمزور ہے تمہیں جلد چشمہ لگا لینا چاہیے۔

شاعر : (جھنجھلا کر) اس بات کا میری بات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

لڑکا : (اسی انداز میں) تم نے ٹھیک کہا۔ اس بات کا تمھاری بات سے نہیں تمھاری سمجھ سے تعلق ہے۔

شاعر : (عورت کی طرف دیکھتے ہوئے) تو گویا یہ عورت ہے؟

لڑکا : تم اسے ماں سمجھ لو۔

شاعر : یہ کیسے ہو سکتا ہے (بڑبڑاتا ہے)

لڑکا : اگر تم چشمہ لگا لو، تو یہ تو کیا اور بہت کچھ ہو سکتا ہے (رُک کر) یہ ماں ہے شاعر، ماں

میری ماں، تمھاری ماں۔

شاعر : (ذرا تن کر) تمھاری باتوں سے اب مجھے دودھ کی بُو آنے لگی ہے۔

لڑکا : اور تمھاری باتوں سے اب دودھ کی بُو جانے لگی ہے۔

شاعر : تمھیں اپنی ماں سے لوری سُن کر سو جانا چاہیے۔

لڑکا : اُس ماں کی لوری سے آنکھ بند نہیں ہوتی۔ آنکھ کھُل جاتی ہے۔

شاعر : یہ کس قسم کی ماں ہے (سوچتے ہوئے) تھے! کیا ماں کی بھی قسمیں ہوتی ہیں۔

لڑکا : ہاں، شاعر! ماں کی تین قسمیں ہیں، ایک ماں جو جنم دیتی ہے، ایک ماں جو پالتی ہے اور ایک

ماں جو لوریاں دیتی ہے۔

شاعر : تم ضرور کسی کا ذہن چُرا لائے ہو تمھارے اندر کوئی بول رہا ہے۔

لڑکا : تم ٹھیک کہتے ہو، شاعر، میرے اندر آج بولتا ہے تازہ، روشن اور ذہین آج تمھارے

اندر کل سو چکا ہے۔ پژمردہ، تاریک اور مردہ کل، آج اور کل میں بہت فاصلہ ہے شاعر!

اس دودھ کا فاصلہ ہے جس کی بُو میری باتوں سے آتی ہے اس چشمے کا فاصلہ ہے جو تمھاری کمزور

بینائی کے لئے بے حد ضروری ہے۔

شاعر : (چونک کر) کوئی آ رہا ہے۔

لڑکا : اس میں پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں آنے والے کو کون روک سکتا ہے۔

شاعر : (عورت کی طرف دیکھ کر) یہ عورت شاید کسی کی منتظر ہے؟

عورت : (جلدی سے) مجھے کسی کا انتظار نہیں ۔

لڑکا : مگر تم پریشان نظر آتی ہو۔

شاعر : اسے ضرور کسی کا انتظار ہے۔

عورت : نہیں (گھبرا کر) یہ ماحول میرے لیے بالکل نیا ہے اجنبی ہے مجھے جھینپ سے ڈر محسوس ہوتا ہے۔

لڑکا : مگر تم بھی تو اجنبی ہو۔

عورت : مجھے خود سے بھی خوف محسوس ہوتا ہے۔

لڑکا : مگر تم میرے پاس ہو۔

شاعر : اور (رک کر) ہم تمھارے ساتھ ہیں۔

لڑکا : شاعر میاں! دیسے تم اس عورت سے زیادہ پریشان معلوم ہوتے ہو۔

شاعر : (بائیں جانب اشارہ کر کے) وہ دیکھو کوئی آ رہا ہے!

لڑکا : میں دیکھ چکا ہوں۔

شاعر : (جھنجلا کر) مگر یہ آ کیوں نہیں جاتا۔ یوں رک رک کر کیوں چل رہا ہے۔

لڑکا : غالباً اس کا ذہن تھک چکا ہے اس لیے پاؤں بوجھل ہو گئے ہیں۔

شاعر : لو وہ آگیا۔ خاصا ہٹا کٹا آدمی دکھائی دیتا ہے۔

لڑکا : تم پھر اس بنا پر یقین کر رہے ہو جسے جانچنے کی ضرورت ہے۔

(بائیں جانب سے ایک تندرست آدمی اسٹیج پر آتا ہے یہ مزدور ہے اس کے چہرے پر تھکن کے آثار ہیں لڑکے اور شاعر کو دیکھ کر وہ چونکتا ہے عورت اسے دیکھ کر سر نہیں جھکاتی، مزدور لڑکے اور شاعر کی طرف بڑھ کر)

مزدور : میں پیاسا ہوں۔ مجھے پانی دو (رک کر) میں بھوکا ہوں مجھے روٹی دو۔

(ایک لمحہ خاموشی)

شاعر : (نرمی سے) معاف کیجیے میں شاعر ہوں بھوکا ہوتا ہوں۔ (لڑکے کی طرف اشارہ کر کے) یہ بچہ ہے

ابھی دو وقت بیٹا ہے۔ (عورت کی طرف اشارہ کرکے) اس عورت سے کچھ مانگ لو۔

عورت : (گھبرا کر جلدی سے) میرے پاس (رک کر) کچھ نہیں ہے (ذرا آہستہ) کچھ بھی تو نہیں۔

لڑکا : تم سمجھ سے سوچتے ہو اس لیے تمھارا ذہن بھوکا ہے (رک کر) بیٹھ جاؤ تم تھکے ہوئے ہو۔

(مزدور عورت کے قریب جا کر بیٹھ جاتا ہے)

شاعر : ننھے میاں! یہ شخص زمین پر بسنے والوں کا سب سے سچا پیش رو ہے، زمین کی پیداوار کتنی بے بسی کی حالت میں ہے۔

لڑکا : شاعر تم غلط کہتے ہو۔ یہ درخت بھی زمین کی پیداوار ہے میرا خیال ہے یہ زمین پر بسنے والوں کا سب سے سچا پیش رو ہے۔ یہ ہم سے کچھ نہیں لیتا۔ البتہ کچھ دیتا ضرور ہے۔

شاعر : درخت اور انسان میں نمایاں فرق ہے۔

لڑکا : انسان اور انسان میں بھی بہت نمایاں فرق ہے۔

شاعر : تم نے میری بات کی تائید کی ہے۔

لڑکا : میں نے تمہاری بات کی تردید کی ہے (رک کر) شاعر! کیا تم آم اور جامن کے بیچ میں تمیز کر سکتے ہو؟

شاعر : نہیں۔

لڑکا : پھر تمھیں انسانوں پر بات کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

(کچھ لمحے خاموشی رہتی ہے۔ شاعر ٹہلتے ہوئے مزدور کے قریب جا کر بیٹھ جاتا ہے)

شاعر : (مزدور سے) آپ کا شغل کیا ہے؟

مزدور : (طنزیہ) شغل! شاعر میاں! میں مزدور ہوں۔

شاعر : مزدوری بھی تو ایک شغل ہو سکتی ہے۔

لڑکا : شاعر! مزدور کی مزدوری اور شاعر کی مزدوری میں وہی آم اور جامن والا فرق موجود ہے۔

شاعر : (تم جیسے ہی ہو) (لڑکے کو مخاطب کر کے) تو مزدور صاحب! مزدوری کے باوجود آپ کو روٹی نہیں ملتی۔

مزدور : شاعر میاں! اب میں تمھیں کیسے سمجھاؤں تم نہیں سمجھو گے۔

لڑکا : (مزدور کے قریب آکر) اسے میں سمجھاتا ہوں۔ (شاعر سے) شاعر! ایسے انسان تو تم نے دیکھے ہوں جنھیں روٹی کے باوجود مزدوری نہیں ملتی۔

شاعر : (لڑکے سے) ننھے میاں! تم بہت دیر سے لفظوں کے الٹ پھیر سے فلسفہ بگھار رہے ہو جنھیں روٹی ملتی ہو انھیں مزدوری کی کیا ضرورت ہے۔

لڑکا : (مسکرا کر) اور اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں پھر لفظوں کے الٹ پھیر سے گذارش کروں گا کہ جنھیں مزدوری ملتی ہو انھیں روٹی کی کیا ضرورت ہے۔

مزدور : میں ان دونوں کی باتیں نہیں سمجھ سکتا۔

عورت : اور میں بھی۔

شاعر : در اصل قصور اس لڑکے کا ہے مزدور میاں! اگر نگلے کی بولی اس کی ماں بھی نہیں سمجھتی۔

مزدور : (عورت سے) تم خاموش کیوں بیٹھی ہو۔ تمھیں ضرور بھوک لگی ہے۔

لڑکا : تم کیوں خاموش نہیں بیٹھتے تمھیں بھی تو بھوک لگی ہے۔

مزدور : (جذباتی آواز میں) میں خاموش نہیں رہ سکتا۔ میں بھوکا نہیں رہ سکتا۔ میں بے کار بھی نہیں رہ سکتا۔ تم جیسے لوگ میں نے کبھی نہیں دیکھے۔ تم عجیب لوگ ہو بے حد عجیب۔ ایک ہوا کھا کر زندہ رہتا ہے ایک دودھ پیتا بچہ ہے۔ اور یہ عورت —— یہ بھوکی ہے اور خاموش ہے اور تم عجیب باتیں کر رہے ہو۔ وہ وقت کتنا اچھا تھا جب کھیل کود کے بعد پیٹ بھر کر کھانے کو ملتا تھا جب میرا باپ مزدوری کرتا تھا میری ماں مزدوری کرتی تھی۔ وہ دن کہاں گئے۔ وہ مزدور کہاں گئے، وہ ملیں کہاں گئیں —— وہ کھیت —— میں مزدور ہوں مگر بے کار ہوں اور بھوکا ہوں۔ ملیں موجود ہیں مگر ان کے پہیئے ساکت اور چمنیاں ٹھنڈی ہیں۔ کھیت موجود ہیں مگر ان کی شادابی غائب ہے۔ مزدور زندہ ہے اور مزدوری دم توڑ چکی ہے (رُک کر) اور تم لوگ ہنس رہے ہو اس لیے کہ میں تمھاری طرح باتیں نہیں کر سکتا۔ (رُک کر)

میں مزدور ہوں کام کرنا جانتا ہوں میں بوجھ اٹھا سکتا ہوں (شاعر کی طرف دیکھ کر) شاعر میاں! میں تمھیں اٹھا سکتا ہوں، اس لڑکے کو اٹھا سکتا ہوں اور (عورت کی طرف دیکھ کر) اس عورت کو بھی ——— میں تم تینوں کو اٹھا سکتا ہوں (رک کر) اگر تم میں چلنے کی سکت نہیں تو چلو میں تمھیں اٹھا کر لے جا سکتا ہوں۔

شاعر : مگر کہاں ؟

مزدور : جہاں روٹی مل سکے۔

لڑکا : مگر پھر کیا ہوگا ؟

مزدور : پھر شاید میں تمھاری طرح باتیں کر سکوں، پھر شاید میں تمھاری باتیں سمجھ سکوں۔

شاعر : میرا خیال ہے (ادھر ادھر دیکھ کر) کوئی آ رہا ہے ؟

مزدور : (چونک کر) شاید اس کے پاس روٹی ہو۔

لڑکا : شاید وہ بھی بھوکا ہو۔

عورت : مجھے ڈر لگتا ہے۔

شاعر : مگر یہ کون ہو سکتا ہے ؟ اس راہ پر جا کر کوئی واپس نہیں آیا۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں، میں کہاں ہوں۔ رات کے چاند کو صبح کے سورج نے نگلا تھا یا صبح کا سورج رات کا چاند اگل رہا ہے۔ صبح کے سامنے دھوپ نے پینے نغمے یا ستاروں کے آنچل ہوا اڑا لاتی تھی۔

لڑکا : شاعر میاں! ذرا سر کو زور سے ہلاؤ۔ تمھارا ذہن شاید مزدور کی باتوں سے لڑتے لڑتے بے ہوش ہو گیا ہے۔

شاعر : یہ نہیں ہو سکتا، وہ دیکھو وہ شخص قریب آ گیا ہے۔ وہ اس راہ سے واپس آ رہا ہے جس راہ سے کوئی واپس نہیں آیا۔

درخت اور دریا بہہ رہے ہیں اور ہوا رک گئی ہے وہ شخص ادھر آ رہا ہے یا میں چل رہا ہوں۔ میں بول رہا ہوں۔ یا سن رہا ہوں تم میرا منہ دیکھ رہے ہو، ننھے میاں، تم تو یوں کھڑے ہو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں (چونک کر) ذرا دیکھو تو ——— وہ آ گیا ہے۔

(لڑکا مزدور عورت اور شاعر پتھر کی سمت دیکھتے ہیں ایک لمحے کے
بعد ہلکی تاریکی سے بوڑھا پتھر کے پیچھے سے نمودار ہوتا ہے، عورت اس
کی طرف غور سے دیکھتی ہے، مزدور کے ہونٹ ہلتے ہیں مگر آواز پیدا
نہیں ہوتی، بوڑھا ان کے قریب آکر رکتا ہے اور ایک لمحے کی خاموشی
کے بعد بڑبڑاتا ہے)

بوڑھا : (مدھم لہجے میں) یہاں اس قدر ہجوم کیوں ہے ؟

لڑکا : بڑے میاں اب دن لمبے ہو گئے ہیں۔

مزدور : آپ کیا ڈھونڈ رہے ہیں؟

بوڑھا : میں (لڑکے اور مزدور کو دیکھتے ہوئے) تمہیں یہاں سے کچھ ملا ہے ؟ (رک کر جلدی سے) تمہیں ضرور
یہاں سے کچھ ملا ہے۔

مزدور : (گھبرا کر) نہیں نہیں ——— مجھے کچھ نہیں ملا ———

لڑکا : آپ یہاں کچھ بھول گئے ہیں

بوڑھا : (آہستہ سے) ہاں !

شاعر : کیا ؟

بوڑھا : (آہ بھر کر) ہے ایک چیز۔

مزدور : کھانے میں ہے پینے میں ——— یا ———

بوڑھا : (بات کاٹ کر) نہیں نہیں ـ وہ چیز (دھندھی آواز میں) وہ چیز بڑی قیمتی ہے۔

شاعر : مگر وہ ہے کیا؟

بوڑھا : وہ چیز جو تم سب کے پاس ہے (سب کی طرف دیکھ کر) مگر میرے پاس نہیں (لڑکے کو مشکوک نظروں
سے دیکھ کر) تم کون ہو

لڑکا : میں (مسکرا کر) میں تمہارے لیے اجنبی ہوں۔

بوڑھا : مگر تم ہو کون ؟

لڑکا : ہیں !!! ، بڑے میاں میں تمہارا ماضی نہیں ہوں ۔

بوڑھا : (اس کے قریب آکر غور سے دیکھتے ہوئے) میں تمہیں پہچان رہا ہوں ۔

لڑکا : تم دھوکہ کھا رہے ہو، تم مجھے ماضی کی دہلیز سمجھ رہے ہو، میں آگے ہوں تم مجھے پیچھے دیکھ رہے ہو میں اوپر ہوں (نرمی سے) تم مجھے نہیں جانتے بڑے میاں! تم دھوکہ کھا رہے ہو۔

بوڑھا : (لڑکے کے اور قریب ہو کر اسے گھورتے ہوئے) میں سمجھا تھا سائے پھیل کر تاریکی میں مل جاتے ہیں، مگر یہ غلط تھا میں سمجھا تھا بارش کا پانی دریا بہا لے جاتے ہیں، یہ غلط تھا میں سمجھا تھا روح غرق ہو کر اپنی حدت کھو دیتا ہے، یہ غلط تھا میں سمجھا تھا شفق کی سرخیاں آسمان کی نیلاہٹ نگل لیتی ہے یہ بھی غلط نکلا میں سمجھا تھا آواز خاموشی میں ڈوب جاتی ہے (جھنجھلا کر کانپتے ہوئے) میں کیا سمجھا تھا اور کیا نکلا۔

شاعر : بڑے میاں! جو کھو جاتا ہے وہ مر جاتا ہے۔ کھوئے ہوئے کی تلاش میں شاعری ضرور ہے۔

مزدور : (عورت سے ترحم لہجے میں) یہ لوگ پاگل ہیں تم میرا ساتھ دو، آؤ ہم مل کر روٹی تلاش کریں۔

لڑکا : (عورت سے) تم اس بھوکے کی باتوں میں مت آنا اسے روٹی مل گئی تو یہ تمہارے ساتھ بھوک کی تلاش میں نکل جائے گا۔

شاعر : یہ بوڑھا اپنی کھوئی ہوئی شئے تلاش کر رہا ہے مزدور روٹی کی تلاش میں ہے یہ عورت بھی کسی کی متلاشی ہے مجھے اس روح کی تلاش ہے جو مرے اور جنم لیتی ہے۔ (رک کر) ننھے میاں انھیں کس کی تلاش ہے۔

لڑکا : مجھے کسی ایسی شئے کی تلاش نہیں جس کا اعلان کیا جا سکے۔ ـــــــ اور میں کچھ ڈھونڈتا نہیں پھرتا بلکہ چل کرتا ہوں، یہاں وہاں اور ہر جگہ سے

بوڑھا : (بڑبڑاتا ہے) یہ عورت ـــــــ یہ لڑکی! میں نے اس کو پہلے بھی کہیں دیکھا تھا (سوچتے ہوئے) میں نے اس کو پہلے بھی یہیں اسی پتھر کے قریب اسی زمانگی سے بیٹھے ہوئے، خاموش اور بے حرکت جب سیب کے درختوں کا سایہ مجھے گلابی نظر آتا تھا مگر میں دھوپ کی سرحدوں پر سے چاندنی کے ہیولوں کو عقل کے سانچوں میں ڈھالنے کے لیے سرگرداں تھا، میں درختوں کے پتوں سے ہواؤں کی سرگوشیاں

چُن کر بتوں میں بند کیا کرتا تھا مچھلی کی آنکھیں نکال کر پانی کا وزن کیا کرتا تھا اور کبوتر کے خُون میں سانپ کی چمک ملا کر اپنا ذہن بھرا کرتا تھا (رُک کر آہ بھرتے ہوئے) وہ دن! جب میں یہاں آیا تھا۔ اسی پتھر کے قریب، جہاں یہ لڑکی بیٹھی ہے اس وقت بھی یہ یہاں بیٹھی تھی مگر اس دن میرا وجود لکڑی کا اور آنکھیں پتھر کی تھیں اور میں یہاں ایک لمحہ، ایک پل گزار کر آگے نکل گیا تھا اُس دن میرے وجُود کی جڑیں زمین میں گڑی تھیں مگر میرے ذہن کے پر فضاؤں میں پھڑپھڑا رہے تھے (رُک کر لڑکے کی طرف دیکھتے ہوئے) اور پتھر کی آنکھیں جب کچھ نہ دیکھ سکیں تو اس پتھر سے آگے نکل گیا۔ پھڑپھڑاتے ہوئے پروں نے میرے وجود کی جڑیں اکھیڑ دیں، اور آج جب میں یہاں واپس آیا ہوں تو میرے ماضی کی دہلیز مستقبل کا دروازہ بن چکی ہے۔

لڑکا: بڑے میاں! مڑ کر دیکھنے والا ہمیشہ غلط راستوں کا پتھر بن جاتا ہے۔ تیز چلنے والوں کی رات، اکثر خلا کی سرائے میں بسر ہوتی ہے۔ تم مجھ میں وہ دیکھ رہے ہو جو تم میں نہیں تھا، تم میں وہ دیکھ رہا ہوں جو تم میں ہے۔

شاعر: بڑے میاں! یہ بچہ بالکل احمق ہے۔ اس کی باتوں پر توجہ دینا خارزاروں کی پرورش کرنا ہے۔

لڑکا: شاعر! جو لوگ بچپن میں حماقتیں نہیں کرتے وہ بڑھاپے میں مسخرے بن جاتے ہیں۔

بوڑھا: کچھ ایسی ہی بات میرے ساتھ ہوئی ہے۔

لڑکا: ابھی سے، بڑے میاں! اگر تم اب بھی حماقتیں نہیں کرو گے تو ایک دن زمین کے اندر تمہاری مردہ ہڈیاں بھی حرکت کرنے لگیں گی۔

شاعر: بڑے میاں! یہ لڑکا گستاخ ہے۔

بوڑھا: (کانپتے ہوئے) نہیں یہ میرا ذہن بول رہا ہے۔

لڑکا: بڑے میاں! اس کی باتوں پر کان مت دھرو، یہ شاعر ہے۔

بوڑھا: (کانپتے ہوئے) اس نے میری آواز چرائی ہے۔

مزدور: (عورت سے) چلو ہم چلیں، یہ سب پاگل ہیں۔

دوسرا منظر

سرائے کا کمرہ جس کے درمیان ایک پرانی طرز کی شکستہ سی میز رکھی ہے
میز کے چاروں طرف کرسیاں پڑی ہیں کمرے کا فرش اور سامنے والی دیوار
جو نظر آتی ہے پتھر کی ہے۔ دیوار کے دائیں طرف ایک روزن ہے جہاں
شام کی ہلکی روشنی چھن کر اندر آ رہی ہے۔ بائیں جانب ایک دروازہ ہے۔
جس کے پٹ غائب ہیں اور پیشانی دھوئیں سے سیاہ ہو چکی ہے یہاں سے
کبھی برتنوں کا شور سنائی دیتا ہے۔ مزدور دروازے کے قریب بائیں جانب
بیٹھا ہے۔ لڑکا اور عورت دیوار کے ساتھ سامنے بینچ کے درمیان بیٹھے ہیں
شاعر کے ہاتھ میں دوتارا ہے اور وہ ادھر ادھر کبھی دائیں بائیں ٹہل رہا ہے
بائیں جانب کے دروازے سے سرائے کی مالکن کمرے میں داخل ہوتی
ہے اس کے ساتھ معصو ہے معصو کو کرسی کی طرف اشارہ کرکے وہ شاعر
کی طرف بڑھتی ہے۔

مالکن ۔ !!! (قہقہہ لگاکر) سناؤ شاعر جی کوئی گانا دوتارا سناؤ۔

شاعر : !! تم اور گانا، تم شور سے میں بہنے اور گرد میں اٹنے والی شعر کو کیا سمجھو۔

مالکن : (تلخ لہجہ میں) بدتمیز شاعر! اس دوتارے پر تمھاری انگلیاں اس لیے رقص کر رہی ہیں کہ تمھارے
بدن میں وہ شور بیتر رہا ہے۔ جو میں نے ابھی تمھیں تیار کرکے دیا ہے۔

مزدور : اے سرائے کی مالکن! اگر تم اجازت دو تو میں تمھیں گانا سناؤں

مالکن : نہیں!

لڑکا : (مزدور کی طرف دیکھ کر) روٹی پر زندہ رہنے والے روٹی پر کتنی جلدی ننگے ہو جاتے ہیں۔

مالکن : یہ شاعر گانا سنائے گا، ورنہ میں اس کا شوربہ کر دوں گی۔ کھانے سے پہلے کتنا معصوم بنا بیٹھا اور یوں میری طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے اور کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔ مجھے یہ دو۔ مجھے وہ دو۔ اب چاند ابال دو۔ دو سورج تل دو۔ کمبخت سارے انڈے کھا گیا۔ (شاعر کی طرف دیکھ کر) ورنہ دو تارے سمیت بھون دوں گی۔

لڑکا : ہا ہا ہا! آؤ شاعر میاں زمین پر جاؤ۔

شاعر : تم چپ رہو جی۔ سرائے کی مالکن سے ہماری بے تکلفی ہے۔

مالکن : (غصہ سے) جھوٹ بکتا ہے کمینہ۔ انھیں بھوک لگی ہم نے کھانا دیا۔ ہمارا جی چاہا تم گانا سناؤ۔

شاعر : سناتا ہوں۔ سناتا ہوں

(ڈر کر آنکھیں بند کرتے ہوئے مذ تار الجاتا ہے)

پردہ

○

تیسرا منظر

(دو تارے کی آواز)

شاعر، (دھیمے لہجے میں)

اک دو، اک دو۔ اک دو۔ اک دو

دو تارے آکاش پہ

اور اک تارہ تم ہو

اک دو، اک دو، اک دو اک دو

(سرائے کی مالکن کے قریب جاکر)

اک دو۔ اک دو۔ اک دو اک دو

دو تارے ہیں اک دوجے کے

پر تم کس کی ہو؟

اک دو۔ اک دو۔ اک دو۔ اک دو

(لڑکے کے قریب آکر)

اک دو۔ اک دو۔ اک دو۔ اک دو

اک تارے کی لگی تو اس نے دیکھا خواب

وہ بیٹھا تھا اک عورت کے پاس ہی کچھ بیتاب

عورت چپ تھی وہ بھی چپ تھا، دونوں تھے چپ چاپ

عورت نے جب تیور بدلے بدل گئے سب کایا

تارے کی بھی آنکھ کھلی اور بدھو گھر کو آیا

اب بیٹھا تو رو

اک دو۔ اک دو۔ اک دو۔ اک دو

(شاعر مزدور کے قریب آ کر)

اک دو اک دو۔ اک دو اک دو

ایک تھا بھوکا پیاسا پنچھی دانہ پانی ڈھونڈے

دانہ پانی ڈھونڈ چکا تو ہوش اسے کچھ آیا

پہلے اس نے پروں کو جھاڑا اور پھر دم کو ہلایا

ادھر ادھر وہ اڑتا پھرا پر کوئی ملا نہ ساتھی

چونچ کو اس نے رگڑا جس پر وہ تھا کالا ہاتھی

ہو ہو۔ رہو رہو۔

اک دو اک دو اک دو اک دو

(شاعر مصور کے قریب آ کر)

ایک تھا کوئی، جانے کیا تھا پر تھا وہ بھی کوئی

اس کی آنکھیں جاگ رہی تھیں اور تھی قسمت سوئی

وہ اندر سے باہر آیا۔ بیٹھ گیا خاموش

لوگوں میں بیٹھا تھا، لیکن پھر بھی تھا روپوش

اس نے دیکھا اس نے دیکھا دیکھنے سے کیا ہوئے

یہ بھی رویا، وہ بھی رویا، یہ بھی بیٹھا روئے

اب رو۔ اب رو

اک دو اک دو اک دو اک دو

(شاعر عورت کے قریب آ کر

اک دو اک دو اک دو اک دو

ایک تھی چڑیا نیلی پیلی دم تھی اُس کی لال
اس کو جب یاروں نے دیکھا تھا مے اپنے جال

بانکی ترچھی چڑیا کا تھا روپ بھی سارا تیکھا
یوں بیٹھی تھی جیسے اس نے ابھی ہو اڑنا سیکھا

اِک اِک کر کے سارے آئے گھر گئی ننھی جان
اس کو دیکھا، اُس کو دیکھا سب نکلے انجان

کیا ہو کیا ہو
اک دو۔ اک دو۔ اک دو۔ اک دو

(شاعر دیوار کے ساتھ لگ کر آنکھیں بند کر کے)

اک دو۔ اک دو۔ اک دو۔ اک دو

ایک بگولا ایک ہولیر تڑپے سب سے دُور
بھولی بھولی پیلی پیلی اُس کی شکل سے چُور

کس کو ڈھونڈے کس کو پکارے کوئی نہ جانے راز
ساز میں اسکے سوز بھرا ہے سوز میں اُسکے ساز

دُور وہ دیکھے اس کو جو اُس کی جانب دیکھے
اور وہ یونہی دیکھتا جائے شاید وہ اب دیکھے

دیکھو دیکھو۔
اک دو اک دو۔ اک دو اک دو

(شاعر آنکھیں کھول کر)

دو تارے آکاش پہ
اور اک تارہ تم رہو۔

اک دو اک دو اک دو اک دو

(سرائے کی مالکن کے قریب آ کر)

اک دو اک دو اک دو اک دو

دو تارے ہیں اک دوجے کے

پر تم کس کی ہو۔

اک دو اک دو اک دو اک دو

(شاعر خاموش ہو جاتا ہے اور دوتارہ میز پر رکھ کر بائیں جانب
سرائے کی مالکن کے قریب بیٹھ جاتا ہے)

مالکن : شاعر تم پاگل ہو۔ کیا بے معنی گانا گاتے ہو۔

لڑکا : (مصور سے) تم اس عورت کو کیوں گھور رہے ہو؟

مالکن : (مصور سے) کیوں جی! کیا یہ ننھا ٹھیک کہتا ہے؟

مصور : ہاں

مالکن : (جل کر غصے سے) کیا؟

مصور : ہاں! یہ ٹھیک کہتا ہے۔ میں اس عورت کو دیکھ رہا ہوں گھور رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں۔

لڑکا : سوچنے کے لئے ذہن کی ضرورت ہے آنکھوں کی نہیں۔

شاعر : سوچنے کے لیے دل کی ضرورت ہے۔ ذہن کی نہیں۔

مزدور : میرے خیال میں سوچنے کے لیے روٹی کی ضرورت ہے۔

(خاموشی)

مالکن : تم پاگل ہو (رک کر عورت کی طرف دیکھتے ہوئے) تم کون ہو؟

لڑکا : ایک عورت ہے۔

مالکن : کیا یہ تمھارے ساتھ ہے؟

لڑکا : اس کا ساتھ ذہن سے ہے۔ اس زمین سے جس پر ہم نہیں رہتے

مالکن : (مصور سے) یہ لڑکا پاگل معلوم ہوتا ہے۔

مصور : ہر بچہ ہے، معصوم، ناسمجھ، کھلنڈرا۔

لڑکا : تم کیوں ہو ؟

مصور : ہیں، میں مصور ہوں، میں آنکھوں سے سوچتا ہوں۔ اور ہاتھوں سے تخلیق کرتا ہوں۔

لڑکا : کاش تم ذہن سے سوچ کر تخلیق کیا کرتے۔

مالکن : (عورت سے) اے عورت تو کس کے ساتھ آئی ہے ؟

عورت : میں اکیلی ہوں۔

مالکن : تم ان میں سے کسی ایک کو چن لو

عورت : یہ سب میرے لیے اجنبی ہیں۔

مالکن : تم کسی ایک کو چن کر اپنا ساتھی بنا سکتی ہو ؟

مزدور : ان لوگوں کی باتوں نے اسے پاگل کر دیا ہے۔ اے عورت! دیکھ میرے بازو مضبوط، اور میرے شانے چوڑے ہیں ہم دونوں زندگی کے ساتھ لڑ سکتے ہیں، یہ لکڑی کی تلوار خونخوار اور بھیانک زندگی کا مقابلہ کرنے کیلئے بہت کمزور ہے۔

مالکن : یہ شخص ٹھیک کہتا ہے۔

شاعر : یہ جھوٹ بولتا ہے، زندگی بھیانک نہیں۔ پھول سے زیادہ نازک اور نرم ہے۔ زندگی لڑنے کے لیے نہیں پیار کرنے کے لیے ہے۔ زندہ رہنے کیلئے مضبوط بازو اور چوڑے شانوں کی ضرورت نہیں بلکہ ایک لطیف احساس کی ضرورت ہے۔

مصور (... ہوئے) سوچتا ہوں کہ خوشنما رنگ اگر صحیح مقام پر نہ ہو تو دھبہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ رنگ ان میں سے کسی کے لیے بھی نہیں ہے اس کا صحیح مقام میں جانتا ہوں صرف میں ——————

مالکن: (مصور سے) کم بخت۔ کیا رنگ ڈھنگ لگا رکھا ہے۔ ایک دن تمھیں کھانے کو نہ ملے تو ساری دنیا تمھیں بے رنگ نظر آنے لگتی ہے۔

مصور: (مالکن سے غصہ میں) خاموش اے عورت! تم نے اگر مجھے کھانا دیا ہے تو میں نے تمھاری تصویر بنا کے تمھیں لافانی کر دیا ہے۔ تمھاری تصویر میں تمھارے خدوخال ضرور ہیں تمھارے رنگ نہیں۔ تمھارے جسم سے کوئی بو آتی ہے۔ تمھارے مالے دار میں ادرک اور پیاز کی بو ہے اور تم اس عورت سے ہم کلام ہو جو صرف پھول ہے۔ صرف رنگ اور خوشبو۔

مالکن: میں تمھارا سر توڑ دوں گی۔

مزدور: بھئی اس میں لڑنے کی کیا بات ہے۔

(کرسی چھوڑ کر اٹھ جاتا ہے)

شاعر: مگر تمھیں سرائے کی مالکن سے یوں بات نہ کرنا چاہیئے۔

مصور: تم درمیان میں کیوں آتے ہو۔

(شاعر کی طرف بڑھتا ہے)

(مصور اور شاعر گتھم گتھا ہو جاتے ہیں۔ سرائے کی مالکن بائیں جانب کے دروازے سے ایک ڈنڈا اٹھا لاتی ہے:
شاعر اور مصور لڑ رہے ہیں۔ سرائے کی مالکن مصور کو مارتی ہے۔
مزدور انکو چھڑانے کی کوشش کر رہا ہے اور لڑکا عورت کا ہاتھ
پکڑ کر اسے سرائے کے دائیں جانب لیکر منظر سے غائب ہو
جاتا ہے کمرے میں لڑتے لڑتے ایک لیمپ الٹ کر ٹوٹ جاتا
اور ہلکی روشنی میں مصور۔ شاعر۔ مزدور اور سرائے کی مالکن کے
لمبے سائے مل کر دیوار پر گدھوں کے سائے نظر آنے لگتے ہیں)

کوچ

انور عظیم

کردار

کاکا
منگو
گرد
جگو
نورو
بینا
گلّو
اُستاد

سیٹھ
باورچی
دھوبی
غریب
مَرد
عورتیں
بچّے
چند بدمعاش

منظر

پردہ آہستہ آہستہ سرکتا ہے۔ جلتی ہوئی گھاس پھوس اور کاغذ
سے چنگاریاں اڑ رہی ہیں جاڑے کی صبح آہستہ آہستہ روشن ہو رہی ہے گلی نما
گندے اور گرد آلود راستے سے پرے چند کھولیوں کے ٹوٹے پھوٹے
دروازے دکھائی دے رہے ہیں ان کے آگے دو تین انسانی سائے
مٹی کی کھردری دیواروں پر ہل رہے ہیں۔ الاؤ کے پاس تین آدمیوں نے
ایک نیم دائرہ سا بنا رکھا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ ہیولے آپس میں
سرگوشیاں کر رہے ہیں ایک سائے کا پگڑی میں لپٹا ہوا سر زور زور
سے ہل رہا ہے ایک بوڑھے آدمی کے کھانسنے کی آواز اسٹیج پر
تیر جاتی ہے۔ اس کے ساتھ دیواروں پر ہاتھ سینکتے ہوئے لوگوں کی پرچھائیاں
[illegible] بھی تڑپ اٹھتی ہیں اسٹیج روشن ہو جاتا ہے اور پرچھائیاں مٹتی جاتی ہیں ٹھیک۔
اس وقت عورت کی ایک دل دوز چیخ دور فضا [illegible] میں ایک کپکپی سی دوڑ رہی
ہے —— اب انسانی ہیولے صاف ہو گئے ہیں ایک بوڑھا شخص
(دادا) جس کے سر پر پگڑی بندھی ہوئی ہے بیچ میں بیٹھا ہے اس کا چہرہ
تڑپتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے جیسے کسی گمبھیر سوچ میں ہو۔ اس کے پاس
دو ادھیڑ عمر کے آدمی پھٹے پرانے کپڑوں میں بیٹھے اپنے دانت بجا
رہے ہیں اور بار بار الٹے ہاتھ پر ایک کھولی کے دروازے کو گھور رہے ہیں
جس کے دونوں طرف اپلوں کے نشان نظر آ رہے ہیں عورت کی وہی چیخ پھر
ایک بار ابھرتی ہے —— ہر شخص سہم جاتا ہے ——

کاکا : بھگوان ! (آواز بھر آجاتی ہے) جگو بڑا بھاگا ہے بھگوان ! اس کی کٹی ٹانگ کی لاج رکھ لے۔ اس کی عورت بھی اس کی طرح ہی ملیا لکھی ہے۔

منگرو : کاکا ! آج (انگلیوں پر آہستہ آہستہ گنتا ہے) سوموار، منگل، بدھ ! ہاں کاکا آج تیسرا دن ہے۔ پرسوں سورج چھپتے جب وہ نل سے پانی لا رہی تھی جب اس کا پاؤں ——— بے چاری سکھیا۔

گرو : منگرو دیکھتا ہے کاکا ! پاؤں کہاں پھسلا گر پپ کا، وہ تو سیٹھ بنارسی لال کی موٹر ——— وہی لال پری ——— اسی سے تو جھٹکا لگا تھا۔ بس یوں کبوتر کی طرح لوٹنے لگی تھی۔ بیچ گلی میں۔ یہی دوپہر کی بات تھی۔ اس کی گود بھری ہونے میں ——— میں جب اپنی پھیری پر نکل رہا تھا ——— تو میں نے ———

منگرو : یہ تو بڑا ظلم ہے (اپنی جیب سے چلم نکالتا ہے اور اس میں جلتی راکھ ڈال کر اپنی مٹھیوں کو ملا کر چلو سا بنا لیتا ہے اور کش لینے لگتا ہے اور کھانسنے کھانستے بولتا ہے) اب تو سیٹھ بنارسی لال ہماری گلی میں بھی اپنی موٹر کو توپ بنائے پھرتا ہے، اجڑا کیا ہے؟ آخر یہ سب ہو کیا رہا ہے؟

گرو : بڑیا ! (اپنے سینہ پر ہاتھ مار کر ——— ہاتھ مارنے سے اس کے جسم کے چیتھڑوں سے گرد اڑنے لگتی ہے، گرو سب جانتا ہے۔

منگرو : (تن کر) جانتا ہے بڑا اپنا سر ——— گرو کا بچہ ! گرو نام رکھنے سے کوئی گرو بنا ہے نہ بنے۔

کاکا : چپ بھی رہو۔ یہ وقت چونچ لڑانے کا ہے کیا۔ سیٹھ بنارسی لال تو ہمیں دودھ کی مکھی طرح نکال پھینکنا چاہتا ہے۔

گرو : ہاں کاکا بس دودھ کی مکھی طرح (وہ اپنا ہاتھ خیالی پیالے میں ڈالتا ہے اور اس میں سے دودھ کی مکھی نکال کر پھینک دیتا ہے)

منگرو : (دھوئیں کے اٹھتے ہوئے تاروں کے اوپر اپنے ہاتھ سینکتے ہوئے) سانس میں بھی جمی جا رہی ہے کاکا الاؤ بھی ٹھنڈا ہو گیا، اب کے برس تو جاڑا بھی مہنگائی کی طرح امڈ پڑا ہے۔ ادھر سے میری ماں (اپنے دونوں ہاتھ بغل میں دبا کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور دونوں ننگے ٹھٹھرے ہوئے پاؤں ٹھیک کرنا چاہتے لگتا ہے)

کاکا : ہاں اور جوڑ جوڑ سے پاؤں ٹپک کرنا چو۔ ٹھنڈک یوں بھاگے گی جیسے ڈسے سے اندھیرا ——— ہاں

کاکا : جگو بیٹا تو تو اتنا بہادر ہے، اتنا دلیر۔ تیرا دل چھلنی ہے۔ پر دنیا میں یہی ہوتا رہتا ہے۔ گھاؤ لگتے بھر
رہتے ہیں۔ یہ تو ہوتا ہی ہے ہاں

جگو : کیوں ہوتا رہتا ہے کاکا (ہاتھ ہوا میں لہراتا ہے) کیوں ہوتا رہتا ہے ؟

(پھر اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے ۔)

(ایک پھیری والا تھیلے میں مونگ پھلی اور اسی قسم کی سستی چیزیں رکھے
اسے دھکیلتا ہوا اسٹیج پر آتا ہے اس کے پاجامے کا ایک پائنچا اوپر ہے اور
دوسرا لٹکتا ہوا ۔)

نورو : (اس کی زبان میں ہلکی سی لکنت ہے) اسے کیا بات ہے، کیا بات ہے تم لوگوں کے چہرے پر
(پھر جگو کی طرف دیکھتا ہے) تجھے کیا ہوا ہے جگو ؟

(جگو سسکیاں بھرتا ہے اور بے بسی کے ساتھ اس کی طرف دیکھتا ہے ۔)

کاکا : نورو بھائی جگو پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے ۔

نورو : مصیبت کا پہاڑ جگو پر کیوں ٹوٹنے لگا ۔

کاکا : مصیبت کا پہاڑ نہیں تو سونے چاندی کا پہاڑ ٹوٹے گا؟ وہ اس طرف اونچے محلوں پر ٹوٹا کرتا ہے ۔
ہماری قسمت میں تو یہی اینٹ پتھر ہیں دکھ کے ۔

(نورو کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا وہ ہکا بکا ہمدردی کے ساتھ جگو کی طرف
دیکھتا ہے اور اس سے کچھ پوچھنا چاہتا ہے)

نورو : جگو ! کیوں نہیں ۔

کاکا : نورو اس کی عورت مر گئی ہے ۔

نورو : (کانپتے ہوئے) عورت مر گئی (اپنے آپ سے) تو آج صبا چل بسی، اوہ لیکن آخر کیسے کیوں ؟

جگو : نورو چاچا چاچا۔ وہاں اس کھولی میں جا کر دیکھو کس طرح منہ کھولے پڑی ہے پیاسی بھوکی ننگی !

نورو : (اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتا ہے) جگو یوں نہیں بکتے یوں بکنے سے گناہ ہوتا ہے ۔

جگو : گناہ ہوتا ہے۔

نورو : ہاں جگو گناہ ہوتا ہے۔ پاپ ہوتا ہے۔

جگو : (اس کی ہچکی نکل جاتی ہے نورو اس کو سہارا دیتا ہے) بات یہ ہے نورو چاچا! مجھے اب بھی یقین نہیں آتا
کہ لچھمیا مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے (کچھ سوچنے لگتا ہے اور خلا میں تکتا ہے۔ اس دوران میں پس منظر سے پھیری والوں
کی آوازیں اور چیل بیل کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ کاکا ایک طرف کونے میں جگو اور گرد کر قریب بلا کر آہستہ آہستہ
سمجھاتا ہے) نورو چاچا تمھیں یاد ہو گا کتنی چھوٹی تھی وہ جب اس کھولی میں آئی تھی سب سے چھوٹے تھے پچھلی
لڑائی میں میری بلیا ٹھیک بھی نہ تھی کہ ایک جنگل میں ساتھ چھوڑ گئی مگر جب میں واپس آیا تو لچھمیا نے مجھے اس
طرح اپنایا۔ دکھ دھندا کرتی ——— اور ہم اس اندھیرے گھونسلے میں چڑیوں کی طرح مگن رہتے
چڑیوں کی طرح ———

کاکا : جگو بیٹے اب ہمیں کچھ دھن کی چنتا کرنی چاہیے

(دو تین آدمی دوڑتے ہوئے آتے ہیں)

ایک : کاکا کچھ سنا تم نے؟

دوسرا : کیا طوفان اٹھا دیا ہے جام نے۔ ہمیں بالکل کتا سمجھ لیا ہے جب جی چاہے دھتکار کر نکال دو۔

تیسرا : کارندہ آیا تھا سیٹھ بنارسی لال کا۔ للکار کر گیا ہے۔ کہتا تھا ایک مہینے سے اوپر ہو گیا سیٹھ کا حکم ٹلتا
چلا رہا ہے اگر آج شام تک سب اپنی کھولیاں خالی نہیں کر گئے تو ———

سب : (کاکا کے سوا) تو؟

تینوں نووارد : تو کہتا ہے گردن میں ہاتھ ڈال کر ڈنڈے کے زور سے۔

سب : ہاں ڈنڈے کے زور سے نکالنے کی دھمکی دیتا ہے۔

کاکا : (سب کاکا کی طرف دیکھتے ہیں ——— جگو ایک طرف خاموش بیٹھ جاتا ہے) جھگڑا بڑھے گا۔ ایک
مہینے سے جس خطرے کا انتظار تھا آ ہی گیا۔ یہاں پر نیا مارکیٹ بنے گا، ہمیں اجاڑا جائے گا سیٹھ بنارسی لال
ہمیں کسی دوسری جگہ بسائے گا بھی نہیں۔ اچھا، آج کا دن بڑا کڑا دن ہے۔

جگو : (اونچی کر) لیکن آج کے دن ہی سب کیوں ہوگا سیٹھ بنارسی لال ہیں آنکھیں دکھاتا ہے اسی کی بجلی کار سے ٹکرا کر میری سکھیا ——

سب : ہاں یہ ظلم کیسے چھپے گا۔

کاکا : اچھا اچھا —— ہم پہلے جمنا پر جائیں گے۔ وہاں سے آکر آج دیکھیں گے کہ اس طوفان کا مقابلہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جگو کی دھارس بندھانا ہی ہمارا کام ہے آج کا دن بہت بھاری ہے۔

منگرو : آج تو بادل چھایا ہے یہی ہوا بھی سینے میں یوں چبھے ہے جیسے تیر۔

(کاکا ایک طرف بڑھتا ہے اور سب اس کے ساتھ بڑھتے ہیں اسٹیج پر روشنی آہستہ آہستہ بہت دھیمی ہو جاتی ہے پس منظر سے رام رام ست ہے کی دھیمی دھیمی آواز آتی ہے اور ڈھول کے بجنے کی جھگوں آواز ابھرتی تھرتھراتی رہتی ہے تھوڑے سے وقفے کے بعد اسٹیج پھر روشن ہو جاتا ہے راستے پر راہگیروں کی آمد و رفت بڑھ گئی ہے ایک طرف کاکا بیٹھا ہے اور اس کے سامنے جوتے کی مرمت کا سامان رکھا ہے اس کے پاس ہی جگو بیٹھا آہستہ آہستہ ایک جوتے کو سہلا رہا ہے اور کہیں دور گھور رہا ہے)

جگو : کاکا !

کاکا : (ایک جوتے میں کیل ٹھونکتے ہوئے) جگو بیٹا !

جگو : میں پوچھتا ہوں سیٹھ بنارسی لال نے آج ہی کا دن کیوں چنا ہے۔

کاکا : (سوچتے ہوئے اور اپنا ہاتھ روکتے ہوئے) جگو — برسات میں بجلی گرتی ہے تو کیا کسی سے پوچھ کر گرتی ہے، کیا وہ دیکھتی ہے آج کون سا دن ہے، کیا وہ دیکھتی ہے کہ جس پیڑ پر گر رہی ہے اس کی چھاتی میں کیا ہے۔ اس کی کونپلوں پر کیا بیتے گی ؟ نہیں دیکھتی جگو، نہیں بجلی اندھی ہوتی ہے سیٹھ بنارسی لال بھی اندھا ہے۔

جگو : تو میں بھی کوئی پیڑ ہوں۔ چپ چاپ جل مروں! میں تو آدمی ہوں۔

کاکا : (ٹو نے کی مرمت کرتے ہوئے) ہوں!

جگو : تم بولتے کیوں نہیں کاکا۔ ہوں سے کیسے کام چلے گا (اپنی جیا لکھی اٹھا لیتا ہے)

کاکا : (رکتے ہوئے) جگو جب تک آنے کا وقت نہیں آتا جوالا مکھی اندر ہی اندر پکتا رہتا ہے۔

جگو : اور جب وقت آجاتا ہے تو؟

کاکا : جوالا مکھی پھٹ پڑتا ہے اس کے منہ سے آگ اور لاوا پھوٹتا ہے اور پھر دنیا اس کے گھٹنے سے

کانپ جاتی ہے۔

جگو : آج کیا ہوگا کاکا؟

کاکا : کیا ہوگا؟

جگو : ہاں کیا ہوگا؟

کاکا : (دانت بھینچ کر دور دیکھتے ہوئے) یہ بتانا مشکل ہے!

جگو : بتاؤ کاکا —— صاف صاف بتاؤ —— آج جوالا مکھی پھٹے گا یا نہیں؟

کاکا : جوالا مکھی —— پگلے یہاں جوالا مکھی کہاں؟

جگو : (اپنے سینے پر ہاتھ مار کر بھری ہوئی آواز میں) یہ ہے جوالا مکھی۔ ایسا لکھی سنبھالتا ہوا اٹھتا ہے۔ اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک اچھلتا چلا جاتا ہے) میں کوئی کیڑا نہیں ہوں جس کا دل چاہے جوتے سے مسل دے۔

کاکا : (حیرانی سے) جگو تجھے کیا ہو گیا ہے (اپنے ہاتھ میں جتا لیے کھڑا ہو جاتا ہے) اس طرح پاگل پن کرنے سے کیا کام بن جائے گا؟

جگو : (اپنی آواز دھیمی کرتے ہوئے) ٹھیک ہے کاکا ٹھیک ہے، کاکا تم نے دیکھا ہے۔ پتیلی میں پانی بھر کر انگیٹھی پر رکھ دو۔ پانی کھولتا رہتا ہے۔ کھولتے کھولتے وہ ڈھکن کو زور سے دھکا دے کر باہر پھینک دیتا ہے یہی حال آدمی کے دل کا ہے۔

کاکا : ہو ٹھیک ہے پر تم نے ایک بالٹی پانی سے جنگل کی آگ کو بجھتے سنا یا دیکھا ہے ؟ (جگو خود فراموشی کے انداز میں نفی میں سر ہلاتا ہے) تو پھر ؟

(گرو اپنے ہاتھ میں کاغذ کے پھولوں کے گچھے اور طرح طرح کے کھلونے
ایک ڈنڈے سے لٹکائے ہوئے داخل ہوتا ہے۔)

گرو : کاکا میں تو قطب مینار پر چڑھ کر ایک دن چھلانگ لگا دوں گا

(بڑی مایوسی اور بے دلی کے ساتھ ٹھنڈی سانس لیتا ہے۔)

جگو : کیا گرو بھیا اتنے ناراض کیوں ہو۔ قطب مینار نے تمھارا کیا بگاڑا ہے۔

گرو : (زمین پر بیٹھتے ہوئے) یہ کوئی بات ہوئی۔ جدھر جاؤ کتے کی طرح دھتکارے جاؤ۔ بس تیری جندگی کی ایسی تیسی۔

جگو : زندگی کو کیوں کوسو بھلا۔ بات کیا ہوئی ؟

گرو : مصیبت ہمارا پیچھا کر رہی ہے۔ تم جانو کلوا کی ماں رات بھر کھانستی رہتی ہے کوئی کہتا ہے دمہ ہے کوئی کہتا ہے دق ہو گیا ہے۔

جگو : تو پھر گھبرانے کی بات کیا ہے۔ ڈاکٹر کو دکھاؤ نا۔

(کاکا اپنے کام کے دوران سر اٹھا کر دونوں کو دیکھتا ہے اور جوتے میں
کیل ٹھونکنے لگتا ہے۔)

گرو : جگو بھیا تمھارا داگ چل گیا ہے۔ گر میں اتنی سکت ہوتی تو اچھے ہی دن تھے۔ میں تو اب جندگی سے تنگ آگیا ہوں۔

جگو : گرو ! تو کاغذ کے پھول بیچتے بیچتے بالکل کاغذی دماگ کا آدمی بن گیا ہے۔ جندگی سے تنگ آگیا ہوں (نقل اتارتے ہوئے) جندگی سے تنگ آگیا ہوں۔ یہ راگ الاپنے سے کبھی کام چلا ہے۔ بتا ؟

گرو : تو میری مصیبت نہیں سمجھتا جگو بھیا۔

جگو : میں تیری مصیبت نہیں سمجھتا۔ آج ہی سکھیا کی راکھ جمنا میں بہا کر آیا ہوں ابھی ؟ (آگے بڑھتے ہوئے)

کیسے کیا ہو گیا۔ جہاں جنگل تھے۔ وہاں اب بجلی کی جگمگاہٹ ہے جہاں گڑھے تھے۔ وہاں اب وزیروں کی کوٹھیاں بن گئی ہیں۔

جگو : تو اس سے بات کیا بنی کاکا؟

کاکا : شہر جوں جوں بڑھتا گیا۔ آدمی کوڑیوں کے مول بکنے لگا۔ بہت سے دھندے پیدا ہوئے لیکن ——

جگو : دھندے بہت پیدا ہوئے —— کہاں پیدا ہوئے؟ سنا ہے جگت جس کارخانے میں کام کرتا ہے وہ بند ہونے جا رہے سکتے ہیں جو سامان پیدا ہوتا ہے بکتا ہی نہیں۔

گرو : بکتا نہیں —— ایسا ہے تو پھر لوگ ننگے بھوکے کیوں ہیں؟

جگو : ہوں! لیکن کاکا یہ تو دنیا کا بدلنا نہیں ہوا۔ یہ تو کچھ اور ہے یہ تو گلے میں پھندا اور کستا جا رہا ہے۔

کاکا : بات یہ ہے جگو بیٹا —— یہ حق کی لڑائی ہے۔

جگو : حق کی لڑائی ہے؟

کاکا : جینا بھی ایک حق ہے۔ اور اس کے لیے لڑنا ہوتا ہے۔

گرو : (یکا یک کاکا کو دیکھتے ہوئے) کاکا ایک بات کہوں؟

کاکا : ہاں ہاں کہو!

گرو : برا نہ ماننا؟

کاکا : کہہ تو سہی!

گرو : کاکا تو سٹھیا گیا ہے؟

کاکا : (کھل کے ہنستا ہے) ہاں میں سٹھیا گیا ہوں۔ یہ سچ ہے پر میں نے ساٹھ برس میں بہت کچھ سیکھا ہے اور یہ ایک گُر کی بات ہے۔

گرو : پہیلی کیوں بجھاتے ہو۔ بتاتے کیوں نہیں؟

(ایک شخص بہت ہی آہستہ آہستہ آتا ہے اور کاکا کے سامنے آ کے کھڑا ہو جاتا ہے۔

کاکا : کیا ہے بابوجی ؟

بابوجی : بھئی دیکھتے ہو ناپینی زبان نکالے سے رہا ہے، ذرا مرمت کر دو۔

کاکا : پانچ آنے پیسے ہوں گے بابوجی ؟

بابوجی : کیا ، پانچ آنے ، حد کر دی۔ پانچ آنے میں تو ———

گرو : پانچ آنے میں تو نئے جوتے آ جائیں گے کیوں بابوجی !

(بابوجی اپنی پتلون میں ہاتھ ڈال کر گھبرائی ہوئی نظروں سے گرو کو گھورتے
ہوئے آگے نکل جاتے ہیں ——— لوگوں کے قہقہے ان کا تعاقب کرتے ہیں)

کاکا : عجیب دن بیت رہے ہیں بابوجی کو دیکھو مجھے بس بال بھی سنوارے ہوئے ہیں پتلون بھی پہنے جیب میں دیکھنے میں کچھ بھی ہے پر اندر سے ہماسے پیٹ کی طرح خالی ہے۔ یہ بابو لوگ : ہونہہ ہوا ہی پلٹ گئی ہے۔

(ایک پندرہ سولہ سال کا لڑکا گنگناتا ہوا اندر کی ایک کھولی سے نکلتا
ہے۔ اس کی بغل میں پوسٹروں کے بنڈل دبے ہوئے ہیں۔ وہ پتلون
اور بنیان پہنے ہوئے ہے۔ چلنے کا انداز فلمی ہیرو کا ہے وہ گنگنا
رہا ہے ——— "میں آوارہ ——— میں آوارہ ہوں")

گرو : کہاں سیٹھ کلو ، کہاں کے ارادے ہیں ؟ آؤ سیٹھ ہمارے پھول ہی لیتے جاؤ۔

کلو : یار تم سگون سی چوپٹ کر دیتے ہو، جا رہا ہوں اپنے کام پر — گلی گلی میں پوسٹر چپکانے اور کیا ؟

گرو : کلو تو ذرا اپنے باپ کا خیال بھی کر لے کبھی کبھی بوڑھے ہاتھ سے کب تک کام لے گا تو۔

کلو : میں جو کچھ کماتا ہوں ۔عیش میں تو نہیں اڑاتا نا ، پر چادر چھوٹی ہو تو سر اور پاؤں دونوں کیسے چھپیں ! اچھا بتاؤ یہ کاغذی پھول کتنے کے آتے ہیں ؟

گرو : یہ دو آنے کے ہیں ؟

کلو : دو آنے کے ——— پھر ہم اصلی مہکتے ہوئے پھول کیوں لیں ؟

گرو : وہ پھول تو مرجھا جائیں گے ——— یہ پھول تو سدا بہار ہیں۔ (گانے کے انداز میں نعرہ لگاتا ہے)

لے لو سدا بہار پھول لے لو — کاگذ کے پھول لے لو — لال پیلے، نیلے، ہرے، کالے، اودے پھول ہیں — پریاں ہیں۔

کلو : استاد تیرے پھول عجب سی نہیں بکتے تو پھول نہیں بیچتا، پریاں بیچتا ہے (ایک پھول اٹھا لیتا ہے۔ اپنے دھیان میں ایسی صورت بناتا ہے اور اکڑتا ہوا نکل جاتا ہے باہر سے آواز آتی ہے) گر دھیا گھبرانا مت یہ اُدھار آج شام کو ہی ادا ہو جائے گا — میں جا رہا ہوں

کاکا : میرا من کرتا تھا کہ کوئی اس گھر میں پڑھ لیتا تو اس کے بہانے ہماری اندھیری جھونپڑی میں روشنی آتی، عکل آتی، طاقت آتی — ہونہہ جگو بیٹا! اب تو سورج جھک چلا ہے اٹھ پانی پی لیں۔

جگو : نہیں کاکا! من نہیں کرتا۔

کاکا : جگو!

(ایک موٹا تازہ خندہ نما آدمی منہ لٹکتا ہوا، کھانستا ہوا اندر اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا داخل ہوتا ہے اور سیٹی بجاتا ہوا ادھر اُدھر کا جائزہ لیتا ہے)

کاکا : کہو استاد کیا بات ہے تم تو اپنی بستی کو بھول ہی گئے۔ کہاں رہتے ہو، کیا کرتے ہو — کیا جمانہ ہے؟

اُستاد : (کھانستا ہے) ٹھاٹھ ہیں کاکا! تم تو جانتے ہی ہو — استاد کی پانچوں انگلیاں ہمیشہ گھی میں تر رہتی ہیں!

کاکا : پھر بھی!

اُستاد : ہاں سنا تھا جگو کی عورت چل بسی۔ سوچا ذرا پرسا کر آؤں۔

جگو : اچھا یکھیا کی بالٹی کی ما بھول گئے استاد؟ اب تو بہو بیٹوں کو چھیڑتے نہ ہو گے تم — یا اب بھی کاروبار چلتا ہے۔

اُستاد : جگو — تم اپنے آپ کو بڑا کائیاں سمجھتے ہو کبھی پلٹن میں بھرتی ہو کر انگریز کمانڈر کی دس بارہ گالیاں کیا سن لیں — ڈیم پھول کیا کہلانے لگے سمجھتے ہو — کمانڈر ہو گئے۔ وہ تو تمہاری ٹانگ چل بسی ورنہ۔

جگو : استاد — (کھڑا ہو جاتا ہے) مجھے تمہارے سب کرتوت معلوم ہیں۔

استاد : کیا ہیں میرے کرتوت، میں جُمّد کی کمائی تو نہیں کھاتا۔

کاکا : اُستاد —— کیا تیرا سر پھر گیا ہے جو اپنے ایک بھائی کے گھاؤ پر نمک چھڑکتے تجھے اچھا لگتا ہے؟

استاد : تم کاکا دیکھو، یہ میری سرا پہنت توبہ کرچلا آیا جو ادھر سُکھ میں ڈھاریں بندھانے —— ایں؟ اور یہ آنکھ نکال کے گرشنے مُردے ایک پڑنے لگا یہ کوئی جھوٹ ہے، یہ تو میں ڈنکے کی چوٹ کہوں۔

سکھیا مرتی تو ایک نہ ایک دن مری کھولی میں ——————

جگو : (جھپٹتا ہے) تو کمینہ ہے ترنتا ہے۔ کتے سے بھی گیا گزرا ہے

(سب بیچ بچاؤ کرتے ہیں)

کاکا : اُستاد —— تو مت آگے بڑھ رہا ہے مردہ عورت پہ کیچڑ اچھالنے سر تم آنی چاہئے۔

اُستاد : جگو سے کہہ دو مجھ سے چھیڑ نہ کرے میں کسی کا رعب نہیں سہتا۔ ایک ہاتھ میں اس کی دوسری ٹانگ بھی۔

جگو : اُستاد کے بچے —— گنتا ہے تیری موت تجھے یہاں کھینچ لائی ہے میں لنگڑا ہوں —— پر اپنی آن پہ ——————

اُستاد : ابے جا بڑا آن بان والا ——

کاکا : اُستاد تیری آنکھوں میں خون اتر آیا ہے تو پاگل ہو گیا ہے تو سکھیا کا بدلہ جگو سے لینا چاہتا ہے۔

اُستاد : کیہر —— چھوڑو میں کیڑوں مکوڑوں کی پروا کب کرتا ہوں؟

کاکا : اچھا ادھر آ —— چین سے یہاں بیٹھ اپنے آپ سے اچھی باتیں تو سیکھیں نہیں بس پھنکارنا سیکھ لیا جو وہ بے چارا آنے والے دکھوں میں سب کے کام آتا تھا۔

اُستاد : کاکا —— ! میں بھی تو اسی لئے آیا تھا پر یہاں بستی میں تو تم نے کتے پال رکھے ہیں شریف آدمی کو دیکھتے ہی بھونکنا شروع کر دیتے ہیں۔

گرو : اُستاد —— تم میں سر اپنت جیسی نہیں رہی۔

اُستاد : (آستین چڑھاتے ہوئے) اچھا تو مینڈکی کو بھی زکام ہونے لگا۔

کاکا : اُستاد بیٹا! —— کیوں چیخ چیخ کر رہا ہے، آ بیٹھ تو آدمی کی طرح بات کر۔

(ایک واجبی قسم کا سفید پوش آدمی داخل ہوتا ہے اور کاکا
کے سامنے آکر رک جاتا ہے ۔)

کیا بات ہے بابو جی ؟

بابوجی : بھئی دیکھنا ذرا انٹرویو میں جا رہا ہوں دو ہاتھ جوتے پہ پالش تو مار دو —— چمکا دو ۔ ایسا
چمکا دُ کہ قسمت بھی چمک اُٹھے ۔

(اپنی سگریٹ کے کش لیتا ہے)

استاد ادھر اُٹھ کر کھڑکیوں کی طرف جھانکتا ہے اور گرد اور
جگو بپھرے ہوئے انداز میں اس کے پیچھے پیچھے آہستہ آہستہ
چلتے ہیں ۔

کاکا : یہ انٹرویو کیا بلا ہے بھلا ؟

(اس کے جوتے پہ پالش کے ہاتھ تیزی سے مارتا جاتا ہے)

بابوجی : انٹرویو ؟ —— انٹرویو ایک جنگ ہے ۔ شیطان کی آنت ہے ۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہے
—— انٹرویو ایک خیال معشوق ہے —— انٹرویو ۔ ——

استاد : پٹ تیرا دھیان کدھر ہے ؟

(زور سے چیختا ہے بابوجی کی طرف آنکھ مارتا ہے اور اپنی مونچھوں
پر تاؤ دینے لگتا ہے دوسری طرف ایک بنیا اپنی ناک پر عینک
جمائے غور سے گھورتا ہوا داخل ہوتا ہے ۔)

بنیا : اجی او بابوجی —— ذرا سنتا تو سہی ——

(بابو گھبرا جاتا ہے اور پالش ختم کرائے بغیر سر جھکا کر دوسری طرف
تیزی سے لپکتا ہے)

کاکا : بابوجی —— ذرا دوسرا جوتا تو چمکانے دو ۔

بابوجی : (جاتے جاتے) دوسرا جوتا کل چمکوالوں گا۔ ابھی ابھی انٹرویو میں۔
(آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔)

بنیا : (پکارتا ہے) بابوجی ---- ارے او بابوجی۔ دیکھا کیا مایہ نکل گیا۔ بڑا نواب بنا پھرتا ہے
اچھا اچھا، گدھے کے سر پہ ڈھونڈتے رہے کو سینگ۔ ابھی مل جاتے ہیں پر یہ بابوجی - پالش
چھی ---- چاہے فاکا ہی کیوں نہ ہو۔ اس ----
---- اوہ جگو ---- ارے جگو ---- بڑا اچھا بڑا اچھا ہوا ----
(اُسا معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے باہر کی طرف کھسک جاتا ہے۔)

جگو : کیا بات ہے سیٹھ ؟

بنیا : (اپنے کان پر ہاتھ رکھ کر) کیا کہا پھر سے کہو۔

جگو : کیا بات ہے سیٹھ ---- تم مجھے دیکھ کر اتنا خوش کیوں ہوئے ؟

بنیا : ارے خوش کیوں ہوتا ---- (پھر منہ بنا کر) سناتیری عورت سادھار گئی رام، رام ---- کتنی
نیک تھی ---- بیچاری، نیک ... سب کا بھلا کرنے والی، کتنا ہی دکھ ہو کبھی دل میلا نہ کرتی۔

کاکا : لالہ جب تم تعریف کے پل باندھ دو تو اس کا مطلب ہوتا ہے کوئی بجلی گرنے والی ہے۔

بنیا : (کان پر ہاتھ رکھ کر) کیا کہا ؟

گرو : (اپنے پنجوں پر کھڑا ہو کر بیٹھتا ہے) کاکا کہتا تھا سیٹھ بڑے دیالو ہیں۔

بنیا : (نقلی رنگ سے جھومتے ہوئے) ہی ہی ہی

گرو : لالہ کا ہماسے ٹولے میں نکل آنا بڑا اشگون ہے

کاکا : چوہوں کے پاس بلی آ جائے تو یہ کیوں سمجھو کہ وہ تمہیں دودھ بتاسے کھلائے گی۔

بنیا : (اسی طرح ہنستے ہوئے) بات یہ ہے جگو ---- میں جرا بُرے وقت آیا ہوں پر آنا ہی پڑا، وہ
تیری سکھیا ---- میری دکان سے سودا ادھار لائی تھی ---- مہینوں سے نکا جا کر تا رہا
تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا۔

گرو : (طنزیہ انداز میں) کہ اُدھار اداکئے بغیر ہی مرجائے گی جانو۔

کاکا : گرو گالی دینے سے تو کچھ ہوگا نہیں۔

جگو : (بہت ہی گری ہوئی مردہ آواز میں) لالہ کھیا اُدھار جیسے بڑے ہی لائی تھی۔ میں ایا ہج بیکار آدمی۔

(ایک طرف بیٹھ جاتا ہے اور اپنا منہ ہاتھوں میں چھپا لیتا ہے۔)

بنیا : ارے بھئی تو کیا لڑ بیٹھے تو جاتا ہے میں اُونچا سنتا ہوں۔

گرو : لالہ بات یہ ہے کہ آج ہی اس پر دکھ کا پہاڑ ٹوٹا ہے (آہستہ سے) اور آج ہی تم بھی ٹوٹ پڑے۔ —— دو چار دن انتظار کرلو۔ سب معاملہ پھر ٹھیک ہو جائے گا۔

بنیا : نا بھائی نا —— یہ کیسے ہو سکتا ہے سیٹھ بنارسی لال کا کارندہ بتا چکا ہے کہ آج ہی یہ سب کھولیاں کھالی ہو جائیں گی سیٹھ کا حکم ہے۔

کاکا : سیٹھ کا حکم ٹل بھی سکتا ہے۔

بنیا : بھائی دیکھو۔ حجت مت کرو۔ بھگوان کا حکم ٹل سکتا ہے سیٹھ کا حکم ٹل نہیں سکتا۔ اور پھر سانپ نکل جائے گا تو کیا کروں گا، میں لکیر پیٹا کروں گا؟

کاکا : جگو کوئی تمہارا پیسہ لے کر بھاگے گا نہیں، ہم ایک مہینے سے سیٹھ کے حکم کے کھلایہ میاں ڈٹے ہوئے ہیں۔ پیسو کے ڈر سے کوئی لنگوٹی تو نہیں پھینک دیتا، ہم تو یہاں۔

بنیا : تم بیچ میں نہ بولو، یہ میرا جگو کا معاملہ ہے۔

گرو : نہیں یہ ہم سب کا معاملہ ہے۔

بنیا : مطلب؟ (گھبرا کر تیور کا اندازہ لگاتے ہوئے)

گرو : مطلب یہ کہ اس وقت تم جاؤ۔ پھر دیکھا جائے گا۔

بنیا : اس وقت تو میں چلا جاؤں گا، مگر تم کو ایک ایک پائی چکا کر جانا ہوگا، یہ صرف جگو کا معاملہ نہیں سب کا معاملہ ہے، تم سب نے میرا اُدھار کھایا ہے —— اور تم سب کو آج ہی ——

جگو : بکو مت لالہ تم سیدھے سیدھے یہاں سے چلے جاؤ، آج ہمارا کچھ مت جاؤ —— نہیں

تو پتہ نہیں کیا ہو جائے گا ۔

(نبیا اس کو بڑھتے ہوئے دیکھ کر آہستہ آہستہ پیچھے پلٹتا ہے اور غائب

ہو جاتا ہے)

کاکا : ایسا معلوم ہوتا ہے آج ایک کے بعد دوسرا بم گرتا رہے گا ۔

(استاد ڈنڈا بجاتا ہوا اور طنزیہ قہقہے لگاتا ہوا داخل ہوتا ہے)

استاد : میں جگو کی بے شرمی دیکھنا نہیں چاہتا تھا سو میں جبراً کنارے کھسک گیا تھا یہ سالا نبیا بھی بڑا چالو ہے

میں نے اسے بہت منع کیا تھا آج ——— مگر تم جاؤ

جگو : استاد اب یہاں سے چلا جا، تو اپنی چاپلوسی کی باتیں کسی اور کو سنا ۔

کاکا : جگو استاد اپنا ہی ہے اس کے دل میں بھی ہمارا درد ہو سکتا ہے ۔

جگو : سڑک کے ڈھیلوں میں کوئی ہمدردی نہیں ہوتی ۔

کاکا : جگو تو کیا کہہ رہا تھا ہس وقت ——— بات تو پوری کر ———

(گرو اور جگو ایک طرف کنارے بیٹھ کر سرگوشی کرنے لگتے ہیں اور استاد

بڑے راز دارانہ انداز میں کاکا کو سمجھاتا ہے ۔)

استاد : دیکھو کاکا اچھا یہی ہے کہ ہم اپنا بوریا بستر سمیٹ اور یہاں سے اٹھ چلیں یہ کوئی ہمارے باپ کی جاگیر تو

ہے نہیں ۔

کاکا : ہے کیسے نہیں، ہم یہیں بیس بیس تیس تیس پندرہ پندرہ برس سے رہتے آ رہے ہیں ۔ تو کیا یک نہ

ہے استاد ہماری چھوٹی سی دنیا بن گئی ہے ——— ہم اس کو اجاڑ کے چلے جائیں اور کہاں چلے جائیں ۔

استاد : کیوں نہیں تو شہر سے باہر جگہیں مل رہی ہیں ۔

کاکا : لیکن کہاں بکواس دس بارہ بارہ میل دور ۔

استاد : اس سے کیا ہوتا ہے کاکا ؟

جگو : اس سے کیا ہوتا ہے ۔ اس سے یہ ہوتا ہے کہ ہماری یہ برسوں سے آباد دنیا اجڑ جائے گی ۔ یہاں ہم ایک

دوسرے کے دکھ سکھ میں ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں۔ کہیں کوئی مر جائے تو ہم ایک ساتھ ارتھی کا بوجھ اٹھا لیتے ہیں۔ کہیں بیاہ ہو، بچہ ہو تو ہم سب ایک ساتھ ہنس لیتے ہیں ناچ لیتے ہیں گا لیتے ہیں۔

گرو : مسکروکی لونڈیا آتی ہے ہماری گود میں سما جاتی ہے۔ چاچا پھول دو۔ کتنے پیار سے کہتی ہے، میں پھول دیتا ہوں اور وہ ——————

اُستاد : یہ سب بکواس ہے۔

جگو : بکواس تم کر رہے ہو، تم یہاں ہمیں بہکانے آئے ہو۔

اُستاد : میں بہکانے آیا ہوں تیرا دماغ چل گیا ہے جگو۔

جگو : ہاں ہمارا دماغ چل گیا ہے پر تم ہمیں دھوکا نہیں دے سکتے۔

کاکا : استاد تو الٹی سیدھی باتیں کیوں کر رہا ہے۔

گرو : میں جانتا ہوں کیوں،

جگو : کاکا —————— یہ بکا ہوا آدمی ہے

اُستاد : بکا ہوا آدمی —— سڑی —— سڑی کا بچہ ——————

(دونوں ایک دوسرے کی طرف جھپٹے ہیں استاد نے دھکے سے جگو کو دور بھگا دیا ہے گرو نے اسے پکڑ لیا ہے)

کاکا : استاد، گرو :

گرو : اُستاد تو آستین کا سانپ ہے، —— بالکل آستین کا سانپ ہے، ——————

کاکا : اُستاد —————— تو ہم سے ایسا سلوک کرتا ہے۔ یہ ٹھیک نہیں۔

جگو : کاکا تم کس سے بات کر رہے ہو —————— یہ آدمی سیٹھ بنارسی لال کا جرخرید ہے۔ ہمیں بہکا کر بھگانے آیا ہے یہاں سے۔

اُستاد : اچھا یہ بات ہے تو یہی سہی۔ میں سیٹھ بنارسی لال کا آدمی ہوں بکا ہوا ہوں زر دار بھرا جاتی ہے زر خرید ہوں، کان کھول کر سن لو، سمجھانا بجھانا ہو گیا اب تم یہاں سے ڈنڈے کے زور نکالے جاؤ گے —— سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلتا، لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ سانجھ ہوتے ہی یہاں سے چل دو

نہیں تو اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی۔ سن رہاں۔ سُن۔ او کان کھول کر سُن لو۔ ایک بات جھوٹ ہو تو
میرے نام کا کتا پال لینا۔

جگّو : تیرے نام کا کتا پلتے ہیں سیٹھ بنارسی لال جیسے لوگ۔ ہمیں ایسے کتوں کی ضرورت نہیں

سُستاد : (ڈانٹ پھٹکتا ہے) اچھا اچھا۔

(پھرتا اور تھوکتا ہوا باہر نکل جاتا ہے — سب خاموش اور حیران نظروں
سے ایک دوسرے کو کھڑے دیکھتے رہتے ہیں — جگّو جھلتا ہوا بدیا کلی کے
سامنے ایک کنارے سے دوسرے کنارے کی طرف جاتا ہے)

جگّو : ہونہہ! — اینٹ سے اینٹ بجا دے گا — جیسے ہمارے پاس بھی کوئی لال قلعہ ہے
کوئی تاج محل ہے — بجا دو اینٹ سے اینٹ ہم ان گیدڑ بھبھکیوں میں نہیں آئیں گے۔

(گرو اور کاکا بڑھ کر اسے پکڑ لیتے ہیں اور آہستہ آہستہ ایک بار پھر اسٹیج
اندھیرے میں غرق ہو جاتا ہے چند لمحوں بعد آہستہ آہستہ اسٹیج روشن ہونے
لگتا ہے، پس منظر سے ایک غمناک موسیقی ابھرتی ہے روشنی کی زردی آہستہ
آہستہ سرخی مائل ہوتی جاتی ہے۔ دور سے ایک گیت کی آواز آتی ہے
"سانجھ بھئی اور سائے چھائے" — جیسے جیسے اسٹیج پر روشنی بڑھتی ہے
کچھ عورتیں بچے، بوڑھے اپنے گھروں کا چھوٹا موٹا اثاثہ لیے سروں
پر اٹھائے، ڈگمگاتے ہوئے، کوستے ہوئے، روتے ہوئے آنچلوں
سے آنسو پونچھتے ہوئے ایک طرف سے دوسری طرف بڑھ رہے
ہیں —)

ایک عورت : تیج پتیج چل منا — دیکھ اندھیرا ہونے لگا ہے اور ہمیں کتنی دور جانا ہے کتنی دور!

ایک بوڑھی عورت : (اپنے سر پر ایک بڑا سا گٹھر اٹھائے ڈگمگاتی ہوئی آتی ہے) ارے جی کی ماں — یہ
بوجھ تو اٹھائے نہ اٹھے۔ ارے سب چھوڑ کہاں چل دیئے ——

(رونے لگتی ہے آنچل سے آنسو پونچھتی ہے اور پلٹ کر دیکھتی ہے۔ اس کے پیچھے دھوبی کا ایک خاندان، ایک بوڑھا شخص، اس کی عورت، بہو بیٹے بچے اور ایک گدھا گٹھرے لدا ہوا اندر آتا ہے ——— اسی وقت ایک کونے سے جگو آتا ہے ———)

جگو : ارے تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے، کیوں اپنا گھر بار چھوڑ کر بھاگے جا رہے ہو ——— چڑیاں بھی اس طرح اپنا گھونسلا چپ چاپ چھوڑ کر نہیں اڑ جاتیں۔

دھوبی : جگو راجہ ——— گھر بار کوئی خوشی سے تھوڑے چھوڑے ہے۔

جگو : پھر اس طرح کیوں بھاگے جا رہے ہو تم لوگ؟

دھوبی : (اپنے روتے بچے کو سینے سے لگا کر) چپ چپ ——— دیکھتا نہیں یہ ہیں اپنے جگو کاکا جگو راجہ! بوڑھے بچے جوان ——— سب لوگوں کے کرم اٹھائے یہاں سے جا رہے ہیں، روز روز کی دھمکی ——— آج تو عزت آبرو پر ہاتھ ڈال دیا سیٹھ کے آدمیوں نے

جگو : پر عزت آبرو بھاگنے سے تو بچے گی نہیں ——— لڑو۔ جرا لڑو تو سہی ———

دھوبی : اگھڑ (؟) ناامیدی کے ساتھ) لڑنے والوں کے ہاتھ کٹے ہوں تو کون لڑے۔ کانون ان کا، دولت ان کی جہاں ان کی، ڈنڈا ان کا ——— اپنا کیا ہے جو کچھ ہے محنت ہے گاڑھے پسینے کی کمائی ہے اور ——— اور ——— اچھا اچھا ——— لو اپنے وہ لوگ نکل گئے۔ اندھیرا بڑھتا آتا ہے ——— رام رام ——— رام رام ———

(بھاگتا ہے)

جگو : (اپنے آپ سے) یہ کیا ہو رہا ہے ——— ان کو کوئی نہیں روکتا ——— کوئی نہیں روکتا ———

(گردو اور منگرو ایک ساتھ لپکے ہوئے آتے ہیں)

گردو : منگرو کہاں سے آ رہے ہو۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے یہ لوگ چپ چاپ کیوں بھاگے جا رہے ہیں؟

منگرو : بزدل ہیں یہ لوگ۔

گرو : کوئی نئی دل نہیں ہے۔ آج سویرے سے لوگوں کو ستایا جا رہا ہے ان کے سامنے اور کوئی راستہ ہی نہیں تھا کریں کیا۔

جگو : گرو! میں تو پھر کہوں گا ہمیں ڈٹ کر ایک دیوار بن جانا چاہئے۔ دیکھیں پھر کون ڈھا تا ہے یہ دیوار۔

گرو : سیٹھ نے آج اپنے میلوانوں کو ——— اپنے حرام خوروں کو دارو پلایا ہے ان کے ہاتھوں میں ڈنڈے چمک رہے ہیں۔

جگو : میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ سنگ تارہیں یہ کانٹے آیا ہے۔

(ایک طرف سے کاکا کھانستا ہوا اور اپنے دامن سے آنکھیں پونچھتا ہوا آتا ہے۔)

کاکا : دیکھا تم نے ہماری بھری دنیا کیسے اُجڑ رہی ہے؟

جگو : (ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے۔ دانت بھینچ کر) دیکھ رہا ہوں کاکا۔ ڈوبتی ہوئی ناؤ میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی ہاتھ پاؤں مارتے ہیں پر اِس دنیا کے لوگ جدھر منہ اُٹھ گیا چل دیئے۔

کاکا : میں تو اتنا جانتا ہوں ——— اپنا رستہ سہرے ٹوٹ جانے گا جو چھوٹے موٹے دھندے ہوتے تھے وہ ناس ہو جائیں گے۔ چمار ہوں، دھوبی ہوں، کمہار ہوں ——— جو بھی ہوں ان کے گاہک تو ہیں رہ جائیں گے تیل بنا دیا لمبی چلا ہے ایں؟

منگرو : (ایک آدمی اپنا سامان سر پر اٹھائے دوسری طرف سے آتا ہے اس کے پیچھے پیچھے اس کی عورت آتی ہے) کیوں بھئی تمہیں بھی جانا ہی تھا؟

آدمی : (غور سے دیکھتا ہے) ہاں ہاں ——— ہاں۔ (سوچتا ہے، مڑتا ہے اور چلا جاتا ہے)

منگرو : ایسا لگتا ہے ان کے اندر جان ہی نہیں رہی، آنسو پونچھنے جاتے ہیں۔ بولتے بھی نہیں اور اپنی راہ چل دیتے ہیں ایسا لگتا ہے جیسے کبھی کی جان پہچان بھی نہیں۔

جگو : اِن کو روکنا پڑے گا، ان کو جرا سہارا دو ——— روکو ——— یہ رک جائیں گے۔

کاکا : بندھ ٹوٹ گیا ہے اس پانی کو اب کوئی نہیں روک سکتا۔

جگو : پر ہم تو نہیں جائیں گے جان جائے پر ہم نہیں جاتے۔

استاد : اچھا تو یہ مجھ سے برسرے اندر غلط ہوتا ہے، تم کیا تمھارا بھوت بھی یہاں سے چلا جائے گا (سب حیران ہو کر میری طرف دیکھتے ہیں) سویرا ہوا، دوپہر ہوئی، سانجھ ہوئی ——— اور تمھاری رامائن ختم نہیں ہوئی بھاگو یہاں سے نہیں تو ———

جگو : نہیں تو۔

استاد : نہیں تو تمھارا جلوس نکالا جائے گا۔

جگو : تم سب تو ہم کو ناک سمجھتے ہو ——— اینٹ کا جواب پتھر سے دے گا؟

کاکا : استاد ہمیں یہاں سے نکال کر تمھیں کیا مل جائے گا۔

جگو : کاکا تم بیچ سے گھگھیا کر بات مت کرو۔

استاد : زبان سنبھال جگو ——— نہیں تو تیری جیبھ چھپکلی کی دم کی طرح یہیں پڑی تڑپ کر ٹھنڈی ہو جائے گی ———!

جگو : (آگے بڑھتا ہے) ایسے جا بڑا آیا۔ (منگرو اور کاکا اس کو پکڑ لیتے ہیں)

استاد : صاف صاف بتاؤ ——— تم سیدھی طرح یہاں سے جاؤ گے کہ نہیں؟

جگو : نہیں۔

استاد : کیا؟

منگرو اور گرو : نہیں، نہیں نہیں۔

استاد : تم بولو کاکا، ان لچڑوں سے میں سمجھ لوں گا تم بولو ——— کاکا؟

کاکا : (دو تین بار استاد اور منگرو اور گرو کے درمیان آہستہ آہستہ ٹہلتا ہے) مجرا جواب سنو گے۔

استاد : ہاں۔

کاکا : ہم یہاں سے چوہوں کی طرح نہیں نکلیں گے۔

استاد : اچھا یہ بات ہے۔

کاکا : یہ لڑائی تجھ سے نہیں ہے۔ میں نے تجھے کھیل کھلایا ہے یہ لڑائی تو تیرے سیٹھ سے ہے تو بیچ میں ہو آتا ہے۔

جگو : یہ کاکا ہے وا وکید نشے میں دھت ہے — اب اپنے بھائیوں کا خون پینے آیا ہے۔

استاد : ... ... جگو — ایک ایک گھر ڈھا دوں تو پھر میں نے کتیا کے پیٹ سے جنم لیا ہو۔

کاکا : رام رام ... ان لوگوں کا لیتے لاج نہیں آتی تجھے!

استاد : (... کرتا ہے) آجاؤ یارو — دکھا دو — ان کتوں کو بھونکنے کا مزا (... ڈنڈے اپنے اندر کو دیکھتے ہیں) بولو اب بھی ... بستر لپیٹتے ہو یا نہیں۔ میں تم سے بڑی مراعات سے نہیں آ رہا ہوں۔

جگو : اپنی مراعات رکھو اپنی جیب میں، ہم ان ڈنڈوں سے نہیں ڈریں گے۔

(استاد بڑھ کر ایک ڈنڈا جگو کو رسید کرتا ہے سب بدمعاش اس کے ساتھ اچھلتے ہیں اور بستیوں کو پیٹنا شروع کر دیتے ہیں ان کی کھولیوں میں گھستے ہیں اور چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکتے ہیں۔ چیزوں کی چھنکار اور دھڑام دھڑام کی آواز ایک سنسنی سی دوڑا دیتی ہے وہ سب شور مچاتے ہوئے اور ڈنڈے جھکاتے ہوئے کھولیوں سے نکل کر دوسری طرف غائب ہو جاتے ہیں)

کاکا : (کراہتے) جگو — منگرو — گرو —

جگو : (سر اٹھاتا ہے اور اپنے چہرے سے خون پونچھتا ہے) کاکا دشمن ہمارا خون بہا کر نکل گیا۔

(اسی وقت اٹھا ٹیک، دھینگا مشتی اور چیزوں کے ٹوٹنے پھوٹنے کی آواز آتی ہے — شور بڑھتا جاتا ہے۔ بچوں اور عورتوں کی چیخیں صاف سنائی دے رہی ہیں۔)

کاکا : (سر اٹھاتا ہے) کیا ہو رہا ہے — یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ مجھے کچھ سوجھتا کیوں نہیں۔

(لڑکھڑاتا ہے اور سہارا ڈھونڈتا ہے) جگو مجھے کیا ہوگیا ہے اتنا اندھیرا کیوں ہے
کلو خون میں نہایا ہوا داخل ہوتا ہے آتے ہی اپنی سیڑھی اور اپنے
پوسٹر پھینک دیتا ہے ـــــ جگو اٹھ کر لنگڑاتا ہوا اسے
تھام لیتا ہے ـــ منگرو اور گدھ بھی اس پر جھک جاتے ہیں)

جگو : کیا ہوا کلو ـــــ کیا ہوا ؟

کلو : کچھ نہیں سپ موسی کو بچانے گیا تو مجھے بھی (پھر وہ تن کر کھڑا ہو جاتا ہے) پر وہاں ایک ایک
گھر لٹ رہا ہے ۔ چلو چلو ـــــ

(سب اٹھتے ہیں اور ایک طرف لپکتے ہیں ۔ صرف کالا کا رہ جاتا ہے
اور آہستہ آہستہ ان کے پیچھے لڑکھڑاتا ہوا نکل جاتا ہے شور بڑھتا جاتا ہے
روشنی بہت دھیمی ہو جاتی ہے ـــ اور اس کی زردی اور سُرخی بڑھ
جاتی ہے ـــــ سیٹھ اپنے دو آدمیوں کے ساتھ داخل ہوتا ہے شور
آہستہ آہستہ کم ہونے لگتا ہے)

سیٹھ : ہے ــ ہے ــ ہے ـــــ شور کم ہو رہا ہے ٹھیک ہے ، ٹھیک ہے ، اب جا کے معاملہ
ٹھنڈا ہوا ۔

ایک آدمی : ہاں سرکار یہ تو ہونا ہی تھا

سیٹھ : میں کسی کو ستانا نہیں ۔ تم جانو میرا دل کتنا نرم ہے ۔

دوسرا آدمی : ہاں ہاں سرکار یہ تو ساری دنیا جانتی ہے ۔ آپ کا دل تو گلاب کا پھول ہے

سیٹھ : ہوں ! لوگ دیوار سے کیوں ٹکراتے ہیں ؟ تو اپنا ہی سر پھوڑیں گے ۔

پہلا آدمی : جی ہاں سرکار ـــــ دیوار بھی کوئی معمولی نہیں ہماری ہی

(اُستاد اپنے آدمیوں کے ساتھ داخل ہوتا ہے سب چھپتے ہیں
اور سیٹھ کو سلام کرتے ہیں)

سیٹھ شاباش (ایک آدمی سے مخاطب ہوکر) ان کو حد سے زیادہ دو ——— ان کو خوش کرو ——— ان کو خوب پلاؤ ——— تھک گئے ہوں گے بے چارے ———

(ایک آدمی سیٹھ کو اکیلا چھوڑ کر اور ان بدمعاشوں کو ساتھ لے کر چل دیتا ہے)

اُستاد: (جاتے جاتے) سرکار ——— ہم ایسی کتنی دُنیا سر کر سکتے ہیں۔

سیٹھ۔ (سر ہلاتا ہے) ضرور ضرور!

(پھر ٹہلتے ہوئے اور ان کھولیوں کو دیکھتے ہوئے)

دیکھنا لاجی! کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟

کارندہ: سیٹھ جی بندر (وقفہ) کیا جانے ادرک کا سواد؟

سیٹھ: اب یہاں سے وہاں تک نیا مارکیٹ پھیل سکے گا! اور نئی دُنیا جگمگا جائے گی

(اکڑتے ہوئے چلتا ہے، جاتے ہی اس کے قہقہے کی آواز چند لمحے تک آتی ہے اور آہستہ آہستہ مٹ جاتی ہے۔)

(تھوڑا وقفہ)

(اندھیرا بڑھتا جاتا ہے، جگو اور کاکا لے دھندلے سے نمودار ہوتے ہیں دونوں اپنی کھولیوں کی طرف دیکھتے ہیں)

جگو: (زور سے چیخ کر) سیٹھ مگر سنتے جاؤ ——— ہم یہاں سے نہیں ٹلیں گے ——— نہیں جائیں گے ——— یہاں جتنا کھون دبانا چاہو ——— ہاں! کسی کی ہری بھری دُنیا چھیننا آسان نہیں ہے ——— ابھی میں جیتا ہوں ——— کاکا ہیں ہے، میری سکھیا یہیں ہے

(اندھیرے کے ساتھ ساتھ پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے۔)

پردہ

○

جاوید اقبال

کردار

بڑھیا ۔ نوجوان کی ملازمہ

مرد ایک سرپھرا نوجوان ۔

ایک لڑکی :

نوکر ۔

منظر

(کسی بلند پہاڑ کی چوٹی پر ایک شکستہ سے مکان کا ویران کمرہ۔
مشرقی دیوار میں ایک دروازہ ہے جو اُوپر کی منزل پر جانے کے لیے سیڑھیوں
کی جانب کھلتا ہے۔ اس دروازے سے سیڑھیوں کی ایک جھلک دکھائی
دے رہی ہے۔ سامنے کی دیوار میں پھر ایک دروازہ اور ایک کھڑکی ہے۔
یہ دروازہ باہر کے برآمدے سے کمرے میں داخل ہونے کا رستہ ہے۔
کھڑکی سے دُور پہاڑ کی برفانی چوٹیاں دکھائی دے رہی ہیں۔ مغربی دیوار کی
انگیٹھی میں آگ سلگ رہی ہے جس کی وجہ سے کمرے کی ساری دیواروں
پر سائے سے رقص کرتے معلوم ہوتے ہیں۔
انگیٹھی کے قریب غلیظ سے صوفہ پر ایک بڑھیا کندھوں پر شال
رکھے بیٹھی سلائیوں سے کچھ بُن رہی ہے۔ کھڑکی کے قریب ایک نوجوان
لڑکی کھڑی ہے جس کے چہرے پر خوف کے آثار ہیں۔ بعض اوقات وہ سردی
سے ٹھٹھر جاتی ہے۔ لڑکی سے قدرے ہٹ کر ایک کرسی پر سفید کپڑوں
کی گٹھڑی دھری ہے۔ کمرے کے عین وسط میں ایک گرد آلود میز پڑا ہے
جس پر رکھے ہوئے گلدان میں پھول مُرجھا چکے ہیں۔
آفتاب غروب ہونے کے قریب ہے۔ چاروں طرف موت کا
سا سکوت طاری ہے۔ کبھی کبھار دور کسی وادی میں بھیڑیئے کی آواز گونجتی ہے
تو فضا میں لمحہ بھر کے لیے ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔)

بڑھیا : (طنز بھری ہنسی کے ساتھ) دیر سے لوٹنا تو اس کا معمول ہے۔

لڑکی : (سنجیدگی سے) مجھے ایسے آقا پسند نہیں ہو رات گئے گھر لوٹیں۔

بڑھیا : (تسلی آمیز لہجہ میں) ہمیں آج شب اس کے سامنے تمہارا ذکر چھیڑوں گی مجھے یقین ہے وہ تمہیں ضرور رکھ لے گا۔ ہمیں ایک نوجوان خادمہ کی بے حد ضرورت ہے۔ جو یہاں کی چیزیں صاف ستھری رکھ سکے، وہ مجھے کل ہی روز کہہ رہا تھا۔

لڑکی : (بے پروائی سے) ان کے اس قدر دیر سے لوٹنے کی وجہ کیا ہے؟

بڑھیا : (بے پروائی سے) میں نے اس سے کبھی پوچھا نہیں۔

لڑکی : (الجھن لینے ہوئے) آخر وہ اپنا وقت کہاں صرف کرتے ہیں؟

بڑھیا : (اسی بے پروائی سے) میں نہیں کہہ سکتی ——— مگر میں نے سن رکھا ہے کہ وہ قریب کے کھنڈروں میں شکستہ ستونوں کے درمیان دندھے منہ پڑا پہروں کچھ سوچتا رہتا ہے، لوگ کہتے ہیں اسے شراب پینے کی علت ہے۔

لڑکی : (بناوٹی حقارت کا اظہار کرتے ہوئے) مجھے شرابیوں سے نفرت ہے۔

بڑھیا : (اسی انداز سے) بعض کہتے ہیں کہ وہ معزول شدہ فرشتہ ہے جسے خدا کی حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کے الزام میں لڑھکا دیا گیا ہے یا خطۂ ارض سے منسلک کوئی جنگلی ہوائی بد روح ہے جو موقع پا کر کسی نحیف پیکرِ خاکی پر اپنا تسلط جما چکی ہے ——— لیکن مجھے یقین ہے۔ وہ تمہیں ضرور رکھ لے گا، اُسے نوجوان لڑکیاں بہت بھاتی ہیں خاص طور۔

لڑکی : (خوف سے) کیا کہا؟

بڑھیا : (اسی انداز میں) خاص طور پر جن کا رنگ سفید ہو جن کے ہونٹ عنابی ہوں جن کی آنکھیں میں نے یہ بھی سن رکھا ہے کہ وہ حسین لڑکیوں کو اذیت پہنچا کر اپنے کسی ناقابلِ بیان جذبۂ انتقام کو تسکین پہنچاتا ہے۔

لڑکی : (لرزتے ہوئے) توبہ ——— کس قسم کا انتقام؟

بڑھیا : (بے پروائی سے) میں نہیں جانتی۔

لڑکی : (خوف سے چیختے ہوئے) م ——— مجھے نوکری نہیں چاہیئے میں ——— میں یہاں نہیں ٹھہروں گی۔

بڑھیا : (اپنے مخصوص تسلی آمیز لہجے میں) مگر مجھے یقین ہے یہ سب غلط ہے ذرا سوچو تو سہی ۔ کبھی کوئی فرشتہ ——— بھی آسمانوں سے لڑھکا ہے؟ اور پھر کوئی بھٹکی ہوئی بدروح بھی کسی پیکر خاکی پر اپنا تسلط جما سکتی ہے؟ ——— میں جانتی ہوں اس جیسا رحم دل آقا تمھیں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکے گا۔

لڑکی : (ڈرتے ہوئے) ممکن ہے تم اُن سے ناواقف ہو۔

بڑھیا : (ہنستے ہوئے) میں اس سے ناواقف ہوں، کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے؟ ایک پانچ بالشت کا لڑکا جس نے اپنی زندگی کے لاتعداد لمحے میری گود میں سو کر گزارے ہیں ——— بتاؤ بھلا میں اس سے ناواقف ہو سکتی ہوں؟ ارے نہیں ——— مجھ سے بہتر اُسے دنیا بھر میں کوئی نہیں جانتا۔

لڑکی : (افسردگی سے) خدا کرے تمھارا کہنا ٹھیک رہے۔

بڑھیا : (کرسی پر دھری گٹھڑی کو دیکھ کر) کیا اس گٹھڑی میں تمہارے کپڑے ہیں؟

لڑکی : (بے پروائی سے) نہیں میری ننھی بچی ہے۔ جسے میں نے سردی سے بچانے کے لیے اچھی طرح لپیٹ رکھا ہے۔

بڑھیا : (معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ) اُسے لڑکیوں سے نفرت ہے۔

لڑکی : (تعجب سے) لڑکیوں سے؟

بڑھیا : (اُسی انداز میں) ہاں ——— صرف ان بچوں سے جو لڑکیاں پیدا ہوئی ہوں تم سے نہیں مجھے یقین ہے وہ تمھیں ضرور پسند کرے گا، میں تمھیں بتا چکی ہوں اسے حسین چہرے بھاتے ہیں وہ تمھیں یقیناً رکھ لے گا۔

لڑکی : (حقارت و غصہ سے) میں انسانوں کے ہاں پناہ چاہتی ہوں، درندوں کے نہیں۔

بڑھیا : (بغیر دھیان دیئے) تم نے اپنے خاوند کی موت کے بعد کہیں اور بھی ملازمت کی ہے؟

لڑکی : (بے پروائی سے) ہاں کی تھی۔

بڑھیا : (دلچسپی لیتے ہوئے) مگر تم نے چھوڑ کیوں دی؟

لڑکی : (اسی انداز میں) میرا آقا بہت ظالم تھا۔

بڑھیا : (بے پروائی سے) کیا وہ شادی شدہ تھا؟

لڑکی : (اسی انداز میں) نہیں ——

بڑھیا : (ہنستے ہوئے) تمھیں پیٹتا ہوگا؟

لڑکی : (اسی انداز میں) نہیں ۔

بڑھیا : (ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے) شاید بے رحم ہو۔

لڑکی : (تنگ آکر) نہیں —— نہیں —— ہاں! وہ بے رحم تھا (پھر خوف سے چیختے ہوئے) مم —— مگر میں یہاں نہیں ٹھہروں گی —— میں کہیں اور ملازمت کی تلاش کروں گی —— خدارا! مجھے جانے دو۔

بڑھیا : (تسلی آمیز لہجے میں) تم بلاوجہ گھبرا رہی ہو —— میرے قریب آؤ —— میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ تمہاری حفاظت کروں گی۔ مجھ پر بھروسہ رکھو تمھیں کوئی کچھ نہ کہے گا۔

لڑکی : (خوف سے لرزتے ہوئے) میں اس گھر سے متنفر ہوں، یہاں کی گھٹی گھٹی فضا مجھے زہر میں بجھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ مجھے شک ہے کہ یہ گھر آسیب زدہ ہے۔

بڑھیا : (بے پروائی سے) ہاں! اس گھر میں واقعی سایہ ہے۔ بسا اوقات رات گئے ہمیں اوپر کی منزل سے عورتوں کی چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ پھر کبھی کبھار کوئی نچلا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے مگر جب میں اسے کھول کر دیکھتی ہوں تو وہاں کسی کو نہیں پاتی۔

لڑکی : (پھر لرزتے ہوئے) کن عورتوں کی چیخیں۔

بڑھیا : (بے پروائی سے) مجھے معلوم نہیں —— لیکن لوگوں کے خیال میں یہ وہ عورتیں ہیں جنھیں اس گھر میں گلا گھونٹ کر مار دیا گیا ہے۔

لڑکی : (مرتعش لہجہ میں) گ ـــــــ گلا گھونٹ کر ـــــــ آہ ! کس قدر بھیانک موت ہے (بڑھیا کوئی جواب نہیں دیتی) م ـــــــ میں جانا چاہتی ہوں، میں یہاں نہیں ٹھہروں گی، مجھے جانے کی اجازت دو۔

بڑھیا : (مخصوص تسلی آمیز لہجہ میں) مگر مجھے یقین ہے یہ محض بکواس ہے، لوگوں کے من گھڑت قصے ہیں۔ مجھے اس گھر میں چالیس برس ہونے کو آئے، لیکن میں نے آج تک کسی عورت کو مرتے نہیں دیکھا (عجیب لہجہ میں) سوائے آقا کی ماں کے، بے چاری بڑی نیک تھی، اپنے میکے سے مجھے ساتھ لائی اور جتنا عرصہ زندہ رہی مجھے نہایت محبت اور پیار سے رکھا۔ وہ مجھے ہمیشہ بہن کہا کرتی تھی حالانکہ میں اس کی خادمہ ہی تو تھی، اور جب اس کا شوہر کام پر چلا جاتا تو گھنٹوں میرے پاس بیٹھی باتیں کیا کرتی۔ اسے ایک بچے کی کس قدر آرزو تھی، کئی بار وہ میرے سامنے رو یا کرتی۔ سردیوں کی سنسان تاریک راتوں میں جب برستے برف کا لبادہ اوڑھ لیتی تو وہ اپنے شوہر کو سوتا چھوڑ کر اپنی خوابگاہ سے نکلتی اور لڑکھڑاتے قدموں سے ویران پگڈنڈی کو طے کرتی ہوئی اس چوٹی پر پہنچ جاتی جو باقیوں سے قدرے بلند ہے ـــــــ وہاں دوپٹہ کا دامن پھیلا کر اپنا چہرہ آسمان کی طرف موڑ کے وہ زار زار روتی خدا کے آگے اپنی تمنا کی تکمیل کے لیے گڑگڑاتی۔ میں نے اسے کئی بار منع بھی کیا کہ سردیوں میں رات کو تنہا اتر کر جانا بے حد خطرناک ہے مگر اس نے میری کبھی پرواہ نہ کی۔ تیرہ سال کے طویل انتظار کے بعد اس کی سنی گئی، خدا نے اسے ایک پھول سا بچہ عطا کیا ـــــــ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ بار بار مجھ سے کہا کرتی "دیکھ لیا نجابو! میرے خدا نے آخر میری سن ہی لی، میں نے تو اس سے صرف ایک بچہ مانگا تھا، لیکن اس نے فرشتہ بھیج دیا" تعجب کی بات تو یہ ہے کہ وہ درست کہتی تھی کیونکہ جب بچہ پیدا ہوا تو اس کے شانوں پر دو ننھے ننھے سفید سے پر تھے اس راز کو ہم دونوں نے ہمیشہ چھپائے رکھا اور کسی کو خبر نہ ہونے دی، یہاں تک کہ اس کا شوہر ـــــــ

لڑکی : (تعجب سے) اس کے پر موجود ہیں ؟

بڑھیا : (حسرت ناک لہجہ میں) نہیں ـــــــ جوں جوں وہ ہوش سنبھالتا گیا، اس کے پر خود بخود جھڑتے

گئے۔ گزشتہ سال سے اس کے شانوں پر ان پروں کے آثار تک باقی نہیں رہے۔

لڑکی : (بے پروائی سے) اس گھر میں اور کون رہتا ہے۔

بڑھیا : (اسی انداز میں) صرف ایک نوکر ہے آقا اسے زنجیروں میں جکڑ کر جنگل سے لایا تھا۔

لڑکی : (تعجب سے) کیوں؟

بڑھیا : (بے پروائی سے) وہ ابھی بچہ ہی تھا کہ بھیڑیئے اسے ماں کی گود سے چھین کر لے گئے۔ کئی سال تک

انہی کے درمیان۔ تا آخر ایک روز جب آقا شکار پر گیا تو اسے پابہ زنجیر یہاں لے آیا۔

لڑکی : (اسی انداز سے) کیا وہ بول سکتا تھا؟

بڑھیا : (بے پروائی سے) بول تو نہیں سکتا تھا البتہ غراتا ضرور تھا۔ کبھی کبھی کاٹنے کو بھی دوڑتا تھا۔ مگر

زنجیریں مضبوط تھیں۔

لڑکی : (ڈرتے ہوئے) اس کی حالت اب کیسی ہے؟

بڑھیا : (بے پروائی سے) آقا نے مار مار کر اسے بولنا سکھایا۔ یعنی کہ از سر نو انسان بن گیا۔

لڑکی : (اطمینان کا سانس لیتے ہوئے) شکر ہے۔

بڑھیا : (وقفہ کے بعد) آفتاب غالباً غروب ہو چکا؟

لڑکی : (کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے) ہاں! وادیاں تاریکی میں ڈوبتی چلی جا رہی ہیں۔

بڑھیا : (بے پروائی سے) دیکھو تو کیا چاند نکل آیا ہے؟

لڑکی : (کھوئے ہوئے انداز میں) نہیں —— ہر طرف عجیب خاموشی چھائی ہے۔ دور، پہاڑوں کی چوٹیوں

پر سیاہ بادلوں کے آوارہ ٹکڑے رینگ رہے ہیں۔ ممکن ہے آج رات طوفان آئے۔

بڑھیا : (اسی بے پروائی سے) ہو سکتا ہے۔

لڑکی : (واپس لوٹتے ہوئے) تم بتی کیوں نہیں جلا لیتیں؟

بڑھیا : (اسی انداز سے) اس گھر میں کوئی بتی نہیں۔ آقا کو روشنی سے نفرت ہے وہ اندھیرے میں رہنا

پسند کرتا ہے۔

لڑکی : (تعجب سے) آخر ــــــ

بڑھیا : (اسے یکدم خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے) ہش ـــ ش ـــ ش ـــ مجھے کچھ سنائی دے رہا ہے، کیا تم سن رہی ہو؟

لڑکی : (وقفہ کے بعد) نہیں تو ــــــ شاید میری بچی نیند میں بڑبڑا رہی ہے۔

بڑھیا : (اصرار کرتے ہوئے) نہیں نہیں ــــ یہ آقا کے قدموں کی چاپ ہے۔ میں اسے اچھی طرح پہچانتی ہوں، وہی لڑکھڑاتے ہوئے قدم۔ راہ راست سے بھٹکے ہوئے ــــ بالکل وہی

لڑکی : (خوف سے چیختے ہوئے) آہ! م ــــ میں جاتی ہوں ــــ میں ان کے سامنے نہیں آنا چاہتی ــــ م ــــ مجھے ڈر لگ رہا ہے خدارا! مجھے کہیں چھپا دو۔ مجھے کہیں!

بڑھیا : (تسلی آمیز لہجہ میں) میں کہتی ہوں حوصلہ رکھو تم۔

(ایک قد آور مرد داخل ہوتا ہے جس نے بھاری پوستین پہن رکھی ہے۔ اس کے سر کے بال پریشان ہیں، داڑھی بڑھی ہوئی ہے، شاید راتوں کو برابر جاگتے رہنے سے اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے ہیں۔ مگر اس کے باوجود اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی پُراسرار کشش ہے۔ جب وہ ابرو تان کر کسی کی جانب دیکھتا ہے تو اسے مبہوت کر دیتا ہے۔ اس کی آواز اس قدر بھاری ہے کہ بولتے وقت کمرے کی فضا متزلزل ہو جاتی ہے۔)

مرد : (ہنستے ہوئے) بلاشبہ ہمارے گرد و نواح میں بڑی جاذبیت ہے۔

بڑھیا : (افسردگی سے) کیا پھر کچھ موتیں واقع ہوئی ہیں؟

مرد : (اسی انداز میں) ان گنت۔

بڑھیا : (بے پروائی سے) کس بیماری سے؟

مرد : (اسی انداز سے) دہی ——— بھوک بکنجت روٹی کے ٹکڑے کے لیے سِسک رہے ہیں۔ مَیں انھیں کراہتے دیکھ کر کس قدر خوش ہوتا ہوں جب مَیں داخل ہُوا تو پھاٹک پہ لاشوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے بیں نے چیتو سے کہہ دیا ہے کہ وہ انھیں گھسیٹ کر کھنڈروں میں پھینک آئے

بڑھیا : (حسرت ناک لہجے میں) تمھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

مَرد : (وقفے کے بعد) یہ سینہ کون ہے ابھی چاند تو طلوع نہیں ہُوا، مگر مَیں اپنی نشستگاہ میں شعاع قمر دیکھ رہا ہوں۔

بڑھیا : (جھجکتے ہوئے) تم اس کی طرف مت دیکھو، وہ سہم جائیگی۔

مَرد : (ہنستے ہوئے) مجھے سہمی ہوئی عورتیں اچھی لگتی ہیں۔

بڑھیا : (دردناک لہجے میں) بے چاری نوکری کی تلاش کرتی ہوئی یہاں آنکلی ہے۔

مَرد : (ہنستے ہوئے) نوکری ——— تو یوں کہو اسے روٹی کے ٹکڑوں کی تلاش ہے (پھر یک دم غضب ناک ہو کر) آخر ان لوگوں نے میری زندگی کیوں دیران بنا رکھی ہے صبح وشام میرے دروازے کھٹکھٹاتے رہتے ہیں۔

بڑھیا : (بغیر دھیان دیئے) ہمیں ایک خادمہ کی ضرورت ہے اگر ———

مَرد : (غصہ سے) نہیں ! اسے باہر نکال دو۔

بڑھیا : (حسرت ناک لہجے میں) یہ بدنصیب سی دکھائی پڑتی ہے ممکن ہے اس کی آمد سے یہاں رحمت کا نزول ہو۔

مرد : (وقفہ کے بعد دھیمے لہجے سے) پھر اسے رکھ لو۔

بڑھیا : (مسرت سے) تم کتنے فیاض ہو

مرد : (حقارت سے) خوشامد مت کرو۔

بڑھیا : (بناوٹی انداز میں) بڑی سمجھدار ہے یہاں کے سارے کام۔

مرد : (بغیر دھیان دیئے) اسے کہو میرے قریب آئے

بڑھیا : (پھر خوف سے چیختے ہوئے) ہیں، نہیں تمہارے منہ سے بدبو آ رہی ہے۔

مرد : (عجیب انداز سے) میں اُسے قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں۔

بڑھیا : (التجا کرتے ہوئے) تمہارے حواس قائم نہیں ہیں، خدارا! اُوپر جاؤ، تمہیں۔

مرد : (اسی انداز میں) میں اُسے قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں۔

بڑھیا : (سلامانہ التجا کرتے ہوئے) تم ——— تم مجھے بیمار معلوم ہوتے ہو، تمہیں اس وقت آرام کی ضرورت ہے۔

مرد : (اسی انداز میں) آؤ ——— (لڑکی مرد کی طرف مسحور انداز میں بڑھتی ہے) میرے قریب آؤ۔ میں تمہیں قریب دیکھنا چاہتا ہوں۔

بڑھیا : (لڑکی سے مخاطب ہو کر چلاتے ہوئے) اس کے قریب مت جانا، میں کہتی ہوں اپنی جگہ پر کھڑی رہو

مرد : (اسی انداز سے) بڑھو ——— اور بڑھو ——— میں جرأت کی قدر کرتا ہوں ——— مجھے اپنے مرجان کی نشاخوں کے سے بازو تھامنے دو۔

بڑھیا : (لڑکی سے، کرخت لہجے میں) کہ ——— کیا تم سن نہیں رہیں؟

مرد : (اسی انداز میں) تمہاری سرمئی آنکھیں، اپنے گھنے خمیدہ ابروؤں سمیت۔ تمہارے گلابی چہرے پر یوں ترتیب سے جڑی ہوئی ہیں جیسے کسی کھلی کتاب میں لفظوں کی سطر لکھی ہو۔ کیا یہ وہی اسم اعظم ہے جسے پڑھ کر پھونک دینے سے تمام کائنات درہم برہم کی جا سکتی ہے؟

بڑھیا : (چیختے ہوئے) خُدارا!

مرد : (اسی انداز سے) اِن لانبی لانبی پلکوں کے سائے تمہارے دہکتے ہوئے رخساروں پر یوں لرز رہے ہیں، گویا تمہارا چہرہ ایک تھکی تھکی شام ہے، جس میں ہر طرف شفق نے اپنے سنہری پر پھیلا رکھے ہوں اور جھومتے درختوں کے طویل سائے آفتاب کی خونیں نعش کے سرہانے بیٹھے محو ماتم ہوں، ——— تمہارا چہرہ پہاڑوں میں گھری ہوئی جھیل کے ساکت پانی میں پڑا ہوا گلاب کا ایک پژمردہ پھول ہے، جسے ہلکی ہلکی لہریں خراماں خراماں اپنے مرکز کی طرف لیے جا رہی ہوں۔

بڑھیا : (پھر التجا کرتے ہوئے) میں کہتی ہوں ــــــــ

مرد : (اسی انداز میں) تمھارا دہن قندھاری انار کی وہ پھانک ہے جیسے مرمر کے چاقو سے تراشا گیا ہو۔

بڑھیا : (نرمی سے) اس کی نگاہوں پر نگاہیں مت ڈالو وہ تمھیں مسحور کر دے گا۔

مرد : (اسی انداز میں) تمھارا سینہ ایک متلاطم سمندر ہے جس کی ڈوبتی ابھرتی لہریں کسی جنبی چاند سے ہم آغوش ہونے کے لیے بے تاب ہے۔

بڑھیا : (روتے ہوئے) اس کی باتوں پر دھیان مت دو، میں تم سے التجا کرتی ہوں۔

مرد : (اسی انداز میں) تمھاری کمر بید مجنوں کی ان شاخوں کی طرح نازک ہے جو ہمیشہ پہاڑی ندیوں کے بہتے پانیوں میں اپنے سر ڈبوئے رکھتی ہیں اور جب آندھیاں چلتی ہیں تو ہزاروں بل کھا جاتی ہیں، اور جن پر پرندے بیٹھنے سے گریز کرتے ہیں، مبادہ ان کے پاؤں پھسل جائیں آہ! مجھے تمھیں کمر سے تھامنے کی تمنّا ہے۔

بڑھیا : (پھر چیختے ہوئے) خدارا، اس پر رحم کھاؤ۔

مرد : (اسی انداز میں) تمھاری رانیں کسی معبد کے دو ریشم میں لپٹے ہوئے مرمریں ستون ہیں جن پر عرق گلاب چھڑکا گیا ہو اور جن سے بچوں کو باندھ کر دیوتاؤں کے سامنے قربانیاں دی جائیں۔ وہی ستون جن سے شاہوں شکستوں پر شہزادیاں لپٹ لپٹ کر روئیں۔

بڑھیا : (پھر چیختے ہوئے) کانپ رہی ہے، وہ کانپ رہی ہے، تم دیکھ نہیں رہے وہ کانپ رہی ہے۔

مرد : (یکدم ہنستے ہوئے) مجھے کانپتی ہوئی عورتیں پسند ہیں۔

(نوکر داخل ہوتا ہے، یہ ایک پست قد کبڑا سا نوجوان ہے جس کے بازو جسم کے تناسب سے کافی طویل ہیں۔ اس کی آنکھوں میں بھیڑیوں کی سی پھرتی ہے وہ حیوانوں کی طرح زور زور سے سانس لیتا ہے اور جب بولتا ہے تو فقرے ٹوٹ جاتے ہیں۔)

نوکر : (مخاطب کرنے کی کوشش کرتے ہوئے) میں ——— سرکار !

بڑھیا : (چونک کر) تم یہاں کیوں آئے ہو؟ میں نے تمھیں کہہ رکھا ہے میرے سامنے مت آیا کرو۔

مرد : (پیار سے) جیتو !

نوکر : (مسرت سے) مدت کے بعد آج ——— پھر بھولا بھٹکا ——— بھکاری ہمارے دروازے پر ——— آیا ہے، سرکار! وہ اس گاؤں میں نیا معلوم ہوتا ہے، ورنہ ———

مرد : (حیرانی سے) بھکاری !

نوکر : (اسی انداز میں) اور اس کی گود میں ——— ایک بچہ بھی ہے ——— اس قدر لاغر کہ میں ——— اس کی پسلیاں تک گن سکتا ہوں۔

بڑھیا : (دردناک لہجے میں) کیا بھکاری بوڑھا ہے۔

نوکر : (بغیر دھیان دیئے) م ——— مجھے اجازت دیجیے سرکار ——— آپ نے مجھ سے ——— وعدہ کیا تھا کہ میں ———

بڑھیا : (چلاتے ہوئے) میں پوچھتی ہوں کیا بھکاری بوڑھا ہے؟

مرد : (بغیر سنے) جاؤ جیتو ——— آج میں اپنا وعدہ پورا کروں گا، اس کی گود سے بچہ چھین کر اسے فرش پہ پٹک دو اور بھکاری کے ہاتھ کسی مضبوط رسی سے باندھ کر اسے اچھی طرح کوڑے لگاؤ۔ (حسرت ناک لہجے میں) مجھے بھی کسی انسان کی درد و کرب سے نکلی ہوئی چیخیں سنے ایک عرصہ ہو گیا ہے۔ جاؤ ——— میں اس نظارے کو معمول کے مطابق کھڑکی سے دیکھوں گا۔

نوکر : (مسرت سے) ب ——— بہتر!

(نوکر چلا جاتا ہے)

بڑھیا : (حسرت و یاس سے) الٰہی !

مرد : (کھڑکی کی طرف جاتے ہوئے) مجھے ابھی تک چیخوں کی آواز نہیں پہنچی جیتو!

نوکر : (باہر سے) میں نے اس کی گود سے ——— بچہ چھین کر ——— فرش پر پھینک دیا سرکار!

اب میں اس کے ہاتھ ——— باندھ رہا ہوں اور ——— وہ اپنی آنکھوں میں آنسو بھر کے ——— میرے سامنے التجائیں کر رہا ہے کہ ——— اسے چھوڑ دوں ——— مگر میں اس کے ہاتھ باندھ رہا ہوں۔

مرد : (خوشی سے) اب؟

بڑھیا : (پیار بھرے لہجے میں) چھیتو سے کہو، اسے چھوڑ دے۔

(کوڑے پڑنے کی آواز کے ساتھ ساتھ بھکاری کی چیخ و پکار سنائی دیتی ہے جو رفتہ رفتہ بڑھتی چلی جاتی ہے، مرد کھڑکی میں یہ سب کچھ دیکھ کر بچوں کی طرح قہقہے لگاتا ہے، بادل گرجتے ہیں۔)

بڑھیا : (حقارت سے) مجھے تمہارے قہقہوں سے کس قدر نفرت ہے۔

مرد : (بے پروائی سے) تمہیں کہنے کی ضرورت نہیں میں جانتا ہوں مجھ سے کوئی بھی محبت نہیں کر سکتا۔

لڑکی (کھوسا انداز میں) میں بادلوں کی گرج سن رہی ہوں۔

بڑھیا: مجھے بھی ایک چیخ سی سنائی دے رہی ہے۔

مرد : چیخو اور زور سے چیخو (ہنستے ہوئے) زور سے چیخو ——— اور زور سے!

(لمحہ بھر کے وقفہ پر بادلوں کی گرج کوڑے پڑنے کی آواز، مرد کے قہقہے اور بھکاری کی چیخیں گونجتی ہیں پھر آہستہ آہستہ مکمل خاموشی چھا جاتی ہے۔)

لڑکی : (اسی انداز میں) اب مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا۔

مرد : (چھیتو سے) چیخیں رک کیوں گئیں چھیتو؟

نوکر : (افسوس کا اظہار کرتے ہوئے) ب ——— بے ہوش ہو گیا ہے سرکار ———

مرد : (کھڑکی سے واپس لوٹتے ہوئے افسردہ لہجے میں) آہ! کاش اس میں زیادہ سکت ہوتی۔

لڑکی : (ہوش میں آتے ہوئے) کیا یہ ستم نہیں؟

مرد : (عجیب انداز میں) پھر کہو میری حسینہ تمھاری آواز میری نس نس میں اس شراب کی طرح سرایت کر رہی ہے جس کا رنگ انسانی خون کی طرح سرخ ہوتا ہے۔

(نوکر پھر داخل ہوتا ہے)

نوکر : (افسردگی سے) وہ فرش پر —— اپنے مردہ بچہ کے قریب پڑا ہے سرکار —— اگر حکم ہو تو ——

بڑھیا : (حسرت ناک لہجے میں) کیا وہ مر چکا ہے۔

مرد : (تعجب سے) تمھارے ہاتھ خون آلود کیوں ہیں نوکر؟

نوکر : (ہچکی بندھی کے ساتھ) جب وہ —— لڑکھڑا کر گرا تو یہ خون —— اس کے منہ سے نکل کر میرے —— ہاتھوں پر لگ گیا سرکار۔

مرد : (بیزاری کے لہجے میں) کیا تم نے اسے چکھا ہے؟

نوکر : (افسردگی سے) جی ہاں! ہم —— مگر سرکار —— اس کا ذائقہ کڑوا تھا۔

مرد : (آہ بھرتے ہوئے) ان سب بھکاریوں کی کھال کے نیچے کڑوا لہو بہتا ہے۔

نوکر : (اسی افسردگی سے) اور —— اور وہ برف کی طرح —— سرد بھی تھا سرکار —— اس میں گرمی نام کو نہیں تھی۔

بڑھیا : (تنگ آ کر) نکل جاؤ یہاں سے، میں تمھارا ——

(نوکر چلا جاتا ہے)

مرد : (وقفہ کے بعد لڑکی سے) تم ابھی کچھ کہہ رہی تھیں

بڑھیا : (خوفزدہ ہو کر) نہیں! اس نے کچھ نہیں کہا

لڑکی : (عجیب انداز میں) میں کہہ رہی تھی، کیا کسی کو دکھ پہنچا کر بھی مسرت مل سکتی ہے؟

بڑھیا : (سنجیدگی سے) دکھ پہنچا کر ——؟ (پھر ہنستے ہوئے) کیوں نہیں —— اری یہ تو اس کی پرانی عادت ہے۔ لڑکپن میں اگر کوئی شامت کی ماری تتلی اس کے ہاتھ آ جاتی تو اس کے پر

نوچ کر بیدردی سے مسل دیا کرتا تھا۔ میں نے اسے کئی بار جھینگروں اور مینڈکوں کے سروں میں سوئیاں چبھوتے دیکھا ہے ——— (معنی خیز ہنسی کے ساتھ۔ مرد سے) کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟

مرد : (حقارت سے) بالکل غلط۔

لڑکی : (جرأت سے) آخر آپ غریبوں کو اذیت کیوں پہنچاتے ہیں؟

مرد : (غضب ناک لہجے میں) کیونکہ میں چاہتا ہوں، کوئی مجھے اذیت پہنچائے۔ غریب اس دیس میں برسات کے ان پروانوں کی مانند، کثیر التعداد میں جو بھوک کے شعلے پر اپنی جانیں نثار کرنے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ انھیں صرف شکوہ و فریاد کی عادت ہے۔ بغاوت کی نہیں ——— مجھے ان لوگوں سے نفرت ہے جو بغاوت نہیں کر سکتے۔ میں چاہتا ہوں وہ میرے خلاف بغاوت کریں۔ میرے گھر کو گھیرے میں لے لیں، مجھے گھسیٹ کر باہر نکال لیں، میرے دونوں ہاتھ کسی شکنجے میں جکڑ کر میرا ایک ایک ناخن کھینچ لیں ——— میری ایک ایک رگ کاٹ دیں۔ میرا ایک ایک جوڑ توڑ دیں ——— اور غروب آفتاب کے بعد جب رات کی سیاہی چاروں طرف پھیل جائے جب بچے تھک ہار کر اپنی ماؤں کی گودوں میں سو جائیں جب پرندے اپنے گھونسلوں میں اور چوپائے اپنی کمین گاہوں میں جا چھپیں جب سارا جہاں نیند کی کشتی میں ہچکولے کھانے لگے اور خاموشی کا یہ عالم ہو کہ افلاک کی انتہائی بلندیوں پر درخشاں تاروں کی سرگوشیاں اور اس کی وسعتوں میں محو خرام چاند کے لڑکھڑاتے قدموں کی دبی دبی آہٹ کسی خواب میں گرتے ہوئے آبشاروں کی آواز کی طرح چونکا دے ——— اس وقت میرے خون سے تھرتھراتے ہوئے جسم کے کسی حصے میں ——— (جذبات سے بے قابو ہو کر) میری پسلیوں میں ایک کیل گاڑ دیں، شدت درد سے میری چیخ ستاروں کی وادیوں میں گونج اٹھے، بچے اپنی ماؤں کی گودوں میں لرز جائیں، مدہوش سوتے ہوئے لوگ کروٹیں بدل لیں ——— اسی طرح ہر رات پسلیوں میں ایک کیل گاڑ دیا جائے اور ہر رات میری چیخ کائنات کے نظام کو تھوڑی دیر کے لیے متزلزل کر دے حتیٰ کہ ——— مگر وہ صرف ——— فریاد ہی کر سکتے ہیں ——— اف! وہ صرف فریاد ہی کر سکتے ہیں۔

لڑکی : (پیار بھرے لہجہ میں) آپ نے کسی کا کیا بگاڑا ہے کہ آپ کو اذیت پہنچائی جائے۔

مرد : (دردناک لہجہ میں) مجھ سے آج تک کسی نے محبت نہیں کی جب میرے والدین زندہ تھے تو میں ان کے لیے بھی بیگانہ تھا ـــــ انھوں نے مجھے کبھی پیار سے نہ بھینچا انھوں نے کبھی میری پیشانی پر بوسہ نہ دیا ـــــ میں نے گھر چھوڑا، اپنے جذبات سے بھٹکتے ہوئے باطن کو نہ جانے کہاں کہاں پھرا، تاریک وادیوں میں گزرا، جہاں مسلسل بارش کی وجہ سے ہمیشہ دلدل رہا کرتی ہے اور سورج کی کرنیں سعیِ بسیار کے باوجود وہاں تک نہ پہنچ سکتیں جنگلوں میں آوارہ پھرتا رہا، جہاں میں نے کئی بار شیروں کی دھاڑیں سنیں، پھر ان چوٹیوں پر چڑھا جو برفیلے لبادے اوڑھے دور سے سفید برقع پوش عورتوں کے گروہ کی طرح معلوم ہوتی ہیں، ان چوٹیوں پر جہاں آج تک کسی انسان کا قدم نہیں پہنچا ـــــ اور وہاں میں اپنے مالک سے کہتا رہا کہ باری تعالیٰ! میرے لیے آسمان سے کوئی فرشتہ اتار جس سے میں محبت کر سکوں، مجھے تیری دنیا میں کوئی بھی چاہنے والا نظر نہیں آتا ـــــ کوئی فرشتہ بھیج! جس سے میں پرسوز نغمے سنوں اور جس کے پروں سے لپٹ کر اتنا روؤں کہ وہ اس بڑھیا کے آنچل کی طرح بھیگ جائیں جو گود میں پڑے ہوئے اپنے نوجوان بیٹے کو کسی مہلک گھاؤ سے دم توڑتے دیکھ رہی ہو۔

لڑکی : (افسردگی سے) کیا آسمان سے کوئی فرشتہ اترا؟

بڑھیا : (ہنستے ہوئے) نہیں ـــــ مگر اسے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی۔

لڑکی : (حیرانی سے) لڑکی سے؟

بڑھیا : (اداس لہجہ میں) وہ اُسے دل و جان سے چاہتا تھا لیکن وہ اسے چھوڑ گئی۔

مرد : (بڑھیا سے غضب ناک لہجہ میں) خاموش! میں نے تمھیں بارہا کہا ہے میری باتوں میں دخل مت دیا کرو۔

لڑکی : (غمگین لہجہ میں) وہ لڑکی کون تھی؟

بڑھیا : (بے پروائی سے) ایک غریب کسان کی بیٹی جو باپ کے مرجانے پر بھیک مانگ کر اپنا

گزارہ کیا کرتی۔

لڑکی : (اُسی انداز سے) وہ انہیں چھوڑ کیوں گئی ؟

بڑھیا : (بے پروائی سے) اسے ایک ایسا شخص مل گیا جو اس سے بڑھ کر حسین اور مالدار تھا۔

مرد : (غصّہ سے) تم پھر بکواس کر رہی ہو۔

لڑکی : (مرد سے) کیا وہ اسی گاؤں میں رہتے ہیں ؟

مرد : (پیچھا چھڑاتے ہوئے) میں نہیں جانتا ——— میں سب کچھ بھول چکا ہوں۔

بڑھیا : (طنزاً) وہ لڑکی تمہیں ابھی تک نہیں بھولی۔

مرد : (اصرار کرتے ہوئے) میں کہتا ہوں، میں اسے بھول چکا ہوں۔

لڑکی : (دلچسپی لیتے ہوئے) پھر کیا ہُوا ؟

بڑھیا : (درد ناک لہجے میں) اُسی روز سے غریبوں کو اذیت پہنچائی جاتی ہے۔ ——— میں تم سے سچ کہتی ہوں۔

مرد : (حقارت و غصے سے) تم بکتی ہو ——— تم جانتی ہو مجھے۔

بڑھیا : (بے پروائی سے) ہاں! میں جانتی ہوں، انہیں ایک اور مل گئی تھی۔ تمہارے انتقام کا شکار بننے کے لیے . . . .

مرد : (اسی انداز میں) میں نے اس سے انتقام نہیں لیا، وہ اسی سلوک کے اہل تھی۔

لڑکی : (دلچسپی لیتے ہوئے) کیا وہ بھی کسی غریب کی لڑکی تھی ؟

بڑھیا : (بے پروائی سے) میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا، صرف سیڑھیاں چڑھتے وقت اس کے ہنسنے کی آواز سنی تھی، جب وہ اُسے اوپر کی منزل پر لے جا رہا تھا۔

مرد : (چڑھتے ہوئے) ہاں! میں اسے اوپر کی منزل پر لے گیا، وہ واقعی سیڑھیاں چڑھتے وقت ہنس رہی تھی تو کیا ہُوا ؟

لڑکی : (بناوٹی بے توجہی سے) کیا وہ زندہ ہے ؟

بڑھیا : (بے پروائی سے) میں نہیں جانتی ــــــ مگر مجھے اتنا علم ہے کہ اسی سبب اوپر کی منزل سے عورتوں کی چیخیں سنائی دیتی ہیں۔

مرد : (حقارت و غصے سے) تم پھر جھوٹ بول رہی ہو۔ میں نے یہاں آج تک کسی کی چیخیں نہیں سنیں۔

بڑھیا : (بے پروائی سے) ہاں! میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ ہم نے یہاں آج تک کسی کی چیخیں نہیں سنیں۔

مرد : (وقفے کے بعد، کرسی کی طرف جاتے ہوئے) یہ کرسی پر کیا دھرا ہے؟

بڑھیا : (بے پروائی سے) اس کی بچی ہے۔

مرد : (لڑکی سے) تمھاری؟

لڑکی : (بے پروائی سے) نہیں میرے خاوند کی۔

مرد : (تعجب سے) خاوند! ــــــ کیا وہ تمھارے ساتھ ہے؟

بڑھیا : (بے پروائی سے) وہ بے چارا تو کب کا مر چکا۔

مرد : (دلچسپی لیتے ہوئے) کیا وہ کسی حادثے سے مرا تھا؟

بڑھیا : (بے پروائی سے) اس نے اُسے زہر دیا تھا۔

مرد : (اُسی انداز میں) زہر! ــــــ اس کی تقصیر کیا تھی؟

لڑکی : (حقارت سے) وہ مجھ سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔

مرد : (ہنستے ہوئے) اور اسی لیے تم نے زہر دے دیا ــــــ خوب! (پھر یکدم سنجیدہ ہوتے ہوئے) لیکن تمھیں کس سے محبت تھی؟

لڑکی : (فخر سے) ایک تباہ حال امیر زادے سے۔

مرد : (معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ) اور کیا اسے بھی آخر میں ــــــ

لڑکی : (بے پروائی سے) نہیں، اس نے مجھے دھوکا دیا۔

مرد : (بناوٹی تعجب سے) واقعی؟

لڑکی : (اندوہگین لہجے میں) وہ ہمیشہ مجھ سے کہا کرتا تھا کہ دنیا میں میرے سوا اس کا کوئی عزیز نہیں ــــــ

اس نے مجھے کئی مرتبہ خنجر بھی دکھایا کہ اگر میں اس کی زندگی میں داخل نہ ہوتی تو وہ بیزار ہو کر کب کا خودکشی کر چکا ہوتا۔ مجھے اس کی حالت پر رحم آتا تھا۔ آخر میں اپنے زیورات سمیٹ کر اس بچی کو گود میں چھپائے اس کے ساتھ بھاگ نکلی۔ مہینہ بھر وہ مجھے ایک جگہ سے دوسری جگہ پھراتا رہا۔ مگر ایک شب جبکہ ہم کسی سرائے میں ٹھہرے ہوئے تھے اور بڑے زور کی بارش ہو رہی تھی۔ وہ مجھے سوتا چھوڑ کر میرے زیورات لے کر فرار ہو گیا۔

مرد : (سنجیدگی سے) تم جانتی ہو وہ کہاں گیا ہے؟

لڑکی : (بے پروائی سے) میں نے اسے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی۔

مرد : (حیرانی سے) کیوں؟

لڑکی : (شدت جذبات سے بے قابو ہو کر) میرے پاس کچھ کھانے کو نہ تھا۔ میری بچی بھوک کے مارے بلک رہی تھی۔ میں در بدر خاک چھانتی پھری۔ لیکن مجھے کسی نے پناہ نہ دی۔

مرد : (بناوٹی افسوس کا اظہار کرتے ہوئے) اوہو!

لڑکی : (اسی انداز میں) میں ان کڑی کے جالوں کو اتار دوں گی، ان پھٹی ہوئی دیواروں میں پیوند لگا دوں گی اس اجڑے ہوئے گھر کو فردوس بنا دوں گی ——— مجھے پناہ دے دیجئے آپ کی اشیاء کبھی گرد آلود نہ ہوں گی، آپ کا تکیہ کبھی میلا نہ ہوگا، آپ کے بستر کی چادر ہمیشہ سفید رہا کرے گی ہر روز صبح سویرے وادیوں میں اتر جایا کروں گی اور جس قدر بھی پھول مل سکیں گے، ان کے گلدستے بنا کر آپ کی خواب گاہ کے ہر گلدان میں سجا دیا کروں گی۔ ان کی بھینی بھینی مہک ہر صبح آپ کی نیند کا طلسم توڑا کرے گی میں آپ کو ہر رنج سے نجات دلاؤں گی، واللہ۔

مرد : (طنزاً) بے شک، بے شک۔

(وقفہ)

(بچی جاگ اٹھتی ہے اور رونا شروع کر دیتی) اسے چپ کراؤ۔

بڑھیا : (بے پروائی سے) شاید اسے بھوک لگی ہے۔

مرد : (حقارت سے) اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دو۔ میں ان چیخوں سے مانوس نہیں ہوں۔ مجھے ان چیخوں سے سخت نفرت ہے۔

لڑکی : (جھولے کی طرف جاتے ہوئے) ابھی چپ ہو جائے گی۔

مرد : (غضبناک ہو کر) آہ! وہ ویسے ہی چلائے جا رہی ہے۔ میں ان کی چیخیں برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کی گردن توڑ دو۔ اس کا گلا بھینچ دو۔ خدا را! اس کا گلا بھینچ دو۔

بڑھیا : (بے پروائی سے) آخر اس بے چاری نے کیا گناہ کیا ہے جو

مرد : (حقارت سے) ابھی تک تو نہیں ——— لیکن میں تمہیں کہتا ہوں وہ مستقبل میں ایسے سپاہیوں کو جنم دے گی جو ٹینک سے محروم ہوں گے ——— وہ ایسی قوم کو جنم دے گی جو صرف فریاد ہی کر سکیں گے، مگر کبھی بغاوت نہ کر سکیں گے۔ میں کہتا ہوں، اسے زندہ نہ چھوڑو۔ اس کی چھاتی پر گھونسہ مار کر اس کی پسلیاں توڑ دو۔

(بچی چپ ہو جاتی ہے)

بڑھیا : (محبت سے) ماں کے قریب جاتے ہی کس طرح خاموش ہو گئی ہے۔ ممکن ہے اس نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہو۔

لڑکی : (بے پروائی سے) ہو سکتا ہے ——— لیکن اب وہ خوفزدہ نہیں، اس نے ایک بار مجھے آنکھیں کھول کر دیکھ لیا ہے اور پھر سو گئی ہے۔

(وقفہ)

(زور سے گھنٹے کی آواز سنائی دیتی ہے)

لڑکی : (کھڑکی کی طرف جاتے ہوئے) یہ کیا آواز ہے؟

مرد : (بے پروائی سے) یہاں کے لوگ اسی آواز سے وقت کا اندازہ لگاتے ہیں۔

بڑھیا : (جمائی لیتے ہوئے) کیا تمہیں ستارے نظر آ رہے ہیں؟

لڑکی : (باہر جھانک کر) صرف چند ——— آج آسمان ابر آلود ہے۔

مرد : (سنجیدگی سے) تمھیں ستاروں سے الفت ہے؟

لڑکی : (حسرت ناک لہجے میں) بے حد، میں چاہتی ہوں انھیں ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہوں (یکدم) وہ ——— آہ ان میں سے ایک اپنے پیچھے زرد روشنی کی طویل لکیر چھوڑتا ہوا ٹوٹ گیا ہے ——— یوں دکھائی دیتا ہے گویا وہ ابھی اس چوٹی سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گا (پیار بھرے لہجے میں) ادھر دیکھئے نا آپ کو ———

مرد : (حقارت و نفرت سے) نہیں نہیں ——— مجھے ان سے نفرت ہے، مجھے ان کی بلندیوں سے نفرت ہے۔

بڑھیا : (وقفہ کے بعد) سمے بیتا جا رہا ہے تم بہت تھکے ہوئے ہو، جاؤ تھوڑا سا آرام کر لو

مرد : (عجیب حسرت ناک لہجے میں دہراتے ہوئے) ہاں سمے بیتا جا رہا ہے اور میں بہت تھکا ہوا ہوں۔

بڑھیا : (پیار بھرے لہجے میں) اور کل صبح جب تم اٹھو گے تو میں تمھارے ناشتے کے لیے منجار گوشت کے ٹکڑے لاؤں گی جو تمھیں بے حد بھاتے ہیں۔

مرد : (بغیر دھیان دیئے) اس انگیٹھی کی آگ بجھا دو۔ میں اپنی حسینہ کے چہرے پر شعلوں کا رقص نہیں دیکھ سکتا۔

بڑھیا : (گھبراتے ہوئے) تم اس کی پروا مت کرو، میں آگ بجھائے دیتی ہوں۔

مرد : (وقفہ کے بعد عجیب انداز میں لڑکی سے مخاطب ہوتے ہوئے) کیا تم میرے ہمراہ نہ چلو گی؟

بڑھیا : (چیختے ہوئے) نہیں، نہیں، خدارا! اسے ———۔

مرد : (لڑکی کو بازو سے تھام کر) آؤ ——— میری آرام گاہ قبر کی طرح تاریک ہے میں تمھارے بغیر اندھیرے میں کھو جاؤں گا۔ مجھے کوئی رستہ دکھانے والا نہیں ہے۔

بڑھیا : (اسی طرح چیختے ہوئے) نہیں نہیں ——— میں تم سے التجا کرتی ہوں، اسے تنہا چھوڑ دو۔

مرد : (اسی انداز میں) میری نشست برف کی سل کی طرح سرد ہے آؤ۔

بڑھیا : (دردناک لہجے میں) تم اسے اوپر نہیں لے جاؤ گے۔ میں نے تمھیں کبھی تنگ نہیں کیا، لیکن آج میں تمھارے

سامنے ہاتھ باندھ کر التجا کرتی ہوں، تم اسے اپنے ساتھ مت لے جاؤ۔ میں نے اس سے وعدہ کر رکھا
ہے کہ میں تمھاری حفاظت کروں گی۔

مرد: (لڑکی کے بازو کو چھوڑ کر) (بڑھیا سے) تم اسے نہیں روک سکتیں۔ میں جانتا ہوں، وہ ضرور آئے گی
(سیڑھیوں کی طرف جاتے ہوئے) میں جانتا ہوں اسے آنا ہی پڑے گا۔ وہ بھی جانتی ہے اسے
آنا ہی پڑے گا۔ (سیڑھیاں چڑھتے ہوئے) میری آرام گاہ اژدہے کے منہ کی طرح خطرناک ہے
تاریکی مجھے نگل لے گی۔ —— مجھے کوئی رستہ دکھانے والا نہیں ہے (بڑبڑاتے ہوئے) میں ڈر
جاؤں گا —— میں ڈر جاؤں گا۔

(مرد کی آواز رفتہ رفتہ مدھم ہوتی جاتی ہے اور سیڑھیاں چڑھتا ہے)

بڑھیا: (وقفہ کے بعد لڑکی سے) دیکھا، وہ کس قدر رحم دل ہے —— میں نے تم سے کہا تھا وہ فیاض
بھی ہے (پیار بھرے لہجے میں) جاؤ اپنی بچی کو سنبھالو، کل صبح میں تمھیں اپنے فرائض سے آگاہ کروں گی
(لڑکی کوئی جواب نہیں دیتی) تمھیں کیا ہو گیا ہے، تم بولتی کیوں نہیں؟ یوں کھڑی میرا منہ کیوں تک رہی
ہو؟ میں نے تم سے کہا ہے اپنی بچی کو سنبھالو۔

لڑکی: (مسحور انداز میں) وہ کس قدر رحم دل ہیں۔ ...

(بادل گرجتے رہیں)

بڑھیا: (موضوع بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے) ہاں! ہاں —— ہم کل اس کے بارے میں باتیں
کریں گے مگر اس وقت تمھیں سو جانا چاہئے۔ بادل پھر گرج رہے ہیں کیا تم سن رہی ہو؟

لڑکی: (اسی مبہوت انداز میں) سن رہی ہوں!

(بجلی کی کڑک کے ساتھ یکدم موسلا دھار بارش شروع ہو جاتی ہے
کبھی کبھار ہوا کے جھکڑوں کی گونج سنائی دیتی ہے۔)

بڑھیا: (گھبراہٹ سے) بجلی کی چمک میری آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر رہی ہے (کھڑکی بند کرتے ہوئے)
طوفان آ گیا ہے، میں جانتی ہوں، اس کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔

لڑکی : (اُسی انداز میں) طوفان آگیا ہے۔

بڑھیا : (لڑکی کو ہاتھ سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے) چلو تمھیں سونے کی جگہ بتا دوں، اپنی بچی کو اٹھاؤ۔ (پیار بھرے لہجے میں) کاش میں تمھاری طرح ماں ہوتی۔

لڑکی : (اسی انداز میں، بغیر پروا کیے) وہ کس قدر فیاض ہیں۔

بڑھیا : (پھر موضوع بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے) ہاں ہاں میں تمھیں کل اس کے متعلق بہت کچھ بتاؤں گی۔

لڑکی : (اُسی انداز میں) ان کی آنکھیں کسی گمنام جزیرے کے تاریک غاروں کی طرح ہیں جن میں بحری قزاقوں نے مختلف ساحلی شہروں سے جواہرات کے ڈھیر لا لا کر چھپا رکھے ہوں میں چاہتی ہوں، ان خزانوں کی تلاش کروں جو ان کی گہرائی میں مدفون ہیں۔

بڑھیا : (ٹالتے ہوئے) ہم دونوں اکٹھی تلاش کریں گی ——— مگر اب نہیں ——— آؤ میرے ساتھ چلو۔

آواز : (اُوپر کی منزل سے گونجتی ہے) میں تاریکی میں کھو گیا ہوں ——— مجھے تمھاری ضرورت ہے، مجھے تمھاری ضرورت ہے۔

لڑکی : (امسرت سے چیختے ہوئے) سنو! وہ مجھے پکار رہے ہیں انھوں نے کہا تھا کہ ان کی آرام گاہ قبر کی طرح تاریک ہے وہ میرے بغیر اندھیرے میں کھو جائیں گے۔ انھیں کوئی راستہ دکھانے والا نہیں ہے اب ——— اب اگر میں انھیں رستہ نہ دکھاؤں گی تو۔

آواز : (پھر گونجتی ہے) مجھے تمھاری ضرورت ہے ——— مجھے تمھاری ضرورت ہے۔

لڑکی : (اسی انداز میں) مجھے پکار رہے ہیں ——— سنتی ہو ——— وہ مجھے۔

بڑھیا : (پھر ٹالتے ہوئے) مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا ——— آؤ آؤ، یہاں سے چلیں۔

لڑکی : (مبہوت انداز میں) وہ مجھے بلا رہے ہیں، میں ان کی حکم عدولی نہیں کر سکتی

بڑھیا : (لڑکی کو محبت بھرے لہجے میں سمجھاتے ہوئے) آہ! تم نہیں جانتیں جو عورت ایک بار اس گھر کی اُوپر والی منزل میں چلی جاتی ہے وہ پھر کبھی نیچے نہیں اُترتی، غلیظ آرام گاہوں کی تاریکیوں میں وہ اپنی نغمگی

نشست پر بیٹھ کر سحر کے مگر وہ جال بنتا رہتا ہے۔ (سرگوشی کرتے ہوئے) اس کے پاس زمرد کی ایک
طلسمی چھری ہے جس سے وہ عورتوں کے سینوں میں شگاف ڈال کر ان کے دل نکال لیتا ہے
میں سچ کہتی ہوں اس نے ———

لڑکی: (اسی مبہوت انداز میں) وہ مجھے بلا رہے ہیں میں ان کی حکم عدولی نہیں کر سکتی۔

بڑھیا: (التجا کرتے ہوئے) میں تمہیں نہیں جانے دوں گی ——— ادھر دیکھو! میں تمہاری ماں ہوں
تمہاری ماں، کیا تم اپنی بوڑھی ماں کا کہا نہیں مانو گی؟

لڑکی: (اپنے دھیان وہیں) میں نہیں ٹھہر سکتی، ——— میں نہیں ٹھہر سکتی۔

بڑھیا: (غصہ سے) نہیں ٹھہر سکتیں تو اپنی بچی کو اٹھاؤ اور اس گھر سے جتنا بھی دور ممکن ہو سکے نکل جاؤ

لڑکی: (مبہوت انداز میں) وہ مجھے بلا رہے ہیں میں ان کی حکم عدولی نہیں کر سکتی۔

بڑھیا: (پھر التجا کرتے ہوئے) خدارا! اس بچی پر رحم کھاؤ ——— وہ تمہاری غیر موجودگی میں چلا چلا
کر اپنی جان ہلکان کرے گی اس وقت اسے کون چپ کرائے گا ——— تم جانتی ہو وہ تمہارے
سوا کسی سے نہیں بہل سکے گی۔

لڑکی: (حقارت سے) جس وقت وہ روئے، اس کا گلا گھونٹ دینا، اسے باہر پھینک دینا (سیڑھیاں چڑھتے
ہوئے) وہ مجھے بلا رہے ہیں۔ میں اُن کی حکم عدولی نہیں کر سکتی

بڑھیا: (چلاتے ہوئے) سنو! ——— میں کہتی ہوں اُوپر مت جانا ——— ذرا ٹھہرو
دیکھو میں ———

(لڑکی سیڑھیاں چڑھ جاتی ہے)

آہ! ——— یہ گھر ایک جہنم ہے (وقفہ کے بعد افسردگی سے) کتنی اچھی لڑکی تھی
دیکھنے میں کس قدر حسین، اس کے گھنگھریالے بال سیاہ انگور کے خوشوں کی طرح اس کے شانوں پر
لٹک رہے تھے۔ (بادل اسی طرح گرج رہے ہیں، بارش ابھی تک جاری ہے اُوپر کی منزل سے لڑکی
کی چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ جو رفتہ رفتہ شدت اختیار کر جاتی ہیں) اس بچی کو چھوڑ گئی ہے اگر یہ رو دی تو میں

اسے کیونکر چُپ کراؤں گی ——— آہ! کس قدر بھیانک ہیں اس کی چیخیں ....
کاش میں اسے بچا سکتی ——— اگر مجھے علم ہوتا کہ یہ بھی اس کی زد میں آجائے گی تو میں محتاط رہتی ——— میں اس کے آنے سے پیشتر ہی اسے کسی تاریک کوٹھڑی میں چھپا دیتی۔
لیکن اب ——— لیکن اب ———

(کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے)

میں جانتی ہوں تم دروازہ کھٹکھٹا رہے ہو چینتو! میں اچھی طرح جانتی ہوں ——— میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اگر میں دروازے کے پٹ کھول دوں تو تم اپنے آپ کو کسی کونے میں چھپا لو گے۔ اور میں صرف تمہارے کراہنے کی آواز ہی سن سکوں گی ——— مجھے تم پر ترس آتا ہے چینتو! بھکاریوں کی مشکیں کس کر انھیں کوڑے لگا سکتے ہو، اُن کی باچھوں سے بہتے ہوئے خون کا ذائقہ چکھ سکتے ہو، لیکن تم سے کسی عورت کی چیخیں برداشت نہیں ہوتیں ——— میں جانتی ہوں چینتو، اور مجھے تم پر رحم بھی آتا ہے۔ (آہ بھرتے ہوئے) خیر جب چیخیں تھم جائیں گی تو میں دروازہ کھول دوں گی ——— تم اُوپر جا کر اس کی لاش کو گھسیٹتے گھسیٹتے کھنڈروں میں لے جانا۔

(بادلوں کی گرج کے ساتھ لڑکی کی چیخیں سنائی دے رہی ہیں۔ دُور کسی وادی میں بھیڑیوں کی آوازیں گونج رہی ہیں)

پردہ

اناناس اور ایٹم بم

خواجہ احمد عباس

کردار

راج : ایک تعلیم یافتہ نوجوان، ترقی پسند شاعر

رجنی : خوبصورت نوجوان لڑکی جس سے راج محبت کرتا ہے

سیٹھ لکشمی چند : رجنی کا باپ لکھ پتی سرمایہ دار

سیٹھ لکشمی چند کا نوکر

منظر

سیٹھ لکشمی چند کا ڈرائنگ روم۔ فرنیچر۔ آرائش کا سامان وغیرہ قیمتی ہے
مگر بھدا۔ ہر چیز بد مذاقی کا نمونہ۔ دیوار پر ٹنگی ہوئی تصویروں میں بھگوان جی بھی ہیں
اور لکشمی بھی گاندھی جی بھی اور کوئی بڑا سا وائسرائے بھی۔ تجوری پر قومی
جھنڈا پڑا ہوا ہے اور اس پر ایک گاندھی ٹوپی ایسے رکھی ہے جیسے تخت پر تاج
دھرا ہو۔ ایک کونے میں ریڈیو رکھا ہوا ہے۔ اس کمرے کے تین دروازے
ہیں۔ ایک کھانے کے کمرے میں کھلتا ہے دوسرا رسوئی میں۔ تیسرا صدر دروازہ
باہر کے برآمدے سے ہیں۔

جب پردہ اٹھتا ہے تو کمرہ خالی ہے مگر ریڈیو بج رہا ہے کوئی گانا ختم ہو رہا
ہے۔

ریڈیو اناؤنسر: ابھی ابھی آپ منی بائی سے دھرپت سن رہے تھے۔ اب آپ مہا نیتا پوجیہ ولیش داس
جی سے "اناج اگاؤ" اندولن کے بارے میں بھاشن سنیں گے۔

(کھانے کے کمرے سے سیٹھ لکشمی چند کی آواز سنائی دیتی ہے۔)

لکشمی چند: (آواز) منگو! ارے منگو! کہاں مر گیا۔ کھانے کو کچھ لائے گا یا نہیں۔

(منگو کی آواز رسوئی کی طرف سے آتی ہے)

منگو: (آواز) آیا سیٹھ جی۔ ابھی ابھی گرم گرم پوریاں تل کر لا رہا ہوں۔

(ریڈیو پر لیڈر کی آواز سنائی دیتی ہے۔)

لیڈر: (ریڈیو پر آواز) بھائیو اور بہنو ——— آج دیش کی جو دردشا ہو رہی ہے وہ آپ
سے چھپی نہیں ہے۔ کتنے پرانتوں میں کال پڑ رہا ہے۔ لاکھوں بھوکے مر رہے ہیں۔ کروڑوں کو

پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ سرکار راشن کم کرنے پر مجبور ہو گئی ہے اس لیے ہمارا فرض کیا ہے؟
جیسا کہ آکاش وانی بھاشا سے ایک سماد دھوان نے کہا ہے (TIGHTEN YOUR BELTS)
اپنی اپنی پتلونوں کو۔ میرا مطلب ہے اپنی اپنی دھوتیوں کو کس لیجیے۔ کھانا کم کھائیے۔ ہر تیسرے
دن برت رکھیے۔ کچی ترکاریاں کھائیے شکر قند کھائیے TAPIOCA کی کھیر پکا کر کھائیے اور کچھ
نہیں تو ٹڈیاں پکڑ کر ان کو بھون کر کھائیے مگر جہاں تک ہو اناج بچائیے۔ چپاتیاں نہ کھائیے اور
پوریاں، پوریوں کو تو ہرگز نہ ہاتھ لگائیے ——— کبھی کبھار ایک آدھ پوری مل گئی تو کھا لی بس "

(اتنے میں منگو ایک تھالی میں بیس پچیس نئی تلی پوریوں کا پہاڑ لے کر کھانے
کے کمرے میں جاتا ہے۔ صدر دروازہ سے رجنی داخل ہوتی ہے۔ ریڈیو کا بھاشن
سن کر ناک بھوں چڑھاتی پھر ریڈیو کی سوئی گھما کر کوئی --INSTRUMEN
TAL MUSIC) کا پروگرام لگا دیتی ہے ——— اور بڑے
رومانی انداز میں کرسی پر بیٹھ جاتی ہے ——— منگو کھانے کے کمرے
سے خالی تھالی لے کر داخل ہوتا ہے اور رسوئی کی طرف جاتا ہے ——— سنگیت
سنتے سنتے رجنی آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ صدر دروازے کی طرف دبے پاؤں
ادھر ادھر دیکھتا ہوا، راج داخل ہوتا ہے۔ زور سے سیٹی بجاتا ہے۔ رجنی
چونک کر اٹھ بیٹھتی ہے راج کو دیکھ کر اس کا چہرہ خوشی سے کھل جاتا ہے
اور دوڑتی ہوئی راج کے پاس جاتی ہے۔ راج بازو پھیلا کر اس کا سواگت کرتا
ہے)

راج : رجنی!

رجنی : راج! تم آ گئے؟

(وہ ایک دوسرے کے گلے لگنے والے ہیں کہ کھانے کے کمرے سے
سیٹھ لکشمی چند کی گرجدار آواز سنائی دیتی ہے اور وہ دونوں گھبرا کر

الگ ہو جاتے ہیں۔

لکشمی چند۔ منگو ارے منگو اور پوریاں کہاں ہیں؟

منگو : کڑاہی میں ہیں سیٹھ جی!

راج : گھر والی جیسی ہیں سیٹھ جی پوریاں!

رجنی : پوریاں رسوئی میں تلی جا رہی ہیں، پتاجی کھانے کے کمرے میں بھوجن کر رہے ہیں۔

راج : تو کوئی خطرہ نہیں ہے۔

(پھر رجنی کی طرف بڑھتا ہے۔)

راج : (رومانی انداز میں) رجنی!

رجنی : ہاں راج۔

راج : آج میں تمہارے پتاجی سے صاف صاف بات کرنے آیا ہوں اب تمہارے بنا گزارہ مشکل ہو گیا ہے۔

رجنی : (شرما کر) راج میرا بھی یہی حال ہے جس دن تم سے ملاقات نہیں ہوتی سارا دن پھیکا اور بے مزہ لگتا ہے۔

راج : مذاق سے (ادھوں تم جھوٹ بول رہی ہو۔

رجنی : (SERIOUS رومانی انداز میں) نہیں راج! میں سچ کہہ رہی ہوں تم میرے روم روم میں سما گئے ہو۔

راج : یہ تو فلمی ڈائیلاگ ہوا ــــــ اچھا لاؤ تمہارا منہ سونگھ کر دیکھوں کتنے ہیں جھوٹ بولنے والے کے منہ سے بدبو آنے لگتی ہے۔

رجنی : (منہ کھول کر) تو لو سونگھو ــــــ

(راج اسی بہانے سے رجنی کو چومنا چاہتا ہے مگر اسی وقت رسوئی سے منگو پوریاں لیے ہوئے آ جاتا ہے اور دونوں کو اس طرح دیکھ کر کھنکھارنے لگتا ہے۔ راج اور رجنی پھر الگ الگ ہو جاتے ہیں منگو جھوٹ موٹ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کھانے کے کمرے میں چلا جاتا ہے۔)

رجنی : تم بہت شریر ہو !

راج : میں تو بہت شریف ہوں رجنی ! مگر کیا کروں تم بہت خوبصورت ہو۔

رجنی : اونہو ! خوشامد کہیں گے۔

راج : اچھا یہ بتاؤ میرے بارے میں تمھارے پتاجی کا کیا موڈ ہے

رجنی : کچھ اچھا نہیں ہے تمھاری ایٹم بم والی کو تیا کو پڑھ کر بہت بگڑ رہے تھے۔

راج : وہ سب میں سمجھ لوں گا۔ مگر مجھے تو تمھارے پتاجی سے اکیلے میں بات کرنی ہے ہم دونوں کے بیاہ

میں سمجھیں نا ؟ اور یہاں اتنے بہت مہمان بیٹھے ہیں ——

رجنی : مہمان —— مہمان کہاں ہیں ؟ پتاجی تو اکیلے کھانا کھا رہے ہیں۔

راج : اکیلے —— تو پھر یہ اتنی بہت پوریاں —— تمھارے —— پتا

—— —— اکیلے۔ کھا —— جائیں گے ؟

رجنی : ہاں۔ اور کیا ؟ —— اور یہ پوریاں ہی تھوڑی —— پھر وہی بڑے ——

دال بھات —— مٹھائی —— پھل ——

(منگو کھانے کے کمرے سے واپس آ رہا ہے اور رسوئی میں جاتا چاہتا

ہے کہ سیٹھ جی کی آواز آتی ہے —— منگو رک جاتا ہے۔ اور

ڈرائنگ روم میں سے جواب دیتا ہے۔)

لکشمی چند : (آواز) ارے او منگو ! دس بارہ پوریاں اور لے آ ——

راج : (حیرانی سے تقریباً بے ہوش ہوتے ہوئے) دس بارہ اور پوریاں

لکشمی چند : (آواز) اور ہاں —— بھاگ کر بازار سے ایک انناس بھی لے آ —— ہاضمہ

کے لیے اچھا ہوتا ہے

منگو : (ٹھٹک کر —— رجنی سے) تم ہی بتاؤ چھوٹی بی بی۔ رسوئی میں پوریاں تل کر کھانا پروسوں

کہ بازار سے جا کر انناس خرید کر لاؤں —— گھر بھر میں اکیلا نوکر ہوں اس وقت۔

رجنی : کیوں اور سب کیا ہوئے ؟

منگو : (کانا پھوسی کرتے ہوئے) چھوٹی بی بی سیٹھ جی سے مت کہنا سب کے سب وہ راج کپور ہےنا ایکٹر۔ اس کی فلم "برسات" دیکھنے گئے ہیں میٹنی شو میں۔

راج : راج کپور۔ آج تک یہ سمجھ میں نہ آیا کہ اس لونڈے میں ایسے کیا سرخاب کے پر لگے ہیں کہ دنیا اسے دیکھنے کیلئے دس آنے یا ایک روپیہ چار آنے یا ڈھائی روپے کا خون کرنے کو تیار ہے۔

لکشمی چند : (آواز) منگو۔ اناس لے آیا ہو تو تھوڑی پوریاں اور تل دے۔

منگو : اب بتاؤ۔ چھوٹی بی بی! ——— کروں تو کیا کروں؟

رجنی : منگو تو جاکر پوریاں تل ——— میں اناس منگواتی ہوں۔

(منگو رسوئی کی طرف جاتا ہے۔)

رجنی : راجو۔ مجھے بڑی ہی بڑھیا ترکیب سوجھی ہے۔

راج : وہ کیا؟

رجنی : وہ یہ کہ تم بھاگ کر نکڑ والی دکان سے ایک اچھا سا اناس خرید لاؤ۔ پتا جی کو اناس بہت بھاتا ہے۔ تم کہنا تم ان کے لیے بھینٹ لائے ہو۔ وہ اناس پاکر اتنے خوش ہوں گے کہ ———

(شرماتی ہے)

راج : کہ ہماری شادی کی اجازت دے دیں گے۔ سچ!

(رجنی شرما کر سر ہلا کر "ہاں" کہتی ہے۔)

راج : تو یہ کیا مشکل کام ہے۔ میں ابھی ایک اتنا بڑا اور رس بھرا اناس لاتا ہوں کہ سیٹھ جی بھی یاد کرینگے۔

(راج دروازہ کی طرف سے باہر جاتا ہے۔ رجنی ریڈیو کے پاس جاکر بیٹھ جاتی ہے۔ منگو پوریاں لے کر کھانے کے کمرے میں جاتا ہے۔ پھر واپس چلا جاتا ہے راستے میں ایک نظر رجنی

یہ ڈالتا ہے جو ریڈیو کے مدھر سنگیت میں اور اپنے رومان بھرے
خیالات میں کھوئی ہوئی ہے۔ ایک دم سنگیت کا پروگرام رک کر ریڈیو
اسٹیشن سے ایک اعلان ہوتا ہے

اناؤنسر: (آواز) تیسرے مہایدھ کی بھیانک پرچھائیں ساری دنیا پر پڑ رہی ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ
کب اور کہاں پہلا ایٹم بم پڑے اور ایٹمی لڑائی شروع ہو جائے۔ لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ
اگر ایک بار دنیا کے دیشوں نے ایک دوسرے پر ایٹم بم برسانے شروع کر دیئے تو ہزاروں
برس کی پروان چڑھائی ہوئی تہذیب و ترقی و تمدن منٹوں میں مٹی میں مل جائیں گے —— یہی
نہیں —— سارا سنسار بھسم ہو جائے گا۔ زندگی ختم ہو جائے گی۔

(رجنی اس خبر سے پریشان ہو کر ریڈیو بند کر دیتی ہے۔ اُٹھ کھڑی
ہوتی ہے اسی وقت لکشمی چند اندر کے دروازے سے داخل ہوتا ہے
ڈکار لیتا ہوا۔ توند پر ہاتھ پھیرتا ہوا۔)

رجنی: (باپ کو دیکھ کر) پتا جی غضب ہو گیا۔

لکشمی چند: کیوں کیا ہوا؟ —— —— جلدی کہہ

رجنی: کتنے ہی شہروں پر ایٹم بم گرنے والے ہیں۔

لکشمی چند: تو نے تو مجھے گھبرا ہی دیا تھا میں سمجھا سونے چاندی کے بھاؤ گرنے والے ہیں۔

(آرام سے صوفے پر بیٹھ جاتا ہے۔)

رجنی: پر پتا جی۔ لڑائی شروع ہو گئی تو سارے سنسار کا ستیاناس ہو جائے گا۔

لکشمی چند: اری مورکھ تجھے سارے سنسار کی کیا پڑی۔ ایٹم بم ہمارے گھر پر تھوڑا ہی گرنے والے ہیں لڑائی
چھڑ گئی تو تیرے باپ کا تو بھلا ہونے والا ہے۔ فوجی ٹھیکے ملیں گے۔ بازار میں ہر چیز کے بھاؤ
بڑھیں گے، ہم ایک ایک کے دس دس بنائیں گے۔ ہے بھگوان میں تو پرارتھنا کر رہا ہوں کہ کل کی ہوتی
آج ہو جائے۔ رجنی منگو سے کہہ انناس کاٹ کر لے آئے۔ برف میں لگا کے ——

جمنی : منگو تو رسوئی میں ہے پتاجی ! کھانا بنا رہا ہے مگر آپ فکر نہ کریں اناس ابھی آیا جاتا ہے ۔

لکشمی چند : منگو ابھی تک یہاں ہی ہے تو اناس لانے کون گیا ہے ؟

جمنی : اسرار ! راج آیا تھا آپ سے کچھ بات کرنے ۔ اس نے سنا آپ کو اناس بہت پسند ہے اس لیے دوڑا ہوا بازار گیا ہے ۔ آپ کہہ رہے اناس لینے ۔

لکشمی چند : کون ؟ راج ؟ وہ کنگال شاعر ! جب غاں پر راں جتنی جا سے چلا الو کو تیا لکھتا ہے وہ بھی ایٹم بم پر ، وہ کیا اناس لائے گا !

جمنی : نہیں ! پتاجی ۔ مجھے یقین ہے وہ بہت ہی اچھا اور میٹھا اناس لائے گا ۔

لکشمی چند : انسے ہر کالج کے باغی چھوکرے یہ پھل پھول کی پہچان کیا جانیں ——— ان کے دماغ پر تو ایٹم بم سوار ہے ——— کہیں اناس کے بدلے ایٹم بم نہ اٹھا لائے ۔

جمنی : (مسکرا کر) اچھا جب وہ آئے گا ، تب دیکھ لیجئے گا ، اناس لایا ہے یا ایٹم بم ——— اگر اچھا اور میٹھا اناس لایا تب تو آپ اسے ادیکھتی ہے کہ باپ بیر لیٹے لیٹے کرکے اونگھ گیا ہے ۔ پتاجی !

پتاجی ! ———

(کوئی جواب نہیں ۔ اب لکشمی چند خراٹے لینے لگتا ہے)

جمنی : ابھی تو بات کر رہے تھے ، ایک پل میں سو گئے !

(پھر دبے پاؤں ریڈیو کے پاس جاتی ہے اور اس کا بٹن دباتی ہے کوئی سنگیت کا پروگرام دھیمی آواز میں شروع ہو جاتا ہے ، پھر وہ پیچھے سے کمرے کے باہر چلی جاتی ہے ۔ یہ کھانے کے کمرے والے دروازے سے ۔ اس کے جانے کے بعد منگو آتا ہے ۔)

منگو : سیٹھ جی ! اناس تو

(دیکھتا ہے لکشمی چند سو رہا ہے ۔ آگے بات پوری کیے بنا الٹے پیروں واپس چلا جاتا ہے ۔)

اب اسٹیج کی روشنیاں دھیرے دھیرے دھیمی ہوتی جاتی ہیں

اور ہم خواب کی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں ——— ریڈیو

پر شانتی بیت بجتا رہتا ہے —— چند سیکنڈ کے بعد دروازے

پر کھٹ کھٹ ہوتی ہے لکشمی چند جو ایک کرسی پر بیٹھا ہے)

لکشمی چند : کون ہے ؟ آ جاؤ اندر ———

راج داخل ہوتا ہے اس کے ہاتھوں میں رومال سے ڈھکی ہوئی

کوئی "چیز" ہے جو انناس بھی ہو سکتی ہے اور ایک بم بھی۔

لکشمی چند : کون ——— راج ——— تم ———

راج : جی ——— ہاں

لکشمی چند : کیا لائے انناس ؟

راج : (اس "چیز" میز پر رکھتے ہوئے بڑی احتیاط سے یہ چیز ابھی تک ڈھکی ہوئی ہے) جی ہاں !

انناس لایا تو ہوں آپ کے لیے مگر یہ ایک بڑے انوکھے ڈھنگ کا انناس ہے

شاید آپ کو پسند نہ آئے ؟

لکشمی چند : کپڑا ہٹاؤ۔ دیکھیں تو ؟

راج ڈرامائی انداز میں دھیرے دھیرے کپڑا ہٹاتا ہے۔

میز پر انناس نہیں، ایک ایٹم بم رکھا نظر آتا ہے۔

لکشمی چند : (حیرت سے) یہ کیا ——— بم ———

راج : (بڑے اطمینان سے) معمولی بم نہیں ——— ایٹم بم ———

لکشمی چند : نہیں نہیں، تم مذاق کر رہے ہو ؟

راج : مذاق تو تب ہوگا سیٹھ جی جب بم پھٹے گا ——— یہ آپ کا گھر ہی نہیں سارا شہر تباہ

برباد ہو جائے گا۔ شہر کے چاروں طرف دس دس میل تک برسوں کبھی کھیتی نہ ہو سکے گی

شہر کی آبادی میں سے اوّل تو کوئی زندہ بچے گا نہیں اور اگر بچ بھی گیا تو اس کے سر کے بال
جھڑ جائیں گے، داڑھی مونچھ، پلکیں بھویں سب صفاچٹ۔ آپ سوچئے کتنے فائدے کی
بات ہے نائیوں یا ربروں کی جھنجھٹ ہی نہ رہے گی اور پھر بلیڈوں کی قیمت بھی تو آپ کی
جہری سے بڑھتی جا رہی ہے ہر طرح بچت ہی بچت ہوئی اور سنئے جو لوگ بچیں گے ان کی
دوا کتنی ہی نسلوں تک جو پیدا ہوگی وہ یا تو اندھی ہوگی یا لنگڑی ——— کسی کے سر
کان نہیں تو کسی کی ناک نہیں ——— کیوں سیٹھ جی کتنا مزہ آئے گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

! ——— ! ——— ! ——— ! - - — — —

(بم اٹھا کر لکشمی چند کی طرف بڑھاتا ہے وہ ڈرتا ہوا پیچھے
ہٹتا ہے)

لکشمی چند: یہ یہ کیا بلا ہے اسے دور رکھو۔

راج: میں نے کہا نا یہ ایٹم بم ہے آپ کا پیارا ایٹم بم ——— (ایک دم مذاق چھوڑ کر سنجیدہ
ہو جاتا ہے) یہ شیطان کا ہتھیار ہے۔ اگر دنیا نے ایک بار اس ہتھیار کو استعمال کرنے کا فیصلہ
کر لیا تو دنیا نے ہمیشہ کے لیے پاپ کے سامنے سر جھکا دیا ہے۔

لکشمی چند: تم کمیونسٹوں جیسی باتیں کہہ رہے ہو میں ابھی پولیس کو بلا کر تمھیں گرفتار کراتا ہوں۔

راج: ضرور بلائیے۔ مگر آپ کو شاید یہ نہیں معلوم کہ میں صرف پردھان منتری پنڈت جواہر لال کی زبان
سے نکلے ہوئے شبد دہرا رہا تھا۔

لکشمی چند: (کھسیانا ہو کر) تم چاہتے کیا ہو؟

راج: میں آپ سے راج نیتی کی باتیں کرنے نہیں آیا سیٹھ جی، میں خود ان باتوں کو نہیں سمجھتا میں تو
سیدھا سادا کوی ہوں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں اور رجنی یعنی رجنی اور میں۔ مطلب یہ کہ ہم دونوں
——— ایک دوسرے سے پریم کرتے ہیں اور شادی کرنا چاہتے ہیں۔

لکشمی چند: رہو جھونپڑیوں میں خواب دیکھو محلوں کے۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ میری بیٹی کا بیاہ

کسی لکھ پتی کروڑ پتی سے ہوگا۔

راج : یوں کہیئے کہ اناج کپڑا تیل شکر تو آپ بلیک مارکیٹ میں بیچتے ہی تھے اب اپنی بیٹی کا بلیک مارکیٹ کرنے کا بھی ارادہ ہے ——— مگر یاد رکھیئے کہ رجنی کا بیاہ مجھ سے ہوگا۔

لکشمی چند : یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ اپنی بیٹی کی قسمت ایک کنگال کوی کے ساتھ جھوڑ دوں ——— اس سے تو اچھا ہے میری بیٹی مر جائے۔

راج : تو فکر نہ کیجیے اس کا انتظام ابھی ہوا جاتا ہے۔

لکشمی چند : کیا مطلب ؟

راج : (گھڑی دیکھتے ہوئے) مطلب یہ کہ دس منٹ میں یہ ایٹم بم پھٹ جائے گا۔ اسی پل نہ آپ ہوں گے نہ آپ کے مل ہوں گے نہ آپ کی لڑکی ہوگی نہ آپ کا بنک ہوگا نہ شیئر بازار ہوگا ——— اور نہ میں ہوں گا نہ میری کویتا ہوگی نہ آرٹ ہوگا۔ نہ ادب یہ سب جھگڑے ٹنٹے مٹ جائیں گے سب پریشانیاں ایک دم دور ہو جائیں گی۔ سب قرضے ادا ہو جائیں گے ——— سودا بُرا نہیں ہے سیٹھ جی سوچ لیجئے۔

لکشمی چند : تم پاگل ہو گئے ہو ——— اپنے ساتھ دوسروں کا بھی خون کرنا چاہتے ہو۔

راج : میں پاگل نہیں ہوا سیٹھ جی ! آپ کی سماج پاگل ہو گئی ہے جو روز سینکڑوں نوجوانوں کی آرزوؤں کا خون کرتی ہے۔ آپ کی دنیا پاگل ہو گئی ہے۔ جہاں انسان روٹی کے ٹکڑے کو ترستے ہیں اور کتے دودھ ڈبل روٹی کھاتے ہیں ——— جہاں کوی اور کلاکار بھوکے مرتے ہیں اور دلال ہزاروں لاکھوں کماتے ہیں ——— جس دنیا میں بچوں کو دودھ دینے کو پیسہ نہ ہو، نوجوان کو تعلیم دینے کیلئے پیسہ نہ ہو۔ سکول اور ہسپتال کھولنے کیلئے پیسہ نہ ہو، مگر دس دس کروڑ خرچ کرکے ایک ایٹم بم بنایا جاتا ہو۔ وہ دنیا پاگل نہیں تو کیا سمجھدار ہے۔ یہ دنیا اسی قابل ہے کہ تباہ ہو جائے اسی لیے تو میں یہ ایٹم بم کا اناناس آپ کو بھینٹ کرنے کے لیے لایا ہوں۔

لکشمی چند : (ڈر کر) نہیں نہیں ——— اسے یہاں سے لے جاؤ ——— دور لے جاؤ

مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔

راج: (چڑانے کے انداز میں ڈراتے ہوئے) ایٹم بم کوئی ہا سے مکان پتھر ای گرے گا۔ لڑائی چھڑ گئی تو تو نے باپ کا بھلا ہونے والا ہے۔ ــــــ پر سیٹھ جی ــــــ یہ ایٹم بم آپ کے دل پر پھٹے گا ــــــ (گھڑی دیکھ کر) ــــــ صرف پانچ منٹ باقی ہیں۔

لکشمی چند: (ڈر کر) بس بس ــــــ مجھے شما کرو ــــــ اسے یہاں سے لے جاؤ میں پچیس ہزار روپے نقد دوں گا۔

راج: (ہنس کر) ایک کروڑ پتی کی جان کی قیمت صرف ہزار روپے

لکشمی چند: جو مانگو گے دیدوں گا ــــــ دس ہزار ــــــ پچاس ہزار ــــــ لاکھ مگر اسے یہاں سے لے جاؤ۔

راج: مجھے آپ کا روپیہ نہیں چاہئے سیٹھ لکشمی چند۔ جو دولت مجھے چاہئے وہ انمول ہے ــــــ رجنی کی محبت ــــــ (گھڑی دیکھتا ہے) مگر افسوس اب تو صرف ایک منٹ باقی رہ گیا ہے۔

لکشمی چند: (پریشانی سے پاگل ہو کر) ــــــ اچھا ــــــ اچھا ــــــ جیسا تم چاہتے ہو ویسا ہی ہو گا ــــــ (بے ہوش ہو کر گرتا ہے مگر بڑبڑاتا رہتا ہے) تم رجنی سے جب چاہو بیاہ کر سکتے ہو۔ تم دونوں سکھی رہو۔

روشنیاں دھیمی ہوتے ہوتے بالکل اندھیرا ہو جاتا ہے جب پھر روشنی ہوتی ہے تو نہ راج ہے نہ ایٹم بم۔ سیٹھ لکشمی چند سو رہا ہے دروازے پر کھٹ کھٹ ــــــ لکشمی چند چونک کر آنکھیں کھولتا ہے مگر اس بار پہلے ہی سے اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے نشان ہیں جیسے کوئی بھیانک سپنا دیکھا ہو۔

لکشمی چند: کون ہے؟ آجاؤ اندر!

(راج اندر آتا ہے ——— پیچھے رجنی ہے
راج تو دیکھتے ہی لکشمی چند اور بھی گھبرا جاتا ہے کیونکہ اس کے ہاتھ
میں لپٹے سے ڈھکی ہوئی کوئی چیز ہے جو اناس بھی ہو سکتی ہے اور
اٹیم بم بھی
جیسے جیسے راج لکشمی چند کی طرف بڑھتا ہے وہ ڈر کے مارے
پیچھے ہٹتا جاتا ہے)

لکشمی چند : تم پھر آ گئے ؟

راج : (حیرانی سے) پھر ؟ ——— ہاں ! ——— میں آپ کے لیے . ———

رجنی : پتا جی دیکھئے تو راج کتنا اچھا اور میٹھا اناس لایا ہے . آپ کے لیے

راج : اسے چکھ کر تو دیکھئے سیٹھ جی ——— اناس کیا ہے . اناسوں کا ایٹم بم ہے .

لکشمی چند : میں جانتا ہوں ——— میں اچھی طرح جانتا ہوں .

راج : (ذرا پریشان سا ہو کر) کیا جانتے ہیں ؟

لکشمی چند . کہ یہ کس قسم کا اناس ہے ——— مگر راج ! اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی . مجھے
تمہاری سب باتیں منظور ہیں ——— میں تو ——— دل سے چاہتا ہوں
کہ تم اور رجنی ———یعنی رجنی اور تم ———مطلب یہ کہ تم دونوں ! ———

راج : (خوش ہو کر) تو آپ میرے آنے کا مطلب سمجھ گئے ؟ اور آپ راضی ہیں ؟

لکشمی چند : ہاں ہاں ! ——— میں تو خود تمہارے پتا سے یہ بات کرنے والا تھا (رجنی سے جو خوش بھی
ہے اور شرما بھی رہی ہے) کیوں رجنی تو راج کو پسند کرتی ہے نا ؟

(رجنی شرما کر باپ سے لپٹ جاتی ہے .)

رجنی : پتا جی ! ——— آپ کتنے اچھے ہیں .

(منگو آتا ہے)

لکشمی چند : کیا ہے ؟

(منگو سیٹھ کے کان میں کچھ کہتا ہے)

لکشمی چند : ان سے کہدو کہ لکشمی چند نے بلیک مارکیٹ کا دھندا چھوڑ دیا ہے ۔

(منگو حیرانی سے سیٹھ کو دیکھتا ہوا باہر چلا جاتا ہے)

رجنی : (حیرانی سے) پتاجی ــــــــ کب سے ؟

لکشمی چند : آج سے ــــــ بیٹی ــــــــ اسی وقت سے !

راج : رجنی تو اس خوشی میں اور کوئی مٹھائی نہیں تو کم از کم یہ اناناس ہی کھایا جائے ۔

رجنی : لاؤ مجھے دو ــــــــ میں ابھی کاٹ کر اور برف میں لگا کر لاتی ہوں ۔

میز پر سے اٹھانے لگتی ہے کہ باپ چلا کر روک لیتا ہے

لکشمی چند : رجنی ! اسے ہاتھ مت لگانا !

رجنی : کیوں ، کیا ہوا ،

لکشمی چند : یہ اناناس نہیں ہے ــــــــ ایٹم بم ہے ۔

راج }
رجنی } ایٹم بم

رجنی : کہیں آپ سپنا تو نہیں دیکھ رہے پتاجی !

راج : تو پھر لیجیے ــــــــ اس ایٹم بم کے درشن تو کر ہی لیجیے ۔

کپڑا ہٹا کر اناناس کو سیٹھ لکشمی چند کی طرف پھینکتا ہے جو یہ دیکھ کر کہ وہ ایٹم بم نہیں ہے اناناس ہے ، خوشی کے مارے بے ہوش ہو جاتا ہے ۔

رجنی : (دوڑ کر) پتاجی !

راج : (نبض دیکھ کر) بالکل ٹھیک ہیں یہ خوشی کی بے ہوشی ہے ابھی ہوش آجائے گا ۔

دونوں کھڑے ہو جاتے ہیں

ایک دوسرے کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہیں

راج : چلو رجنی !

رجنی : چلو ——— مگر کہاں ؟

راج : اپنا گھر بسانے ۔

رجنی : اپنا گھر ؟ ——— (خوش ہو کر)

راج : ہاں ——— چھوٹا سا جھونپڑا ——— اِدھر اُدھر چھوٹا سا بغیچہ ۔

رجنی : مگر ایک شرط ہے ۔

راج : وہ کیا ؟

رجنی اُس میں انناس کا ایک پیڑ ضرور ہوگا !

راج : ایک اور شرط ۔

رجنی : وہ کیا

راج : وہاں ہم کسی کو اٹم بم کے بیج کبھی نہ بونے دیں گے

ساتھ ساتھ وہ جاتے ہیں

پردہ گرتا ہے ۔

○

دینُو

دھرم پرکاش آنند

کردار

ڈاکٹر بھلّہ	ایک سرکاری ڈاکٹر
ڈاکٹر کھنّہ	ایک مقامی ڈاکٹر
بلونت	ڈاکٹر بھلّہ کا ایک دوست
منگو	چائے کے باغات میں کام کرنیوالا ایک غریب پہاڑی
رکمن	منگو کی بیوی
دھرنا	منگو کا اکیس برس کا لڑکا
دادی	منگو کی ماں۔ دھرنا کی دادی
دینو	دھرنا کا چھوٹا بھائی جو مشکل سے ابھی چھ سات مہینے کا ہے۔
مہرو	
سونا	

چندی

چوکیدار وغیرہ

مقام

ضلع کانگڑہ میں چائے کے باغات کے قریب مزدوروں کی بستی

منگو کے مکان کا آنگن

وقت

غروب آفتاب سے کچھ دیر پہلے

○

منظر

(پردہ اٹھنے پر ڈاکٹر جلد اور ڈاکٹر کھنہ اپنے عملے کے ساتھ مکان کے آنگن میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ مکان کچا اور دو منزلہ ہے۔ باہر سے چکنی مٹی اور گوبر سے لپا ہوا دیکھنے میں صاف ——— دو کمرے نیچے ہیں ایک اوپر۔ بالائی منزل میں داخل ہونے کا صرف ایک ہی راستہ ہے جو کافی تاریک ہے۔ اوپر کے کمرے میں ایک چھوٹی سی کھڑکی ہے جس میں ایک رسی کے سہارے کچھ لہسن سوکھنے کے لیے لٹکا دیئے گئے ہیں۔ آنگن کے ایک کونے میں نیم کے درخت اور مکان کی دیوار سے بندھی ہوئی ایک رسی پر دو چار بہت ہی میلے کچیلے کپڑے لٹک رہے ہیں ——— دروازے کی دہلیز پر بوڑھی دادی ساٹھ سال کے بوجھ سے جھکی لاٹھی ٹیکے بیٹھی ہے۔ آنگن میں کچھ بچے مٹی کے گھوڑے ہاتھ میں لیے کھیلتے کھیلتے آکر حیرت کی نظروں سے نوواردوں کو دیکھنے لگتے ہیں۔

کھڑکی میں دو ننھی لڑکیاں حیرت سے ان ڈاکٹروں کو دیکھ رہی ہیں۔ اندر سے بچے کی کھانسی کی آواز آجاتی ہے۔)

ڈاکٹر کھنہ : (ہاتھ میں رجسٹر دیکھتے ہوئے) منگو کدھر ہے؟

ایک لڑکا : باہر سے شام آئے ابھی۔

ڈاکٹر کھنہ : [illegible] ؟

[illegible] : [illegible] روٹی کھا رہا ہے۔

ڈاکٹر [illegible] : [illegible] بلاؤ۔

لڑکا : (بلند آواز سے) او دھرنا ! او دھرنا ! او۔ و۔ و

(ایک ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا پکڑے اور ایک لقمہ نگلتا ہوا دھرنا باہر آتا ہے وہ انیس بیس سال کا نوجوان ہے۔ چہرہ پھیکا پھیکا اور آنکھوں میں ناامیدی)

ڈاکٹر بھلہ۔ (انگلش: لیجے ہیں) دیکھو دھرنا ہم سرکار کی طرف سے اس علاقہ میں بیماریوں کی پڑتال کرنے آئے ہیں ہم تم سے کچھ سوال پوچھتے ہیں جواب ٹھیک ٹھیک دو۔ شام ہونے لگی ہے اور ہمیں ابھی دو چار جگہ جانا ہے

دھرنا : (پھر یا بیٹے ! ذرا بیٹھے)

ڈاکٹر بھلہ : اچھا یہ بتاؤ کہ اس گھر میں پچھلے دس سال میں کتنے لوگ مرے ہیں ؟

دھرنا : (دہلیز پر بیٹھی ہوئی دادی کی طرف دیکھ کر) کوئی نہیں (ذرا بے چینی اور گھبراہٹ سے) کوئی بھی تو نہیں۔

ڈاکٹر بھلہ : کوئی لڑکا۔ بچہ۔ مرد۔ عورت۔ کوئی تو مرا ہی ہوگا !

دادی : بتا نہ دھرنا۔ بتا تا کیوں نہیں۔ انھیں کون سا کسی کا قرض دینا تھا۔ جو تجھے شرم آئے۔ غریبوں کو ڈر کس بات کا ؟

دھرنا : (پھر بھی جھجک کر) میرے دو بھائی مرے ہیں۔ پیدا ہوتے ہی مر گئے تھے۔

ڈاکٹر بھلہ : اور ؟

دھرنا : میری پہلی لڑکی پیدا ہونے کے دو مہینے بعد ہی چل بسی تھی۔

بلونت : ہوں ! تم شادی شدہ ہو ؟ اور پھر بال بچوں والے !

(دھرنا صرف شرما کر رہ جاتا ہے)

ڈاکٹر بھلہ : بیمار ہوئی تھی ؟

دھرنا : نہیں ماں کا دودھ سوکھ گیا تھا۔

(دھرنا کے چہرے پر ایک لمحہ کے لیے سیاہ بادل سا چھا کر مفقود ہو جاتا ہے)

ڈاکٹر بھلہ: (ڈاکٹر کھنہ سے) نوٹ کر لیجئے (دھرنا سے) کوئی اور؟

دھرنا: چھ مہینے ہوئے میرے چچا دفات پا گئے تھے۔

ڈاکٹر بھلہ: بیمار تھا؟

دھرنا: جی ہاں!

ڈاکٹر بھلہ: کیا بیماری تھی؟

دھرنا: (ذرا پریشان ہوکر) بیماری تو کوئی خاص نہیں تھی ——— بس ایسے ہی بیمار تھا۔

ڈاکٹر بھلہ: کتنی دیر بیمار رہا؟

دھرنا: (سوچ کر اور گن کر) یہی کوئی ڈیڑھ دو سال۔

ڈاکٹر بھلہ: کھانسی بھی آتی تھی؟

دھرنا: جی، کافی آتی تھی۔

ڈاکٹر بھلہ: اور خون بھی؟ روز بروز ڈھال ہوتا جاتا تھا؟

دھرنا: جی جی!

ڈاکٹر بھلہ: (کھنہ سے) ٹی۔بی کیس لکھ لیجئے۔

ڈاکٹر کھنہ: (نوٹ کرکے اور رجسٹر دیکھ کر) تیرہ کون ہے؟

ایک بچہ: میں۔

ڈاکٹر بھلہ: ادھر آؤ بیٹا ذرا۔

(ڈرتا ڈرتا ڈاکٹر بھلہ کے پاس جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس کے گلے کو ٹوہ کر دیکھتے ہیں۔)

لہ تپ دق ۔

ڈاکٹر کھنہ سے   صحت کمزور اور خون کم ۔

ڈاکٹر کھنہ: (رپورٹ لکھ کر) سونا ۔

ایک لڑکی: جی ہاں!

(ڈاکٹر بھلّا اُس کے پاس جاکر دیکھتے ہیں ڈاکٹر کھنہ سے) السٹومیلیشیا[1] اور انیمیا[2]

ڈاکٹر کھنہ: (رپورٹ لکھ کر) چندی ۔

(اُوپر کی کھڑکی سے پانچ چھ سال کی چنچل لڑکی میلی سی گڑیا کو ہاتھ میں لیے جھانکتی ہے۔ چہرے پر مسکراہٹ ہے)

چوکیدار: بیٹی ذرا نیچے آنا ۔

ڈاکٹر بھلّا: یہ کس کی بیٹی ہے ۔

چوکیدار: دھرنا کے مرحوم چچا کی ۔

(چندی نیچے آتی ہے اور دروازے کے پاس آکر رُک جاتی ہے ۔

چندی: گڑیا کھلا رہی تھی میں اب اس کی شادی جو ہونے والی ہے کپڑے لینے ٹھیک کر رہی تھی ۔

(گڑیا کو چھاتی سے لگانے جھومتی ہے)

ڈاکٹر بھلّا: آؤ بیٹی تمھیں ذرا دیکھیں ۔

چندی: (انکار میں سر ہلاتی ہے) نہ۔ نہ پہلے میری گڑیا کے لیے کپڑے دو۔ چچا جی جب بھی لاہور سے آتے تھے، میرے لیے مٹھائی اور میری گڑیا کے لیے کپڑے لاتے تھے، کپڑے نہ ہوں گے تو اس کا بیاہ کیسے ہوگا۔ سُنو تو اپنے گڈے کے لیے جہیز مانگتی ہے دو گے نہ؟

مسٹر ملونت: (ہنستے ہوئے) عجیب شوخ اور چنچل لڑکی ہے۔ آؤ بیٹی تمھیں کپڑے دیں گے ۔

(چندی مسکراتی ہوئی آگے آتی ہے)

ڈاکٹر کھنہ: لڑکی بڑی سمجھ دار معلوم ہوتی ہے۔ ان گنواروں میں یہ کیسے آگئی؟

---

[1] Calcium کی کمی [2] خون کی کمی۔

ڈاکٹر بھلہ : (چندری کو دیکھ کر ڈاکٹر کھنہ سے انگریزی میں) اسے تو ہجریں (اکنبٹھ مالا) معلوم ہوتی ہے ہو سکتا ہے دق ہو جائے۔

(چندری مسٹر بلونت کے کوٹ کا دامن پکڑ لیتی ہے)

چندری : لا بٹیے! اب میری گڑیا کے لیے کپڑے۔

(مسٹر بلونت پیچھے ہٹتے ہیں)

مسٹر بلونت : پرے رہو، پرے رہو۔

(اسے الگ کرنے کی کوشش کرتا ہے چندری سہم جاتی ہے)

مسٹر بلونت : (غصے سے ایک چونی نکال کر پھینکتا ہے) بھاگو یہاں سے وہ چونی اٹھا لو۔ جو چاہے خرید لینا۔

(چندری خوشی خوشی جا کر چونی اٹھا لیتی ہے پھر مڑ کر کھنہ کی طرف دیکھتی ہے مسکراتی ہے گویا کو پچکارتی ہے)

چندری ۔ نہ رو میری بٹیا نہ رو۔ تیرے لیے خوب کپڑے بنوا دوں گی۔

(مسٹر بلونت کا غصہ کافور ہو جاتا ہے وہ ہمدردانہ نگاہوں سے چندری کے بھولے بھالے چہرے کی طرف دیکھتے ہیں)

ڈاکٹر بھلہ : اس لڑکی کی باتیں تو سنو۔

ڈاکٹر کھنہ : (انگریزی میں) میں تو یہی سوچ رہا تھا کہ ان گنواروں میں یہ سرسوتی کہاں سے آ گئی۔

ڈاکٹر بھلہ : (سنجیدہ لہجہ میں انگریزی میں) اس کے اندر تپ دق کے جراثیم سرایت کر چکے ہیں اس کی ساتی انھیں کیوجہ سے ہے ان جراثیم سے دماغ زیادہ تیزی اور چستی سے کام کرنے لگتا ہے۔ لیکن جلد ہی یہ لڑکی اپنی سب شوخی اور لسانی کے ساتھ ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے چلی جائے گی۔

(مسٹر بلونت حیران اور مسز بلونت گم کھڑے رہ جاتے ہیں)

چندی: ان کی طرف دیکھ کر مسکراتی ہوئی۔ تمھیں بھی میں اپنی گڑیا رانی کے بیاہ پہ بلاؤں گی۔ ضرور آنا۔ نہیں تو (شوخی سے سر ہلا کر) اپنی شادی پہ بھی نہیں بلاؤں گی۔

(گڑیا کو چھاتی سے لگائے جاتی ہے)

بلونت: (کچھ گھبرا کر انگریزی میں) ڈاکٹر صاحب اسے تو ہسپتال پہنچانے کا انتظام کرنا چاہئے اس بے چاری کی زندگی بچ جائے۔ وقت پہ علاج ———

ڈاکٹر کھنہ: (روکھی مسکراہٹ سے انگریزی میں) کہاں ہسپتال ہیں اس علاقے میں، اور ہوں بھی تو ان کے پاس وہاں جانے کا خرچ بھی کہاں ہے؟ اس غریب کو دھکے کھانے کے لیے کہاں بھیجو گے اس کی قسمت میں یہیں ختم ہونا لکھا ہے۔

بلونت: لیکن ڈاکٹر صاحب ———

ڈاکٹر کھنہ: (رجسٹر دیکھتا ہوا) بھولی!

دادی: میں نہاں۔

ڈاکٹر بھلہ: بڑی اماں! تمھیں کبھی کوئی بیماری تو نہیں ہوئی۔

دادی: (لمبی سانس لے کر) مجھے کیا ہوگا بیٹا! صرف عمر کی بیماری ہے وہ بھی نہ جانے کب ختم ہو جائے۔ وہ وقت تو گیا۔ جب میں سارا سارا دن کام کر کے نہ تھکتی تھی۔ اب تو اندر سے دروازے تک آتے آتے سانس پھول جاتی ہے۔ جوڑ جوڑ درد کرتے ہیں۔ گھسٹ گھسٹ کر یہاں تک آ جاتی ہوں۔ میرا کیا ہے میں تو اچھی بھلی ہوں۔ آپ ان بچوں کا ہی علاج کیجئے۔

ڈاکٹر بھلہ: (ڈاکٹر کھنہ سے) اسے بھی اسیٹو ملیشیا کی شکایت ہے۔ (دھرنا سے) تم لوگوں میں اسیٹو ملیشیا کی اتنی شکایت کیوں ہے۔

دھرنا: وہ کیا ہوتا ہے سرکار؟

ڈاکٹر بھلہ: تم لوگوں میں (Calcium) کی کمی ہے (دادی کی طرف دیکھ کر) کیا تمھیں محسوس نہیں ہوتا کہ تمھاری ہڈیاں خستہ ہو گئی ہیں گویا جھٹکا دینے سے ٹوٹ جائیں (دھرنا کی ٹیڑھی

ٹانگوں کی طرف اشارہ کرکے) تمھارے جسم کے اعضا ٹیڑھے ہو گئے ہیں (سونا کی طرف اشارہ کرکے) اور تمھارے چہرہ پیلا زرد ہو رہا ہے (دھرنا کی طرف مخاطب ہوکر) تمھیں محسوس نہیں ہوتا کہ تمھاری طاقت روز بروز زائل ہو رہی ہے۔

دھرنا : سرکار! ہم کیا کرسکتے ہیں پرماتما کی مرضی یہی ہے۔

بلونت : پرماتما کی مرضی۔ ہوں۔ اس میں پرماتما کا کیا قصور ہے۔ تم لوگ دن رات محنت کرتے ہو لیکن کھاتے کچھ نہیں۔ تم لوگ کنجوس ہو۔ پیسے جمع کرتے ہو۔ تمھیں گھی دودھ کی تو قسم ہے۔ صرف چاول اور پھیکی روٹی کھانے سے تو تم میں CALCIUM کی افراط نہ ہو جائے گی۔ تمھیں لسی دہی کھانا پڑے گا پھلوں کا استعمال کرنا پڑے گا۔ پرماتما۔ ہوں!

(بیزاری سے سر ہلاتا ہے)

دھرنا : (جیسے اپنے آپ سے) گھی، دودھ، دہی! (ہاتھ میں پکڑا ہوا سوکھی روٹی کا ٹکڑا دکھا کر) یہی اگر مل جائے تو غنیمت ہے سرکار! پانچ آنے روزانہ میں دس آدمیوں کا پیٹ بھرنا ہوتا ہے میں اور میری بیوی دو دو آنے روزانہ کماتے ہیں۔ ایک آنہ میری چھوٹی بہن لاتی ہے ماں میری سات مہینے سے بیمار پڑی ہے (اندر سے کھانسنے کی آواز آتی ہے) باپ کو مار کر کام سے نکال دیا گیا۔

بلونت : دو آنے روزانہ! ناممکن!

دھرنا : جی! ہاں! گھی دودھ!

(روکھی مسکراہٹ مسٹر بلونت منہ کھولے رہ جاتے ہیں)

ڈاکٹر کھنہ : (پھر رجسٹر دیکھتا ہوا) اب اس گھر میں صرف تین چار شخص دیکھنے کو باقی رہ گئے ہیں۔ منگو۔ رکمن۔ دینو اور بیلی۔ یہ بیلی کون ہے؟

دھرنا : میری بیوی ہے سرکار! کل ہی بیکل ہو گئی ہے۔ ایک دو دن میں اس کے بچہ ہونے والا ہے۔

(چہرہ لال سا ہو جاتا ہے اندر سے کھانسی کی آواز آتی ہے)

ڈاکٹر کھنہ : منگو کہاں ہے؟

دھرنا : ابھی باہر سے نہیں آیا۔ آتا ہی ہوگا ؛

ڈاکٹر کھنہ ، اور رکمن ؛

دھرنا : رکمن تو میری ماں ہے وہ تو سات مہینے سے بیمار پڑی ہے (جیسے اپنے آپ) وہ باہر کیسے آئیگی۔

داوی : ہاں سرکار ! بے چاری رکمن کیسے آئے گی۔

(اندر سے کھانسنے کی آواز ——— پھر آہستہ آہستہ بچے کو کندھے سے لگائے لڑکھڑاتی ۔ دیوار کا سہارا لیتی رکمن دروازہ تک آتی ہے پیلا۔ زرد چہرہ۔ میلے کچیلے کپڑے۔ روکھے اڑتے بال اور ہڈیوں کا پنجر جسم کانپ رہا ہے)

رکمن : (ہانپتے ہوئے) کس نے کہا تھا رکمن ۔ کس نے میرا نام لے کر پکارا تھا (ڈاکٹر کھنہ کو دیکھ کر) ڈاکٹر ہے ۔ (مصنوعی ہنسی ہنستی ہے) اب کیوں آئے ڈاکٹر ؛ اب کیوں رحم آگیا ؛ پیسے تو میرے پاس اب بھی نہیں ۔ چار آنے روزانہ بیٹا اور بہو لاتے رہے ۔ اس میں ایک وقت پیٹ بھر کھانا تو ملتا نہیں ۔ پھر فیس (کھانستی ہے) نہیں دی ۔ میں نے بھی تو ۔ اب بھی نہ دوں گی ۔ (ماتھے پر سے پسینہ پونچھتی ہے) اور اب تو بہو بھی میکے چلی گئی ——— بچے کو کندھے سے ہٹا کر چومتی ہے ۔ لڑکھڑاتی ہے ۔ پھر دیوار کا سہارا لیتی ہے ۔ بچہ بے ہوش سا ہے اچانک رو پڑتی ہے) نہیں ٹھہرو ——— دوں گی ۔ کپڑے بیچ کر بھی تمھاری فیس دوں گی ۔ تب بھی میں بیمار تھی ۔ اب میرا بچہ بیمار ہے اُس کو آرام ہو جائے گا نہ ! ڈاکٹر : اسے بچا دو ڈاکٹر میرا بچہ !

(دیوار کا سہارا چھوڑ آگے بڑھ کر ڈاکٹر کو دکھانا چاہتی ہے مگر لڑکھڑا کر گرنے لگتی ہے ڈاکٹر کھنہ اور دھرنا اسے سنبھال لیتے ہیں)

رکمن : (سنبھل کر) نہیں پرے رہو ۔ میں اچھی بھلی ہوں ۔ (ڈاکٹر کھنہ سے) پھر فیس پیسے مانگ لینا یونہی سر میں چکر سا آگیا تھا (آس پاس سے بے خبر اپنے آپ سے) مجھے اب اتنے چکر کیوں

آنے لگے ہیں (ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سمجھ سوچ کر) شاید میری حالت اب خراب ہو گئی ہے۔

(کھانستی ہے —— ہانپتی ہوئی۔ ایسے ہی لگتا ہے اوہ۔

سر میں چکر آنے کی وجہ سے دھڑام سے زمین پر گرتی ہے۔ ڈاکٹر جعلہ

اور ڈاکٹر کھنہ اسے دیکھنے کے لیے جھکتے ہیں ایک طرف سے

منگو نشے میں چور۔ لڑکھڑاتا۔ بڑبڑاتا داخل ہوتا ہے)

منگو : اب کے نظر آ جائے تو مار ہی ڈالوں۔ (ہنستا ہے) لیے تیز چاقو سے — ذبح کر ڈالوں (دانت پیستا ہے) بکرے کی طرح (پھر ہنستا اور لڑکھڑاتا ہے) پیسے مانگتا ہے ہمارے باپ نے جو خزانہ ورثے میں دیا ہے (رُک کر) اپنے بچے نہیں ہوں گے نہ۔ —— کہنے لگا۔ دو روپے دو تو بچے کو ہسپتال میں داخل کر لوں گا (قہقہہ لگاتے ہوئے ... ہا ہا۔ دو روپے۔ میں نے خوب جواب دیا دو روپے۔ میں نے کہا میرا خون چوس لو۔ شاید اس میں تمہیں دو روپے مل جائیں۔ (اپنی پیٹھ ٹھوک کر) کیا خوب کہا منگو نے —— (اچانک رُک کر) یہ، یہ کیا (ڈاکٹروں کو دیکھتا ہے۔ پھر رکمن کو، پھر اس کی طرف جھپٹتا ہے۔ کیوں اس طرح کھلے سر سب کے سامنے آ جاتی ہے کیوں آ جاتی ہے تو۔ (اسے گھسیٹتا ہوا دروازے تک لے جاتا ہے۔ پھر لڑکھڑاتا ہوا نوواردوں کی طرف آتا ہے۔ نشہ میں چور۔ غضب ناک آواز میں) تم کون ہو جو بنا پوچھے دوسرے کے گھر گھس آئے ہو۔ کون ہو تم میں منگت رام راجپوت۔

(سینہ تانے آگے بڑھتا ہے)

ڈاکٹر کھنہ : کیا بک بک کر رہا ہے؟

منگو : بک بک۔ کیوں بنا پوچھے میرے گھر آئے؟ کیوں میری بیوی کو بلایا۔ میں مقدمہ کر دوں گا۔ میں راجپوت ہوں۔

ڈاکٹر کھنہ : کیوں جیل کی روٹیاں توڑنے کو جی چاہتا ہے —— چوکیدار

منگو : جیل! جیل! (قہقہہ مار کر ہنستا ہے اور گر گر کر ناچتا ہے) سمجھا وہ جیل میں۔ وہاں مرتی ہوئی عورتیں نہیں ہیں۔ وہاں تڑپتے بچے نہیں ہیں۔ وہاں عیش ہے۔ دو وقت روٹی اور کوئی غم نہیں

ڈاکٹر بھلہ : جانے بھی دیجئے ڈاکٹر کھنہ۔ اس نے بہت پی رکھی ہے۔

دھرنا : حضور! اسے معاف کردیں

منگو : (لڑکے کی طرف جھپٹتا ہے) تو کہتا ہے میں ہوش میں نہیں ہوں۔

(چوکیدار اسے دھکیل کر پرے لے جاتا ہے۔ لڑکھڑا کر منگو گر پڑتا ہے اور وہیں پڑا بڑبڑاتا ہے)

مسٹر بلونت : جو پیسے اس کے شراب میں جاتے ہیں ان سے اپنی عورت کا علاج کرے تو کیا اچھا ہو۔

چوکیدار : (ذرا ہنس کر) پیسے کس کے پاس ہیں حضور۔ یہ تو قسمت کے کھیل ہیں کل کی بات ہے یہی منگو گاؤں بھر میں اپنے اچھے چال چلن کے لیے مشہور تھا۔ سب اس کی شرافت کی تعریف کرتے تھے۔ میاں بیوی دونوں چائے کے باغوں سے روزانہ دو آنے لاتے تھے۔ دھرنا اور اس کی بہو بھی کماتے تھے۔ اور مزے میں بسر ہو رہی تھی۔ پھر اس کی گھر والی بیمار پڑ گئی۔ بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ تکلیف اسے زیادہ تھی۔ منگو اسے لے کر گیا۔ کوس طے کرکے پالم پور لے گیا۔ وہاں ڈاکٹر کو دکھایا۔ اس نے فیس مانگی۔ پر فیس ان کے پاس کہاں اور فیس دیتے بھی تو دوائی کے پیسے کہاں تھے۔ رو تے دھوتے واپس آگئے۔ راستہ میں ہی بچہ پیدا ہوا تبھی سے نہ جانے منگو نے کس طرح پی کر بے سدھ ہونا سیکھ لیا ہے۔ چائے والوں نے اسی لیے اسے مار بھگا دیا۔

دوسرا چوکیدار : سرکار بڑا بھلا آدمی تھا۔ اب مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ گھر والی بھی نہیں بچہ بھی بیمار ہے۔ ہم نے پھر کہہ سن کر ہسپتال بھیجا تھا پر ڈاکٹر تو چاہتا تھا اس کی مٹھی گرم ہو تو پھر رکھن اور بچے کو ہسپتال میں داخل کرے۔ بس اسی دن سے اس کی حالت اور بھی خراب ہو گئی۔

(سب کچھ دیر چپ کھڑے رہتے ہیں پھر ڈاکٹر کھنہ جیسے آفتاب

غروب ہوتے دیکھ کر چونکتے ہیں ۔

ڈاکٹر کھنہ : ڈاکٹر صاحب دیر ہو رہی ہے ۔ ہمیں ابھی اور دو جگہ بھی جانا ہے ۔

(ڈاکٹر بھلہ کوٹ درست کرتے ہیں ۔ اچانک رکمن گھٹ کر ان کے

پاؤں پکڑ لیتی ہے ۔)

رکمن : ڈاکٹر ۔ ڈاکٹر ! اسے تندرست کر دو ۔ ایشور کے لیے اسے تندرست کر دو ۔ تمہارے بھی بچے ہونگے

بھاتا کے لیے اسے دیکھو ۔ تم پیسے مانگتے ہو ۔ میں دوں گی ۔ میں کہیں سے لا کر دوں گی اسے دیکھ

جاؤ (رک رک کر) تم بولتے کیوں نہیں ۔ مانگنے سے گھبراتے ہو ۔ (ہانپتی ہے پھر نیم اور درد بھری

آنکھوں سے ڈاکٹر بھلہ کے چہرے کی طرف دیکھتی ہے) نہیں آپ وہ تو نہیں ۔ آپ تو کوئی اور

ڈاکٹر ہیں آپ تو مہربان معلوم ہوتے ہیں آپ کے چہرے سے تو فراخدلی ٹپکتی ہے میرے ڈبو

کو دیکھ لیجئے سرکار ! آج کتنی دیر سے بے ہوش ہے ۔

ڈاکٹر بھلہ پاؤں پیچھے کھینچتے ہیں ۔

رکمن : (اٹھ کر بہت ہی درد بھری آواز میں) ڈاکٹر جی !

بچے کو ان کے پاؤں میں رکھ دیتی ہے ڈاکٹر بھلہ جھکتے ہیں ۔ پر چونک کر پیچھے ہٹ

جاتے ہیں ۔ مسٹر بلونت اور ڈاکٹر کھنہ آگے بڑھتے ہیں)

ڈاکٹر کھنہ : (حیرت سے) ہیں !

ڈاکٹر بھلہ ۔ (افسوس آمیز لہجہ میں) مائی صبر کرو ۔ تم مرے ہوئے بچے کو لیے پھرتی ہو ۔

رکمن : آہ میرے لال (پچھاڑ کھا کر گر پڑتی ہے)

(سورج کی آخری شعاع ایک لمحہ کے لیے بچہ کی لاش پر چمکتی ہے پھر

اندھیرے میں غائب ہو جاتی ہے ۔)

پردہ

○

خواجہ سرا

راجندر سنگھ بیدی

کردار

کاشفہ : اُڑدا بیگنی محل میں ڈولیوں کی تنقیح کرتی ہے۔

قباد : خواجہ سرا

مرزا کوچک سلطان : نواب ثالث زمانی بیگم کا چھوٹا بھائی

بیگمات نواب کاؤس شاہ

نواب نتھی بیگم

نواب کاؤس شاہ

داروغنی

بابا طاہر : شاہی طبیب

تین ڈولی بردارنیاں، سقنی، نوکر چاکر۔

وقت

زوالِ مغلیہ خاندان

پہلا منظر

حرم کا بیرونی دروازہ سنگِ مرمر کا بنا ہُوا ہے اور مُغلیہ صنعت کا اچھا نمونہ ہے ، دروازے کے عین بغل میں ایک پانی کی پکھال دکھائی دیتی ہے (جس سے پانی نیچے باڑے ــــــ ایک حوض میں گر رہا ہے کبھی کبھی کوئی سقنی پانی بھر کر حرم میں لے جاتی ہے۔

پردہ اُٹھنے پر اُڑوا بیگنی ایک پاؤں باڑے پر رکھے، داہنے ہاتھ کی کہنی گھٹنے پر ٹکائے، اُسی ہاتھ کے انگوٹھے اور انگشت شہادت میں اپنی ٹھوڑی لیے خلا میں گھور رہی ہے۔ اس کے سر کے بال بکھرے ہوئے ہیں اور دوپٹہ لاپروائی سے گلے میں ڈالا ہُوا ہے ــــــ وہ فقط ایک قمیص اور ایک چوڑی دار پائجامہ پہنے ہوئے ہے۔

اُڑوا بیگنی کو اس جگہ اور اس حالت میں کھڑے کچھ دیر ہوتی ہے کہ دارو غنی ایک اُدھیڑ عمر سیاہ فام عورت ایسے ہی لباس میں اس طرف سے گذرتی ہے اُڑوا بیگنی اس وقت گنگنا رہی ہے۔

اُڑوا بیگنی :

دانی کرچہ مذہبیت ملے دلبر ما ــــ بااین جہتے نرفت راز بر ما
خود کس نلغزستی و نپُرسی ہرگز ــــ نا بتو چہا می گذرد بر سر ما

(دارو غنی ا ٹینتی ہوئی آتی ہے)

دارو غنی : اُڑوا بیگنی ــــ اڑوا بیگنی ــــ کا شفہ! اری! تم ابھی تک یہیں کھڑی ہو؟

اُڑوا بیگنی : (چونک کر) کیوں ؟ کیا ہے دارو غنی بی ؟

داروغنی : کیا ہے ! تعجب ہے محل میں زنانہ سواریاں آیا چاہتی ہیں اور تم پکھال کے پاس کھڑی کیا مزے سے کہہ رہی ہو ——— کیا ہے ؟ ——— اری آج ڈولیوں کی تنقیح نہیں ہوگی کیا ؟

اُڑوا بیگنی : اوہ ! ڈولیاں بھی آنیوالی ہیں ؟ ——— داروغنی بی ، اللہ جانے آج مجھے چکر کیوں آرہے ہیں رنگارنگ حلقے میری آنکھوں کے اردگرد پھیل رہے ہیں ——— یہ باؤلا ہے نا پانی کی پکھال ——— اور بس اس سے آگے مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تنقیح کیا ہوگی ، ناک ؛

داروغنی : چکر سے آرہے ہیں ——— اوئی ! اب میں نے جانا کیوں ہوائیاں چھوٹ رہی ہیں ، تمھارے چہرے پر ——— قباد کو دیکھے کے دن ہوئے ہیں تھیں ؟

اُڑوا بیگنی : قباد ——— قباد ——— للہ اس کا ذکر نہ کرو ، داروغنی بی ! ——— تم نے قباد کا نام لیا اور میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی ، اب تم سے کیا چھپاؤں خالہ ، گھڑیوں ایک ٹک دیکھتی رہتی ہوں گوندلاندوں کے محلے کی طرف ——— مہینوں سے قباد نے وہاں آنا چھوڑ دیا ہے ! اور یہاں وہی رسم وفا ہے اور وہی خلجان : ...... دیکھو خالہ ! اگر کوئی بار بدار مغنی نظر پڑتی ہے تو اسے کہو دو گلی سے میری کپائی اچکن اور انگرکھا لے آئے ۔

ذرا جلدی آجائے ، ڈولیاں آرہی ہیں (گھبرا کر) گھنٹیوں کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں ۔

(گھنٹیوں کی دھیمی دھیمی آواز سنائی دیتی ہیں)

داروغنی : قباد کو دیکھو گی ——— کاشکے ! تو تمھارے دل میں اور ٹیسیں اٹھیں گی ——— نادان چھوکری ، نیا فرمان دیکھ لیا تم نے ؟

اُڑوا بیگنی : نہیں تو ——— نئے فرمان میں خاص کوئی وہ ہے ؟

داروغنی : ہے تو وہی روزمرہ ——— لیکن ایک بات ہے ، مرزا دبیر کو حسن الدولہ کا خطاب عنایت کیا گیا ہے اور غلجی سردار قولیش کو ایک ہزاری منصب اور ہاں ! محل میں ایک نیا خواجہ سرا آرہا ہے ہو نہیں ——— اری ! میں کیا کسی پتھر کے بت سے باتیں کر رہی ہوں ؟

(گھنٹیوں کی آوازیں اور قریب ہوجاتی ہیں)

اُڑوابیگنی : مجھے اس وقت کچھ ہوش نہیں ہے خالہ ! ——— اور ڈولیاں آرہی ہیں۔

داروغنی : اب کس سے کہوں تمہاری چکن لانے کیلئے ؟ نہ یہاں سقنی دکھائی دیتی ہے اور نہ بابیدارنی البتہ وہ خیر صلاوالی گھوم رہی ہے ——— بے حیا کی بلا دُور، یہ لُومڑی پھر لگائی بجھائی کرنے آئی ہوگی۔ اری او خیر صلاوالی !

(وقفہ)

اُوں ہوں ! کیسی چھنپی ہوئی عورت ہے کس مزے سے رنگ جاتی ہے جیسے میری آواز ہی نہیں سُنی، نہیں جانتی میں اس کی قبر تک سے واقف ہوں ——— اجی سرکار ! ایک عرض بندی کی بھی سنیئے گا لے ہے !

اُڑوابیگنی : خالہ ! تم خود جاؤ اور لے آؤ ——— سواریاں بھی آگئیں ——— جا جلدی ذرا ——— اچھی بہن ———"

(داروغنی جاتی ہے اور مطلوبہ لباس لے کر لوٹ آتی ہے
اس وقت اُڑوابیگنی سخت گھراہٹ میں کپڑے پہننا شروع کر دیتی ہے)

(داروغنی سے) پہنا دو ——— باندھ دو کمر ادھر بھی ——— ہاں ہاں، بس داروغنی بی ڈولی آگئی ———،

(گھنٹی کے ساتھ ہی ڈولی سامنے آتی ہے)

داروغنی : لو پردہ تھام لو !

اُڑوابیگنی : بلند اقبال نواب ثالث زمانی، ان کی صاحبزادی چھٹی زلیسنی اور آچا ہیں اللہ رسول کی امان ! بیگم ! لونڈی سلام عرض کرتی ہے۔

نواب ثالث زمانی : کہو کاشفہ ! اچھی تو ہو ؟ یہ میرے ساتھ صاحبزادی اور دوسری اُن کو پڑھانے والی آچا ہیں۔ یہ نئی ہی آئی ہیں لکھنؤ سے (آچا سے) آچابی ! یہ اُڑوابیگنی ہیں، ان کا کام یہاں ڈولیوں کی تنقیح ہے، ہر روز ادھر آنے سے پہلے ان سے ملاقات ہُوا کرے گی تمہاری۔

اُڑوابیگنی : خوش آمدید ! یہ تو بہت اچھا ہُوا، محل کی رونق میں اور بھی اضافہ ہُوا۔ اللہ صاحبزادی نیک اختر

کو عمر دراز عطا کرے، ان کے صدقہ ہمیں بھی بڑے بڑے آدمیوں کا نیاز حاصل ہوا۔

نواب ثالث زمانی : اور کاشفہ! تمہاری والدہ تو اب اچھی ہیں نا؟

اُڑدابیگنی : حضور کی لاانتہا کرم فرمائیوں کی بدولت اچھی ہیں وہ آپ کا ارسال کردہ جوشاندہ پلا دیا تھا اور اب تو کھانسی کو افاقہ ہے —— اور ہاں فرمایئے —— مرزا کوچک اچھے ہیں؟ پچھلے دنوں دشمنوں کی طبیعت کے ناساز ہونے کا خط آیا تھا۔

نواب ثالث زمانی : ہاں کاشفہ! —— بھائی ہم پر جاتے ہی نصیب دشمناں بیمار ہو گئے بہت بارشوں کی وجہ سے بنگلہ کی زمین سے نکلنے والے بخارات کی لپیٹ میں آ گئے۔ اب ان دنوں فتحیاب ہو کر لوٹا ہی چاہتے ہیں —— چھٹی نویسی کو انھیں ہی خط لکھنے کیلئے لائی ہوں۔

(دوسری ڈولی سامنے آتی ہے)

داروغنی : تو یہ وہ تھا، اُڑدابیگنی!

اُڑدابیگنی : بخت بلند نواب نیفی بیگم —— اللہ رسول کی امان! بیگم غلام تسلیمات عرض کرتی ہے (سخت حیران ہو کر) قباد! —— قباد!!

نواب نیفی بیگم : ہاں اُڑدابیگنی! یہ ہمارے نئے خواجہ سرا ہیں آئیں ہائیں! یوں ششدر کیوں رہ گئیں جانے کیسی بُت ہو گئیں تم، نئے فرمان میں نام نہیں دیکھا خواجہ قباد کا ——؟ تعجب ہے داروغنی ——!

داروغنی : ہاں! نواب صاحبہ —— نام تو کب کا شائع ہو چکا تھا، لیکن خدا جانے اُڑدابیگنی کو کیوں نہیں بتایا گیا؟ میں تو آج بھی اسے فرمان سنا رہی تھی لیکن ——"

(ڈولیاں حرم میں چلی جاتی ہیں)

اُڑدابیگنی : ڈولیاں چلی گئیں —— قباد —— قباد خواجہ سرا ہو گیا، داروغنی! تمہاری کاشفہ پاگل ہو جائے گی۔ —— قباد نے یہ کیا کیا —— قباد نے یہ کیا کیا۔

داروغنی : تم نہیں جانتیں کاشفہ —— قباد کو تم سے کتنی محبت تھی۔ وہ تمہارے کتنا قریب

دینا چاہتا تھا، وہ چوگانِ محبت میں تم سے گوئے سبقت چھین لے گیا ہے۔ تمہاری محبت کا یہ عالم ہے
کہ تم اپنی محل سے نکل کر گولندازوں کے ہاں تک بھی نہ پہنچ سکیں جہاں وہ ساری ساری رات منڈلایا
کرتا تھا اور نواب ثالث زمانی کو اکثر شجاعت خاں کے بھوت کا دھوکا ہوتا ———— کبھی
اندھیری راتیں، کبھی چاندنی راتیں گذر گئیں، اور وہ برابر گولندازوں کے ہاں آیا کیا ———— اور
تم، تم پانی کی پھال سے آگے نہ بڑھ پائیں ———— !

اُڑوا بیگنی: قباد! تُو نے یہ کیا کیا ———— تُو نے محبت پر اپنا سب کچھ قربان کر دیا قباد، تو ہمیشہ سچی
اور پاک محبت کا نام لیا کرتا تھا ———— سچی اور پاک محبت جس میں جسم کو کوئی دخل نہیں ———— قباد
میں پاگل ہو جاؤں گی -

داروغنی: اب شجاعت خاں کے بھوت کو گولندازوں کے ہاں منڈلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اب وہ
نواب ثالث زمانی بیگم کے بغلی کمرے کے پاس جہاں اُڑوا بیگنی کا حجرہ ہے منڈلایا کرے گا ————،
تو کاشفہ! میرے خیال میں وہ شجاعت خاں کا بھوت آ رہا ہے، شجاعت خاں کا بھوت ———— !
میں جاتی ہوں -

(ایک طرف غائب ہو جاتی ہے، دوسری طرف سے قباد آتا دکھائی دیتا ہے)

اُڑوا بیگنی: قباد! ———— قباد!!

قباد: (قریب آکر) کاشفہ ———— میری اپنی کاشفہ !

اُڑوا بیگنی: قباد تم ہو ———— قباد! میرے کمسن محبوب ———— تم نے یہ اقدام کیوں کیے؟ تم
نے یہ اقدام کیوں کیے؟ ———— بتاؤ، بتاؤ !

قباد: اپنی کاشفہ کے قریب ہونے کے لیے ———— قریب تر ہونے کے لیے، وہاں محل کے نیچے
منجمد کر دینے والی سردی تھی، کاشفہ! وہاں پانی اور کیچڑ تھی جس میں سردیوں کی لمبی راتیں پھنس کر
رہ جاتی تھیں، یہاں رونق اور حسن کی فصیلیں ہیں اور تمہارا گرما دینے والا حسن کاشفہ !

اُڑوا بیگنی: آہ قباد! میرے معصوم محبوب! تو نہیں جانتا، تُو نے کیا کیا ہے! تیری معصومیت کے

صدقہ ! میں تیری قربانی کا جواب قربانی سے دوں گی، لیکن ——— (نفرت سے)
خواجہ سرا قباد ! مجھے یقین نہیں آتا کہ تم ایسی حرکت پر کیسے اتر آئے ؟ ——— تم عورت ہی
ہوتے ——— اب تم مرد ہو نہ عورت ! تم کیا ہو تم کچھ بھی نہیں ہو، (محبت سے) لیکن
آہ ! قربان جاؤں تمہارے بھولپن کے میرے قباد ——— ادھر دو مجھے اپنا ہاتھ ———
(چیخ مار کر) آہ مجھے اس سے کتنا ڈر آتا ہے، اس برف ایسے ٹھنڈے اور منجمد ہاتھ سے !

قباد : (آواز بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے) اسنہ ہے کاشفہ !

اژدا بیگم : اُف میرے اللہ ! تمہارا لہجہ کس تیزی سے بدل رہا ہے، اس سے پہلے تم کتنے دُبلے
پتلے انسان تھے، اب گوشت تمہارے جسم اور تمہاری گردن پر جمع ہو رہا ہے (روتے ہوئے)
قباد ! مونگ اور سن کی ان فصیلوں میں نواب بلند بخت آئے، نواب کا دس شاہ آئے اور مرزا ئے
کوچک سلطان بھی آتے ہیں ——— لیکن تم ایسے آئے کہ گولند ازوں کی کیچڑ بھی ساتھ
ہی لیتے آئے جس میں کاشفہ کا گرباد دینے والا حسن بھی سردیوں کی لمبی راتوں کی طرح پھنس کر رہ
جائے گا ——— قباد ——— قباد ——— تم نے یہ کیا کیا ؟

قباد : میں تم سے کل کی بات کہتی ہوں ——— کہتا ہوں کاشفہ ——— کل جو کہ اب عدم آباد
والوں کا حصہ ہو چکا ہے، کل جبکہ مجھ میں مرد کا صائب حسد زندہ تھا اور جب میں نے مرزائے
کوچک کو دست بدست لڑائی میں زخمی کیا تھا اور ابھی اپنے نئے پیشے کی تعلیم پانے کیلئے خواجہ سراؤں
کے ہاں نہیں گیا تھا ——— مرزائے کوچک نے حضرت علیؑ کی نیاز کے روز ایک مشروع
کا تھان اور مونگے کی مالا دی اور وہ میری برداشت سے باہر تھی۔ میں جانتا تھا کہ تم بھی مشروع
میں ملبوس ہو کر اور مالا میں محض ایک مونگا بن کر لٹک جاؤ گی ——— خواجہ سراؤں کی
آمدنی کے پیش نظر مجھے خیال تھا کہ تمہیں ایک موتیوں کی مالا نذر کر سکوں گا۔ موتی جو مونگے سے
گراں تر ہوتے ہیں اور تم موتی بن کر لٹکنا زیادہ پسند کرو گی ———"

اژدا بیگم : تم کس قدر بھولے ہو قباد ! عورت خواہ مونگا بن کر لٹک جائے خواہ موتی بن کر لٹکنا وہیں

چاہتی ہے میرے محبوب! عورت دولت نہیں چاہتی، جاہ وحشمت کی طلبگار نہیں ہوتی وہ محبت
چاہتی ہے لیکن —— لیکن محبت کسے کہتے ہیں، یہ تم نہیں جانتے، شاید یہ میں بھی نہیں جانتی۔

قباد۔ مجھے تم سے محبت ہے —— پاک اور بے لوث محبت! میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں بھی مجھ سے
بے غرض محبت ہوگی، تم میری قربانی کا جواب قربانی سے دینے کا وعدہ کرتے ہوئے وفا کی لاج بھی
رکھ رہی ہو اور نفرت بھی بچا رہی ہو —— لیکن اس میں تمھارا کیا قصور ہے کاشفہ!

اڑوابگی: جسے تم محبت کہتے ہو، وہ محبت نہیں ہے —— رفاقت ہے، جیسے دو مسافر ایک ہی
منزل کو روانہ ہوں اور انھیں منزل کے ایک ہونے کی وجہ سے ایک طرح کی محبت ہو جائے جیسے
ایک انتہائی بدصورت سے کوئی اتنا انوس ہو جائے کہ اس سے خوف کھانے کی بجائے اس سے
اُنس ظاہر کرنے لگے۔ لیکن تمھارے اس فعل کے پیچھے جو خلوص ہے میں اس کی قدر کرتی ہوں' قباد!
لیکن —— قباد ——

قباد: (روتے ہوئے) میں کچھ نہیں جانتا —— میں اس وقت نہیں جاننا چاہتا کہ
میں نے کیا کیا ہے کاشفہ! —— میں صرف یہ جانتا ہوں کہ تمھیں چاہتا ہوں....
اور ——

پردہ

○

دوسرا منظر

(حرم کا اندرونی منظر ۔ نواب ثالث زمانی کے محل کا ایک کشادہ سا
کمرہ جس کا ماحول پردوں اور ہر قسم کے سازوسامان کے اعتبار سے نہایت
پرتکلف ہے ۔ سامنے دو تین سیڑھیاں ایک بڑے مسند کے ساتھ ملحق ہوتی ہیں
اس مسند پہ بیسیوں گاؤ دم تکیئے اور کئی ایک پیچوان اور کٹوریاں دکھائی دے
رہی ہیں ۔

پردہ اٹھنے پر دروازے کے قریب باریدارنیاں حکم کی منتظر
کھڑی نظر آتی ہیں اور بیگمات کھڑکیوں سے نیچے ایک جلوس کو دیکھ رہی
ہیں ۔ یہ جلوس مرزا ئے کوچک کے محلوں میں فاتحانہ داخلے کے سلسلہ میں ہے
اس لیے نفیریوں اور شادیانوں کی ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دیتی ہیں

ایک آواز : نواب کوچک سلطان فاتح بنگلہ زندہ باد

دوسری آواز : دولت کا دم ثنا ہی پائندہ باد !

ساتھ کے کمرے میں عورتیں گا رہی ہیں ۔

" دیو سے مبارکبادیاں ری مائی جم جم نت نت ")

نواب ننھی بیگم : (کھڑکی سے سر نکالتے ہوئے) مبارک ہو بہن ثالث ——— سچ کہتی
ہوں مجھے تو تم پر رشک آتا ہے ۔

داروغنی : بیگم سچ فرماتی ہیں ——— اللہ کرے نواب کوچک کا سا بھائی ہر کسی کا ہو ۔

اُڑوابیگنی : میں پہلے نہ کہتی تھی بیگم ——— مرزا کوچک بڑے شہ زور آدمی ہیں اور بنگلے کی مہم میں
ضرور کامیاب رہیں گے ۔

نواب ثالث زمانی : انہوں کو خوشی نہ ہوگی تو کیا دوسروں کو ہوگی؟ جب کوچک بھائی یہاں پڑے انڈے مرغیوں کے لڑایا کرتے تھے تو نواب صاحب کا یہ خیال ہو چلا تھا کہ یہ بس انڈے لڑانے ہی کو جانتے ہیں۔

نواب نھی بیگم : اُن کی کیا بات کرتی ہو ثالث بہن! بیٹھے بٹھائے پھبتیاں کسنا تو اُن کا کام ہی ہے۔ —— اور جو میں ان سے اتنی دہ نہ کروں تو ہر روز میرے سر پر چکی دلا دیں —— سچ!

نواب ثالث زمانی : ہاں نھی —— وہ تو ان کی بات ہی ہے۔

نھی بیگم : اری بی قباد! —— جا تو میرا پاندان اٹھا لا۔

خواجہ قباد : جاتی ہوں بیگم صاحبہ —— پان تراش بھی لاتی ہوں، سموسہ گلوری لاؤں یا لگی؟

نھی بیگم : میرے لیے تو سموسہ لے آؤ یا تعویذی اور —— ثالث بہن کیا لیں گی؟

نواب ثالث زمانی : بیڑا لوں گی اور کیا؟ —— لیکن دیکھو اتنا چونا نہیں لگانا جتنا اس روز لگایا تھا۔ منھ کا ایک کلہ آج تک سوجا ہوا ہے۔

خواجہ قباد : بیڑا وہ کاٹ کے لاؤں گی کہ بعینہ اندر پڑ جائے اور نہیں تو ——

انّوا بیگمی : (آہستہ سے) قباد! خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کرو ——

نھی بیگم : اور دیکھو بی قباد! —— آج آخری چہار شنبہ ہے انگوٹھی اور چھلے [illegible] آنا آج جبر سے کوچک میاں کو بھی ایک انگوٹھی دوں گی۔

(قباد جاتا ہے)

نواب ثالث زمانی : اور ہاں دو نہ کی کیوں نہیں؟ پچھلی دفعہ سر ہو [illegible] ! نھی بیگم مجھ سے ناحق تنی رہتی ہیں۔

اُڑوا بیگمی : وہ تو ایسے نہیں ہیں بیگم، جو اتنی سی بات پہ منھ کو آئیں۔ —— وہ جو کام بھی کریں ایک قرینے کے ساتھ، انڈے لڑا دیں تو اُس میں بھی شاہانہ شان ٹپکے —— جن میں بازو کا زور ہوتا ہے وہ نہیں ہوتے خفا ان چھوٹی چھوٹی باتوں پہ ——

ثالث زمانی : ہاں کاشفہ ـــــ لو کوچک میاں آ گئے ۔

(استقبال کے لیے اٹھتی ہے اور سیڑھیوں سے نیچے آتی ہے ۔ ایک طرف سے کوچک میاں داخل ہوتے ہیں، ہاروں سے لدے پھندے ہیں سر پر دوپلی آڑی رکھی ہوئی ہے، ذرا بانکے دکھائی دیتے ہیں ہاتھ میں ہمیشہ کی طرح ایک ڈنڈا ہے)

مرزا سے کوچک : آداب عرض کرتا ہوں آپا ـــــ اور چھوٹی آپا کو بھی تسلیمات عرض ہیں ۔

ننھی بیگم : (بے دلی سے بڑھتے ہوئے) کوچک میاں کو بنگلہ کی فتح مبارک ہو !

(کوچک میاں جھک کر سلام کرتے ہوئے ہاروں کا بوجھ اتار کر ایک طرف رکھ دیتے ہیں، نواب کاؤس شاہ داخل ہوتے ہیں)

ثالث زمانی : اب طبیعت کیسی ہے کوچک میاں ؟ سنا تھا پچھلے دنوں طبیعت خراب تھی ۔

نواب کاؤس شاہ : خیر سے بھلا چنگا ہے ایک دن کچھ سر درد ہوا تھا اور بس ـــــ تم عورتیں بھی خوب رائی کا پہاڑ بنا لیتی ہو واللہ !

مرزا سے کوچک : ٹھیک کہتے ہیں نواب ۔

ننھی بیگم : اونہہ ! آپ کی تو عادت ہے کہ بات منہ سے نکلی نہیں اور پکڑ لی ۔

نواب کاؤس شاہ : اچھا بھلا جو منہ میں آئے کہے جاؤ ـــــ "

ننھی بیگم : اچھا تو میں چپ ہو جاتی ہوں، میری باتیں کہاں اچھی لگتی ہیں آپ کو ـــــ

کاؤس شاہ : ثالث کو بہت بولنا چاہیے اور وہ چپ ہیں ـــــ مبارک باد بھی نہیں دے سکیں بھائی کوچک کو ـــــ ۔

ثالث زمانی : (گلے میں رقت ہے) مجھ سے بولا نہیں جاتا ـــــ

نواب کاؤس شاہ : اوہ ! اتنی خوشی ہے واللہ کہ رو رہے ہیں ۔

(سب ہنستے ہیں)

ثالث زمانی : یہ آپ ہی تھے جو کہتے تھے کہ بس انڈے سے نکلنے ہی آتے ہیں کوچک میاں کو۔

نواب کاؤس شاہ : اوہ برگ یہ دکھ رہی ہے ——— ؟

مرزا کوچک : وہ تو مذاق میں تھا ——— آپا جان!

ثالث زمانی : جی ہاں! جانتی ہوں۔

نواب کاؤس شاہ : یہ لو ——— ارے بابا! ان عورتوں سے خدا بچائے۔ یہ وہ ہیں جو کنوئیں میں گرے ہوئے عاجز کا ٹیلا بڑھے کر پہنچ جاتی ہیں ——— ارے بابا! ابھی تھی سر ہو رہی تھیں اب تم جوتے لگاؤ۔

ثالث زمانی : آئے ہائے! میں کیوں دشمنوں کے جوتے لگانے لگی؟

نواب کاؤس شاہ : ہاں ہاں! "دشمنوں" کو کیوں لگانے لگی؟

(سب ہنستے ہیں)

مرزا کوچک : تم تو اپنی اپنی ——— گویا برسوں کی لے بیٹھے ہو۔

کاؤس شاہ : اللہ ہی بچائے۔ اب تو کفر کی چل نکلی ہیں۔

ننھی بیگم : خود ہی واویلا کرتے ہیں اور خود ہی ڈرتے ہیں ——— مگر ان سے کون کہے؟

مرزا کوچک : (ہنستے ہوئے) اور کہہ بھی دیا ——— کیا ادا ہے۔

ننھی بیگم : چلو چھوٹے میاں ——— آج ہی آئے اور آج ہی ———

ثالث زمانی : ارے چھوٹے میاں ——— کوئی بنگلہ کی کہو ———

کاؤس شاہ : ڈینگیں چل نکلیں گی بیگم ——— یہ خیال شریف میں رہے۔

ننھی بیگم : مشکل سے جان چھڑا کر آیا ہے اور بہن ثالث اُسے پھر بنگلہ کی یاد دلا رہی ہیں ——— کچھ ستانے تو دو ———

کاؤس شاہ : یہیں بنگلہ کا رن نہ پڑ جائے۔ مجھے تو ڈر آتا ہے۔

ثالث زمانی : اور نہیں تو کاشفہ کو کہتی ہوں ——— وہ کچھ سنائے۔

اُڑوا بیگی: (شرماتے ہوئے) بیگم صاحبہ! مجھے گانا نہیں آتا۔

کوچک سلطان: (حیران ہوکر) اُڑوا بیگی ——— کاشفہ! (اپنے آپ سے) کیا رنگ نکالا ہے کاشفہ! ——— یہ تیری محبت ہی تو ———

ثالث زمانی: چل ہٹ! گانا نہیں آتا، چار پانچ روز سے وہ سر کھپایا ہے ——— وہ مشق کی ہے کہ ——— اداب ———

ننھی بیگم: منھ پر تعریف گالی برابر ہوتی ہے۔ لیکن کہاں اُڑوا بیگی اور کہاں عمر خیام کی رباعیات اللہ کی دین ہی تو ہے۔ ——— اور پھر کیا گلا پایا ہے!

ثالث زمانی: ایرانی نژاد ہے آخر ——— اس کے دادا کو ابھی تک لشکری نہیں آتی۔

کاؤس شاہ: اُڑوا بیگی ——— گاؤ، ہم تمھیں دوشالا دیں گے۔

مرزائے کوچک: شروع کا تھان دیں گے۔

اُڑوا بیگی: (مرزائے کوچک کی طرف دیکھتے ہوئے) پہلے ہی حضور کی جوتیوں کے صدقہ کیا تھوڑا ہے؟

کاؤس شاہ: داروغنی ———

داروغنی: حکم سرکار!

کاؤس شاہ: اس کٹوری میں تمباکو کم ہے، جا اور تمباکو لے آ۔

(قدموں کی آواز)

خواجہ قباد: (داخل ہوتے ہوئے) لیجئے حضور پاندان!

کاؤس شاہ: بیگم! نیا خواجہ سرا کیسا ہے؟

ننھی بیگم: اچھا ہے! (ایک طرف ہوکر) اکیلے میں بتاؤں گی۔

مرزائے کوچک: اور ہم کیا پرائے بیٹھے ہیں جو ہم سے چھپاتی ہو، آپا؟

ثالث زمانی: تعجب ہے ———!

ننھی بیگم: ایسی بھی باتیں ہیں ——— جو مردوں سے چھپانے کے لائق ہوتی ہیں۔

ثالث زمانی : گویا نواب تو کوئی وہ ہیں ——— ۔

(ہنستے ہیں)

وجاہت سلطان : ٹھٹکا ہوا ہوں ——— بھئی کوئی بات ہو جائے ۔

ثالث زمانی : کاشفہ کا گانا ۔

کاؤس شاہ : فرمایئے ؟

ثالث زمانی : ہو سکتا ہے ، کیا کاشفہ بی ؟

اڑوا بیگم : ہو سکتا ہے سرکار ، لیکن .....

ننھی بیگم و ثالث زمانی : لیکن ویکن ہم نہیں جانتے ہیں ۔

خواجہ قباد : نواب صاحب ! ——— بندی تعویذی پیش کرتی ہے ۔

کاؤس شاہ : واللہ خوش کر دیا ——— لاؤ تعویذی ———

ثالث زمانی : کیا گلوری ہے ؟

خواجہ قباد : نواب صاحب ! ——— بندی لُغمی پیش کرتی ہے ۔

ننھی بیگم : لاؤ تو بی قباد ۔

کوچک سلطان : او قباد ! (حیرانی چھپاتے ہوئے) تم ہو قباد ——— گولندازوں کے ہاں منڈلانے والے ——— !

خواجہ قباد : جی ! میں ہی ہوں ——— وہ قباد ۔

کوچک سلطان : ہوں ——— تو گویا تم زندہ ہو ——— تمھارا گھاؤ ابھی تک رس رہا ہے ۔
(خوش ہو کر) لیکن ——— نہیں ——— تم زندہ نہیں ہو ، واللہ کیا صورت نکالی ہے ۔

(ہنستا ہے)

آخر تم نے میرا کہنا مان ہی لیا ، کیا سعادت ہے !

خواجہ قباد : ہاں نواب صاحب ! مان لیا ——— لیکن .... لیکن ...... آہ ..... لیجئے

پرسمو سہ گلوری!

کوچک سلطان: شکریہ! تم کتنے اچھے دکھائی دیتے ہو قباد — میں نے کہا تھا کہ اپنی شکست کا بدلہ لوں گا۔ سو میں نے لے لیا ہے۔

خواجہ قباد: اس کے لیے بندی شکریہ ادا کرتی ہے۔

کاؤس شاہ: ارے بابا تم کن ذاتیات میں پڑ گئے ہو۔

ثالث زمانی: اب سنو گے بھی اپنی دل پسند چیز — !

کاؤس شاہ: ارے بھائی وہ گاؤ۔

اے نمک پاش خدا کے لیے چٹکی بھر کے
کوئی دم اور تڑپنے کا مزا لینے دے

ثالث زمانی: ہاں، ہاں — کچھ تو ہاتھوں میں مرے دو حنا رہنے دے — اور اس کے متعلق کیا خیال ہے۔ علاج تشنگی کے شوق آتش عشق

ننھی بیگم: یوں فیصلہ نہیں ہو سکے گا۔ اچھا ہے کاشفہ کو وہی چیز گانے کے لیے دی جائے جو اس نے اپنی مرضی سے تیار کی ہے۔

داروغنی: (داخل ہوتے ہوئے) حضور لیجیے، نئی گلوری —

کاؤس شاہ: تمباکو کافی ہے — داروغنی —

داروغنی: سرکار!

ثالث زمانی کاؤس شاہ: سازندے ہیں نا — ؟

داروغنی: یہی دروازے کے پاس حکم کے منتظر کھڑے ہیں۔

کاؤس شاہ: بھیج دو اندر اور سنو — دروازہ بند کر دو۔

داروغنی: بہت اچھا سرکار! — (جاتی ہے)

کوچک سلطان: (ہنستے ہوئے) خواجہ قباد — خواجہ قباد — !

کاؤس شاہ: کاشفہ! اب کہو گی بھی کچھ —— سازندے آ گئے۔

اُڑوا بیگم: بجو ارشاد —— (گاتی ہے)

ساقی نظرے بہ بیکساں بہر خدا

بشکن بُت بوالہوساں بہر خدا

(پہلے مصرعہ کی ادائیگی میں اتنی التجا ہے کہ کوچک سلطان اسے سُن کر بے خود ہو جاتے ہیں اور داد میں سر دُھننے لگتے ہیں۔)

کوچک سلطان: واہ وا —— حالت غیر کردی —— کاشفہ —— واہ ——

اُڑوا بیگم: گاتے ہوئے۔

ساقی نظرے بہ بیکساں بہر خدا

بشکن بُت بوالہوساں بہر خدا

ما ماہیِ مردہ ایم و تو آبِ حیات

مارا بوصالِ خود رساں بہر خدا

(کچھ دیر سب بے خود و اضطراب رہتے ہیں —— گویا گانے کی اس سے بڑی تعریف نہیں کر سکتے)

کوچک سلطان: واہ وا —— واہ ہی واہ —— کیا میٹھا گانا تھا۔ سفر کی تھکان جاتی رہی۔

کاؤس شاہ: خدا قسم! کیا گلا پایا ہے —— اور بول کیا نرے نشتر تھے۔

ننھی بیگم: نشتر؟ —— اوہو! نشتر ہی تھے کہیں۔

کاؤس شاہ: جانے ننھی بیگم خود بہت اچھا گاتی ہیں۔

ننھی بیگم: نہیں یہ تو نہیں لیکن نشتر۔

کاؤس شاہ: ہاں چھوڑو اس کو اب۔

ثالث زمانی: بھئی اب چلا جائے —— کھانے میں دیر ہو رہی ہے۔ داروغنی کب سے منتظر

ہے بے چاری۔

کاؤس شاہ: چلو چلیں!

ننھی بیگم: ہاں بھئی، اب بہت دیر ہو گئی ــــ اٹھو، لو کوچک میاں یہ ہمارے رشتے کی انگوٹھی ہے تم نہیں چلو گے کیا؟

کوچک سلطان: انگوٹھی کے لیے شکریہ آپا ــــ اس پر کیا لکھا ہے ــــ شبیر بنگلہ (کھسیانی سی ہنسی ہنستے ہوئے) جی کہاں آپا ــــ میں اس خطاب کا سزاوار نہیں ہوں۔ اور ہاں میں کھانے پر بھی نہیں جا سکتا۔ ذرا آرام کروں گا ــــ کاشفہ مجھے کوئی ہلکا پھلکا گانا گا کر سلا دے گی، اور قباد ــــ بی قباد ــــ تم بھی یہیں ٹھہرو۔

(باقی سب چلے جاتے ہیں)

کوچک سلطان: سناؤ بھائی قباد! اب تم بتاؤ شکست تمہاری ہوئی یا میری؟

خواجہ قباد: اے حضور، شکست ہمیشہ ہم غلاموں ہی کی ہوتی ہے۔

اُڑوا بیگنی: نواب صاحب! خدارا یوں بات نہ کیجیے، قباد آپ کی ہاں میں ہاں ملاتے چلا جائے گا جو کچھ کہ وہ کر رہا ہے اور جو کچھ کہ وہ کر چکا ہے اس کی نوعیت قباد خود بھی سمجھنے سے قاصر ہے۔

خواجہ قباد: اے ہے تم کیا کہہ رہی ہو کاشفہ ــــ جیسے میں بچہ ہی تو ہوتی ہوں۔

کوچک سلطان: (احساس فتح مندی سے) میں کاشفہ سے محبت کرتا تھا اور تم بھی کاشفہ سے محبت کرتے تھے، ہمارے دونوں کے درمیان ایک ہی بات مشترک تھی ــــ اس لیے تمہیں اس بات کا فخر بھی حاصل ہوسکا کہ میرے ساتھ بات کر پاؤ ــــ میں نے تمہاری حوصلہ افزائی کی ــــ اور تمہیں کاشفہ کے قریب ہونے کا طریقہ بتا دیا۔

(ہنستا ہے)

اب تم کاشفہ کے کس قدر قریب ہو گئے ہو ـــــــ کس قدر قریب !

خواجہ قباد : کاش میں قریب نہ ہوتی ـــــــ بالکل کاشفہ ہو جاتی لیکن ـــــــ

نواب کوچک : (قہقہہ لگاتا ہے) ہا ہا ہا ہا ـــــــ

اُڑدا بیگنی : (بلند آواز سے) خاموش ! نوابصاحب ـــــــ آپ کو ندامت سے سر جھکا دینا چاہیئے۔

(مرزا کوچک پر کٹوری پھینکتی ہے جو فانوس سے بچتی ہوئی نیچے گر جاتی ہے)

نواب کوچک : اُف ـــــــ لیکن بچ گیا۔ اتنی جرأت کاشفہ ـــــــ بیس ہزار کا فانوس توڑنے لگی تھیں۔

اُڑدا بیگنی : (غصے سے) اب قباد میں مرد کے حسد اور مرد کے انتقام کو بھول کر آپ قہقہے لگاتے ہیں وہ دن یاد نہیں جب آپ کا عمامۂ مبارک قباد کے ہاتھوں بدر روؤں میں لڑھک رہا تھا ـــــــ آپ اسے ذلیل کرتے ہیں اب جسے آپنے مرد بھی نہیں رہنے دیا ـــــــ اور جو نہ عورت ہے ! کاش آپ کسی مرد سے ہی باتیں کرتے تو وہ اس بپھرے ہوئے شیر بنگلہ کو ردّ یا و اودھ میں تبدیل کر دیتا۔ آپ کسی عورت سے باتیں کرتے تو وہ آپ کو ڈوپٹہ اُڑھا کر گڑی پر بٹھا بھیجتی۔

مرزائے کوچک : (بلند آواز میں) کاشفہ ! تم ایک دو پیسے کی چھوکری ایسے منھ کو آتی ہو ـــــــ۔

اُڑدا بیگنی : معاف کیجیئے ـــــــ آپ کی طرح کسی بہن کی بدولت دوشالے نہیں پھڑکاتی پھرتی ....
اور جب ایک دو پیسے کی چھوکری کو منھ لگایا جاتا ہے تو وہ آپ کی والدہ مرحومہ سے زیادہ ذی وجاہت ہو جاتی ہے۔

مرزائے کوچک : ہوں ! ـــــــ میں اپنی دانست میں قباد کو مار چکا تھا۔ لیکن اب دیکھتا ہوں قباد مرا نہیں ـــــــ قباد اُڑدا بیگنی کے دل میں بدستور زندہ ہے۔

خواجہ قباد : (خواجہ سرایانہ انداز میں) اجی حضور ! خفا نہ ہوجئے ـــــــ کیا کبھی بے لوث محبت بھی فنا ہوتی ہے۔

مرزائے کوچک : (دانت پیستے ہوئے) بے لوث محبت ! (بلند آواز سے ہنستا ہے) (طنزاً) اور کاشفہ کتنی حسرت سے گاتی ہے ۔

مارا بوصال خود رساں بہر خدا

اژدا بیگمی : (خجل ہوکر) اس کا یہ مطلب نہیں کہ ——— "

مرزائے کوچک : چھ دن کی تیاریاں ——— اور اس کا یہ مطلب نہیں !میں نے تمھارے دل کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھ لیا ہے کاشفہ اب تم مجھ سے نہیں چھپ سکتیں ، اگر ابھی تک قباد میرے راستے میں حائل ہے تو میں اسے جلا دوں گا ، راکھ کر دوں گا ۔

(اٹھتا ہے اور تیزی سے قباد کو مارنے کیلئے دوڑتا ہے)

خواجہ قباد : اسے خدا کے لیے مجھے بچاؤ ، کاشفہ بی ——— خدا کے لیے —— رسول کریمؐ کے لیے ۔

اژدا بیگمی : یہ خونی پنجہ مجھ پہ اٹھے کوچک میاں ——— پھر قباد کو ہاتھ لگانا ——— میرے پیچھے ہو جاؤ قباد ۔ تمھارا کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکے گا ۔ پہلے میری آنتیں باہر آئیں گی پہلے میں دو نیم ہو جاؤں گی اور پھر مرزائے کوچک کی "ذوالفقار" تمہیں چھوئے گی ۔

(قباد ہانپنے لگتا ہے اور اس کی "للہ للہ" کی آوازیں سنائی دیتی ہیں

——— شور سن کر نواب ثالث زمانی بیگم داخل ہوتی ہیں)

ثالث زمانی : کوچک میاں ——— شبیر بنگلہ : تمہیں عورت پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے شرم نہیں آتی ——— ؟

کوچک سلطان : عورت نہیں آپا جان ! یہ وہ مردود ہے جو عورت کی پناہ لے رہا ہے ——— ——— قباد !

ثالث زمانی : یہ اور بھی باعث ننگ ہے ۔ آج بنگلہ سے لوٹتے ہوئے تمھارے یہ اقدام ہوں کہ خواجہ سرا پر ہاتھ اٹھاؤ ——— کیا یہ کوچک سلطان کی شان کے شایان ہے ؟ چل اٹھ

خانصہ! میرے ساتھ چل ——— "

(باہر نکل جاتے ہیں)

خواجہ قباد : کاشفہ! میں تمہارا کتنا ممنون ہوں —— کتنا م ——— "

اُزوابیگم : چل ہٹ میں تمہارا منھ دیکھنا نہیں چاہتی ——— "

خواجہ قباد : کاشفہ ——— کیوں ، تم نے اپنی زندگی کو جوکھم میں ڈال کر مجھے بچایا —— اب میرا منھ دیکھنا نہیں چاہتیں —— کاشفہ ——— "

اُزوابیگم : چلی جاؤ ——— جاؤ ، بی قباد —— مجھے تم سے نفرت ہے ۔

پردہ

○

تیسرا منظر

(محلسرا کا ایک اور کمرہ قریب قریب ایسا ہی جیسا دوسرے منظر میں نظر آتا ہے۔ ایک لونڈی گا رہی ہے)

دل کہے ہے کہ مجھے روزنِ سینہ سے نکال ورنہ خوں ہو کے میں آنکھوں سے نکل جاؤں گا

گر پڑا آگ میں پروانہ دمِ گرمیِ شوق سمجھا اتنا بھی نہ کمبخت کہ جل جاؤں گا

کاؤس شاہ (دہراتے ہوئے) سمجھا اتنا بھی نہ کمبخت کہ جل جاؤں گا —— واہ!

ننھی بیگم: کیا خوب غزل ہے۔

(خواجہ قباد دوڑتا ہوا آتا ہے)

خواجہ قباد: بیگم —— بیگم —— اے قبلہ نواب صاحب!

ثالث: ہائی۔ کیا ہے بی قباد؟

ننھی بیگم: کیا ہے بی قباد؟

کاؤس شاہ: اری کیا ہوا؟

خواجہ قباد: اجی سرکار! داروغنی سے پوچھئے —— نیر صلا والی سے —— آپ سے بتاؤں عرض کرتی ہے —— ہائے آگ لگے ایسی جوانی کو —— موئی جوانی

نواب کاؤس شاہ: اری کچھ کہے گی بی؟

ننھی بیگم: کیا ہوا جوانی کو —— جو اُسے کوسنے دینے جا رہی ہو۔

خواجہ قباد: اے بیگم کیا بتاؤں —— کاشفہ بی دروازے میں کھڑی تھی —— کہہ رہی تھی —— اب آپ سے کیا چھپاؤں —— اب جبکہ کاشفہ بالکل مرنے کے قریب ہے تو آپ کیا کہیں گے اجی وہ کہتی ہی تھی قباد مجھے تم سے عشق ہے

کاؤس شاہ : تبھی تو مرنے چلی ہے ——

ثالث زمانی : خواجہ قباد سے محبت ہے —— اُڑوا بیگمی کاشفہ کو ——

(ہنستے ہیں)

کاؤس شاہ : کاشفہ کی سی پری کو دیوزاد قباد سے محبت ہے، تو گویا یہ دیو پری کا قصہ ہے

(ہنستے ہیں)

ثالث زمانی : اور درمیان میں آدم بُو ——

ننھی بیگم : جیسے ہُمو آ لکھی بنا کر دیوار پر چپکا دیا جاتا ہے

ثالث زمانی : بیگم لکھی نہیں ——

خواجہ قباد (بدستور ہانپتے ہوئے) جی نہیں —— اُسے محبت ہے، یہ لو تسامحبت !

(سب ہنستے ہیں)

خواجہ قباد : عرض کیا حضور —— اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے، ہمیں بچپن ہی سے ایک دوسرے سے محبت ہے ہم ازلکوں کے احاطے میں اکٹھے کھیلے، کھٹے پیٹھے اور پل کر جوان ہوئے ابھی کاشفہ پیدا بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ میری ہو چکی تھی ۔

(سب کھُل کر ہنستے ہیں)

نواب ثالث زمانی : ہیں ٹھیک ہے، اب تو تم قبر میں جاؤ تو پھر شادی ہو جائے گی ۔

خواجہ قباد : اے سرکار —— اجازت ہو تو کہوں —— کاشفہ کی ماں نے کہا تھا میری ماں کو —— اگر لڑکی پیدا ہوئی تو تمہارے قباد کو دے دوں گی اور اگر لڑکا ہوا تو پیر غضنفر کے مجاوروں کے حوالے کر دوں گی ۔ —— لیکن یہ قصے لمبے ہیں، یہ باتیں پھر ہو جائیں گی —— حضور ! کاشفہ سے باتیں کرتے ہوئے نواب کو چک کا ذکر آیا —— تو جانے وہ کیا ہوا —— غشی آ جاتی ہے تو دھم سے نیچے آ رہتی ہیں ۔

کاؤس شاہ : اد ہو، تو شاہی طبیب کو کیوں نہیں بلایا ؟

خواجہ قباد : عرض بندی کی یہ ہے کہ حکم نہ تھا سرکار کا !

کاؤس شاہ : جاؤ کاشفہ کو یہاں لے آؤ۔ —— ٹھاکر جلدی سے —— اور دارو غنی یا باریدانی جو کوئی بھی نظر پڑتی ہے اُسے کہو کہ شاہی طبیب کو بلا لائے۔ اب تو حکم ٹھیک سے ہے —— ؟

خواجہ قباد : جی جی ! حضور بجا فرماتے ہیں۔ خدا آپ کا اقبال بلند کرے، خدا آپ —— (جاتا ہے)

کاؤس شاہ : یہ بات کیا ہوئی آخر ؟

ننھی بیگم : آنکھوں سے دیکھے انسان تو صاف پتہ چلتا ہے۔

ثالث زمانی : تمہاری آنکھوں میں کیا چھٹا پڑ گیا ہے ؟ —— اور میری طرف کیوں دیکھتی ہو۔

ننھی بیگم : اس سے تو صاف کہہ دو تو اچھا ہے۔

کاؤس شاہ : ارے بھئی آپس میں کیا راز داری ہے !

ننھی بیگم : میں کوئی دشمنی کی نہیں کہتی۔ بھلے کی ہی کہتی ہوں تاکہ معاملہ بہت دُور جانے سے پہلے ہی تم لوگوں کے کان ہو جائیں —— کوچک میاں کو اُڑوا بیگنی کاشفہ سے محبت ہے۔

ثالث زمانی : دیکھو الٹی بات تو نہ کرو —— چاند پرست تھوکو۔ کہے دیتی ہوں، کاشفہ کو کوچک سے کوئی بات ہو گی، کوچک میاں کی پروا کرتی ہے بیزار ——

کاؤس شاہ : ہیں ! ایک اُڑوا بیگنی کو اتنی جرأت کہ کوچک میاں سے آنکھیں لڑائے۔

ننھی بیگم : چھنال ! اور کٹنیوں کے ذریعے نامہ و پیام ہوتے ہیں۔ کاشفہ کی بوڑھی ڈہڈھوال کی پانچوں گھی میں رہی ہیں۔ پچھلے دنوں —— اسے بڑی فضیحتا ہے وہ دلالہ ——

کاؤس شاہ : (بلند آواز سے) بیگم چراغ تلے اندھیرا۔ تم میں سے کسی نے بات بھی نہیں کی سو رہی تھیں کیا —— ؟

ننھی بیگم : اے گویا آپ میری باتیں سنتے ہیں۔

کاؤس شاہ: کوچک میاں کے تحفے دُرست کر دیے ہوتے ——

ننھی بیگم: وہ ثالث کے بھائی ہیں۔

کاؤس شاہ: (زیادہ خفا ہو کر) کاشفہ کو محل بدر کر دیا ہوتا ——

ننھی بیگم: وُہ کوچک میاں کی محبوبہ ہے۔

ثالث زمانی: پھر وہی بات ننھی بیگم ——

—— قدموں کی چاپ —— (کوچک میاں بھاگتے ہوئے داخل ہوتے ہیں)

مرزا کوچک سلطان: (ہانپتے ہوئے) کاؤس بھائی، کاؤس بھائی —— میں آپ سے ایک بات کہنے آیا ہوں، گردن زدنی ٹھہراؤ یا کچھ اور —— میں بلا تمہید کہتا ہوں، مجھے کاشفہ اُردا بیگنی سے محبت ہے۔ ——

ننھی بیگم: یہ رہا تمہارا چاند —— ثالث زمانی بیگم!

ثالث زمانی: توبہ نہیں ہو سکتا —— کاشفہ نے کوئی تعویذ پلا دیا ہو گا۔

کاؤس شاہ: تمہیں کاشفہ سے محبت ہے؟

ثالث زمانی: تمہیں کاشفہ سے ——!

کوچک سلطان: محبت ہے!

کاؤس شاہ: (بلند آواز میں) کہیں تمہارا سر تو نہیں پھر گیا کوچک میاں؟

کوچک سلطان: (بدستور گھبرائے ہوئے) میں کیا کہہ رہا ہوں یہ میں خود بھی نہیں جانتا —— للہ اُسے بچا لیجے —— وہ نولکھے کے قریب بے ہوش پڑی ہے۔ للہ ——

(اِس اثنا میں خواجہ قباد ہانپتا ہُوا آتا ہے)

خواجہ قباد: یہ ہے کاشفہ! —— اے حضور، اسے کسی طرح ہوش میں لائیے، ہائے میں لُٹ گیٔ ——

نواب ثالث زمانی: داروغنی ——

داروغنی : جی سرکار !

ثالث زمانی : جاتو ذرا طاقچی پر سے وہ مُرادآبادی ڈبیا لے آ، اس میں لخلخہ ہے بہن نغمی ——— تو اُٹھ ——— داروغنی کی بینائی کمزور ہے ذرا۔

(نغمی بیگم جاتی ہے)

کاؤس شاہ : اس کے ہات اندر کو مڑے ہوئے ہیں۔

کوچک سلطان : (بدحواسی میں) دانت بھنچے ہوئے ہیں۔

ثالث زمانی : ہائے ہائے، کتنی گلفام تھی ——— اب منہ پر سیپروں ہلدی بکھر رہی ہے۔

نغمی بیگم : (آتے ہوئے) اس کی ماں کو اطلاع دے دو، ہائے ہائے! پھول ایسی بیٹی ہاتھوں سے جارہی ہے۔

کاؤس شاہ : ہاں ہاں! داروغنی جاؤ ——— دیکھتی کیا ہو ؟

داروغنی : جاتی ہوں سرکار !

خواجہ قباد : ہائے ہائے ——— میری عُمر بھر کی کمائی ———

کوچک سلطان : جلدی کرو ——— جلدی کرو ——— کوئی نہیں آتا ———

نغمی بیگم : یہ لیجئے لخلخہ ——— اور بید مشک ——— اور نہ جانے کیا کیا ہے اس میں دیکھ لے ثالث

ثالث زمانی : روئی کا ایک پھاہا چاہیئے۔

کوچک سلطان : اس وقت روئی کہاں سے ملیگی ؟ اس لحاف میں شگاف کر لیجئے۔

نغمی بیگم : کوچک بھائی ! دیکھنا میرا ایرانی لحاف ہے !

کوچک سلطان : آپا! مجھ سے دوگنی، سہ گنی قیمت وصول کر لینا۔ کاشفہ بچ جائے کسی طرح ——— ——— کسی طرح ———

نغمی بیگم : قیمت کی کوئی بات نہیں کوچک میاں ——— ایرانی لحاف، روز روز تھوڑے ہی آتے ہیں ———

کوچک سلطان : اُف آپا! تمھیں لحاف کی پڑی ہے ——— —

ننھی بیگم : اوہو! یہ تو میں بھول ہی گئی تھی کہ اب کوچک میاں کی وجہ سے یہ آڑوا بیگنی ایک بیگم کا مرتبہ رکھتی ہے ——— کیوں نہ ہو، ایرانی نژاد خاتون ہے۔

کوچک سلطان : تم عورتوں کو اپنی جنس کے لیے ذرا بھی ہمدردی نہیں ہوتی ——— آپا معاف کیجئے گا، اگر آپ کو یہ الفاظ ناگوار گذریں تو ———

ننھی بیگم : کہہ دو --- کہہ دو ——— ناگوار گذرتے ہیں تو تمھیں اس سے کیا، اپنی جنس کے لیے ہمدردی ہم نے تم ایسے مردوں کو سونپ رکھی ہے۔

کوچک سلطان : اللہ! طعنوں کے لیے کوئی اور موقع رکھنا ——— تم بھی کنوئیں میں پڑے ہوئے ماجرے پر نہ پھپکنے نکلیں

کاؤس شاہ : تمام ہوش! کیا شور مچا رکھا ہے۔ ——— کاشفہ کو ہوش میں تو آنے دو۔ ہوا چھوڑ دو ——— ہوا چھوڑ دو ———

(کاشفہ کی چیخ سنائی دیتی ہے)

آڑوا بیگنی : ہائے ہائے، میں کہاں ہوں ———؟ قباد ——— میرے قباد ———

(ادھر اُدھر دیکھ کر) بی قباد ———

ثالث زمانی : ہاتھ سیدھے ہو گئے ہیں ———

ننھی بیگم : دانت بھی کھل رہے ہیں

ثالث زمانی : دیکھو قباد کا ہی نام لیتی ہے ———۔ بی قباد ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی

قباد : پنکھا کہاں ہے، اوہ ——— جل تو جلال تو ———

ننھی بیگم : رنگ آرہا ہے منھ پر واپس ———

ثالث زمانی : ہاں آ تو رہا ہے

آڑوا بیگنی : چھوڑ دیجئے ——— چھوڑ دیجئے ——— ———

داروغنی : حضور شاہی طبیب آئے ہیں ——— پردے میں ہو جائیں ———

کاؤس شاہ : تم سب پردے میں ہو جاؤ ——— وہاں داروغنی، بابا طاہر کو فوراً اندر لے آؤ۔

(بیگمات کے اِدھر اُدھر ہو جانے کے بعد شاہی طبیب آتے ہیں)

شاہی طبیب : حضور پُرنُور ——— رعایا آداب و تسلیمات عرض کرتی ہے۔

مرزا کوچک : بابا طاہر خدا کے لیے ان آداب و رسوم کو چھوڑ کر اس عورت کی جان بچائیے۔

——— للہ ———

شاہی طبیب : کس کی جان بچاؤں؟

مرزا کوچک : محل کی اِک وابستگی کی

شاہی طبیب : بہ بیچیے دعا گا ——— ان کی نبض پر لپیٹ کر اِک سرا مجھے دیجیے گا۔

کاؤس شاہ : لیجیے۔

(کاشفہ کراہتی ہے)

شاہی طبیب : پہلے انھیں کیا شکایت ہوئی؟

خواجہ سرا : کچھ بھی نہیں حکیم صاحب! ——— یوں ہی کھڑی کھڑی اِک دم پیچھے آ رہیں اور ہات پاؤں اندر کو مڑ گئے، نسیں تن گئیں، دانت بھنچ گئے ——— اور منھ پر سیروں ہلدی بکھر گئی۔

شاہی طبیب : ہوں! (وقفہ) اب ان سے پوچھئے کیسے محسوس ہوتا ہے۔

خواجہ سرا : کہہ رہی ہیں دشمنوں کا جسم پھٹا جاتا ہے۔

شاہی طبیب : کچھ اور تکلیف ہے؟

خواجہ سرا : کہہ رہی ہیں۔ دشمنوں کے ہات پاؤں بوجھل ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ——— سب کچھ پھولا ہوا دکھائی دیتا ہے ——— اور اعضا کھنچے ہوئے ہیں ——— جی چاہتا ہے کہ اِک بازو کے دو بازو ہو جائیں ——— اِک منھ کے دو منھ ——— اور نہ جانے کیا ہو رہا ہے ———

شاہی طبیب : ان سے پوچھئے کہیں متلی تو نہیں محسوس ہوتی ؟

خواجہ سرا : اسے ہے متلی کا ہے کو محسوس ہونے لگی ——— کہہ رہی ہیں کہ نہیں !

شاہی طبیب : نواب صاحب ——— آپ ذرا اندر تشریف لائیے ——— میں تخلیہ میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں

نواب کاؤس شاہ : فرمائیے بابا طاہر ———

شاہی طبیب : (آہستہ سے) جان کی امان پاؤں تو ایک سوال پوچھ سکتا ہوں ؟ کیا انھیں کسی سے محبت تو نہیں ہے ؟

نواب کاؤس شاہ : آ ——— م ——— ن ——— نہیں تو ———

شاہی طبیب : میرا مطلب ہے ——— محبت کا ہیجانی جذبہ اس عورت میں شدت سے بیدار ہو چکا ہے ——— اس کی شادی کر دیجئے ۔

پردہ

○

چوتھا منظر

(وہی جو دوسرے منظر میں ہے ۔ نواب ثالث زمانی بیگم ایک گاؤ تکیے پر بازو رکھے اپنا منھ چھپائے ہچکیاں لیتی ہوئی نظر آتی ہیں ۔ قریب کوچک سلطان بیٹھے ہیں ۔ ان کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں جیسے آپا جان کو منانے کی کوشش کر رہے ہوں)

نواب ثالث زمانی : میں نے تو سب امیدیں تمھیں پر لگا رکھی تھیں کوچک میاں ۔

کوچک سلطان : اور میں آپ کی کون سی امیدوں پر پورا نہیں اترا ۔ بنگلہ میں نے تمھارے کہنے پر فتح کیا ! (آہستہ آواز میں) تخت و تاج تمھارے قبضے میں رکھنے کے لیے میں نے خواجہ سراؤں سے اور منصب داروں سے سازشیں کیں ۔ تمھارے حقوق کو بچانے کے لیے میں نے تخت کے وارث کو گولکنڈہ کی طرف بھجوا دیا ہے ، دکن ایک ایسی جنگی دلدل ہے جس میں پھنس کر کوئی مشکل ہی سے نکلتا ہے ۔

نواب ثالث زمانی : یہ تو ٹھیک ہے ، کوچک میاں ، لیکن اتنا وقار ، اتنی وجاہت حاصل کرنے کا یہ عبرتناک انجام کہ تو شاہی خاندان سے باہر ایک اڑدابیگنی سے محبت کرے ـــــ شرافت محل کی قمر النسا میں کیا کمی ہے ـــــ تم میری جگ ہنسائی کروا رہے ہو ۔ اس دن جبکہ تم پر کاشفہ سے محبت کا الزام لگ رہا تھا تو میں نخفی بیگم سے کہہ رہی تھی کہ تم چاند پر تھوک رہی ہو ـــــ

کوچک سلطان : (التجا آمیز لہجے میں) یہ ایک ایسی بات ہے جس میں میں بالکل بے دست و پا ہوں ۔ میں ہفت اقلیم کی بادشاہت حاصل کر سکتا ہوں ۔ لیکن کاشفہ کی محبت کو نہیں چھوڑ سکتا ـــــ میں خود نہیں جانتا ، آپا ! مجھے کیا ہو گیا ہے ، میرے جسم کا رُواں رُواں اس اتصال کا قائل ہے ـــــ آپا !

نواب ثالث زمانی : اور پھر سوچو تو سہی کہ کاشفہ کو کسی زمانے میں قباد سے محبت تھی۔
کوچک سلطان : اس قصرِ محبت کے ستون عرصہ ہوا منہدم ہو چکے ہیں۔
ثالث زمانی : خواجہ قباد نے کاشفہ کے لیے جو قربانی کی ہے اس کا جواب وہ قربانی سے دینا چاہتی ہے
کوچک سلطان : مجھ سے یہ بات نہ کہو آپا ——— للہ مجھے ایک اُڑوا بیگنی سے محبت کرنے
پر ملامت نہ کرو، عشق ار چہ بلاست آں بلا حکم خداست، بر حکم خدا ملامتِ خلق چرا ست ؟
ثالث زمانی : ان سب باتوں کو میں اچھی طرح جانتی ہوں، کوچک میاں ! کاشفہ خواجہ سرا قباد سے اور تمھیں
بیک وقت محبت بھی کرتی ہے اور نفرت بھی، خواجہ سرا قباد کی قربانی کی وہ معترف ہے، لیکن
قباد کاشفہ کی محبت کے اہل نہیں ——— تم اس کی محبت کے اہل ہو لیکن خواجہ قباد کے
ساتھ جو کچھ تم نے کیا ہے، وہ کاشفہ کے دل سے دھوئے نہیں دُھلے گا۔
کوچک مرزا : یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو آپا ——— مجھے اس بات کا ثبوت دو، مجھ میں اصل کوچک مرزا
بیدار ہو رہا ہے مجھے جلدی بتا دو، نہیں تو میرے غصّے کی آگ میں یہ محل، یہ خواجہ سرا یہ کاؤس شاہ
اور بلند بخت یہ شرافت محل اور ننھی بیگم ——— یہ اُڑوا بیگنی سب جل جائیں گے۔
ثالث زمانی : تو سنو جس دن تم قباد کو تحت الثریٰ پہنچانے کے لیے تیار ہو رہے تھے تو کاشفہ
نے قباد سے محبت کی پاسداری کی اور اپنی اوٹ دے کر اُسے بچا لیا اور جب اُس نے قربانی کا شکریہ
ادا کیا تو اس نے نفرت سے کہا ——— پیچھے ہٹ جاؤ قباد ! مجھے تم سے نفرت ہے۔
کوچک مرزا : گویا قباد کی جان بچا کر کاشفہ ——— اس کی قربانی کا جواب قربانی سے دے چکی ہے۔
ثالث زمانی : ہرگز نہیں ——— وہ جانتی ہے کہ اگر قباد مرد ہوتا تو اس کے پیچھے نہ چھپتا۔
وہ تمھاری شجاعت کی معترف ہوتے ہوئے تم سے نفرت کرتی ہے کہ تم نے قباد میں مرد کو فنا
کرتے ہوئے اپنی کم ظرفی کا ثبوت دیا ہے۔ اور اگر قباد اس قسم کی حرکتیں کرتا ہے تو یہ اس کے بس
کا روگ نہیں بیماری کے دنوں میں قباد نے اس کی بہت خدمت کی۔ لیکن اس کی موتیوں کی مالا ٹھکرا
کر کاشفہ نے تمھاری مونگے کی مالا پہن لی اور تم خوش ہوئے ——— لیکن جب تصفیہ کا

موقع آیا تو اُس نے تمھیں مات دینے سے انکار کر دیا ۔۔۔۔ یہ سب کچھ میں جھروکے میں سے
دیکھ رہی تھی ۔

کوچک مرزا : کیا عجب ہے آیا ۔۔۔۔ وہ ابھی تک ڈرتی ہو آپا ۔۔۔۔ اچھی آپا ۔۔۔۔ اس
طلسم کو بنا رہنے دو ۔۔۔۔ میں اپنے سامری کے اور ناٹک دیکھنا چاہتا ہوں ۔۔۔
میں اتنی حقیقت جاننا نہیں چاہتا ۔۔۔۔

(محل میں شور سنائی دیتا ہے اور داروغنی آتی ہے)

داروغنی : نواب صاحب ۔۔۔۔ نواب صاحب !

نواب ثالث زمانی : کیا بات ہے داروغنی جی ؟

داروغنی : محل میں لامبہ سلطان، قمر النسا، اور شرافت محل کی ڈولیاں آ رہی ہیں اور اُٹڑوا بیگمی محل میں نہیں ہے ۔

کوچک مرزا : (چلّا کر) کاشف بیتقع کے لیے نہیں ہے ؟

داروغنی : جی نہیں ہے ۔

نواب ثالث زمانی : داروغنی ۔۔۔۔ کسی بار برداری کو پکڑ لو اور اُسے کیانی اچکن اور انگرکھا پہنا دو ۔

داروغنی : لیکن ۔۔۔۔

نواب ثالث زمانی : لیکن کیا ؟

داروغنی : اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں ۔

کوچک سلطان و نواب ثالث زمانی : کہو جلدی کہو ۔

داروغنی : نواب صاحب پچاس سال سے ہم نے اس گھر کا نمک کھایا ہے اور اس کے ہی خواہ ہیں اس خاندان
ذی مرتبت کی خاطر میری دادی نے اپنی جان تک قربان کر دی تھی اور میں بھی اگر ضرورت پڑے تو جان
تک دینے کو تیار ہوں ۔ ۔۔۔۔ بات یہ ہے کہ اس معاشقے کی بدولت محلوں کی بدنامی ہو
رہی ہے ۔ شہر میں لوگ چہ میگوئیاں کر رہے ہیں ۔

نواب ثالث زمانی : (غصے سے) تمھیں اس سے غرض ۔۔۔۔ ؟ تمھاری آنکھیں نہیں کیا ؟

ست منہ لگو ہے —— جاؤ کسی باریدارنی سے تنقیح کروالو۔

داروغہ : جو حکم حضور ——— (جاتی ہے)

نواب ثالث زمانی : (روتے ہوئے) تم نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا کوچک میاں۔

کوچک سلطان : کاشفہ چلی گئی —— کاشفہ نے خودکشی کر لی، یہ نہیں ہو سکتا۔ —— یہ نہیں ہو سکتا میری کاشفہ —— اگر کاشفہ مر گئی تو اس کا خون تم لوگوں کی گردن پر ہوگا۔

(نواب ننھی بیگم داخل ہوتی ہیں)

کوچک سلطان : آپا چلی جاؤ —— مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ رستے زخموں پر زیادہ نمک نہ چھڑکو۔ میں کاشفہ کو سمندر کی تہ سے لاؤں گا، پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے تلاش کروں گا۔

ننھی بیگم : سمندر کی تہوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر جانے کی ضرورت ہی کیا ہے ——— کاشفہ شہر میں خلجی سردار کے ہاں دیکھی گئی ہے۔

کوچک سلطان : (چونک کر) کون خلجی سردار؟

ننھی بیگم : قولیش ——— وہ سردار قولیش کے ساتھ چلی گئی ہے۔ باریدارنیوں نے اُسے سردار کے ساتھ دیکھا تھا۔

کوچک سلطان : کاشفہ وہاں کیسے پہنچ گئی۔

ننھی بیگم : پہنچ گئی —— محل کی عزت و افتخار کو لات مار گئی۔ ایسے میں محلوں کی دیواریں راہ میں حائل نہیں ہو سکتیں، اس نے سردار قولیش کو صرف ایک دو بار دیکھا اور فوراً اُس کے دماغ نے فیصلہ کر لیا کہ اس کے مقدر میں جو کچھ لکھا تھا، قولیش سردار اس کا باپ ہوگا۔

کوچک سلطان : آپا —— آپا جان —— یہ نہیں ہونے کا، جب تک مرزا کوچک زندہ ہے۔

ثالث زمانی : دیکھا اپنی محبت کا عبرتناک انجام؟ —— کہاں جاتے ہو کوچک؟ —— رک جاؤ قولیش سردار تم سے کہیں طاقتور ہے کوچک، تھم جاؤ۔

(ثالث زمانی اور ننھی بیگم کوچک میاں کو پکڑنے کی کوشش کرتی ہیں)

ننھی بیگم : وہاں مت جاؤ ــــــ کوچک بھائی ــــــ مت جاؤ ، خدا کے لیے ــ ــ !

کوچک سلطان : کوچک سلطان ایسی بات کی تاب نہیں لا سکتا۔ کوئی بھی مرد ایسی بات برداشت نہیں کر سکتا۔ آپا جان ، مجھے چھوڑ دو ــ چھوڑ دو ــ مر جاؤں گا ، زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا نا ــ مجھے جانے دو ــــــ جانے دو ــــــ

(بہت شور برپا ہوتا ہے ، دروازے کھلتے اور بند ہوتے ہیں اور مرزا سے کوچک بھاگ جاتے ہیں)

ثالث زمانی : بھاگ گیا ــــــ آہ ننھی بہن ۔ تو نے نہ بتایا ہوتا تو کوچک کو نہیں جانتی کیا ؛ نہیں جانتی تھی کیا ــــــ اب انھیں خبر کر دو ــــــ جلدی سے نہیں تو ــــــ

ننھی بیگم : میں اس ارادے سے آئی تھی کہ کاشفہ کی بے وفائی کے متعلق سن کر کوچک سلطان اپنے ارادے کو ترک کر دے اور محلوں کے متعلق جو چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں ، وہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں۔

ثالث زمانی : تم نے مجھ سے دشمنی کی ہے ننھی بیگم ــــــ ہائے کوچک !

ننھی بیگم : قبا ــــــ اری قبادی ۔

(قباد : داخل ہوتا ہے)

قباد : بیگم ! کیا حکم ہے ؟

ننھی بیگم : اری جا ــــــ بھاگ جا اور انھیں خبر کر دے کہ مرزا کوچک سردار قویش سے لڑنے کے لیے تن تنہا بھاگ نکلے ہیں۔

ثالث زمانی : ہاں ہاں ــــــ جا جلدی ذرا ــــــ سن !

قباد : حکم سرکار ــــــ !

ثالث زمانی : تو نہیں جانتی بی قباد —— تیری کاشفہ اُڑ دابیگمی سردار قریش کے ساتھ چلی گئی ہے —— ۔

قباد : معلوم ہے سرکار! میں نے بھی دو آدمی چھوڑے ہوئے ہیں —— رتی رتی کی خبر پہنچی ہے مجھے ۔

ثالث زمانی : تو ابھی تک یہیں ہے قباد !

قباد : (مکمل خواجہ سرایانہ انداز میں) آئے ہائے بیگم —— قربان جاؤں —— راتی سی بات کہہ دیجیے اب مر تھوڑے ہی جائے ہے آدمی —— جینا بھی تو مقدم ہے —— !!

پردہ

○

جبرو

رحمان مذنب

کردار

جبرو — علاقے کا نامی غنڈہ

تاجاں — اُس کی بیوی

طیفہ — نیا سرکش غنڈہ

جیناں — اُس کی بیوی

بوٹی سائیں — تائب غنڈہ۔ بوڑھا مگر توانا

گگو — جبرو کا وفادار ساتھی

خالہ — بڑھیا مگر توانا

صابرہ — خوش پوش مالدار آسامی

پہلا منظر

(ایک تنگ و تاریک گلی جہاں منزلہ ڈیڑھ منزلہ شکستہ نیم شکستہ مکان ہیں انہی میں ایک مکان سب سے زیادہ مشہور اور علاقے کی سب سے بڑی شخصیت — جبرو کا گھر ہے اس وقت وہ گھر پر نہیں۔ اس کی جوان اور خوبرو بیوی — تاجاں موجود ہے۔ تیور بگڑے بگڑے ہیں۔ چارپائی پر لیٹی ہے۔ پاس ریشمی بنیانیں قمیض اور شلوار کا کپڑا، دوپٹہ، زری کی جوتی اور کچھ آرائش کی چیزیں رکھی ہیں ——

گلو کھڑا سگریٹ پی رہا ہے —— تاجاں اٹھتی اور کولھے پر ہاتھ رکھ کر گلو کے قریب آتی ہے ——)

تاجاں کتنے کی ہیں یہ سب چیزیں؟ (گلو کو چپ دیکھ کر پنکھے سے پیٹتی ہے) بولتا کیوں نہیں؟ منہ کیوں سل گیا ہے؟

گلو : بولتا ہوں، بولتا ہوں بی بی! تو کچھ سوچنے ہی نہیں دیتی۔

تاجاں : سوچنے کے بچے! بول؟

گلو : نشہ بھی کتنی بری بلا ہے کچھ یاد ہی نہیں رہتا، پر خیر سن بی بی۔ دوپٹہ تیس کا، قمیض اور شلوار کا کپڑا ستر کا جوتی پچیس کی، باقی سب چیزیں کوئی پندرہ بیس کی ہوں گی۔

تاجاں . ہوا نا کوئی سو سوا سو کا مال؟

گلو : (سر ہلا کر) ہاں ہاں! بس اتنے کا ہے اتنے کا۔

تاجاں : روپیہ کہاں سے آیا؟

گلو : روپیہ؟ واہ بی بی! تجھے آج تک پتہ نہ چلا کہاں سے روپیہ آتا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ جبرو کے پیچھے سورستے ہیں پیسہ آنے کے۔ صابر علی سے ٹکڑوں تھما جاتا ہے، شاگرد بیٹھیں ملے جاتے ہیں۔ جواری رقمیں ہار جاتے ہیں۔ خدا کی قسم اب جبرو بڑی کمائی کرتا ہے۔

تاجاں : ہیں چرسی کہیں کا ! تو چھوکچھ بتا تا کچھ ہے۔ میں کمنی ہوں کہیں اُس سوکن نے تو رقم نہیں دی ۔

گلو : اس سوکن نے ؟

تاجاں : ہاں اس سوکن نے ۔ میں اس کی ٹنگڑیاں توڑ دوں گی۔

گلو : بڑی بُری عورت ہے وہ !

تاجاں : ضرور اسی نے دیا ہوگا ؟

گلو : بی بی ! ایکدم پانسو کہاں سے دیا ہوگا ؟

تاجاں : پانسو تھے کس کے پاس ؟

گلو : دھوتی کی گانٹھ کھولی تھی ۔ تو اس میں سو سو کے پانچ نوٹ دیکھے تھے میں نے ۔

تاجاں : کسی کی جیب تو نہیں کاٹی ؟

گلو : خبر نہیں ۔

تاجاں : تو بڑا اچنبی ان ہے تجھے سب خبر ہے ۔ جان بوجھ کر چھپاتا ہے

گلو : تجھے تو یقین ہی نہیں آتا ۔ اب میں تجھ سے کیا کہوں ؟

تاجاں : مجھ سے کیا کہے گا ؟ تو تو اس حبّی چھپکلی سے ملا ہوا ہے نا ۔ تم دونوں اس کے یہاں آتے جاتے ہو اس سے روپیہ اینٹھتے ہو ۔ جبھی تو تم دونوں مجھے کچھ نہیں بتاتے ۔

گلو : قسم ہے گیارھویں والے کی ! آج تک اس سے کھوٹا پیسہ تک نہیں لیا ۔ میری بے جُوتی ۔ میں تجھ سے نہیں بے سکتا ۔ پھر وہ تم سے نہیں بے سکتا ؟

تاجاں : چل چل باتیں نہ بنا ! میں دودھ پیتی بچی نہیں جو تمھاری چار سو بیس نہ سمجھوں بیٹا ! ہر بات سمجھتی ہوں ۔ میرا بس نہیں چلتا ورنہ تمھارا بھیجا نکال کر رکھ دوں ۔

گلو : بی بی ! تجھے کیسے یقین دلاؤں ۔ کیسے تیرا وہم دور کروں ؟ تُو تو کسی طرح مانتی نہیں ۔

تاجاں : بس بس رہنے دے ! تم سب آپس میں ملے ہوئے ہو ۔ میرے تو تم دونوں دشمن ہو ۔

گلو : توبہ کر ، توبہ کر ! بی بی ۔ دشمن پر خدا کی پھٹکار ! ہم تو تیرے غلام ہیں ۔

تاجاں: پھر تو بتا نا کیوں نہیں،

گلو: کیا؟

تاجاں: یہی کہ روپیہ کہاں سے آیا ہے؟

گلو: قسم ہے پاک پروردگار کی۔ داتا کے دربار کی اگر دھیلہ بھی تیرے دم کلمہ نصیب نہ ہو جو مجھے ذرا بھی خبر ہو۔

تاجاں: دور دفعان! کالا منہ نیلے ہاتھ پیر۔ ہر وقت سائے کی طرح ساتھ ساتھ پھرتا ہے اور خبر نہیں رکھتا ذرا بھی۔

گلو: (ہنس کر) آج تو میں سوٹا لگا کے دن بھر تکیئے میں پڑا رہا۔

تاجاں: لعنت ہو تجھ پر خدا کی!

گلو: مجھے تو وہ کہیں دوپہر کے بعد جا کر ملا ہے۔

تاجاں: اسے یہ کپڑے لینے کی کیا سوجھی؟

گلو: بس! یونہی بیٹھے بٹھائے سوجھ گئی۔ جنوں پان والے کے اڈے پہ بیٹھا تھا۔ من میں لہر اٹھی۔ بولا "آ چل بیٹا گلو! زرکو آگ لگائیں"۔

تاجاں: زرکو کیا؟ وہ تو مجھے آگ لگائے گا۔ مجھے جلائے گا۔

گلو: خدا نہ کرے جو ایسا ہو۔

تاجاں: کیا نہ ہو؟ ہو رہا ہے۔ پہلے وہ بے چاری سکینہ تھی۔ بے زبان اور بھولی بھالی لڑکی۔ غریب نے کتنے ظلم سہے ہیں۔ لیکن کبھی بھول کر بھی شکایت نہیں کی۔ اس کا ہمیشہ یہی چلن کہ دوسری عورتوں سے میل ملاپ رکھنا اور اپنی عورت کو جلانا۔ جب پانی سر سے گذر گیا اور وہ صدمے سہتے سہتے تھک گئی تو غریب نے دم دے دیا۔

گلو: مولا جانے بتیری بہن بڑی صبر والی تھی اس پہ اس نے بڑے ظلم توڑے تھے۔

تاجاں: اب مجھ پر کچھ کم ظلم توڑ رہا ہے۔ بیاہ سے پہلے کیا کیا صفائیاں پیش کی ہیں۔ کیا معصوم اور بھولا

بھالا بنا ہے اور اب وہ گل کھلا رہا ہے کہ تو بہ ہی بھلی وہ سسری کیا ملی کہ گھر بار کو بھلا بیٹھا۔

گلو : ایسا مت کہہ بی بی! گھر بار کا خیال نہ ہوتا تو یہ سامان کیوں بھیجتا۔

ناجاں : بس بس! بک بک نہ کر! بڑا آیا اس کا حمائتی! میں سکینہ نہیں سب چالیں سمجھتی ہوں وہ اس لئے خاطر کرتا ہے کہ اس طرف سے دل میلا نہ کروں (چمک کر) گلو! مجھے یہ حرکتیں پسند نہیں۔ مجھے یہ چیزیں اچھی نہیں لگتیں، یہ سب چیزیں لے جا اور اسی کمینی کے حوالے کر آ۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں دودھ پیتی بچی ہوں۔ نادان ہوں۔ ان چیزوں سے بہل جاؤں گی ان بے جان چیزوں سے (چیزیں اٹھا کر پھینکتی ہے) خود تو ادھر ادھر مارا مارا پھرے اور مجھے ان مردار چیزوں پر ٹرخائے۔ ہونھ! لے جا انہیں! مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔ جب وہ خود مجھ سے دور دور رہتا ہے پھر یہ چیزیں بھی کیوں بھیجتا ہے گلو! میں سکینہ نہیں۔ لال مرچ ہوں لال مرچ۔ میں اسے یونہی نہیں پھرنے دوں گی۔ اگر وہ باز نہ آیا تو ایسے مزہ چکھاؤں گی کہ یاد بھی رکھے گا۔ میں بھی نجے قصائی کی لڑکی ہوں ہاں جس طرح میرا باپ جلاد تھا اسی طرح میں بھی جلاد ہوں۔

گلو : بی بی! طیش میں مت آ!

ناجاں : کیوں طیش میں نہ آؤں۔؟ میں کسی سے ڈرتی ہوں؟ کسی کی چوری لی ہے میں نے؟

گلو : غصہ اچھا نہیں۔

ناجاں : چل بزدل کہیں کا! میں کسی سے دبتی نہیں نجے قصائی کی لڑکی ہوں ایسے ویسے کی نہیں۔

گلو : بی بی! خدا کے لیے غصہ تھوک دے، کوئی آفت نہ کھڑی ہو جائے، وہ آ رہا ہے۔

ناجاں : جا جا! مجھے نہ ڈرا! آ رہا ہے تو آنے دے۔ آج فیصلہ ہو کر رہے گا۔ یہ روز روز کی بک بک جھک جھک اچھی نہیں۔ جان عذاب میں ہے۔

(جبرو آتا ہے)

جبرو : واہ بھئی واہ! کیا تماشہ بنا رکھا ہے۔ اتنی مہنگی چیزیں دھول میں پھینک رہی۔ جبر جی جان! میرا مال حرام کا تو نہیں اور جو بھی تو محنت کئے بغیر کب ملتا ہے۔ میری موہنی! روٹھے ہوؤں سے

نہیں لگتے۔ بڑے ہیر پھیر حیلے بہانے کے بعد ملتے ہیں۔ جیسے مچھلی کا شکار کرتے ہیں نا مچھلی کا شکار
نہ ہے تو دن بھر زیرہ بھی نہ ملے الٹا کانٹا بھی گنوانا پڑے اور ملنے پہ آئے تو دیکھتے ہی دیکھتے یہ ڈھیر
کا ڈھیر لگ جائے۔ بس اس طرح مال لگتا ہے۔ اتنی بدمزاجی اچھی نہیں۔ میں تو جاق لکھیا ہوں اور تجھے کچھ
قدر نہیں۔

تاجاں : کون کہتا ہے جان کھپانے کو ؟

جبرو : مجھ کیا گھاس کھودوں ؟

تاجاں : کیا جیب ہی کترنا اور جوا ہی کھیلنا چاہیے ؟ اور بھی جینے کے ڈھنگ ہیں ؛

جبرو : بڑے آئے ڈھنگ جینے کے۔

تاجاں : ہاں ہاں ! پتہ ہے مجھے منہ کو لگی چھٹتی نہیں۔

جبرو : چل یہی سمجھ لے !

تاجاں : آوارہ گردی میں کچھ نہیں۔ مکھا اس سے کچھ نہیں ملے گا

جبرو : کیوں نہیں ملے گا ؟

تاجاں : نہیں ملے گا۔

جبرو : رہنے دے اپنی نصیحت ! اس پر عمل کروں تو بھوکا مروں۔

تاجاں : یہ ساری دنیا جوا نہیں کھیلتی۔ جیبیں نہیں کاٹتی تو بھوکی ہی مرتی ہوگی۔

جبرو : کیا ہے دنیا ؟ میں دنیا کو کیا سمجھتا ہوں۔ دنیا کون سی میری سجن ہے ؟

تاجاں : ہاں ! تو دنیا کو کیوں کچھ سمجھنے لگا ؛ تجھے دنیا سے کیا ؛ دنیا کیوں تیری سجن ہونے لگی۔ تیری سجن تو
بس وہ چڑیل ہے۔

جبرو : تاجاں ہوش کی بات کر ؛

تاجاں : اس کی بات آئی اور چمکنے لگا۔ اتنا چمکتا کیوں ہے۔

جبرو : میری چمکتی ہے جوتی۔ میری وہ کیا لگتی ہے ؟

تاجاں: ہاں! وہ تو تیری کچھ لگتی ہی نہیں۔ تو بھلا کیوں اقرار کرنے لگا؟ تیرے ساتھ بھاگنے کی فکر میں ہے وہ تو۔

جبرو: ہونہہ! تاجاں تیری عقل چرنے گئی ہے پگلی! وہ طبیفہ میرا ہی پٹھا ہے مجھی سے اس نے سارا ہنر سیکھا مگر اب مجھی سے بگڑ گیا ہے۔ علاقے میں بدمعاشی کرتا ہے اور تو جانتی ہے، مجھے حصہ بخرہ دیئے بغیر کوئی شخص میرے علاقے میں کام نہیں کر سکتا۔ طبیفہ ایسا وہ ہے جس نے حصہ بخرہ دینا ہی بند نہیں کیا بلکہ میرا دشمن بن گیا ہے۔ کیا بڑھ بڑھ کر باتیں کرتا ہے بھلا اس کی بیوی مجھ سے بات کرنے کی روادار ہوگی۔

تاجاں: ہوگی ہوگی کیا۔ تجھ سے ملتی جلتی ہے اب اور زبان نہ کھلوا۔ کچا چٹھا کھول کے رکھ دوں گی۔

جبرو: کھول دے کچا چٹھا!

تاجاں: تُو تو بڑا پارسا بنتا ہے لیکن میں بے وقوف نہیں، سب کچھ سمجھتی ہوں۔ طبیفہ پر پُرزے نکال رہا ہے نا، اس کا اڈہ بھی خوب ترقی پر ہے بڑی بڑی آسامیاں اسی کے یہاں جا کر جوا کھیلتی ہیں۔ علاقے کے لڑکے اسی سے دبنے لگے ہیں وہ تیرے مقابل آ رہا ہے اور یہ تجھے برا لگتا ہے نا؟ تو اُسے نیچا دکھانا چاہتا ہے اور تو کسی طرح نیچا دکھا نہیں سکا تو دوسرا حیلہ ڈھونڈا، اس کی کمزور رگ پکڑ لی جیسنا کو اپنے جال میں پھانس لیا۔

جبرو: میں اسے ضرور نیچا دکھانا چاہتا ہوں جس نے حصہ بخرہ دینا بند کر دیا ہے۔

تاجاں: پھر تُو نے یہ سوچا ہے کہ اس کی بیوی کو جیسے بخرے میں دھر لے۔

جبرو: میں اپنے علاقے کا مالک ہوں جو میرے منہ آئے گا منہ کی کھائے گا۔

تاجاں: پھر جیتی چھپکلی کی بات پکی ہی ہوئی نا؟

جبرو: تُو تو جل ککڑ ہے بات تو سمجھتی نہیں تیری کسی طرح تسلی ہی نہیں ہوتی۔

تاجاں: تسلی کیسے ہو؟ تو اس کم ذات سے ملتا ہے اور میری چھاتی پر مونگ دلتا ہے۔

جبرو: وہم کا کیا علاج؟ بے چارا لقمان نہ کر سکا۔ جبرو کس کھیت کی مولی ہے؟

تاجاں: ابھی ابھی اقرار کیا تھا اب مکرنے بھی لگا۔

جبرو: یہ میری پالیسی ہے۔ پالیسی ——— میری پالیسی کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

تاجاں : ہاں ! تیسی ہی پال سی کیوں کوئی سمجھنے لگا ! محلے بھر میں چرچا ہے بچے بچے کی زبان پر تم دونوں کی کہانیاں ہیں اور تو کہتا ہے تیری پال سی کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا تیرے خیال میں تو ساری دنیا پاگل اور جھوٹی ہے۔

جبرو : بھناکر ، دنیا دنیا دنیا ! میں دنیا کی کیا پرواکرتا ہوں میرے سامنے تو کوئی زبان کھولے۔ ہاں تجھ سے آ کر لوگ قصے کہانیاں کہہ جاتے ہیں۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔

تاجاں : تو کیا کر سکتا ہے اپنی چلائے جا۔ گلچھرے اڑائے جا۔

جبرو : بچوں کی سی باتیں مت کر ! کہیں دماغ تو خراب نہیں ہوا ؟ احمق ! تیرے سوا میرا کسی سے واسطہ نہیں۔ خدا نے جب مجھے اتنی اچھی بیوی دی ہو تو میں ادھر ادھر کیوں جھک ماروں۔

تاجاں : کسی اور کو بے وقوف بنا ! میرا دماغ ٹھیک ہے۔ میں احمق نہیں تو اس نگوڑی کو تانگے میں لیے لیے پھرتا ہے۔ اسے سینما لے جاتا ہے، شالامار اور مقبرے کی سیر کراتا ہے۔

جبرو : کیوں بے پر کی ہانکتی ہے۔ گھر میں بیٹھے بیٹھے کاغذی گھوڑے دوڑاتی ہے۔

تاجاں : ہائے اللہ اب آنکھوں دیکھی باتیں بھی جھوٹی ہو گئیں۔ ایک تو چوری دوسرے سینہ زوری اسے لیے لیے پھرتا ہے اور کہتا ہے مانتا نہیں۔

جبرو : گلو۔ ذرا بی بی کو سمجھا ! یہ ہوش میں نہیں ہے۔

تاجاں : گلو سے کیا کہتا ہے۔ گلو کیا سمجھائے گا ؟ تیری نیت میں فتور ہے۔

جبرو : پھر تیری کیا نیت ہے ؟

تاجاں : میری نیت یہ ہے کہ تو نے اس فاحشہ کا پیچھا نہ چھوڑا تو میں، میں تجھے چین سے بیٹھنے نہ دوں گی۔ آسمان سر پہ اٹھاؤں گی۔

جبرو : ارے ارے ایسا غضب نہ کرنا !

تاجاں : مجھے تیرے لچھن پسند نہیں۔ پہلے سکینہ کو مارا اور اب مجھے برباد کر رہا ہے۔

جبرو : اب گڑھے مُردے تو نہ اکھاڑ۔

تاجاں : تو اپنی حرکتوں سے باز جو نہیں آتا۔

برو : یہ میری سیاست ہے۔ میری چال ہے یہ میرا کام ہے۔ میرا معاملہ ہے۔ تجھے اس میں دخل نہ دینا
چاہیے۔ تجھے اس سے کیا؟ دھندا چلانے کے لیے مردوں کو جانے کیا کیا کرنا پڑتا ہے ان کا کام
وہی جانیں گھر والیوں کو دخل نہ دینا چاہیے انھیں تو بس گھر کے کام سے کام رکھنا چاہیے۔

جال : ہاں ہاں! تو تو کہتا ہے۔ میں آنکھیں بند کر لوں اور تجھے کھلی چھٹی دے دوں۔ جو جی میں آئے کرے۔

برو : گوری! یہ بڑی پیچیدہ اور بڑی چوڑی باتیں ہیں تو ان میں نہ پڑ خواہ مخواہ دماغ خراب ہوگا۔ موج میلہ
کیئے جا۔ دربیں میں آخر تیرا خاوند ہوں تیرے سب حقوق پورے کرتا ہوں مجھ پر بھروسہ رکھو۔

جال . خاک بھروسہ رکھوں ہمیشہ جھانسے دیتا ہے۔

برو : (جھلاکر) اگر تو میری زبان پر اعتبار نہیں کرتی تو مت کر! جا میں یونہی جھانسے دیتا رہوں گا۔

جال . کیسے کیسے جھانسے دیتا ہے گا؟ میں فیصلہ کر کے رہوں گی۔

برو : تا جاں! میں سیاست کھپ کھپا کر تھک ہار کر آیا ہوں اور تو نے آتے ہی فساد شروع کر دیا۔ ذرا آرام
کرنے دے، دم لینے دے! خدا رسول کے بیچ یہ دانتا کل کل بند کر۔

جال : کیوں بند کروں؟ میں سکینہ نہیں جو منہ میں گھنگھنیاں ڈالے رہوں۔ جیسے کہ نہیں تجھے قصائی کی بیٹی ہوں۔

برو : تو جبرو کی عورت ہے اور جبرو سے زبان درازی نہیں کر سکتی۔

جال : یہ آنکھیں لال پیلی کر کے کسے دکھاتا ہے۔

برو : آنکھوں کی بچی! بک بک جھک جھک بند کر

جال : تو اس چھچھوندر سے ملنا جلنا بند کر۔

برو : تو مجھے زن مرید سمجھتی ہے جو یوں حکم سناتی ہے! میں مرد ہوں۔ علاقے کا مالک ہوں جو چاہے کروں
تجھے کیا۔

جال : میں تجھے من مانی نہیں کرنے دوں گی

برو : تو میری ہٹ سے واقف نہیں۔

جال : میں بھی کسی سے کم ہٹی نہیں۔

جیرو : میں جیناسے بات تک کرتا لیکن تو ضد دکھاتی ہے تو میں باپ کا نہیں جو اس سے بات نہ کرکے رکھوں۔
یوں ہے تو یوں ہی سہی۔

تاجاں : دیکھوں گی کیسے بات کرتا ہے۔

جیرو : میں اُسے اس گھر میں لاؤں گا

تاجاں : مجھے بھی نجے تمہائی کی نہیں کسی جنگی کی بیٹی لنا جو میں نے اُس مردار کے تجھے پر چھری نہ چھیری اور اس کا خون نہ پیا۔

جیرو : میں کہتا ہوں میں رات بھر کا جاگا ہوا ہوں مجھے تنگ نہ کر۔ آرام کرنے دے یہ دنگا فساد بند کر۔

تاجاں : نہیں بند کرتی۔

جیرو : کیسے بند نہیں کرتی (اسے مارتا ہے)

تاجاں : مار اور مار! اُرک کیوں گیا؟ کلیجہ ٹھنڈا ہو گا۔

(بوٹی سائیں کھانستا کھنکھارتا آتا ہے۔ داڑھی اور سر کے بال سفید ہیں لیکن صحت اچھی ہے۔ ہاتھ میں موٹا ڈنڈا پکڑے ہے)

بوٹی سائیں : جیرو! او بے بابا! یہ کیا کیا؟ عورت پر ہاتھ اُٹھایا تُو نے؟ کچھ شرم کر۔

جیرو : بوٹی سائیں! تاجاں کو سمجھا۔ اتنی دیر سے جھگڑا کر رہی ہے۔

بوٹی سائیں. بھائی! یوں مار کٹائی سے تو جھگڑا نہیں مٹے گا۔

تاجاں : بوٹی سائیں! جھگڑا کیسے نہ کروں۔ یہ جینا سے ملتا ہے۔ منع کرتی ہوں تو مانتا نہیں الٹا اسے یہاں لانے کی دھمکی دیتا ہے۔

بوٹی سائیں : ٹھہر ٹھہر! تاجاں۔ حوصلے سے کام لے! جلد بازی نہ کر! کہیں اور کھٹ پڑ نہ جائے۔ حوصلے سے کام لے۔ حوصلے سے۔

جیرو : بوٹی سائیں! یہ بڑی جھگڑالو عورت ہے۔

تاجاں : تُو تو جیسے جھگڑتا ہی نہیں۔

بوٹی سائیں : مَیں کہتا ہوں ! بھلے مانسو۔ دوسرے کی بھی سنو !

جیرو : بوٹا سائیں ! یہ دیکھ قبلے کی طرف منہ ہے۔ کافر ہو جس نے کسی عورت کو میلی نظر سے دیکھا ہو۔

تاجاں : تو تو ابھی حسیناں کو یہاں لانے کی بات کر رہا تھا !

جیرو : تو میری چال سی نہیں سمجھتی۔ میری پا۔ ہر یں ہی سمجھ سکتا ہوں۔ میرے دھندے کی بات ہے اپنی عزت کی خاطر جانے کیا کرنا پڑتا ہے۔ تجھے میرے دھندے کا کیا پتہ۔

تاجاں : ہاں ہاں ! مَیں بے سمجھ جو ٹھہری۔

بوٹی سائیں : سنو۔ سنو ! احمقو ! تاجاں تجھ جیسی عورتیں ہیں جو بیٹھے بٹھائے گھر بار برباد کر دیتی ہیں اور پھر ۔وتی بھجاتی ہیں تو بھی سن لے جیرو ! یہ قصہ عمر بھر طے نہ ہو گا۔

جیرو : بوٹی سائیں ! مَیں کیا کہتا ہوں ۔؟

بوٹی سائیں : یہی کہ میری سنتا نہیں۔

جیرو : اب بوٹی سائیں تو تو کہتا ہے میں اپنا پیشہ چھوڑ دوں۔

بوٹی سائیں : خدا کے بندے ! بدمعاشی کا پھل اچھا نہیں۔ تو مجھ سے بڑا غنڈہ تو نہیں جا پولیس کا رکارڈ دیکھ ! کچہری کی مسلیں دیکھ ! اپنے زمانے میں بڑے بڑے کام کئے ہیں بیٹا ! خطرے کو تو کبھی خاطر میں نہ لائے۔ ڈاکے ڈالے۔ اغوا کیے۔ لڑائیاں کریں خون خرابے کئے۔ سر پھاڑے پھڑوائے چاقو چھریاں چلائیں۔ پگڑیاں اچھالیں۔ نشے کئے۔ قیدیں کاٹیں۔ نام پیدا کیا۔ دس نمبری بنے۔ لیکن زندگی برباد گئی۔ بربادی کے سوا کچھ پلے نہ پڑا۔

جیرو : بوٹی سائیں ! زندگی برباد ہی ہونے کے لئے ہے۔

بوٹی سائیں : پاگل نہ بن ! جیرو تیرا کام بہت بُرا ہے۔

جیرو : مَیں نے کب اچھا کہا ہے ؟

بوٹی سائیں : نہیں کہا تو پھر اسے چھوڑتا کیوں نہیں۔

جیرو : میں اور کوئی کام نہیں کر سکتا۔ جس میں تیس سال گزارے اُسے اب کون چھوڑے۔

بوٹی سائیں : رحمت کر بہت ! یہ عیب والی زندگی اچھی نہیں۔ لعنت بھیج اس پر۔

جیرو : (چمک کر) بوٹی سائیں! مجھے کیا کہتا ہے۔ اس وکیل سے جا کر کہہ جس نے میری ماں کے مرتے ہی دوسری شادی کر لی۔ جو نئی بیوی کے نخرے اٹھاتا جاتا تھا لیکن میرا دھیان نہ کرتا۔ سوتیلی ماں مجھے دن رات مارتی پیٹتی۔ بُرے سے بُرا کرتی اور اس کے عوض میں اپنے شوہر سے داد لیتی۔ خدا کی قسم! مجھے گھر سے۔ ماں سے باپ سے۔ سخت نفرت ہو گئی سخت نفرت آخر میں بھاگ گیا۔

بوٹی سائیں : پہلے بھی بُرا ہوا۔ اب بھی بُرا ہو رہا ہے۔

جیرو : کچھ بھی ہو کم از کم اپنا اختیار تو ہے کسی کی دھونس نہیں۔

بوٹی سائیں : یہ شیطانی کام ہے۔

جیرو : شیطانی ہو یا انسانی۔ دنیا کا دھندا یونہی چلتا ہے شیطان بھی معمولی ہستی تو نہیں بڑے بزرگ آئے۔ کیا ہوا؟ شیطان مرا تو نہیں۔ بدی کا کارخانہ بند تو نہیں ہوا بوٹی سائیں! چھوڑ ان باتوں کو!

بوٹی سائیں : تو بھولتا ہے یوں سکھ چین نہیں ملے گا۔

جیرو : سکھ چین کسی کا اجارہ نہیں نہ ملے تو نیکوں کو نہ ملے اور ملے تو بدوں کو ملے۔ دیکھ لے اپنے علاقے کے میاں سلطان کو۔ بلیک کرتا ہے۔ حرام کھاتا ہے موج میلہ کرتا ہے سکھ چین سے دن گزارتا ہے۔

بوٹی سائیں : بُروں کو دیکھ کر بُرا نہ بننا چاہیئے تیرا پیشہ ناقص ہے اس میں اطمینان نہیں مل سکتا۔

تاجاں : اسے اطمینان کی ضرورت ہی کب ہے؟

جیرو : مولا جانے میں اطمینان کے لیے مرتا ہوں۔ بھلا تاجاں کے سوا کون اطمینان دے سکتا ہے۔

تاجاں : بس رہنے دے۔ کہتا کچھ ہے کرتا کچھ ہے۔

جیرو : قسم ہے خاکِ مدینہ کی! میں تاجاں کو ضرور خوش رکھوں گا۔ یہ صبر تو کرے۔

بوٹی سائیں : تاجاں! جیرو کی بات مان لے۔

تاجاں : ہزار بار تو مانی ہے؛

جیرو : ایک بار اور سہی۔

بوٹی سائیں۔ ہاں ہاں رے! میری پریشانی بھی دور ہو میں بس گھر سے تنگ آچکا ہوں ایک دن ایسا نہیں جس دن تمہارا جھگڑا اٹھانا نہ پڑے۔ دن رات تمہارے خیال اور تمہارے فکر میں گزرتا ہے۔ کہیں لڑائی یا گل نہ کھلا بیٹھو تم سے ڈرتا ہی رہتا ہوں۔

ناجل: بوٹی سائیں کہتا ہے تو مان لیتی ہوں۔

بوٹی سائیں۔ شاباش شاباش! جاؤ گھل مل کر بیٹھو۔ پیار بڑھاؤ۔ گزری باتو سمجھو میں الہ دین کے جن کی طرح آیا۔

جیرو۔ سائیں بادشاہ تیرا گھر ہے جم جم آ۔

بوٹی سائیں چلا جاتا ہے

پردہ

دوسرا منظر

معمولی درجے کا مکان۔ جبرو کے مکان کے بعد علاقے میں مشہور
ہے۔ مکان میں جیناں موجود ہے جو سوٹ کیس میں زیور اور قیمتی کپڑے
سنبھال رہی ہے۔ شام کا وقت ہے۔

جیناں : خالاں! بس وہیں کھڑکی کے پاس کھڑی رہنا!

خالہ : گھبراتی کیوں ہے لڑکی۔ اطمینان سے سامان سنبھال۔ میری نظر سڑک سے ہٹ گئی ہوئی ہے کوئی
آیا نہیں اور میں نے سنگل ڈاؤن کیا نہیں۔

جیناں : بس تھوڑی ہی کسر رہ گئی ہے۔

خالہ : رتی بھر فکر نہ کر۔ مزے سے کام کیے جا۔ اب کیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد گھر میں اُلو بولنے لگ
جائیں گے۔ میں ڈھلتے نرخ جاؤں گی اور تو چڑھتے۔ نرخ

جیناں : ہاں ہاں! شام ہو رہی ہے تار سے نکلتے ہی روانہ ہوں گے۔

خالہ : بس یہ طیفہ بھی ہوش میں رہے گا۔

جیناں : اپنی بلا سے!

خالہ : خالی گھر دیکھ کر اس کی تو بن آئے گی۔

جیناں : اسے چھٹی مل جائے گی!

خالہ : وہ تو چاہتا بھی یہی ہے۔

جیناں : مجھے گابلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔

خالہ : تیری اُسے ضرورت ہی کب ہے۔ تجھے آدمی کب کرنا چاہتا ہے۔

جیناں : بے غیرت ہو بیٹا۔ مگر تو بھول کر بھی پھر انہیں ملتا۔

خالہ: تو بھی تو آزاد ہی رہی ہے۔ تجھے اس نے کبھی کچھ کہا بھی تو نہیں۔

جیناں: مجھے وہ کیا کہہ سکتا ہے؟ میں نہیں اس کا رعب مانتی جائے مرے کرے۔ میں اس کے بلے جی جلانے سے رہی

خالہ: تو گئی تو وہ پچھتائے گا نہیں؟

جیناں: پچھتائے جوتی کی نوک سے۔

خالہ: تیری جان تو عذاب سے چھوٹے گی۔

جیناں: بس خالہ مجھے تو اب جبرو پر پورا پورا بھروسہ ہو گیا ہے۔

خالہ: طیفے تو ہزار درجے اچھا ہے۔

جیناں: ہزار درجہ کیا۔ لاکھ درجہ مزاج کا اچھا ہے اچھی کمائی والا ہے اور عورت کا خیال رکھنے والا ہے۔

خالہ: اور یہ طیفہ تو گھر آتا ہی نہیں۔ آتا ہے تو یہی پل دو پل کے لیے

جیناں: آتا ہے تو کیا نہال کر جاتا ہے۔ وہ تو آدمی ہی اور ڈھب کا ہے۔

خالہ: خیر! اب بات کون سی لمبی رہ گئی ہے۔ تھوڑی دیر میں گھر کا صفایا ہو جائے گا اور تو جبرو کے پاس جا پہنچے گی۔

جیناں: ایکبار اس کے پاس پہنچ جاؤں پھر کوئی ڈر نہیں پھر میں ہر خطرے سے محفوظ ہو جاؤں گی۔

خالہ: تیری ساری تکلیفیں جاتی رہیں گی طیفے کے ہاتھوں جو سختیاں جھیلی ہیں ان کے بدلے اب تجھے آرام ملیگا۔ تکلیف کے بعد راحت ہوتی ہے۔ جبرو تجھے عیش کروائے گا۔

جیناں: وہ تو مجھ پر جان چھڑکتا ہے۔

خالہ: جیناں! ایک بات ہے

جیناں: کیا؟

خالہ: طیفہ تجھے چاہے نہ چاہے پروا کرے نہ کرے لیکن تجھے جبرو کے پاس نہیں دیکھ سکتا۔ تو جبرو کے پاس گئی تو وہ گرم ہوگا۔

جیناں: گرم ہو یا سرد۔ میں تو گئی کہ گئی۔ طیفہ کرے گا بھی تو کیا کرے گا۔ جبرو کے آگے دال گلنے سے رہی۔

خالہ : آجکل جبرو سے ٹھنی ہوئی ہے۔

جیناں : کچھ بھی ہو جبرو اس کی ایک نہ چلنے دیگا۔

خالہ : ویسے طیفہ بھی زوروں پر آ رہا ہے جبرو کے مقابلے میں اس نے پالٹی تو بنا لی ہے

جیناں : مجھے تو طیفے سے نفرت ہو گئی ہے جس آدمی کو اپنی عورت کا خیال نہ ہو، آدمی کس کام کا؟ ذرا اس کے مٹیر کا چرخ ٹیڑھی ہو جائے۔ تو دیکھو کتنا غم کھاتا ہے۔ عورت مر بھی جائے تو خبر نہ لے گا۔ میں تو اب اس گھر میں : ہوں آئی۔ کالے چور کے ساتھ رہنا منظور ہے اس کے ساتھ رہنا منظور نہیں۔

خالہ : اری غضب ہو گیا۔ تاجاں آ رہی ہے ناک کی سیدھ میں آپ کی طرف۔

جیناں : او بی اللہ! اس کو بھی اسی وقت آنا تھا۔ ذرا اٹھ کے آ جاتی تو اس کا کیا بگڑ جاتا۔

خالہ : اس کے کانوں میں نہیں کسی نے بھنک نہ ڈال دی ہو۔ ہماری بات کا اسے پتہ نہ چل گیا؟

جیناں : ہونھ!

(دروازے پر دستک۔ جیناں سامان سمیٹنے لگتی ہے)

تاجاں : لاڈو رانی! جیناں بی بی! ذرا دروازہ تو کھول!

خالہ : ٹھہر بہن ذرا دم لے۔

تاجاں : اندر خزانہ گاڑ رہی ہے جو دم لینے کو کہتی ہے؟

خالہ : گھر میں سو باتیں ہوتی ہیں کوئی بات بتانے کی ہوتی ہے کوئی نہیں ہوتی؟

تاجاں : ہاں ہاں! تمھیں تو ایک گھر والی ہو۔ باقی تو سب سڑکوں پر پڑے رہتے ہیں کام بیچ کر لینا۔ دروازہ کھول دو۔

(دروازہ کھلتا ہے۔ سامان سمٹ گیا۔ کچھ بے ترتیب پڑا ہے جیناں کے چہرے پر اضطراب اور پراگندگی کے آثار نمایاں ہیں)

جیناں : (گھبرا کر) آ۔ آ بہن! آجا۔ لے یہ پیڑھی۔ بیٹھ جا۔

خالہ : بیٹھتی ہے میری جوتی۔ میں پوچھتی ہوں تم دونوں نے مل کر یہ کیا چکر چلایا ہے۔

جیناں : (ڈر کر جیسے پائی گئی ہو) چک کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔ بس یونہی، ذرا گھر صاف کرنے لگی تھی کہ اُوپر سے بہن آ گئی۔

تاجاں : خیر! گھر کی صفائی کی تو کوئی بات نہیں۔ میں کر دوں گی۔ پر چک چھلو! میں جھاڑو بہارو کی بات نہیں کرتی۔ میں اصلی بات پوچھتی ہوں۔ اُس کی کہ اُس کی۔

جیناں : ہاں تو آ سے ہی گلے پڑ گئی۔ مجھے کیا پتہ اصل بات کون سی ہے؟

تاجاں : ہاں ہاں! تجھے تو کچھ پتہ ہی نہیں۔ ڈائن کبھی دل کی بات بتاتی ہے۔

جیناں : اے بہن! ذرا منہ سنبھال کے بات کر۔

تاجاں : (چمک کر) بس بس! رہنے دے۔ سنبھال لیا منہ۔ جو کچھ تو کر رہی ہے وہ بھلی عورت نہ کرتی ہوگی۔

جیناں : (جم کر، گھبراہٹ سے نجات پا کر) میں کیا کر رہی ہوں؟

تاجاں : تو کیا کر رہی ہے؟ اپنا سر کر رہی ہے۔

خالہ : اے لڑکی! ذرا سنبھال کے بات کر؟

تاجاں : چپ ری چھپاں کی ماں! خبردار جو بیچ میں بولی گھونسہ مار کر بتیسی باہر نکال دوں گی۔

جیناں : اوہو! بڑے جلال میں آ رہی ہے،

تاجاں : ہاں ہاں! آ رہی ہوں تجھے قصائی کی بیٹی ہوں۔ جبرو کی بیوی ہوں۔

جیناں : (طنزاً) کس جبرو کی بات ہے؟

تاجاں : ہاں ہاں! جانتی ہوں۔ تجھے بھی جبرو پہ گھمنڈ ہے۔

جیناں : ہاں ہاں! ہے تو کیا کر سکتی ہے؟

تاجاں : میں کیا کر سکتی ہوں، میں تیرے گلے چیر سکتی ہوں تیرے جبڑے توڑ سکتی ہوں،

جیناں : اری چل! بڑھ بڑھ کے باتیں نہ بنا!

تاجاں : یہ بات ہے تو آ جا میدان میں۔

جیناں: آجا!

(تاجاں جھپٹ کر جیناں کے بال پکڑ لیتی ہے۔ دونوں گتھم گتھا ہو جاتی ہیں۔ تاجاں جیناں کو فرش پر پٹخ دیتی ہے۔ جیناں تاجاں کو ہٹا کر نیچے گرا دیتی ہے۔ کبھی وہ نیچے یہ اوپر اور کبھی یہ نیچے وہ اوپر۔ تاجاں کا پلہ بھاری رہتا ہے۔ خالہ کھڑکی کے پاس جا کر چیخنے چلانے لگتی ہے)

خالہ: ارے کوئی آئیو! غضب ہو گیا ارے کوئی بچا کر آئیو۔ لوگو! خون ہو جانے کا ارے کوئی تکیے سے جا کر طیفے کو بلا لائے۔ ارے تاجاں اور جیناں لڑ رہی ہیں (بوٹی سائیں کو دیکھ کر) دیکھ کیا رہا ہے۔ آجا۔ سائیں بادشاہ جلدی سے آجا! (کھڑکی سے ہٹ کر تاجاں اور جیناں کو دیکھ کر) یہ تو بھیڑیوں کی طرح لڑ رہی ہیں۔ او ہائے اللہ! جیناں کا تو سر پھٹ گیا ہے تاجاں! تجھے خدا سمجھے۔ تو نے آفت مچائی ہے۔ دیکھ لینا نتیجہ اچھا نہیں نکلے گا

(بوٹی سائیں آتا ہے)

بوٹی سائیں: او بے شرمو، بے حیاؤ! یہ کیا پاکھنڈ مچا رکھا ہے؟ (دونوں کو پکڑ کر چھڑاتا ہے۔ دونوں ہانپ رہی ہیں کپڑے جھاڑتی پونچھتی ہیں بال جھٹکارتی ہیں۔ خالہ کپڑے سے جیناں کا زخمی سر پونچھتی ہے)

تاجاں: (ہانپتے ہانپتے) بوٹی سائیں! تو بیچ میں پڑا ہے تو اس مردار کو سمجھا! میرے رستے سے ہٹ جائے۔

جیناں: مردار ہو گی تو۔ مردار ہو گی تیری ماں!

بوٹی سائیں: کم بختو! چپ کرو نہیں تو دونوں کی کھلڑی ادھیڑ دوں گا۔

جیناں: یہ مجھے آنکھیں کیوں دکھاتی ہے۔ اسے کہہ اپنے خصم کو قابو میں رکھے۔ گوری چٹی چمڑی والی ہے چنچل ہے۔ ناز نخرے دکھا سکتی ہے۔ قصاب باپ نے خوب نلیاں کھلائی ہوں گی۔ جبرو کو اس سے اچھی عورت کہاں ملے گی۔

بوٹی سائیں: جیناں دم لے! زبان کو لگام دے۔

تاجاں: بوٹی سائیں! اسے کہہ! آپے ہی میں رہے! میرے خصم پر ڈورے نہ ڈالے۔ اپنا مرد تو قبضے میں نہیں۔

دوسروں کے مردوں کو پھانستی پھرتی ہے۔

بوٹی سائیں : او خدایا ! ذرا تھم جاؤ۔ بات مت بڑھاؤ۔ تم لوگوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے یاد رکھو! یہ جو اوسے کا آوہ بگڑا ہے اور راہ راست پر آنے کا نام نہیں لیتا ایک دن غارت ہو کر رہے گا۔ پچھ مہینے سے تمہارے گورکھ دھندے میں پڑا ہوں۔

تاجاں : اس بیمار کا کیا قصور ہے ؟

بوٹی سائیں : قصور کسی کا بھی ہو، یہ سمجھ لو تباہی سب پر آئے گی۔ میرا تو تم نے کھانا پینا۔ اٹھنا بیٹھنا حرام کر رکھا ہے۔ ہر دم تمہاری الجھن سلجھن میں پڑا رہتا ہوں کوئی رستہ نہیں سوجھتا۔

جیناں : آپ ہی سوجھ جائے گا۔

تاجاں : اسے سوجھ گیا ہو گا نا ؛

بوٹی سائیں : لعنت شیطان پہ، چھوڑو ! لڑائی بھڑائی نہ کرو۔

جیناں : اپنی طرف سے تو بند ہے سائیں بادشاہ ! تاجاں کو سمجھا۔

تاجاں : سمجھانے کی ضرورت نہیں میرا رستہ صاف ہے تو میں کسی کے گلے نہیں پڑتی

جیناں : بہن ! خدا نے چاہا تو آج سے تیرا رستہ صاف ہی صاف ہے۔

بوٹی سائیں : شاباش ! یوں صلح صفائی سے کام لیا تو ساری بپتا کٹ جائے گی۔ تم دونوں بڑی اچھی ہو۔ آپس میں پیار بڑھاؤ ! میں تمہارے مردوں کو سمجھاؤں گا۔ خدا کی ذات سے امید ہے کہ وہ سمجھ جائیں گے۔ سمجھاتے رہو سمجھاتے رہو تو انسان آخر سمجھ ہی جاتا ہے۔

جیناں : نہ نہ نہ نہ ! بوٹی سائیں ! یہ مردوں کو سمجھانے والا کام نہ کرنا۔

بوٹی سائیں : کیوں ؟

جیناں : ہمارے مرد بڑے اکھڑ ہیں۔ تجھے تو سب کچھ معلوم ہی ہے۔ تجھ سے کون بات چھپی ہے ادھر جانے کو کہو تو ادھر جاتے ہیں الٹی عقل کے مالک ہیں۔ بس تو اطمینان رکھ ! میری طرف سے جھگڑے والی کوئی بات نہ ہو گی۔

بوٹی سائیں : خیر تم دونوں پر بات چھوڑتا ہوں عقل سے کام لو۔ میرا تو یہ مطلب ہے کہ کسی طرح یہ جھگڑا بند ہو تمہاری نا سمجھیاں

تیسرا منظر

(ایک مزار، مزار سے متصل تکیہ جہاں ایک طرف بھنگ اور تمباکو کا ڈھیر پڑا ہے حقہ اور کونڈی ڈنڈا پاس دھرے ہیں ایک طرف بڑا گھڑا، مٹی کا پیالہ اور لوٹا رکھے ہیں۔ ایک طرف (اونچے چبوترے پر) تاش، چوپٹ اور شطرنج کا سامان بکھرا پڑا ہے۔ جبرو اکیلا بیٹھا تاش کے پتے پھینک رہا ہے اور گنگنا رہا ہے۔ گلو وسکی لے کر آتا ہے)

(رات کا وقت ہے)

گلو : یہ لے استاد تیری قسم! سیل بند ہے ہاں! ایک دم ولیتی!

جبرو : لا دکھا۔

گلو : (پکڑاتے ہوئے) لے دیکھ!

جبرو : واہ بھئی واہ!

گلو : کیوں استاد کیسی ہے؟

جبرو : ارے میرے یار! یہ سچ مچ ولیتی ہے۔ نمبر ایک ہے۔

گلو : ارے استاد یہ تو نمبر دس سے بھی اوپر ہے۔

جبرو : (کھولتے ہوئے) کہاں سے تیر کر لایا ہے؟

گلو : کچھ نہ پوچھو استاد! اس کے لیے بڑا خراب ہونا پڑا۔ پہلے ملو سے پوچھا۔ اس نے کہا نہیں۔ جیجے کے اڈے پر گیا۔ وہ بھی جواب دے گیا اب تو میں سوچ میں پڑ گیا سوچ رہا تھا۔ دور موڑ پر طیفہ اور بوڑی سائیں باتیں کرتے نظر آئے۔

جبرو : (پینے میں مصروف رہتے ہوئے) اس بوڑی سائیں کو چین نہیں۔ کچھ نہ کچھ خرابی کرے گا؟

گلو : کرنے دے استاد خرابی! ہمارا کیا کرے گا۔ بات تو سن میری۔

جبرو : سنا :

گلو : تھوڑی دیر ہوئی تو بوٹی سائیں چلا گیا اور طیفہ پتہ نہیں مجھے دیکھ کر یا اپنے آپ جیسے کے اڈے پر گیا۔

جبرو : ہونہہ!

گلو : آتے ہی بولا "یار گلو بس شکر ہے" میں نے کہا "شراب کی فکر نہ" کہنے لگا "آ تجھے شراب دوں۔

جبرو : اس کا یہ مطلب ہے طیفے کی عقل ٹھکانے آ گئی ہے اور اب وہ توبہ کرنے لگا ہے۔

گلو : استاد! تو ڈٹا رہ! دیکھ تو کسی طرح سیدھا ہوتا ہے طیفہ! وہ جھکا۔ ور تو نے میدان مار لیا۔
خوشی خوشی اپنے ساتھ لے گیا اور ولیتی شراب کی بوتل سامنے رکھ دی۔

جبرو : ولیتی شراب تو کیا میں اس کے گھر کی دیسی شراب کی بوتل بھی سے اڑاں گا۔

گلو : استاد! وہ تو بالکل موم ہو گیا ہے کہنے لگا "گلو! آ کیوں ساری بوتل نہ چڑھا جا! استاد جبرو کو بھی
پلانا"

جبرو : اسے گلو! میرے پیر مرشد کو منظور ہوا تو یہ قدموں میں آ کر گرے گا۔

گلو : بڑا اڈے کا ٹھیکیدار بنتا تھا؟

جبرو : بس جو کچھ بننا تھا بن لیا۔ اب اللہ کیا بنے گا۔ بوٹی سائیں نے سمجھایا ہو گا کہ مجھ سے ٹکر نہ لے۔
ارے گلو! سمندر میں رہنا مگرمچھ سے بیر۔ یہ بھی کوئی عقل کی بات ہے۔ میں اول درجے کا بدمعاش
علاقے کا بادشاہ۔ مجھ سے کوئی ٹکرا سکتا ہے جو ٹکرائے میں اسے چکنا چور نہ کر دوں۔

گلو : استاد کچھ بھی ہو طیفے نے تھوڑے دن تو خوب آسمان سر پہ اٹھایا تیرے خلاف بڑا زہر اگلا تو
اسے معاف نہ کرنا۔ بدلے لے کر چھوڑنا! تجھ سے کتنا فرنٹ ہوا تھا؟

جبرو : تو فکر نہ کر! میں بڑی چال ہی ماروں گا۔ طیفے سے تو وہ کروں گا کہ یاد رکھے گا بس ایک بوٹی سائیں
کا خیال آتا ہے۔

گلو : بوٹی سائیں کیا کر سکتا ہے؟

جبرو : کر تو کچھ نہیں سکتا۔ بھلا آدمی ہے۔ پولیس میں سوخ رکھتا ہے موقع بے موقع آملتے آتا ہے۔

گلو : اُستاد! پولیس تیرا کیا بگاڑ سکتی ہے۔

جبرو : پولیس کو میں کیا سمجھتا ہوں، تجھے کیا خبر پولیس میں میرا کیا رسوخ ہے؟ سب بنا رکھی ہے۔

گلو : مجھے سب پتہ ہے۔

جبرو : بس پھر، بوٹی سائیں کے بغیر بھی میرا کام چل سکتا ہے۔

گلو : استاد! تیرے برابر رسوخ والا کون ہو گا۔ بوٹی سائیں تو لوہی معتبر بنا پھرتا ہے۔

جبرو : (نشے کی حالت میں) کہتا ہے لفنگا پن چھوڑ دے۔ ہونھ! اس کا مطلب ہے افیم کھاؤں۔ ہاتھ پاؤں توڑ دوں بھوکا مروں۔ وہ کیا جانے میرے دل کا روگ میرے دل میں تو آگ لگ رہی ہے۔ بوٹی سائیں اور تیل پر تیل چھڑکتا ہے۔ خدا کی قسم میں جلا تو دنیا کو بھی جلا کر چھوڑوں گا۔ میں شرابی کبابی سہی۔ عورتوں کا بیوپاری سہی لیکن مجھ میں سو عیبوں کے ساتھ ایک آدھ بھلائی بھی ہو گی۔

گلو : اُستاد! سب آدمی کیسے نیک بن سکتے ہیں! برے نہ ہوں تو نیکوں کو کون پوچھے، نیک تو پھر ٹکے سیر بھی نہ بکیں۔

جبرو : گلو! مجھے جو کچھ بننا تھا بن گیا۔ اب میں کیا بدلوں گا، کتنی کتنی آفتیں جھیلی ہیں کس مشکل سے اپنے کام میں طاق ہوا ہوں۔ اب اس کام کو چھوڑ کر دوسرا کام کیسے سیکھوں؟

گلو : اُستاد! دوسرے کام میں کیا پڑا ہے اس کام میں تو کتنوں کا بھلا کرتا ہے کوئی ادھر سے آتا ہے کوئی اُدھر سے آتا ہے کوئی لیتا ہے کوئی دیتا ہے۔ لوگ آجاتے ہیں کھاتے ہیں پیتے ہیں اُستاد! تو سخی ہے تیرا دربار سب کے لیے کھلا رہتا ہے اُستاد! چراغ لے کر ڈھونڈیں تب بھی تیری نظیر نہ ملے۔

جبرو : مولا جانے کئی کئی لوگوں کے کام سنوارتا ہوں۔

گلو : ہاں ہاں! مجھے پتہ نہیں کیا؟

(جبرو ایک طرف بغور دیکھنے لگتا ہے)

گلو : کیا ہے اُستاد !

جبرو : کوئی آ رہا ہے ۔

گلو : ہاں اُستاد ! کوئی آ رہا ہے لیکن یہ تو صابر علی ہے ۔

جبرو : فکر نہ کر آنے دے ! اس سے تو سودا کیا ہے آج اس کا بھی کام بنا ہی دیں گے ۔

گلو : ہاں اُستاد ! بنا دینا !

جبرو : آ میرے یار صابر علی !

صابر علی : ارے واہ اُستاد ! خوب چڑھائی ہے ۔

گلو : اُستاد نے پوری بوتل پی ہے

صابر علی : ارے یہ تو ولیتی ہے ؟

گلو : اُستاد گھٹیا شراب نہیں پیتا ۔

صابر علی : کیا کہنے اُستاد کے

جبرو : اپنی تو چلتی ہے صابر علی ! جیسے تو اپنے علاقے کا بادشاہ ہے ۔ اسی طرح میں بھی اپنے علاقے کا بادشاہ ہوں جو چاہوں کروں ۔ مجھے کون ٹوک سکتا ہے ؟

صابر علی : کوئی نہیں ۔

جبرو : اشارہ کروں تو اسے ڈل جی کی دکان میرے قدموں پر آ جائے

گلو : مولا جانے اُستاد بڑے رسوخ والا ہے !

جبرو : بھولے بادشاہ ! چھوٹے بڑے سب کا تابع ہوں ۔ میرا کام پتھر کو موم کرنا ہے اپنی سروں کو ناراض نہیں کرتا ۔

صابر علی : اُستاد ! تو بڑا سیانا ہے ۔

گلو : اُستاد بڑا نامی گرامی ہے دور دور تک اس کا ڈنکا بجتا ہے ۔

صابر علی : مجھے سب خبر ہے نام سن کر تو میں آیا ہوں ۔

جبرو : داتا کا حکم ہوا تو تیرا کام ایسا سنواروں گا کہ عمر بھر یاد کرے گا یار صابر علی۔

صابر علی : استاد تجھ پر اعتبار ہے۔ دیکھ لے! مال دیکھے بغیر سودا کیا ہے؟

جبرو : پھر کیا ہوا؟ اللہ جانے ایسی چھوکری ہے کہ جواب نہیں

صابر علی : کنواری ہے؟

گلو : کنواری ہے

جبرو : سب باتیں چھوڑ! بس نری حور ہے۔

گلو : موتی چور ہے۔

جبرو : پری ہے پری؟

گلو : پھلجھڑی ہے۔

جبرو : ہنس مکھ ہے رنگیلی ہے ناچار نہ ہوتی تو میں اسے گھر میں ڈال لیتا یہ تو یونہی ضد کا معاملہ ہے ایک
آدمی سے بدلہ لینا ہے اس بہانے تیرا الو سیدھا ہو جائے گا۔

صابر علی : استاد اچھا پڑ ڈھیلی چھوڑنی ہے۔

جبرو : سودا ٹھیک ہو گا۔ مال کھرا ہو گا کھوٹ ہو تو پلٹ کر منہ پہ مارنا۔ ہزاروں میں تو بالکل سستی ہے۔

گلو : گاجر مولی کے بھاؤ پڑے گی۔

صابر علی : پانسو تو دے چکا ہوں۔

جبرو : وہ تو اسی دن اٹھ گئے۔ کچھ ناچاں کی چیزوں میں لگے کچھ اپنے کام آئے۔ میرے یار باقی رقم تھا۔

صابر علی : رستم شوق سے لے! رقم کا گھاٹا نہیں لیکن دیکھنا مال ٹھیک ہو۔

جبرو : شرطیہ ٹھیک ہو گا پیارے! میری زبان پر اعتبار کر۔ سودا کھوٹا ہوا تو پائی پائی
کا دیندار ہوں۔

(صابر علی نوٹ نکال کر جبرو کو دیتا ہے)

بس پیارے! وہ جو بڑی گراؤنڈ ہے نا اسے والی سیڈ میں وہیں ٹھہرنا۔ سینما ٹوٹا کر میں اسے لیکر

پہنچا۔ راتوں رات تیرے گھر پہنچا کر آؤں گا

صابر علی: استاد تو بڑا سیانا ہے۔

جبرو: بڑا ایکسپرٹ ہوں بابو ہے۔ ساری عمر یہی دھندا کیا ہے

صابر علی: اچھا پھر اللہ بیلی!

جبرو: اللہ بیلی!

(صابر علی چلا جاتا ہے)

جبرو: گلو یار! اسامی تگڑی ہے۔ اپنے علاقے میں اس کا بڑا سکہ چلتا ہے۔

گلو: استاد یہ تو سونے کی کان ہے۔ جب سے ان کا کینہ بتے گئے ہیں۔ ایک ہزار میں تو بالکل سستی ہے۔

جبرو: نہیں! میں کب جنیاں کو اس کے پاس ٹکنے دوں گا۔ اتھوڑے سے کے بعد میں واپس بھگا لاؤں گا۔

گلو: وہ پھر بھاگا بھاگا آئے گا۔

جبرو: گلو! میں پھر اس کی حجامت کروں گا تو تماشہ تو دیکھ! مُرغی پھنسی ہے یونہی تو نہیں چھوڑتا اسے۔

گلو: کیا کہنے اُستاد تیرے؟

جبرو: چل جنیاں کو لے آئیں۔

گلو: چلتے ہیں اُستاد۔ ذرا شو تو ٹوٹنے دے۔

جبرو: شو کے بچے! دیکھ! اب کون اِدھر آ رہا ہے۔ کہیں جنیاں تو نہیں؟

گلو: شاید جنیاں ہو۔ ذرا نزدیک آ لینے دے۔

(دونوں بغور دیکھتے ہیں)

گلو: اُستاد! عورت نہیں مرد ہے۔ ارے یہ تو لطیفہ ہے؟

جبرو: لطیفہ ہے! آ یار لطیفے! سنا پھر کیا حال ہے؟

لطیفہ: حال تو میں سنا دوں گا، پر اُستاد یہ بتا! تجھے شرم نہ آئی؟ جب تک مال کھاتا رہا تو میرا لحاظ کرتا رہا اب مال کھانا بند کیا تو تُو نے میری عزت سے کھیلنا شروع کر دیا۔

جبرو ۔ طیفے : میں جبرو ہوں گردن تان کر اور چلا چلا کر بات نہ کر

طیفہ ۔ تو جبرو ہوگا اپنے گھر ہوگا ۔ میں نے یہ بچا پس پیپے کی وسکی یونہی تو نہیں پلائی ۔ اب میں گردن تان کر اور چلا کر بات کر سکتا ہوں

جبرو : چل بچے نی !

طیفہ : چل بھیر ! زیادہ اکڑے گا تو رگیں مسل دوں گا ۔

جبرو : یہ گیدڑ بھبکیاں کسی اور کو دینا ؟

طیفہ : یہ گیدڑ بھبکیاں نہیں ۔ طیفے کی للکار ہے ۔ طیفہ جو کہتا ہے پورا کر دکھاتا ہے ۔

جبرو ۔ آپے سے باہر کیوں ہوتا ہے ؟

گلو : گرم ہونے کی کیا ضرورت ہے ؟

طیفہ : گلو ! بیچ میں بولا تو ٹانگیں چیر دوں گا ۔

جبرو : گلو کو کیا آنکھیں دکھاتا ہے ؟ مجھ سے بات کر ۔

طیفہ : تجھی سے بات کروں گا ۔ تجھ میں تو نام کو شرافت نہیں ۔ میری بیوی کو ورغلاتے ہوئے شرم نہ آئی ؟ آنکھوں کا پانی اتنا ہی مرگیا ہے ؟ نہ اپنی عزت کا پاس نہ دوسرے کی عزت کا ۔ اتنی بے حیائی ۔ اتنی بے غیرتی ۔ ایسی اندھیر گردی ؟

جبرو : میں علاقے میں جو چاہوں کروں ۔

طیفہ : علاقے میں میں بھی کچھ ہوں ۔

جبرو : علاقے میں بہتری بھیڑ بکریاں ہیں ۔

طیفہ : جبرو ! بھول میں نہ رہنا ۔ میں طیفہ ہوں ۔ طیفہ

جبرو : جانتا ہوں تجھے تیری اوقات سے بے خبر نہیں ۔ غیرت والا ہوتا تو عورت کو بس میں رکھتا ۔

طیفہ : یہ میرا گھر کا معاملہ ہے ۔ کسی کو اس سے کیا ۔

جبرو : یہی ہے تو عورت کو باندھ کے رکھ ۔

طیفہ . باندھ لیا ہے ایک دن ایسا کہ ناہی تھا کب تک قصّے کہانیاں سُنتا ؟

جبرو : قصّے کہانیاں بند تو نہ ہوگی

طیفہ کیسے بند نہ ہوگی ؟ آج کے بعد کسی نے قصّے کہانیاں سنیں سنائیں تو اس کا پیٹ چاک کر دوں گا۔

جبرو . جا ! باتیں نہ بنا۔ تیری عورت پر ہمارا قبضہ رہے گا ۔

طیفہ : (غیر معمولی طور پر چلاتے ہوئے) جبرو منہ سنبھال !

جبرو : چل گھر چپکے !

طیفہ : جبرو ! گھمنڈ ٹھیک نہیں۔ تیری بھی عورت ہے۔

جبرو . خبردار جو میری بیوی کا نام لیا تو ؛

طیفہ : جو میری بیوی کی طرف بڑھے گا۔ میں اس کی بیوی کی طرف بڑھوں گا ۔

جبرو : چل بکواس بند کر۔ جو میری بیوی کی طرف بڑھے گا میں اسے چکنا چور کر دوں گا ۔

(نشے کی وجہ سے جبرو میں استقامت نہیں رہتی)

طیفہ : بس رہنے دے ۔ بڑے دیکھے ہیں چکنا چور کرنے والے ۔

جبرو : لے میں تیری بیوی کو نکال کر لاتا ہوں۔ کر کیا کرتا ہے ،

طیفہ : میں اپنے باپ کا نہیں جو تمہاری کو اٹھا نہ لاؤں ۔

جبرو : ٹھہر ! تیرے کمین کی ————

جوش میں آتا ہے اور چاقو نکال کر بڑھتا ہے طیفہ سنبھلتا ہے دونوں مقابل
آتے ہیں۔ کش مکش شروع ہو جاتی ہے۔ گلو مدد کے لیے بڑھتا ہے۔ لیکن طیفہ
اسے اٹھا کر جبرو کے اوپر پٹخ دیتا ہے جبرو بچتا اور گلو کو ایک طرف ہٹا دیتا
ہے۔ طیفے پر جھپٹ کر۔ چاقو کا گہرا وار کرتا ہے بہ ہزار دقت طیفہ جبرو کی
کلائی پکڑ لیتا ہے ۔ گلو بھاگ جاتا ہے دور سے گلو کے چلانے کی آواز آتی ہے
ارے کوئی آؤ ! ماجی ، ساجی ۔ بوٹی سائیں ! کوئی ہے ؟ ارے جھٹ آؤ !

خون ہو چلا۔ خون ہو چلا ــــــــــــ

طیفہ چاقو چھین لیتا ہے اور جیرو کے بھونک دیتا ہے جیرو "ہائے"
کہہ کر گر پڑتا ہے۔ دونوں مہلک طور پر زخمی ہوئے ہیں)

طیفہ : چھین میں تو ؟

جیرو : بذات! تو نے نہیں شراب نے مارا ہے۔ تیری بوٹی بوٹی کر دیتا ہائے اے میرے اللہ!

طیفہ : (دیوار سے سہارا لے کر۔ چاقو پھینک کر اور زخمی پسلیوں پر ہاتھ رکھ کر) تو کیا بوٹی بوٹی کر سکتا ہے۔ بدلہ لے لیا۔ ایک دن تجھ سے ٹکر لینی تھی۔

(طیفہ دیوار کا سہارا چھوڑ کر چلتا ہے۔ گھاؤ گہرا ہے گر پڑتا ہے۔
سنبھل کر اٹھتا اور باہر نکل جاتا ہے۔ سازوں پر بھیانک الم انگیز
تاثر۔ بوٹی سائیں۔ گلو۔ تاجاں اور جیناں آتے ہیں سازوں کی
آواز مدھم ہو جاتی ہے تاجاں اور جیناں رو رہی ہیں)

جیرو : آگئے

تاجاں : یہ کیا ہوا جیرو ؟

جیرو : دنیا میں کچھ نہیں۔ ہائے ہائے یہاں کچھ نہیں۔ ہائے میرے اللہ! بوٹی سائیں کی بات ٹھکرا کر اچھا نہیں کیا ؛

بوٹی سائیں : جیرو پہلوان! بڑی جلد بازی کی تو نے ؛

جیرو : کوئی بات نہیں۔ مرنے جینے پر کسے اختیار ہے ؟ ہونی ہو کر رہتی ہے۔

بوٹی سائیں : امر ربی میں کسی کو دخل تو نہیں۔ پھر بھی نادانی بری چیز ہے۔

جیرو : قدرت جو کرتی ہے ٹھیک کرتی ہے میرے اعمال نامے میں ایک نیا دھبہ لگتے لگتے رہ گیا۔

تاجاں : کون سا دھبہ جیرو ؟

جبرو: (منہ چھپاکر) جیناں مجھے معاف کر دے! میں نے تجھے محبت کا فریب دیا۔ آج میں تجھے بیچنے والا تھا۔ اور یہ نوٹ! یہ نوٹ واپس کر دینا! گمو! اسے لوٹا دینا۔ کہنا کہنا پانسو مجھے بخش دے۔

جیناں: اوئی اللہ جیبے! جیبے! تو کہاں گیا۔

دیوانہ وار باہر بھاگ جاتی ہے

تاجا: جبرو! گھبراؤ نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں۔ جیناں کے جانے میں زخم ٹھیک ہو جائے گا۔

جبرو: مجھے کہیں نہ لے جاؤ! میں جا رہا ہوں سب کو چھوڑ کر۔ میرا مولا مجھے بلا رہا ہے۔

دم توڑ دیتا ہے ——— خوفناک خاموشی

پردہ

سلسلے بگڑتے بنتے —

ریاض بٹالوی

کردار

خدیجہ ممتاز کی ماں عمر تقریباً پینتیس سال

ممتاز خدیجہ کی بیٹی عمر اُنیس سال

مجید ممتاز کا بھائی عمر تیرہ سال

غلام محمد ممتاز کا والد عمر پینتالیس سال

صفیہ خدیجہ کی بہن عمر تیس سال

ماما مشاطہ عمر تقریباً پینتالیس سال

سلطانہ عمر تقریباً چالیس سال

زینت سلطانہ کی بہن عمر تقریباً اٹھائیس سال

منظر

(ایک چھوٹا سا کمرہ سامنے دیوار میں ایک دروازہ — اس دروازہ کے بائیں طرف سیڑھیاں ہیں جو کمرے سے نظر نہیں آتیں۔ بائیں دیوار میں دو کھڑکیاں ہیں جو ایک چھوٹی سی گلی میں کھلتی ہیں۔ دائیں دیوار کے ساتھ ایک چارپائی ہے۔ اس پہ سفید چادر اور ایک تکیہ ہے کھڑکیوں کے ساتھ بھی ایک چارپائی ہے جس پر دھلا ہوا کھیس بچھا ہے۔ ان چارپائیوں کے درمیان ایک چھوٹی سی میز اور اس پر ایک نیا میز پوش پڑا ہے۔ ایک کونے میں بوسیدہ سی کرسی ہے — کمرے کے ماحول سے پتہ چلتا ہے کہ خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

پردہ اٹھتا ہے۔ تو کمرہ خالی ہوتا ہے۔ چند سیکنڈ کے بعد خدیجہ داخل ہوتی ہے)

خدیجہ : او مجید — مجید — کہاں مر گیا ہے تو — ادھر آ۔

مجید : (باہر سے) آیا (چند سیکنڈ کے بعد داخل ہوتا ہے) کیا ہے ؟

خدیجہ : ایک آواز سنائی نہیں ؟ — یہ کرسی باہر لے جا — اور وہاں والوں سے دو کرسیاں مانگ لا۔ اچھی سی ہوں — کہنا ابھی لوٹا دیں گے۔

مجید : اچھا۔

(کرسی اٹھا کر باہر لے جاتا ہے۔ خدیجہ دو ایک منٹ تک ادھر اُدھر گھومتی ہے۔ چارپائی پر تکیہ درست کرتی ہے۔ اس کی نظر چارپائی کے نیچے پھٹے ہوئے جوتوں پر پڑتی ہے جھک کر انہیں اٹھاتی ہے)

خدیجہ : ممتاز ـــــ اری ممتاز ـــ ادھر آ ـــــ کیا اب چولھے کے پاس ہی مرجائے گی۔

ممتاز : (کمرے میں داخل ہوتی ہے) کیا ہے ماں؟

خدیجہ : اری دیکھ ـــــ یہ پھٹے پرانے جوتے یہاں پڑے ہیں تجھے بھی کوئی خیال نہیں لے جا باہر انھیں اور ہاں اب وہ آتی ہی ہوں گی۔ جلدی سے کپڑے بدل لے اور دیکھو ہاتھ منہ بھی دھولینا۔

ممتاز : اچھا۔ (باہر جانے لگتی ہے)

خدیجہ : کہاں مرنے لگی ہے۔ میری بات تو پوری ہونے دے۔ کتنی پیالیاں ہیں؟

ممتاز : چار۔

خدیجہ : اگر وہ چھ ہوئی تو ـــــ اچھا ایسا کر کہ چھیدی کی ماں سے دو پیالیاں مانگ لا۔

ممتاز : ہاں! ان پیالیوں کے رنگ جدا ہوں گے۔ اور یہ پیالیاں مانگی ہوئی معلوم ہوں گی۔

خدیجہ : تو پھر ـــــ خیر چھیدی کی ماں سے چائے کا سیٹ ہی مانگ لے۔ کہنا وہ سبز رنگ والا سیٹ دے دے۔ ذرا جلدی کر۔

(ممتاز باہر جاتی ہے)

خدیجہ : (اکیلی کمرے میں) ابھی تک تمہارا باپ نہیں آیا۔ کہا تھا آج جلد گھر آجاییو۔ مگر وہ سنتا ہے کسی کا

(باہر سے گلا صاف کرنے کی آواز آتی ہے)

شکر ہے وہ آگیا۔

(غلام محمد کمرے میں داخل ہوتا ہے)

خدیجہ : اتنی دیر میں آئے ہو ـــــ کیا تنخواہ بھی لائے؟

غلام محمد : تنخواہ تو نہیں ملی۔ بڑی مشکل سے دس روپے لایا ہوں۔

خدیجہ : صرف دس روپے! کیا اس مہینے تنخواہ نہیں ملے گی؟

غلام محمد : ملے گی کیوں نہیں ـــ آج کل کچھ مندا ہے اس لیے مالک کا ہاتھ تنگ ہے۔

خدیجہ : بڑی مصیبت ہے آج دس تاریخ ہوگئی۔ مجید فیس کے لیے روتا ہے۔ اس پہ اناج وغیرہ ختم ـــــ

گیا کیا جائے ؟

غلام محمد : خیر یہ تو بعد میں دیکھا جائے گا۔ کیا وہ عورتیں ابھی نہیں آئیں ؟

خدیجہ : نہیں ـــــ میں تو سمجھ بیٹھی تھی کہ تم رات گئے گھر لوٹو گے۔ اس کمبخت سے دو روپیہ اُدھار منگوا لئے ـــــ دودھ چینی اور چائے مجید لے آیا ہے۔

غلام محمد : خالی چائے دوگی کیا ؟

خدیجہ : نہیں ـــــ اب تم جلدی سے کچھ کھانے کی چیزیں لے آؤ ـــــ تھوڑا سا پھل اور پیسٹری۔ ذرا جلدی کرو۔ بس وہ آنے والی ہوں گی۔

غلام محمد : مجید کہاں ہے ؟

(مجید کرسی لیے داخل ہوتا ہے)

خدیجہ : اسے یہاں رکھ دو۔ میں خود ڈھکانے پر رکھ لوں گی۔ دوسری کہاں ہے ؟

مجید : باہر ہے۔ وہ بھی لاتا ہوں۔

غلام محمد : چل مجید میرے ساتھ تم پھل لے کر آجانا۔ میں دوسرے بازار سے پیسٹری لاؤں گا۔

(مجید دوسری کرسی بھی باہر سے لاتا ہے)

خدیجہ : ہائے دیکھو ابھی تک صفیہ نہیں آئی۔ بس مجھے اس کی یہ عادت بہت بری لگتی ہے۔ اس سے کام ہو ذرا تو لگتی ہے نخرے کرنے۔

غلام محمد : پریشان کیوں ہوتی ہو۔ آتی ہی ہوگی۔ گلی میں تو رہتی ہے۔ اُسے آواز دیتا جاؤں گا۔

(غلام محمد اور مجید باہر جاتے ہیں)

خدیجہ : ممتاز ـــــ اری او ممتاز ـــــ ایک آواز کا تو اس پر اثر ہی نہیں ہوتا!

ممتاز : (باہر سے آواز آتی ہے) کیا ہے اماں ؟

خدیجہ : سیٹ مل گیا ہے کیا ؟

ممتاز : لے آئی ہوں۔

خدیجہ: اچھا — اِدھر آ ——— بات سُن۔

(ممتاز آتی ہے)

خدیجہ: دیکھ! جب وہ عورتیں آئیں تو تم چولھے کے پاس ہی رہنا۔ اور جب میں تمھیں آواز دوں۔ تو پھر اندر آنا۔ سُن رہی! مجھے تیری یہ عادت بہت بُری لگتی ہے۔ کہ تو پاگلوں کی طرح بات کرنے والے کا بِٹر بِٹر منہ دیکھنے لگتی ہے ان کے سامنے ایسا نہ کرنا۔ آنکھیں نیچی کرکے چپکے بیٹھی رہنا اگر وہ تم سے کچھ پوچھیں تو دھیمے لہجہ میں جواب دینا۔ سمجھ گئی ہو نا۔

ممتاز: جی۔

خدیجہ: اچھا اب جا۔ اور جلدی سے کپڑے بدل لے۔

(ممتاز باہر جاتی ہے اور خدیجہ کرسیوں کو ایک ایک کونے میں رکھتی ہے۔ پھر کمرے کا جائزہ لیتی ہے۔ چارپائی کی پائینتی کی طرف بڑھتی ہے اور دیوار کے ساتھ ایک پائے کے پاس کتاب اٹھاتی ہے)

خدیجہ: (خود بخود بڑبڑاتی ہے) الّو کا پٹھا۔ پڑھتا پڑھاتا کچھ نہیں۔ بس جس طرف دیکھو۔ اس کی کتابیں ہی بکھری ہوتی ہیں۔ ——— تو ابھی تک صفیہ نہیں آئی

(باہر جاتی ہے اور چند لمحے کمرہ خالی رہتا ہے)

(صفیہ پہلے اور اس کے پیچھے خدیجہ داخل ہوتی ہے دونوں آپس میں باتیں کرتی آتی ہیں)

صفیہ: آپا! تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔

خدیجہ: میرے دل میں بار بار وسوسے اٹھتے ہیں۔ تابو کہتی ہے کہ وہ امیر لوگ ہیں اور ہم ——— خیر وہ تو تم جانتی ہو۔

صفیہ: (چارپائی پر بیٹھتے ہوئے) اگر وہ لوگ امیر ہیں تو ہوا کریں۔ ہم اُن کے ہاں بھیک تو مانگنے جا رہیں ہے اپنی اپنی پسند ہے ——— اور پھر آپا! میں تو کہتی ہوں۔ مقدر کی بات ہے۔ اگر رشتہ ہونا ہوا تو ضرور ہوگا۔

خدیجہ : ٹھیک ہے۔ اپنے اپنے مقدر کی تو ہیں۔ پر میں سوچتی ہوں ایسے امیر لوگوں کو ہمارے جیسے غریبوں کے دروازے پر آنے کی کیا ضرورت ہے۔ کہیں لڑکے میں کوئی عیب نہ ہو

صفیہ : کیا آج ہی نکاح کر رہے ہیں ؟ لڑکے کی جانچ بھی تو کرنا ہے۔

خدیجہ : ——— چلو چائے کا بندوبست دیکھیں۔

(دونوں باہر جاتی ہیں کمرہ دو منٹ کے لیے خالی رہتا ہے)

غلام محمد : (کمرے میں داخل ہوتے ہوئے) ممتاز کی ماں !

خدیجہ : (باہر سے) آتی ہوں۔

(خدیجہ اور صفیہ دونوں کمرے میں داخل ہوتی ہے)

غلام محمد : لو ! پیسٹری تو لے آیا ہوں۔ کچھ اور تو نہیں چاہیے۔ میں باہر بازار میں ملیجے کی دکان پر ہوں گا۔ جب وہ عورتیں جا چکیں تو مجھے بلا لینا۔

صفیہ : آپا گھبرا رہی ہے۔

غلام محمد : کیوں ؟ گھبرانے کی اس میں کیا بات ہے ؟ کیا ہماری لڑکی کوئی کانی یا لنگڑی ہے۔ جو تمہیں ڈر لگتا ہے

خدیجہ : یہ بات نہیں۔ سنا ہے وہ امیر لوگ ہیں۔

غلام محمد : امیر لوگ ہیں تو بس ٹھیک ہے۔ ابھی کونسی بات پکی ہو رہی ہے۔ اچھا میں جاتا ہوں۔

(باہر جاتا ہے)

خدیجہ : ابتک نہیں آیا۔ آ جانا چاہیے تھا۔

صفیہ : بس آتی ہی ہوں گی۔

(دونوں پھر باہر جاتی ہیں۔ ——— چند منٹ کا وقفہ

باہر سے مختلف آوازیں آتی ہیں جس میں بسم اللہ۔ سلام۔ وعلیکم

صاف طور پر سنی جاتی ہیں اور ساتھ ہی کمرے میں خدیجہ کے ساتھ سلطانہ،

زینت ، تابو اور صفیہ داخل ہوتی ہیں۔)

خدیجہ: (سلطانہ سے) تشریف رکھیے۔

(سلطانہ اور زینت کمرے پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالتی ہیں اور اپنے
ریشمی برقعوں کو اتار کر چارپائی کی ایک طرف رکھتی ہیں۔ دونوں عورتوں
کے لباس سٹینڈرڈ ٹائپ ہیں۔ لباس اور چہرے کا میک اپ وقت کے فیشن
کے مطابق نظر نمائش مدعا ہے۔ سرخی اور غازے کا استعمال بڑی فراخدلی
سے کیا ہوا ہے۔ سلطانہ چارپائی پر بیٹھنے لگتی ہے)

خدیجہ: کرسی پر بیٹھیے۔

سلطانہ: (چارپائی پر بیٹھتے ہوئے) نہیں ٹھیک ہے۔ میں چارپائی پر ہی بیٹھوں گی۔

خدیجہ: (زینت سے کرسی چارپائی کے پاس کرتی ہوئی) آپ اس پر بیٹھیے۔

زینت: نہیں میں چارپائی پر ہی ہوں۔

سلطانہ: تابو! باہر جا کر میرے نوکر کو کہہ دے۔ کہ ابھی تانگہ نہ لے جائے۔ ہم تھوڑی دیر کے بعد آ رہی ہیں۔

خدیجہ: تابو بہن تم بیٹھو۔ میرا لڑکا جا کر کہہ آتا ہے۔ مجید —— او مجید ——

مجید: (دروازے پر) جی!

خدیجہ: (سلطانہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ان کا تانگہ باہر کھڑا ہے ان کے نوکر سے کہو کہ وہ کہیں
جائے نہ۔ بی بی تھوڑی دیر کے بعد آ جائے گی۔

مجید: اچھا۔

(باہر جاتا ہے —— چند سیکنڈ تک خاموشی)

سلطانہ: بہن بس اتنا ہی مکان ہے؟ نچلی منزل آپ کے ہی پاس ہے؟

خدیجہ: پچلی منزل میں کوئی اور رہتے ہیں۔ ہماری جگہ یہی ہے۔ یہ کمرہ باہر دالان اور ایک چھوٹی سی کوٹھری

زینت: مکان تو بہت چھوٹا ہے۔

صفیہ : آج کل مکان کہاں ملتے ہیں۔ یہی غنیمت ہے بہن۔

زینت : کیا یہ اپنا مکان ہے ؟

خدیجہ : (تابو کی طرف ایک نظر ڈالتی ہے) نہیں بہن۔ کرایہ پر رہتے ہیں۔

تابو : بہن مکان کرایہ کا ہو یا اپنا۔ یہ کوئی اتنی ضروری بات تو نہیں۔ ضروری ــــــ

سلطانہ : چھوڑو اس قصہ کو۔ بہن سچ پوچھو تو ہم شرافت کے گاہک ہیں۔ ہمارے پاس خدا کا دیا سب کچھ ہے۔

تابو : شاباش کی ماں! ہم نہ کہتی تھیں۔ بی بی سلطانہ کو دولت کی پروا نہیں ــــــ تمہاری بیٹی راج کرے گی راج!

سلطانہ : بہن! دولت تو اللہ کی دین ہے سب سے بڑی چیز تو شرافت ہے۔

خدیجہ : آپ کی مہربانی۔ پر ایک بات ضرور ہے۔ کہ ہم آپ کی برابری نہیں کر سکتے۔

زینت : اس میں برابری کی کیا بات ہے۔ بہن لڑکی اپنے نصیب اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ دعا کرو لڑکی بھاگوان ہو۔

سلطانہ : بہن! میرا لڑکا بھی یہی چاہتا ہے۔ کہ کسی غریب گھرانے کی لڑکی ہو سلیقہ شعار ہو۔ خواہ معمولی لکھی پڑھی ہو۔ ویسے تو ہمیں بڑے بڑے گھرانوں کے رشتے آئے۔ مگر جانتی ہو۔ تو ہمیں لڑکے کی مرضی کا بھی خیال رکھنا ہے۔

تابو : ہاں خدا نظر بد سے بچائے۔ بی بی تمہارا لڑکا تو ہزاروں میں ایک ہے۔ امیروں والی اس میں کوئی بات ہی نہیں۔

خدیجہ : میں ابھی منٹ میں آئی۔ صفیہ ذرا باہر تو آنا۔

سلطانہ : بس رہنے دو تکلف کیوں کرتی ہو۔ ہم تو شام کی چائے پی کر ہی آئی ہیں۔

صفیہ : اس میں کون سا تکلف ہے چائے کی ایک پیالی تو کوئی بات نہیں۔

(دونوں باہر جاتی ہیں)

زینت : (دھیمے لہجہ میں) آپا! یہ تو بہت ہی مفلس معلوم ہوتے ہیں۔ لڑکی کا باپ کیا کرتا ہے؟

سلطانہ : ہیں تو واقعی مفلس ــــــ فرنیچر کی دکان ہے لڑکی کے باپ کی ــــ کیوں تابو؟

تابو : نہیں بی بی! اس کی اپنی دکان نہیں۔ کسی کی دکان پر ملازم ہے۔ خود میز کرسیاں بناتا ہے۔

زینت : (مسکراتے ہوئے) چلو کپا۔ آپ کے فرنیچر بنانے کی الجھن تو ختم ہوئی۔

سلطانہ : پتابو! تم نے تو پہلے یہ نہیں بتایا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے تم نے کہا تھا کہ اس کی اپنی دکان ہے۔

تابو : خدا کو جان دینا ہے بی بی! میں نے جھوٹ بول کر کیا لینا ہے۔ اور پھر لڑکی کی ماں نے مجھ سے کچھ نہیں چھپایا۔ اس نے مجھے صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ وہ مزدور لوگ ہیں۔ لڑکی کا باپ ستر اسی روپے ماہوار کماتا ہے۔

(ایک منٹ تک خاموشی رہتی ہے)

سلطانہ : لڑکی کو تو دیکھنا چاہیے۔

(صفیہ اور خدیجہ چائے وغیرہ لے کر داخل ہوتی ہیں۔ چائے چھوٹی میز پر رکھ کر دونوں چارپائیوں کے درمیان رکھ دی جاتی ہے۔ کرسیاں بھی پاس کھسکا دی جاتی ہیں۔ صفیہ چائے دانی سے چائے انڈیلتی ہے)

صفیہ : (سلطانہ کی طرف پیالی بڑھاتے ہوئے) لو بہن! آپ کو ہم غریبوں کی چائے لینا آ جائے تو زہے قسمت۔

سلطانہ : (پیالی اپنے سامنے رکھتے ہوئے) آپ تو ہمیں شرمندہ کرتی ہیں۔

(زینت اور تابو کو بھی چائے دی جاتی ہے)

سلطانہ : (خدیجہ سے) آپ چائے نہیں پئیں گی؟

خدیجہ : آپ پیجئے۔ میں تھوڑی دیر ہوئی چائے پی کر بیٹھی تھی۔

(کچھ وقفہ)

تابو : ممتاز کی ماں! شادی کی تیاریاں تو کر رہی ہوں گی نا۔

خدیجہ : بہن! غریبوں کی کیا تیاریاں ہوتی ہیں۔

زینت : خیر لڑکی والوں کو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔

صفیہ : ٹھیک ہے منوں دھوے میں بھی کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔ سات جوڑے تیار ہیں۔

تایو : اور زیور ؟

خدیجہ : زیور۔ کوئی خاص تو نہیں۔ بس کان کے بُندے۔ دو انگوٹھیاں اور دو دو چوڑیاں ہیں۔

سلطانہ : لڑکی کی قسمت تیز ہو۔ تو زیوروں کی کیا کمی ——— ؟ اں بہن ذرا لڑکی کو تو بلانا

خدیجہ : اچھا۔ صفیہ ! ممتاز کو بلانا۔

(صفیہ باہر جاتی ہے)

زینت : بہن ! ممتاز کو کتنا پڑھایا ہے۔

خدیجہ : آٹھ جماعتیں ——— اسے پڑھنے کا تو بہت شوق ہے۔ پر آپ جانتی ہیں کہ آج کل زمانہ بہت خراب ہے۔ جوان جہان لڑکیوں کا سکول جانا کوئی ٹھیک نہیں ——— گھر میں ادیب عالم کی تیاری کر رہی ہے۔

زینت : آپ تو پرانے زمانے کی باتیں کرتی ہیں۔ اس زمانہ میں لڑکیوں کے لیے تعلیم بہت ضروری ہے۔

خدیجہ : یہ ٹھیک ہے ——— پر بہن ! اسکول کے خرچ کا بھی تو کوئی ٹھکانہ نہیں۔

(ممتاز صفیہ کے ساتھ دروازے پر نمودار ہوتی ہے)

سلطانہ : آؤ بیٹی۔ یہاں آؤ۔ میرے پاس بیٹھو۔

(سلطانہ اپنی جگہ سے ذرا سی کھسکتی ہے۔ ممتاز منہ نیوڑائے اس کے قریب آتی ہے)

ممتاز : (نہایت دھیمے لہجہ میں) سلام علیکم !

سلطانہ : جیتی رہو بیٹی۔ بڑے نصیب ہوں۔

(سلطانہ ممتاز کو اپنے پاس بٹھاتی ہے اور بڑے پیار سے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتی ہے۔ ہاتھ پھیرنے کا انداز بڑا مشتاق ہے سلطانہ کا ہاتھ ممتاز کی کمر سے ہوتا ہوا بغل تک جاتا ہے اور اس

کی چھاتیوں کو چھوتا ہے۔ پھر وہ اپنا ہاتھ ہٹا کر ممتاز کا چہرہ اوپر اٹھاتی ہے

زینت۔ ماشاءاللہ لڑکی خوبصورت ہے۔

سلطانہ۔ جیسے بے خبری میں ممتاز کی زانو پر ہاتھ رکھا ہے کشیدہ کاری جانتی ہو گی بیٹی تم؟

ممتاز: اسی طرح زینو آئے ہے جی

تابو: خدا اس کی عمر دراز کرے بڑی سلیقہ شعار ہے۔ کھانا پکانا تو کوئی اس سے سیکھے۔ گم گو ہے اور عقلمند

سلطانہ: بیٹی تم کس سکول میں پڑھتی تھیں۔

ممتاز: مشن سکول میں۔

زینت: عقلمند تو ہو تیا معلوم ہوتی ہے

خدیجہ: ممتاز اب تم اندر جاؤ

سلطانہ: نہیں۔ ابھی کچھ دیر بیٹھنے دو

اپنے پرس سے دس روپے کا نوٹ نکال کر ممتاز کو دیتی ہے۔

دوسری طرف سے مٹھائی کھا لیتا

خدیجہ: رہنے دیجئے۔ یہ ٹھیک نہیں

سلطانہ: کیا ٹھیک نہیں۔ میں بیٹی سمجھ کر دے رہی ہوں۔ لو بیٹیا

ممتاز: جی نہیں —— آپ کی مہربانی ہے۔

زینت: یہ معمولی بات ہے (خدیجہ سے) اسے لو۔ اسے رکھ لے۔

خدیجہ: رہنے دیجئے۔ ہمیں شرمندہ نہ کیجئے۔ آپ کا ہمارے ہاں آنا ہی ہمارے لیے سب کچھ ہے۔

سلطانہ: آپ خواہ مخواہ ضد کرتی ہیں۔ میری خوشی کے لیے اسے لینے دیجئے۔ میں بھر کہتی ہوں۔ بیٹی سمجھ کر دے رہی ہوں۔ لو بیٹی!

(زبیدہ کچھ نوٹ ممتاز کے ہاتھ میں تھما دیتی ہے)

اچھا اب تم جاؤ۔

(خدیجہ کا اشارہ پاتے ہی ممتاز باہر چلی جاتی ہے)

سلطانہ: خدا لڑکی کے نیک نصیب کرے۔ مجھے بڑی اچھی لگتی ہے۔

تابو (خوش ہو کر) ہاں تو کہتی بھی لڑکی بہیر لاکھ بہیرا

سلطانہ: بہن! اس کا رنگ پیلا سا کیوں ہے۔

خدیجہ: چند دنوں سے اسے بخار آ رہا ہے۔

سلطانہ: آج کل نامراد ملیریا کا موسم ہے۔ پرہیز کرنا چاہئے۔ دوا سے زیادہ پرہیز کی ضرورت ہوتی ہے۔

صفیہ: اب تو اسے بخار نہیں آتا۔ ویسے پرہیز کا خیال رکھتی ہے

سلطانہ: (صفیہ سے) بہن تم کہیں پاس پاس ہی رہتی ہو۔

صفیہ: ہاں اسی گلی میں۔ آٹھ دس مکان چھوڑ کر میرا مکان ہے۔

سلطانہ: کسی روز ہمارے ہاں تشریف لائیے۔

خدیجہ: بہتر —— کوشش کروں گی۔

(سلطانہ اور زینت اپنے اپنے برقعے سنبھالتی ہیں۔ تابو بھی ان کے ساتھ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہو جاتی ہے)

سلطانہ: اچھا ہمیں اجازت دیجئے۔ تانگہ کھڑا انتظار کر رہا ہے۔

خدیجہ: کچھ دیر تو اور بیٹھئے

سلطانہ: بس اب ہمیں چلنا چاہئے۔

خدیجہ: تابو! تم تو تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ۔

تابو اس وقت تو مجھے ایک کام ہے۔ کل ضرور آؤں گی۔

(تمام عورتیں باہر جاتی ہیں اور باہر سے سلام اور اس کا جواب

سنا جاتا ہے چند لمحوں کے بعد خدیجہ اور صفیہ کمرے میں داخل ہوتی
ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے مجید داخل ہوتا ہے اور آتے ہی پیسٹری
کا ایک ٹکڑا منہ میں رکھتا ہے)

خدیجہ : کمینے ! ذرا صبر تو کر۔ تیری جان کیوں نکلے جا رہی ہے۔ پیسٹری بھاگی نہیں جاتی۔ پہلے کرسیاں تو
ان کو پہنچا دے۔

مجید : پہلے مجھے چائے دو۔ پھر کرسیاں دے آؤں گا۔

خدیجہ : ارے جاتا ہے یا نہیں۔ پہلے کرسیاں دے آ۔ پھر چائے ملے گی۔ اور ممتاز کو یہاں بھیج دے۔

مجید : نہیں ! میں تو ــــــــــ

خدیجہ : جاتا ہے کہ میں اٹھوں ــــــ اس نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے۔

(مجید منہ میں بڑبڑاتا ہوا باہر چلا جاتا ہے)

صفیہ : توبہ۔ توبہ ــــ کتنی مغرور تھی لڑکے کی ماں ــــ کیا نام تھا ماں سلطانہ ــــــ دیکھو
تو آپا چائے بھی تو ایک گھونٹ پی کر چھوڑ دی۔ اور کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ نواب زادی ــــ

خدیجہ : یہ سب قصور تالو کا ہے۔ پتہ نہیں۔ انہیں ہمارے متعلق کیا کیا بتاتی رہی۔ اور وہ کن امیدوں پر یہاں
آئیں ــــ یہ عورت بھی کتنی بے وقوف ہے۔ بس اسے تو اپنے ٹکوں سے کام ہے۔

صفیہ : مجھے تو اس بات پر غصہ آ رہا ہے کہ ہم ان کے آگے بچھتی رہیں اور انھوں نے کسی چیز کی پرواہی نہ کی
ــــــ آپا ! میں تو پہلے ہی کہتی تھی۔ کہ امیر گھرانوں سے ٹکر لینا کوئی آسان کام نہیں۔

خدیجہ : مجھے کیا پتہ تھا کہ رشتہ کے لیے نواب زادیاں آ رہی ہیں۔ تالو نے صرف یہ بتایا تھا کہ کھاتا پیتا گھرانہ ہے
خیر ــــــ

صفیہ : اور جو اس کی بہن تھی۔ وہ تو سبحان اللہ ــــــــ مکان اپنا ہے ؟ زیور کیا کیا ہیں ؟ ایسے
پوچھ گچھ کر رہی تھی کہ توبہ ــــــ اب گھر جا کر ہمارا خوب مذاق اڑائیں گی۔

(ممتاز داخل ہوتی ہے)

خدیجہ : (ممتاز سے) برتن لے جا۔ اور یہ مٹھائی سنبھال کر رکھ۔

(ممتاز برتن سمیٹ کر باہر لے جاتی ہے)

(غلام محمد داخل ہوتا ہے۔)

غلام محمد : کیا انھیں لڑکی پسند آئی؟

صفیہ : ہاں پسند آئی۔

غلام محمد : تو پھر؟ (خدیجہ سے) تم منہ پھلا کر کیوں بیٹھی ہو؟

خدیجہ : میں سوچ رہی ہوں ان کے بہت اونچے خیال ہیں۔ ان کا انداز ہمارے متعلق کچھ اور تھا۔

غلام محمد : یہ پہلے سوچا ہوتا۔ تو تو بڑی خوش تھی کہ امیر گھرانے سے بات لگ رہی ہے۔

خدیجہ : میں خوش کہاں تھی۔ اور پھر میں انھیں جانتی تھوڑا ہی تھی۔ یہ تو آج ہی اُنہی کی زبانی معلوم ہوا۔

غلام محمد : بہرحال یہ ہماری بے وقوفی ہے۔ کہ خود سمجھتے سمجھاتے تو ہیں نہیں۔ اور آنے دیتے ہیں گھر میں جیسے —— جیسے سودا چکا رہے ہیں لڑکی کا۔

خدیجہ : ایسا نہ کہو

صفیہ : اور تو اور —— جاتے جاتے ممتاز کو دس روپے بھی دے گئی ہیں۔

غلام محمد : کیوں؟ تم نے کیوں لینے دیئے —— اتنی بے عزتی ——

خدیجہ : میں کب لیتی تھی۔ پر وہ لڑکے کی ماں برابر اصرار کرتی رہی۔

غلام محمد : گویا وہ اپنی طرف سے چائے کے پیسے دے گئی ہیں۔

صفیہ : میرا تو خیال ہے۔ ابو کے ہاتھ —— یہ پیسے لوٹا دینا چاہیئے۔

غلام محمد : ضرور ہمیں یہ روپے واپس کر دینے چاہئیں۔ ہم غریب سہی —— مگر ہماری بھی کو[illegible] عزت ہے

(کچھ وقفہ)

خدیجہ : لڑکے کی ماں —— بار بار شرافت کا ذکر کرتی تھی۔

صفیہ: آپا! یہ تو سب کہنے کی باتیں ہیں۔ شرافت کا کوئی مول ہوتا ہے کیا۔

خدیجہ: پر ایک بات تو ہے کہ وہ جاتے جاتے ہمیں اپنے گھر آنے کی دعوت دے گئی ہیں۔

غلام محمد: تو تمھارا خیال تھا۔ کہ ایک دم کورا جواب دے جاتیں —— کچھ بات بھی رکھنا تھی نا۔ انھوں نے —— میری اناتو کل تابو کے ہاتھ یہ دس روپے واپس بھیج دو۔ اور کہلا بھیجو۔ کہ آپ ہمارے گھر تشریف لائیں۔ آپ لوگوں کی بہت مہربانی —— مگر ہم چائے کے پیسے لینا نہیں چاہتے۔

خدیجہ: پر میں کہتی ہوں۔ کہ کل تابو بھی ہمیں کچھ بتائے گی کہ نہیں —— اور سچ تو یہ ہے صفیہ! کہ انھوں نے نہ ہاں کی ہے اور نا نہ۔

غلام محمد: پھر وہی بات —— تم سمجھتی کیوں نہیں۔ کہ انھیں غلط فہمی ہوئی تھی۔ اور وہ کچھ نہ کچھ کہہ کر اپنا پیچھا چھڑانا چاہتی تھی۔

خدیجہ: تم تو ایسے باتیں بنا رہے ہو کہ تمھیں کوئی پروا ہی نہیں۔

غلام محمد: میں تم سے جھگڑنا نہیں چاہتا۔ مگر یہ ضرور کہوں گا کہ تم اپنی اوقات بھول رہی ہو۔ اور امیر گھرانے کے پیچھے اپنی ہنسی اڑا رہی ہو۔

خدیجہ: مگر لڑکی کو کسی کنگال کے پلے تو نہیں باندھنا — مجھے تو سو طرح کے دھیان ہیں۔

غلام محمد: تو رکھو دھیان —— میں تمھیں روکتا نہیں۔ گھر بٹھا رکھو لڑکی کو۔

خدیجہ۔ عجیب باتیں کرتے ہو۔ جیسے تمھیں کوئی واسطہ ہی نہیں۔

صفیہ: آپا! جھگڑنے سے کیا فائدہ۔ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ پر ایک بات کا مجھے بھی بڑا دکھ ہے۔ کہ تین بار تمھارے لیے رشتے آئے اور تینوں بار غریبی کو دیکھ کر بات آئی گئی ہو گئی۔ کیوں نہ ہم اپنی طرح کے کوئی مفلس اور محنتی لڑکے کی تلاش کریں چھوڑو بس قصہ کو —— کہ ضرور امیر ہی گھرانہ ہونا چاہئے۔ میں تو یہ جانتی ہوں کہ بس اپنی لڑکی کی قسمت کی رتی تیز ہونا چاہئے۔ تو مفلسی میں بھی راج کرے گی۔

غلام محمد: تمھاری بہن کسی کی بات تھوڑا ہی مانے گی۔ میرے بس میں ہوتا تو کبھی کا کسی محنتی اور شریف نوجوان سے شادی کر دیتا۔ مگر میری کون سنتا ہے۔ اس گھر میں —— اس نے لڑکی کو اٹھ جماعتیں اور وہ —— ادیب ودیب کیا پڑھا رہی ہے۔ کہ اب اسے کچھ سوجھتا ہی نہیں۔

خدیجہ: باتیں بنانے تو بیٹھ گئے ہو۔ پر تم نے کونسی کوشش کی ہے۔ پھر بتاؤ کہ کون سے مطلب کے رشتے آئے ہیں۔

غلام محمد: الٹی سیدھی باتیں کرکے مجھے غصہ نہ چڑھاؤ۔ کبھی کہتی ہو۔ لڑکی کو کنگال کے ساتھ تو نہیں کرنا۔ اور کبھی کہتی ہو۔ کہ مطلب کے رشتے کتنے آئے ہیں۔ اور آ ہی سکتے ہیں۔ مگر جو رشتے تم چاہتی ہو۔ وہ کبھی بھی ہماری سیڑھیوں پہ آنے کے نہیں۔

خدیجہ: امیروں کی پروا کرتی ہے میری جوتی —— انھوں نے لڑکی دیکھنے کی خواہش کی۔ تو بتاؤ۔ میں کیا کرتی۔ لڑکی والوں کا تو سر ہمیشہ نیچے ہی رہتا ہے۔ میرے اللہ نے چاہا تو دیکھنا سب ٹھیک ہو گا۔ میں کسی کو فریب یا دھوکا نہیں دے رہی اور ——

(یک لخت تابو دروازے پر نمودار ہوتی ہے۔ اسے دیکھ کر تینوں حیران ہوتے ہیں)

تابو: (کھڑے کھڑے) بہن! عجیب عورتوں سے واسطہ پڑا ہے۔ کل تک انتظار بھی نہ کر سکیں۔ کھڑے کھڑے مجھے واپس تمھارے ہاں بھیجا ہے۔

صفیہ: خیر تو ہے نا؟

تابو: (چارپائی پر بیٹھ کر) خیر ہی خیر ہے بہن! انھوں نے کہلا بھیجا ہے۔ کہ رشتہ منظور ہے بات پکی کرنے کا دن مقرر کر دیجئے۔

صفیہ: پر میں کہتی ہوں کہ

خدیجہ: (بات کاٹ کر) بہن تابو! دو چار روز کے بعد آنا۔ تو تعین بتاؤں گی۔ ہم آپس میں مشورہ بھی کر لیں۔

غلام محمد: اور لڑکے کی جانچ پڑتال بھی۔

پردہ

○

دشمن
شمار لعل تی شرن

پہلا منظر

(گریش کا ڈرائنگ روم، گریش اور اس کا دوست نریش آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھے ہیں)

نریش : تمھیں یاد ہے، ہم تمھیں کیا کہا کرتے تھے ——— ڈائی نوسٹر اور سچ مچ تم لگتے بھی ایسے ہی تھے ——— تمھارا وہ لمبا قد، جھکی کمر، میلی پتلون، بڑھے ہوئے بال اور پالش کو ترستے ہوئے بوٹ ——— کالج میں ان دنوں تم انسان نظر نہیں آتے تھے۔

گریش : (ہنستے ہوئے) چلو خیر ——— اب تو تمھیں انسان نظر آتا ہوں۔

نریش : انسان ہی نہیں بلکہ ایک خوبصورت سجیلے نوجوان! اب تمھارا جسم بھر گیا ہے۔ چہرہ پہ خشکی کی جگہ چمک آگئی ہے، بال تراشے ہوئے اور سنورے ہوئے اور لباس صاف اور ستھرا ہے۔ یہ انقلاب کیسے آیا؟

گریش : تمھاری بھابی کی وجہ سے۔

نریش : یقیناً اس کی اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی، تمھاری ذات سے تو اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

گریش : یہ بالکل درست ہے یار۔ — شادی کے ایک ڈیڑھ سال تک میں سروج کے لئے ایک مسئلہ بنا رہا یوں سمجھو کہ جہاں سے گزرتا، چیزیں گراتا، پھیلاتا اور بکھیرتا چلا جاتا۔ سروج بے چاری میرے پیچھے پیچھے چیزیں اٹھاتی اور سنوارتی پھرتی۔ صبح کو میں دفتر جاتا تو کمرے کی حالت ایسی ہوتی جیسے زلزلہ آیا ہو۔ لیکن شام کو لوٹتا تو ہر چیز قرینے سے لگی پاتا۔ یہی حال میرے کپڑوں کا تھا کبھی ٹرنک میں رہنے ہی نہ پاتے تھے۔

نریش : یوں کہو کہ تقدیر کے زور دار نکلے؟

گریش : ہاں یار! اس معاملے میں یقیناً تقدیر کو سراہتا ہوں۔ سروج نے میری زندگی میں ایک انقلاب

پیدا کر دیا ہے۔ مجھ پر اور اس گھر کی ہر چیز پر اس کے سلیقے اور سگھڑپن کی گہری چھاپ ہے

نریش : (فوٹو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ انھیں کی تصویر ہے نا ؟

گریش : ہاں! اور ساتھ میں میری بچی ہے۔ —— گم گم

نریش : تمھیں یاد ہے تم کہا کرتے تھے۔ تمھیں خوابوں کی چاہئے جس میں سوز کی ہلکی ہلکی جھلک ہو آنکھوں کو اس بے حد پسند کیا کرتے تھے نا ؟

گریش : ہاں —— کیوں ؟

نریش : تمھاری یہ خواہش بھی پوری ہو گئی —— بھابی کی آنکھیں دیکھو —— کس قدر حسین، کتنی گہری اور کتنی اتھاہ! لیکن ان میں اُداسی کا ایک باسی پھول بھی پڑا ہے جس نے اُن آنکھوں ہی میں نہیں بلکہ سارے چہرے پر ایک اُداسی۔ ایک سوز۔ ایک گھلاوٹ کا احساس پیدا کر دیا ہے۔ لگتا ہے آنسوؤں نے ان آنکھوں کے کناروں کو برسوں دھو دھو کر پختہ کیا ہے۔

گریش : تم تو شاعری کرنے لگے ہو۔

نریش : میں نے آج تک شاعری نہیں کی گریش یہ اُداس اداس آنکھیں اور تھکی تھکی پلکیں انھی گہرائیوں میں انسان کی تھکی ہاری آتما کو سچ مچ تھپک کر اس طرح سلا سکتی ہیں، جیسے ماں اپنے بچے کو۔

گریش : عجیب بات ہے کہ تم وہی باتیں کہہ رہے ہو نریش جو میں نے محسوس کی ہیں۔ لیکن جنھیں الفاظ میں ڈھال لینے کی کوشش نہیں کی۔ آج مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے —— میں بیمار پڑا تھا ایک رات میری حالت بہت خراب ہو گئی۔ ڈاکٹر بھی گم سم سا لوٹ گیا۔ سروج میرے سرہانے بیٹھی تھی۔ میں نے آنکھیں اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا، اس وقت میری آنکھوں میں خوف بھی تھا اور مایوسی بھی محبت بھی اور حسرت بھی اس وقت سروج نے اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ میرے ماتھے پر رکھ دیا اور اپنی پلکیں کچھ ایسے انداز سے بند کر لیں جیسے اس نے مجھے اپنی پلکوں میں چھپا کر رکھ لیا ہو۔ اور میں ایسے سو گیا جیسے کوئی تھکا ہارا بچہ سو جاتا ہے۔

(باہر ٹیکسی رکنے کی آواز اور ہارن سنائی دیتا ہے۔)

دوسرے روز ڈاکٹر کے ہاں سے لوٹ آتی ۔

(سروج ڈرائینگ روم میں داخل ہوتی ہے)

گریش : (تعارف کراتے ہوئے) سروج ——— میرے دوست ——— !

سروج : اوہ آپ آ گئے ——— نمستے ۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ میں آپ کے سواگت کے لیے گھر نہ رہ سکی ۔ مجھے آپ کے آنے کی خبر تھی لیکن پپی اچانک بیمار ہوگئی اور اُسے لے کر مجبوراً ڈاکٹر کے ہاں!

نریش : ایسی کوئی بات نہیں بھابی جی ! ——— آپ یہاں نہ تھیں ، لیکن یہاں کی ہر چیز سے آپ کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا ۔ پپی کہاں ہے ؟

سروج : نوکرانی پچھلی طرف سے اندر لے گئی ہے ——— ابھی بھیجتی ہوں اُسے ۔ آپ اس وقت چائے پئیں گے یا کوئی ٹھنڈی چیز ؟

گریش : کوئی چیز بھجوا دیجئے ——— میں چائے کے فوراً بعد لسی اور لسی کے بعد دودھ پی لیتا ہوں ۔

سروج : (متفکر ہو کر) نہیں نہیں ، ایسا نہ کیا کیجئے ۔ کبھی کبھی جسم ہماری لاپرواہیوں کو برداشت نہیں کر سکتا اچھا ! میں ابھی چائے لاتی ہوں ۔

(اندر چلی جاتی ہے)

نریش : گریش میں سچ کہتا ہوں تم بے حد خوش نصیب ہو ۔

گریش : اپنے منہ سے ہاں کرنا برا لگتا ہے نریش ! لیکن ہاں کہے بغیر رہا بھی نہیں جاتا (ایکا ایک سنجیدگی دور کرتے ہوئے اور موضوع بدلتے ہوئے) اچھا ان باتوں کو چھوڑو ۔ یہ تو بتاؤ کالج کے ساتھی کیسے ہیں ؟ کہاں ہیں ؟ میں تو سب سے الگ ہو گیا ہوں ۔

نریش : اُسے سب اچھے ہیں ——— یہاں تک کہ تم جیسے گاؤدی بھی ۔

گریش : (ہنستے ہوئے) اچھا اچھا ! یہ تو بتاؤ شیام سندر کہاں ہے ؟

نریش : وہ پچھلے دنوں گورکھپور میں ڈپٹی کلکٹر تھا۔

گریش : بہت آگے نکل گیا۔

نریش۔ ہاں ! تقدیر کا سکندر نکلا۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ نارائن ایکٹر بن گیا۔

گریش : ہاں ! میں بمبئی میں اس سے ملا بھی تھا۔ ٹھاٹ ہیں سالے کے، یار اُسے شروع ہی سے شوق تھا اس لائن کا

نریش : چلو اسے تو شروع سے ہی شوق تھا مگر اس حسنی کو کس بات کا شوق تھا ؟ آج کل ایک اخبار کا ایڈیٹر بنا ہوا ہے۔

گریش : (تعجب سے) حسنی اور ایڈیٹر ! اسے تو کلرک ہونا چاہیئے تھا مگر اس لحاظ سے تو اپنے سب ساتھی زندگی میں اپنے اپنے مقام پر پہنچ گئے ہیں

نریش : ہاں ! اگہرا سانس لے کر) سب زندگی میں کامیاب ہوگئے لیکن بے چارہ ونود ——— !

گریش : ونود ؟ ——— اوہ وہ تمہارا دوست ، اسے کیا ہوا ؟

نریش : اس نے خودکشی کرلی۔

گریش : (حیرت سے) خودکشی ؟

نریش ، ہاں ——— بڑی دردناک موت تھی !

گریش : اوہ ——— میں تو اسے قریب سے نہ جان پایا مگر تم بتایا کرتے تھے کہ وہ کوئی ریسرچ کر رہا تھا۔

نریش : اس نے اپنا تھیسس مکمل بھی کر لیا تھا مگر موت اس کی تاک میں تھی۔

گریش (کیا ہوا ؟

نریش : کیا بتاؤں ——— کمبخت نے مجھے بھی اس وقت بتایا جب پانی سر سے گذر چکا تھا

گریش : کیا محبت ——— ؟

نریش : ہاں ! اور اس محبت نے اُس کی جان لے ڈالی۔

گریش : لیکن وہ تو بہت سیدھا سادا لڑکا تھا ؟

نریش : اسی لیے تو اپنی جان تک دے بیٹھا ۔ وہ جتنا سیدھا تھا اتنا ہی جذباتی بھی تھا ۔ خاموش رہتا تھا اس بیے محسوس بہت کرتا تھا معمولی سی بات بھی اس کے لیے پہاڑ بن جاتی تھی ۔ اور اس پہاڑ پر بیٹھ کر تفکرات میں اس طرح گم ہو جاتا جیسے چاروں طرف سیلاب اُمڈ رہا ہے اور اسے دنیا کو بچانا ہے

گریش : مگر یہ ہوا کس طرح ؟

نریش : یار کالج کے زمانے میں اُسے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی ۔ لڑکی کسی بہت بڑے گھرانے کی تھی ۔ اس نے لڑکی کے باپ تک رشتے کی بات پہنچائی لیکن اس نے رشتہ ٹھکرا دیا ——— ونود کو کسی مندر کے پجاری نے پالا تھا ۔ اس کے بعد دونوں نے گھر سے بھاگنے کی صلاح بنائی لیکن رات کو جس وقت لڑکی اپنے گھر سے نکل رہی تھی اس کے والد نے آکر پکڑ لیا ——— ونود نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا اور اسے اتنا صدمہ پہنچا کر پاگل نے لیبارٹری سے سانیا ئیڈ نکال کر چاٹ لیا ۔

گریش : اوہ ——— کیا دردناک انجام ہے ——— لیکن اس لڑکی کا کیا ہوا ؟

نریش : ہوا کیا ہو گا ؟ ——— ماں باپ نے کہیں شادی کر دی ہو گی ؟

گریش : لیکن وہ تو جیتے جی مر گئی ہو گی وہ خوش تھوڑا ہی رہ سکتی ہے ۔

نریش : ہاں ! ——— کلیجہ مسوس کر جی رہی ہو گی ۔

(سروج پچھلے دروازے سے ڈرائینگ روم میں داخل ہوتی ہے ہاتھ میں چائے کی ٹرے ہے ۔)

سروج : لیجیے چائے لیجیے ۔

نریش : اوہ !

سروج : آپ دونوں کی کیا حالت ہو گئی ؟

گریش : کچھ نہیں ۔ نریش نے اپنے ایک دوست کی کہانی سنائی بے چارے نے خودکشی کر لی ۔

سروج : (چیخ کر) خودکشی ؟

(اور ایک ساتھ سروج کا سارا جسم لرز اٹھتا ہے۔ ٹرے اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑتی ہے اور وہ خوفزدہ ہو کر بُری طرح ہانپنے لگتی ہے۔ گریش اور نریش اٹھ کر اسے سہارا دیتے ہیں)

گریش : کیا ہوا سروج؟

نریش : آپ کو کیا ہوا بھابی جی۔

گریش : تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے سروج!

سروج : (اپنے آپ کو سنبھال کر) ہاں —— ہاں —— میں ٹھیک ہوں —— بس مجھے کسی کی خودکشی کی بات۔

نریش : آپ اس وقت آرام کیجئے بھابی جی —— وہ تو میرا دوست تھا۔ آپ کا نہیں۔

گریش : تم اندر چلو سروج —— میں تمھیں سہارا دیتا ہوں!

سروج : نہیں نہیں! میں خود چلی جاؤں گی، آپ مجھے معاف کریں۔

نریش : یہ کیسی بات کرتی ہیں آپ۔ گریش کو ایسی بُری بات کا ذکر آپ کے سامنے کرنا ہی نہیں چاہیئے تھا۔ آپ اندر جائیں۔

گریش : تم اندر جا کر کپڑے بدل لو نریش، میں ابھی آتا ہوں۔

نریش : ہاں ہاں! تم جاؤ۔

(گریش اور سروج اندر چلے جاتے ہیں۔ نریش جھک کر پاس رکھا ہوا سوٹ کیس اٹھاتا ہے اور بغل والے کمرے میں چلا جاتا ہے۔)

پردہ

○

دُوسرا منظر

گریش کا وہی ڈرائنگ روم ۔ صوفے پر گریش اور سُرج بیٹھے ہیں۔

سُرج : نریش ابھی تک نہیں آئے۔

گریش : آجائے گا اس کے دُور کے رشتہ دار یہاں رہتے ہیں ان سے ملنے گیا ہے۔

سُرج : پھر بھی بہت دیر ہوگئی ، اندھیرا ہو چلا ہے۔ انھیں اب تک آجانا چاہئے تھا !

گریش : تم بہت جلدی گھبرا جاتی ہو ، وہ اس شہر میں نیا تھوڑا ہی ہے۔ آجائے گا۔

سُرج : (کچھ لمحے خاموش رہ کر) اپنے پُرانے دوستوں سے ملاقات میں کافی وقت گزر جاتا ہے اور اس کا احساس ہی نہیں ہوتا۔

گریش : بہت ——— اور خاص طور پر اس وقت جب وہ پہلے سے خلوص اور محبت سے ملتے رہیں ، نریش کے دل میں میرے لیے پہلے جیسی محبت ہے اور سب سے زیادہ خوشی کی بات تو یہ ہے کہ وہ تمھیں بھی پسند کرتا ہے کل تمہاری بے حد تعریف کر رہا تھا۔

سُرج : بھلا مجھ میں کیا خوبی ہے۔

گریش : تم میں کیا ہے۔ مَیں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا ۔ لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ تمھیں پانے کے بعد کسی اور چیز کو پانے کی چاہ نہیں رہی ۔ انسان کچھ سپنے دیکھتا ہے کچھ چیزوں کا تصور کرتا ہے اس کی آتما کسی کے پیار کے لیے بھٹکتی پھرتی ہے میں نے تمھیں پاکر سب کچھ پالیا ہے۔

سُرج : بس بس اور زیادہ نہ کہو (یکایک اُداس ہو جاتی ہے) مَیں اتنی اچھی نہیں ہوں ، یہ تمھارا پیار ہے۔ جو تمھیں ایسی چیز دکھائی دیتی ہوں۔

گریش : ارے تم پھر اداس ہو گئیں ——— سروج کیا بات ہے کہ جب کبھی مَیں اپنے دل کی بات تم پر کھولنے لگتا ہوں ، اپنا پیار جتانے لگتا ہوں ، تم اداس ہو جاتی ہو۔ تمہاری پلکیں بند

ہوجاتی ہیں اور اُن سے آنسو ٹپکنے لگتے ہیں تم تو اپنا پیار مجھ پر جتا لیتی ہو ——— میری ذرا ذرا سی بات کا خیال کر کے میری ہر تمنا پوری کر کے لیکن جب کبھی میں اپنے جذبات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں تم مجھے روک دیتی ہو ——— میں ترستا رہ جاتا ہوں۔

سروج : لیکن مجھے تو معلوم ہے کہ آپ میرے بارے میں ہی سوچتے ہیں۔

گریش : سچ ؟

سروج : ہوں۔

گریش : میری زندگی تمہاری زندگی میں کچھ اس طرح گھُل گئی ہے کہ تمہارے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ نریش نے اپنے دوست کی جو کہانی سنائی تھی وہ ایک حقیقت ہے۔ میں محسوس کر سکتا ہوں کہ جیسے ہم پیار کرتے ہیں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔

سروج : (بہت سنبھل کر) نریش جی کے کسی دوست نے خودکشی کر لی تھی ؟

گریش : ہاں ! ——— میں تو تمہیں قصہ سنانے والا تھا لیکن تم ——— ؟

سروج : (عجلت سے) ہاں ! مجھ سے ایسی خبریں نہیں سنی جاتیں لیکن ——— کیا اُن کے دوست نے محبت میں ناامید ہو کر خودکشی کی تھی ؟

گریش : ہاں ! وہ بے حد حساس تھا، ناامیدی برداشت نہ کر سکا لیکن چھوڑو ان باتوں کو ——— تم تو ویسے ہی اُداس رہتی ہو۔

(نریش جلدی جلدی قدم اُٹھاتا ہوا کمرے میں داخل ہوتا ہے۔)

نریش : بھئی آپ لوگ مجھے معاف کر دیجئے گا، کافی دیر ہو گئی۔ بھابی جی آپ بس جلدی سے تیار ہو جائیے گا ——— سینما جانا ہے۔

گریش : سینما ؟

نریش : ہاں یار ! بہت اچھی فلم ہے اور اس کا آخری شو ہے جلدی تیار ہو جائیے بھابی۔ میں ٹکٹ لے آیا ہوں۔

سروج : لیکن میں ـــــ !

گریش : نریش یہ تو نہیں جا سکیں گی۔ بچّی کی طبیعت خراب ہے اور آیا رات بھر کی چھٹی لے کر چلی گئی ہے

نریش : ارے !

سروج : مگر کوئی بات نہیں ۔ یہ آپ کے ساتھ چلے جائیں گے ۔

گریش : لیکن تم ـــــــ اکیلی ـــــــ :

سروج : تو کیا ڈر ہے ، کواڑ بند کر لوں گی ۔ آپ ان کے ساتھ ضرور جائیے بے چارے ٹکٹ خرید لائے ہیں ۔

نریش : بھابی ـــ سچ اگر مجھے ٹم ٹم کی بیماری کا خیال ہوتا تو ہرگز ٹکٹ نہ لاتا ۔

سروج : تو کیا ہوا ـــــ آپ اٹھئے نا ۔

گریش : اچھا ـــ ـــ لیکن ہم ایک بجے کے قریب لوٹیں گے ۔

سروج : کوئی بات نہیں آپ بے فکر ہو کر جائیے ۔

گریش : آؤ نریش

نریش : چلو ۔

(دونو باہر نکل جاتے ہیں سروج اٹھ کر اندر چلی جاتی ہے ۔)

پردہ

○

تیسرا منظر

(وہی ڈرائینگ روم ۔ گریش اور نریش شب خوابی کے کپڑے پہنے صبح کی چاء

پی رہے ہیں ۔)

نریش ۔ کیوں رات والی تصویر تھی نا غضب کی ؟

گریش : ہاں یار ! بڑی دردناک تصویر تھی ، اب تک اثر باقی ہے ۔

نریش : عورت کی ٹریجڈی کیا خوب پیش کی ہے ۔

گریش : ہاں ! اور دوست نہ جانے کیوں تصویر دیکھتے ہوئے مجھے کئی بار ونود یا اس کی محبوبہ کی یاد آگئی

میں ونود یا اس کی محبوبہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا ، لیکن کیا ونود کی موت کے بعد ونود کی محبوبہ

اس جذباتی کرب اور ذہنی کش مکش سے نہ گزری ہو گی جس سے اس تصویر کی ہیروئن گذری ہے ؟

اس پر کیا بیتی ہو گی جب اس کی شادی ہوئی ہو گی ۔ کس طرح محبت کر سکی ہو گی وہ اپنے شوہر سے ۔

نریش کیا تمھیں کچھ نہیں معلوم اس لڑکی پہ کیا گزری ؟

نریش : نہیں ! ـــــ درحصل میں نے تو اسے دیکھا بھی نہیں ، شاید میں اس سے ملنے کی کوشش کرتا

لیکن امتحان ختم ہو گئے اور میں لکھنؤ سے چلا آیا ۔ لیکن خواہش ضرور ہے کہ زندگی میں ایک بار اس

سے ملوں اور اس کی امانت اُسے لوٹا دوں ۔

گریش : امانت ؟

نریش : ہاں ـــــ میرے پاس اس کے دو خطوط محفوظ ہیں جو اس نے ونود کو لکھے تھے ، ونود آخری دنوں

میں میرے ساتھ ہی رہنے لگا تھا ۔ غریب کے ٹرنک میں گُنڈا بھی نہیں تھا اپنے روپے اور خط

میرے پاس ہی رکھتا تھا ۔

گریش : نریش نہ جانے کیوں میں اس لڑکی کے بارے میں جذباتی ہُوا جا رہا ہوں ۔ ـــــ شاید یہ فلم کا

اتر ہو، لیکن اس لڑکی کے بارے میں معلوم تو کرو ـــــــ میں اس معاملے میں تمہاری مدد کرونگا کیونکہ سریج لکھنؤ ہی کی ہیں۔

نریش : لیکن معلوم کر کے ہوگا کیا؟ اور پھر مجھے تو اصلی نام بھی معلوم نہیں۔

گریش : اصلی نام؟

نریش : ہاں ونود نے اُسے "دیپ شکھا"[1] کا نام دے رکھا تھا اور خطوں میں بھی وہ اپنے کو "دیپ شکھا" لکھا کرتی تھی ـــــــ اور اگر اس کا اصلی نام پتہ معلوم ہو بھی جائے تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟

گریش : نریش کیا تم نہیں سمجھتے کہ اُسے ہمدردی کے دو الفاظ کی کتنی ضرورت ہو گی۔ کسی غمگسار کے ملنے سے اس کی روح کو کتنا قرار آئے گا؟ کیا ہم اس کا غم ہلکا نہیں کر سکتے؟

نریش : گریش! زندگی میں اتنا غم اور کرب ہے کہ تم اسے بانٹ نہ سکو گے یہ تو ایک "دیپ شکھا" ہے زندگی میں نہ جانے کہاں کہاں اور کتنی تعداد میں دیپ شکھائیں جل رہی ہیں۔ اور جل چکی ہوں گی ـــ وہ دیپ شکھا جہاں بھی جل کر اپنے آپ کو ختم کر رہی ہے اسے ختم ہونے دو ہمدردی سے تم اسے سکون نہ بخش سکو گے الٹا بھڑکا دوگے۔

گریش : نہیں نریش ـــــــ میں وعدہ کرتا ہوں میں خود اس سے کبھی نہ ملوں گا۔ میں سریج سے کہونگا شاید وہ اس کی آتما کا بوجھ ہلکا کر سکے۔ عورتوں کی اس بدنصیبی اور مجبوری پہ میرا دل خون روتا ہے۔

نریش : دیکھو گریش! تمہیں بھابی سے اس کا ذکر نہ کرنا چاہئے تھا۔ دیکھا نہیں تھا خودکشی کی بات سنتے ہی اُن کے دل پر ٹھیس لگی تھی۔ ہاں اگر میں کبھی لکھنؤ گیا تو پتہ لگانے کی کوشش کروں گا۔

گریش : مگر وہ رہتی کہاں تھی؟

نریش : حضرت گنج میں۔

گریش : (دلچسپی سے) حضرت گنج میں؟ اس کے والد کا کیا نام تھا؟

نریش : یہ مجھے معلوم نہیں البتہ اتنا یاد پڑتا ہے وہ تو انہیں لکھنؤ کا سب سے بڑا بیوپاری بتاتا تھا۔

---

[1] دیپ شکھا یعنی دیپ کی لَو

شاید کاغذ کا۔

(گریش چونک اٹھتا ہے لیکن نریش کو اس کی خبر نہیں ہوتی وہ سگریٹ
کے دھوئیں میں، دھندلی آنکھوں سے خلا کو گھورتا ہے)۔

گریش : کیا لکھتے ہو؟

نریش : ہاں، ہاں کاغذ کے بڑے بیوپاری۔ کافی ہاؤس کے برابر ان کی دکان تھی۔

گریش : (بیٹھے بیٹھے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور سوکھے گلے سے بول اٹھتا ہے) سروج !

نریش : (چونک کر کچھ نہ سمجھتے ہوئے) سروج ؛ بھابی ؛ کہاں ہیں ؟ (مڑ کر دیکھتا ہے عین اس وقت
سروج دروازے سے کمرے میں داخل ہوتی ہے) آئیے آئیے بھابی جی !

سروج : آپ نے چائے پی لی ؟ انھیں کیا ہو گیا ہے ؟

گریش : (سوکھے گلے سے۔ نظریں بچاتے ہوئے) کچھ نہیں ———— کچھ نہیں !

سروج : کیا سر میں درد ہے ؟

نریش : ابھی تو تم ٹھیک تھے۔ یکایک کیا ہو گیا ؟ چہرہ سفید ہو رہا ہے

گریش : کچھ نہیں ، کچھ نہیں۔ میرے سر میں درد ہے۔ میں اندر جا کر سوؤں گا ؛

سروج : آئیے میں بستر بچھا دوں۔

گریش : نہیں ! میں خود بچھا لوں گا ———— تم یہیں ٹھہرو ———— نریش کے پاس۔

نریش : تمھیں کیا ہو گیا ہے ؛ ابھی تو تم ٹھیک تھے ؛

گریش : بس ———— میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔

نریش : ابے تم اب بھی وہی ہو۔ تمھاری بے ہودگی گئی نہیں۔

گریش : (بڑی تلخی سے) ہاں گئی نہیں۔ میں بے ہودہ ہی نہیں احمق اور اندھا بھی ہوں۔

نریش : (مجروح ہو کر) گریش ! تم سنجیدہ ہو گئے : مجھے معاف کر دو میرا مدعا تمھاری ہتک کرنا
نہیں تھا۔

سروج : یہ آپ نے کیا کہہ دیا بابا! انھوں نے تو مذاق کیا تھا۔

گریش : (اسی تلخی سے) اور مذاق کرنے اور بے وقوف بنانے کے لیے دنیا میں ایک میں ہی رہ گیا ہوں۔

نریش : گریش! میں ایک دفعہ پھر تم سے معافی مانگتا ہوں۔ شاید تمھیں میرا یہاں رہنا پسند نہیں آیا۔ میں ابھی چلا جاتا ہوں۔

گریش : (پلٹ کر) نہیں نہیں نریش۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ مجھے تم معاف کر دو کیونکہ میں ہوش میں نہیں ہوں۔ پاگل ہو گیا ہوں۔

(منہ چھپا کر اندر چلا جاتا ہے۔ نریش اور سروج اس کے پیچھے پیچھے اندر جاتے ہیں)

پردہ

○

چوتھا منظر

(ڈرائنگ روم ۔ کیلنڈر سولہ تاریخ دکھا رہا ہے جس سے معلوم ہوتا
ہے کہ ہفتہ گزر گیا ہے ۔ گریش ہاتھ میں ایک پیکٹ لیے ہوئے بوکھلایا سا کمرے
میں داخل ہوتا ہے ادھر اُدھر دیکھتا ہے اور یہ یقین کرکے کہ کمرے میں کوئی
نہیں ہے وہ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیتا ہے پھر بتی جلا کر اور جلدی
میں کوٹ ایک اور صوفے پر پھینک کر بیٹھ جاتا ہے اور کانپتے ہاتھوں سے
پیکٹ کی ڈوریاں توڑتا ہے ۔ ڈوریاں توڑ کر جیسے ہی وہ کاغذ اُتارتا ہے
بہت سے خط میز پر بکھر جاتے ہیں ۔ بوکھلا کر وہ خطوں کو سمیٹنے کی کوشش
کرتا ہے اور پھر ایک خط لفافے سے نکال کر اس پر نظر ڈالتا ہے ۔ یکایک
تڑپ کر چونک پڑتا ہے جیسے سانپ نے ڈس لیا ہو ۔)

گریش : اوہ ——— تو تم ہی ہو ——— جو سوچا تھا صحیح نکلا ۔ ونود کی محبوبہ ——" دیپ شِکھا"
تم ہی ہو ——— تم سرت ——— ہاں یہ گریش کے بھیجے ہوئے خط تمہارے ہی ہاتھ کے لکھے
ہیں ——— خط جو تم نے ونود کو لکھے ——— اور میں ان خطوں کے ایک ایک لفظ کو پہچانتا
ہوں کیونکہ ایسے ہی لفظ تم نے مجھے بھی لکھے ہیں اور میں نے ان لفظوں کو لاکھ لاکھ بار پڑھا ہے آنکھوں
سے لگایا ہے ——— یہ سمجھ کر کہ یہ موتی تم نے اپنی آتما کی گہرائی سے پہلی بار میرے لیے
صرف میرے لیے نکالے ہیں ——— لیکن اب معلوم ہوا کہ یہ موتی پاک نہیں ہیں یہ موتی اترے
ہوئے ہیں ۔ جو تم نے ونود کی لاش سے اٹھا کر مجھ پر چڑھائے ——— اوہ جسے میں آرتی
کا دیپک سمجھا وہ سمادھی کا دیا نکلا ۔ میں چار سال سے اپنے گھر میں سمادھی کا دیا جلائے ہوئے ہوں
تم نے یہ ٹھیک ہی لکھا ہے (پڑھتا ہے) " ونود اگر تم مجھے نہ ملے تو یہ ہونٹ ہنسنا چھوڑ دینگے

یہ پلکیں بجانا چھوڑ دیں گی میری چھاتی میں یہ ننھا سا دل کسی کی آہٹ سے دیئے کی لو کی طرح چھپانا بند کر دے گا ——— "اوہ تو یہ ہے تمھاری اداسی کا سبب۔ یہ ہے وہ اداسی کا پھول جو نرگس کو تمھاری آنکھوں میں پڑا نظر آیا ——— سورج اب معلوم ہوا کہ جس گرمی اور جس تڑپ کو میں تم میں اور تمھارے خطوں میں تلاش کرتا رہا وہ تم کسی اور پر لٹا چکی ہو! چھڑ خط پڑھنے گما سے" دنود! ابھی ابھی گجر نے دو بجائے ہیں سب سو گئے ہیں چاند بھی اپنی بانہوں پر سر رکھ کر سو گئی ہے ——— صرف میں جاگ رہی ہوں۔ ——— تم کہاں ہو؟ کل تین دن بعد تمھیں اپنی کھڑکی کے سامنے سڑک پر دیکھا ——— ہائے تمھاری کیا حالت ہو گئی ہے ——— میرے چاند کو گہن لگ گیا ہے ———' ہاں سورج گہن لگ گیا ہے سب چیزوں کو ——— چاند کو ——— سورج کو آسمان کے تاروں کو اور زمین کے ذروں کو ——— میری زندگی اس عجیب گہن کے سائے میں آ گئی ہے (تھکے لہجے میں) میں گہنا گیا ہوں

(روشنی بجھ جاتی ہے ——— پردہ گر جاتا ہے)

پردہ

○

پانچواں منظر

(ڈرائینگ روم۔ سروج میز پر کتابوں کو ٹھیک کر کے گلدان کے پھولوں کو سجاتا ہے عین اسی وقت گریش کمرے میں داخل ہوتا ہے اس کے چہرے پر وحشت سی برس رہی ہے لیکن بظاہر وہ بالکل نارمل معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے برتاؤ میں ایک مصنوعیت اور غیر فطری پن ہے جو اس کی ذہن کی غیر معمولی حالت کا پتہ دیتا ہے وہ داخل ہوتا ہے تو بہت سے ڈبے بغل میں دبائے ہوتا ہے۔)

سروج : (خوش ہو کر) آپ آگئے

گریش : ہاں

سروج : یہ کیا لائے؟

گریش : تمہارے لیے ساڑیاں

سروج : میرے لیے ساڑیاں۔ لیکن ابھی پرسوں تو آپ دو ساڑیاں لائے تھے؟

گریش : تو کیا ہوا (ڈبہ کھولتا ہے) دیکھو یہ رہی ساڑیاں

سروج : (چونک کر) لیکن یہ بھی بڑے شوخ رنگ کی ہیں

گریش : تو کیا ہوا؟

سروج : میں نے آپ سے کہا تھا مجھے شوخ رنگ اچھے نہیں لگتے۔

گریش : کیوں اچھے نہیں لگتے؟

سروج : (اداسی سے) میرے رنگ پر نہیں کھلتے۔

گریش : یہ بھی ایک ہی کہی۔ اگر تمہارے سفید رنگ پر شوخ رنگ نہیں کھلیں گے تو کس رنگ پر کھلیں گے۔ اب میں تمہیں یہ ہلکے رنگ کی سادی ساڑیاں پہننے نہیں دوں گا۔ (دوسرا پیکٹ سامنے رکھتے ہوئے) اور یہ

رہنمائے میک اپ کا سامان

سُورج : میک اپ کا ! یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے آپ تو جانتے ہیں کہ میں پاؤڈر تک نہیں لگاتی۔

گرلیش : اس لیے تو سب کچھ لایا ہوں۔ (لہجہ میں غیر دانستہ طور پر بے رحمی اور سختی جھلکنے لگتی ہے) اب تم شوخ رنگ کے کپڑے پہنو گی۔ اور میک اپ کرو گی میں اب تمہیں ہرگز اداس اور غمگین نہیں رہنے دوں گا۔ تمہیں ہنسنا ہوگا۔ کھلکھلانا ہوگا۔ سمارٹ بننا ہوگا۔

سُورج : ان دو تین دنوں میں آپ کو سچ مچ کچھ ہو گیا ہے ہم تو اب تک اپنی سادہ سی زندگی میں خوش تھے۔ آپ خود کہتے تھے زندگی میں برساتی ندی جیسا تلاطم چھچھورا پن کی نشانی ہے —— اور ہماری عمر بھی ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے ہمیں عیش کرنا اور ایسی ویسی جگہ جانا زیب نہیں دیتا۔

گرلیش : واہ یہ بھی کی بھی ایک ہی کہی۔ کیا جن کے ایک بچی ہو جاتی ہے وہ کپڑے پہننا اور عیش کرنا بند کر دیتے ہیں ؟ تم خواہ مخواہ بڑھیا پن کے رہ گئی ہو۔ ہر وقت سر ڈھانپے اور نظریں جھکائے اور ہونٹ بھینچے رہتی ہو (ڈرامائی انداز میں بولنے لگتا ہے جس میں بناوٹ کے ساتھ ساتھ کھسیانا پن بھی عیاں ہے) اسے ذرا سر کو ہوا لگنے دو۔ ان لانبے لانبے بالوں میں گلاب کے پھولوں کو مسکرانے دو۔ پلکیں اٹھاؤ اور زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھو۔

سُورج : آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں ؟ آپ نے تو کبھی پہلے ایسی باتیں نہ کی تھیں آپ مذاق تو ......

گرلیش : میں مذاق نہیں کر رہا ، پوری سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ اب تمہیں سوسائٹی کی دوسری عورتوں کی طرح رہنا ہوگا۔ میں تمہارے بال بھی ترشوا کر ——

سُورج : نہیں نہیں ! ---- یہ مجھ سے نہیں ہوگا ، ایسا میں کبھی نہ ہونے دوں گی۔

گرلیش : (تیزی سے) کیوں ! وجہ ؟

سُورج : (لہجہ فوراً مدہم پڑ جاتا ہے۔ اداسی گہری ہو جاتی ہے) بس ! بس !! مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا۔

گرلیش : کیا اچھا نہیں لگتا ؟ —— میں —— یہ گھر ؟

سُورج : (تڑپ کر) یہ —— یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ؟

گریش : تو پھر تم یہ سب کچھ کیوں نہ کرو گی؟ تمہیں کرنا ہوگا۔

سروج : میں یہ سب کچھ نہ کر سکوں گی (آنسو چھلک پڑتے ہیں۔ پلو میں منہ دے لیتی ہے)

گریش : (بڑے بے رحمی سے) کیونکہ تم سوگ منا رہی ہو؟

سروج : (تڑپ کر) کیا ——— یہ ——— یہ آپ نے کیا کہہ دیا۔

گریش : ڈر کیوں گئیں؟ میں نے تو صرف اپنے کو گالی دی ہے ——— کچھ اور نہیں کہا ہے۔ ابھی میں زندہ ہوں۔ شوخ رنگ کی ساڑی پہننے پر ایک آپ کرنے اور "ہائے" کرنے پر کوئی نہ ٹوکے گا۔ ہاں اگر میرے ہوتے ہوئے بھی تم اپنے کو بیوہ ———

سروج : (اٹھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے) بس بس بھگوان کے لیے آگے ایک لفظ نہ کہیے۔ مجھے اتنی سخت سزا نہ دو۔ آپ جو کہیں گے، میں خوشی سے کر لوں گی۔

(اور روتی ہوئی اٹھ کر تیزی سے اندر چلی جاتی ہے ——— گریش ایک لمحہ اسی حالت میں بیٹھا رہتا ہے۔ پھر اس کے چہرے پر گہری روحانی تکلیف اور ذہنی کشمکش کے آثار نمایاں ہوتے ہیں وہ کوٹ اتار کر پھینک دیتا ہے ٹائی کی گرہ ڈھیلی کر دیتا ہے۔ کمرے میں بے چینی سے گھومتا ہے اور آخر صوفے پر گر کر اور میز پر باہیں رکھ کر اپنا سر باہوں میں چھپا لیتا ہے جب وہ سر اٹھاتا ہے تو اس کے چہرے پر وحشت نمایاں ہوتی ہے اور وہ تڑپ کر کہتا ہے)

گریش : اوہ یہ سب کچھ کیا ہے ——— کیا ہے ——— کیا ہو رہا ہے ——— میں کیا کر رہا ہوں ——— مجھے کیوں لگتا ہے۔ جیسے کوئی اصلی سورج اٹھا کر لے گیا ہے اور ساری دنیا میں ایک نقلی سورج چمک رہا ہے۔ دھوپ کا رنگ بدل گیا ہے، یہ مکان یہ فرنیچر، یہ تصویریں۔ یہ سب گھناؤنی ہوئی کیوں معلوم ہوتی ہیں ——— سروج یہ سب کچھ کیا ہے یہ چار سال جو تم نے میرے ساتھ گزارے ہیں ——— یہ خدمت جو تم نے میری کی ہے یہ

میرا گھر جو تم نے سجایا ہے ؛ ——— یہ بچی جو تم نے مجھے دی ہے یہ سب کچھ کیا ہے ؛
مجھے یوں لگتا ہے جیسے یہ آسمان۔ زمین۔ چاند۔ ستارے سب موم کے بنے ہیں اور موم پگھل رہی
ہے ——— : میں سورج ! ان موم کے پگھلتے ہوئے تودوں کو پکڑنے کے لیے بھاگا بھاگا
پھر رہا ہوں ——— سورج ! تم کیا ہو ؛ تمھاری آتما میں کتنی گہرائی ہے ——— تمھارا
ونود مر گیا جس نے تمھارے لیے خودکشی کر لی اور تم نے ایک پرائے مرد کے ساتھ گھر بسا لیا ———
تم اپنا سا اپنا یہ ساری محبت ایک اور آدمی پر لٹا چکی ہو۔ لیکن پھر بھی مجھے سب کچھ دیے جا رہی ہو — یہ
کیا ہے کہ آج بھی صبح جب میری آنکھ کھلتی ہے تو تم میرے سامنے چائے لیے کھڑی ہوتی ہو ؛ غسلخانے
میں میرا تولیہ اور میرے کپڑے ٹنگے ملتے ہیں دفتر سے لوٹنے پر مجھے اپنے چپل اور کپڑے اس طرح
رکھے ملتے ہیں۔ جیسے وہ انتظار میں ہوں کہ میں آؤں اور انھیں پہن لوں ——— سورج کیا یہ
سب کچھ دھوکا تھا ؛ یا پھر دھوکا دھوکا نہیں ہوتا۔ سچائی سچائی نہیں ہوتی ——— ونود
کی یاد کو تم نے اپنے اندر کہاں چھپا کر رکھا ہے ؛ ——— تم کیا ہو سورج ؛

(اور گہری روحانی اذیت میں سر جھٹکتا ہوا وہ پھر اپنا سر ہاتھوں
پر رکھ کر میز پر جھک جاتا ہے۔ بتیاں بجھ جاتی ہیں -)

پردہ

○

چھٹا منظر

(وہی ڈرائینگ روم۔ گریش صوفے پر بیٹھا ہے۔ شب خوابی کے کپڑوں میں ملبوس۔ اس کی حجامت بڑھی ہوئی ہے۔ چہرے کا رنگ سیاہ اور آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑ گئے ہیں وہ دھواں دھار سگریٹ پی رہا ہے اور ابھی سگریٹ ختم ہونے بھی نہیں پائی کہ اُسے بڑی بیرحمی سے ایش ٹرے میں رگڑ کر توڑ مروڑ دیتا ہے۔ پھر صوفے پر سر رکھ کر بے چینی کے عالم میں اپنا سر جھٹکتا رہتا ہے پھر سیدھا ہو کر سگریٹ سُلگاتا ہے اور گہرے گہرے کش لگاتا ہے۔ سروج ڈرائینگ روم میں داخل ہوتی ہے۔ کچھ لمحے وہیں کھڑی رہ کر گریش کی حالت دیکھتی ہے اور پھر اس کے سامنے آ جاتی ہے اور اُس کے قدموں میں فرش پر بیٹھ جاتی ہے اور ایک ہاتھ اس کے گھٹنے پر رکھ دیتی ہے۔)

سروج : آخر بتائیے تو سہی، آپ کو کیا ہو گیا ہے، نہ دن کو چین نہ رات کو نیند۔ نہ کھانے کی سُدھ نہ پہننے کا خیال، ہنسنا بولنا تک چھوڑ دیا۔ اس طرح تو آپ کی صحت بھی گر جائے گی۔

گریش : (بے رُخی سے) گر جانے دو۔

سروج : دیکھئے ——— میرا خیال نہیں کرتے تو نہ سہی اپنی کم کُم کا خیال کیجئے۔ مجھے ڈاکٹر بُلانے دیجئے۔

گریش : نہیں! مجھے کچھ نہیں ہُوا۔

سروج : ہُوا کیسے نہیں؟ ——— آئینے میں دیکھئے، سونا سا رنگ سیاہ پڑ گیا ہے۔

گریش : سونا نقلی تھا ——————— اسلئے۔

سروج : یہ کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں؟ کس بات کی مجھے سزا دے رہے ہیں؟ کیا مجھ سے کوئی بھول ہوئی ہے؟

گریش: بھول؟ تم سے؟ نہیں، بھول تو مجھ سے ہوئی ہے کیونکہ میں احمق ہوں۔ اندھا ہوں۔

سروج: ضرور مجھ سے کوئی بھول ہوئی ہے مجھے بتا دیجئے، بتا دیجئے وہ کیا بات ہے۔

گریش: وہ بات ایسی ہے کہ بتاتے ہی زلزلہ آ جائے گا۔ زمین پھٹ پڑے گی۔ آسمان گر پڑے گا اور آتش فشاں پہاڑوں کے دہانے کھل جائیں گے۔ اور اس کا سرخ سرخ دہکتا ہوا لاوا، مجھے، تمہیں اور تم کو...

سروج: نہیں نہیں! آگے کچھ نہ کہئے۔ بھگوان کے لیے کچھ نہ کہئے۔

گریش: (تڑپ کر) اوہ میرے دماغ میں زہر چھلک رہا ہے میری رگوں میں زہریلے ناگ پھنکارتے پھر رہے ہیں ۔۔۔ اُف ــــــــ آہ ــــــــ

سروج: آپ آرام کیجئے ــــــ سو جائیے میں سر دباتی ہوں۔

گریش: (بھڑک کر) نہیں نہیں مجھے ان ہاتھوں سے نہ چھوؤ؛ ــــــــ مت چھوؤ۔ میں اب کبھی نہیں سو سکتا۔ جس نے کسی کی ارتھی سے چادر اُتار کر اوڑھ لی ہو، مردے کے اُتارے ہوئے کپڑے پہن لیے ہوں۔ وہ کیسے سو سکتا ہے۔

سروج: (ہلکی سی چیخ نکل جاتی ہے) بس کیجئے بھگوان کے لیے ایسی بھیانک باتیں نہ کیجئے میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں۔

گریش: میرے پاؤں نہ پڑو ــــ مجھے ہاتھ نہ لگاؤ نہیں تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔ گھر سے نکل جاؤں گا۔

سروج: لیکن یہ تو بتاؤ۔ یہ کس قصور کی سزا ہے! چار سال تم نے مجھے کس پیار سے رکھا ہے ہر بات پر میرا من رکھا ہے مجھے سکھ اور دکھ میں اپنا شریک سمجھا ہے پھر اب کیا ہو گیا ــــــ کیا ہو گیا اردو پڑتی ہے، آپ تو کہا کرتے تھے ــــــــ!

گریش: وہ سب جھوٹ تھا۔ چھل تھا، کپٹ تھا۔

سروج: وہ دھوکہ نہیں تھا آپ کسی کو دھوکا نہیں دے سکتے۔

گریش: جس طرح کہ تم نہیں دے سکتیں؛ (بھڑک کر) فریبی۔ مکار۔ دھوکے باز عورت میری نظروں کے سامنے سے دور ہو جا۔ ــــــــ آہ ــــــــ آہ!

سُرج : (تڑپ کر) گریش ! (ایک دو لمحے ٹھہر کر صدمے کو برداشت کر کے) تم مجھے مار ڈالو — میرا گلا گھونٹ ڈالو ——— اگر اس مدت میں ایک دن بھی میں نے تمھارے ساتھ چھل کیا ہو. میں کیسے اپنا کلیجہ چیر کر دکھاؤں کہ وہاں چھل نہیں ہے. کپٹ نہیں ہے. دھوکا نہیں ہے میں نے تمھیں ویسے ہی پوجا ہے جیسے پجاری بھگوان کو پوجتا ہے. میں نے آج تک تمھاری مورتی کا اپمان نہیں کیا.

گریش : (بڑے بے رحمانہ اور نفرت وحقارت سے جلتے لہجہ میں) دیپ شِکھا !

سُرج : (چیخ مار کر بے ہوش ہوتے ہوئے) گریش !

گریش : بے ہوش ہو گئیں ! (دیوانہ وار قہقہہ لگاتا ہے) ہا ہا ہا ——— ہا ہا ہا ——

(قہقہہ لگاتا لگاتا اندر چلا جاتا ہے. سُرج فرش پر پڑی رہتی ہے
روشنیاں بجھ جاتی ہیں.)

پردہ

○

ساتواں منظر

(وہی کمرہ۔ لیکن رات کا وقت ہے۔ گھڑی میں چار بجنے ہیں۔ کمرے میں میز پر لیمپ جل رہا ہے۔ ٹیبل لیمپ کے پاس ایش ٹرے میں ایک آدھ جلی سگریٹ سے دھوئیں کی پتلی سی لکیر اُٹھ اُٹھ کر کمرے کی تاریکی میں تحلیل ہو رہی ہے۔ فرش پر اور میز پر سگریٹ کے ٹکڑوں کا ڈھیر ہے۔ گریش اپنے ہاتھ میز پر رکھے اور ہاتھوں کی پشت پر رخسار ٹکائے بڑے غور سے دھوئیں کی اس پتلی لکیر کو دیکھ رہا ہے۔ سروج اندر کمرے میں آتی ہے اور دھیرے دھیرے پیروں کا سہارا لے کر آگے بڑھتی ہے اور پھر ایک ساتھ یا کچھ لڑکھڑاتی ہوئی صوفے پر گریش کی گود میں آ گرتی ہے۔ گریش بڑی بے رخی سے پیچھے ہٹ جاتا ہے اور سروج مجروح ہو کر اٹھ بیٹھتی ہے۔)

گریش : تمہیں ڈاکٹر مکمل آرام کرنے کے لیے کہہ گیا ہے۔ اندر جا کر آرام کرو۔ جاؤ۔

سروج : چلی جاؤں گی لیکن آپ رات بھر کیوں جاگتے رہے؟ بھگوان کے لیے جا کر کچھ دیر کے لیے سو جائیے مجھے جو سزا دینا ہے صبح اٹھ کر دے دیجیے گا۔

گریش : سزا! کس بات کی سزا؟ تم نے کوئی چھل نہیں کیا۔ کپٹ نہیں کیا۔ دھوکا نہیں دیا میری موسیقی —— !

سروج : ہاں گریش اس میں ذرہ برابر جھوٹ نہیں۔

گریش : اوہ! تو بے ہوش ہو جانے کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ تمہاری طبیعت کافی سنبھل گئی۔

سروج : میں اس وقت کچھ نہیں کہوں گی۔ میں تمہارا بڑے سے بڑا الزام ——

گریش : الزام! تو میں الزام لگا رہا ہوں —— جھوٹ بول رہا ہوں —— دغاباز عورت!
یہ دیکھو (میز کی دراز کھولتا ہے اور اس میں سے سروج کے خط نکال کر اس پر پھینکتا ہے) تیرے وہ خط جو

تو نئے اپنے پریمی کو بھی۔

سرُرج : (بڑے اطمینان سے) گریش ——— وہ مر چکا ہے اور اس کے ساتھ سب کچھ مر چکا ہے۔

گریش : لیکن اس کی چتا تیری آنکھوں میں بھی پڑی ہے اس کی ہڈیاں تیرے سینے میں پڑی ہیں اور تو اس کی سمادھی کا دیا بن کر جی رہی ہے۔

سرُرج : (بڑے حساس لہجہ میں) کیا تم نے سچ مچ ایسا ہی محسوس کیا ہے گریش : ان چار برس میں ———

گریش : بس بس۔ مجھے ان چار برسوں کی بھی یاد نہ دلاؤ۔ یہی چار برس تو مجھے پاگل بنائے ہوئے ہیں چار سال تک ایک عورت ایک مردے کو لیے میرے سینے سے لگتی رہی۔ پیار جتاتی رہی۔ میرے بچے کو دودھ پلاتی رہی۔ اور مجھے اس کی آنکھوں میں محبت اور چہرے پر پاکیزگی اور لمس میں گرمی ہی نظر آتی رہی۔

سرُرج : اور آج نظر نہیں آتی؟

گریش : اس لیے تو میں کہتا ہوں کہ تم عورت نہیں ہو۔ چھل کپٹ کی جیتی جاگتی مورتی ہو، تم آج بھی مجھے دھوکا دے سکتی ہو، آج بھی جب میں تمہیں دیکھتا ہوں ——— تمہاری آواز سنتا ہوں تو تم مجھے ویسی ہی بھولی پاک اور معصوم معلوم ہوتی ہو۔

سرُرج : گریش ——— اگر میں تمہیں اپنی آتما کا حال سناؤں تو کیا تم مجھے سمجھنے کی کوشش کروگے؟
——— یہ سچ ہے کہ مجھے ونود سے پیار تھا ——— بے انتہا پیار — مجھے لگتا تھا اس کے بنا میں جی نہ سکوں گی جس دن میں نے سُنا ونود نے خودکشی کر لی مجھے لگا میں مر گئی ہوں تین دن اور تین رات میں مردے کی طرح گم سم پڑی رہی نہ کھایا نہ پیا نہ بولی نہ چالی۔ موت کی گہری کلپنا میں کھوئی پڑی رہی۔ لیکن چوتھے دن میں نے پایا میں مری نہیں ہوں ——— نہ جانے کہاں میرے اندر ایک آگ ہے جو مجھے جلائے ہوئے ہے۔ میں نے اپنا گلا گھونٹنا چاہا۔ سانس روکنا چاہا! طرح طرح سے مرنے کے جتن کیے مگر وہ شعلہ بند نہ ہوا ——— وہ کل کل کرتا ہوا میری نسوں میں سرسرا تا رہا۔ یہی نہیں دھیرے دھیرے اس کا شور اونچا ہونے لگا اور اس کی رفتار تیز ہونے لگی اب شور میرے سارے جسم میں گونج رہا تھا اور سرسراہٹ انگ انگ کو جگا رہی تھی۔ اور نہ جانے کیسے میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ چلنے پھرنے

گی۔ کملنے پینے بھی گی۔ چھوئی موئی کی طرح مرجھائی ہوئی میری پلکیں بھی کھلنے لگیں اور مجھے لگا جیسے دنیا میں پھر سے دھوپ پھیلتی جا رہی ہے۔ میں زندگی سے ہار گئی۔

گریش : نہیں ——— یوں کہو کہ تم نے اپنی جان بچا لی۔ تم نے ونود کے ساتھ بھی دغا کی۔

سروج : تم ایسے غافل سکتے ہو، لیکن ہم نے ساتھ ساتھ جینا چاہا تھا۔ مرنا ہم میں سے کوئی نہ چاہتا تھا۔ میں نے ونود کے ساتھ کوئی چھل نہیں کیا۔

گریش : اور میرے ساتھ؟

سروج : یہی تو میں بتانا چاہتی ہوں گریش! جس گھڑی تک میرے تمہارے ساتھ پھیرے نہیں پھرے تھے، میں یہی سوچتی تھی کہ میں تمہیں پیار نہ کر سکوں گی، لیکن جس گھڑی پنڈت نے میرا آنچل تم سے باندھا اور ہم ویدی کے گرد پھیرے لینے لگے، میرے اندر ایک عجیب سی تبدیلی آنے لگی ——— جیسے کوئی چیز جا رہی ہو۔ کوئی چیز آ رہی ہو۔ میرے من میں اپنے آپ ایک تصویر سی بننے لگی اور جس گھڑی تم نے میرا گھونگھٹ اٹھا کر میری آنکھوں میں جھانکا، ایک لمحہ کیلئے ونود کا چہرہ تلملا کر میری آنکھوں کے سامنے آ گیا لیکن دوسرے لمحہ وہ چھن سے تارے کی طرح ٹوٹا اور نہ جانے کہاں کھو گیا۔

گریش : یہ سب جھوٹ ہے۔ بہلاوا ہے۔ محبت یوں نہیں مر جاتی۔

سروج : یہ ٹھیک ہے میں نہیں کہتی کہ سب کچھ یوں آسانی سے اپنے آپ ہو گیا۔ مجھے پاپ اور پن کے وچار سے بھی ڈرانا پڑا۔ میں نے اپنے کو سمجھایا ان کا کیا دوش ہے۔ انہوں نے تو ونود کو مجھ سے نہیں چھینا۔ انہوں نے تو انجانے میں مجھے ویسے ہی چاہا ہے۔ جیسے ونود نے۔ پھر انہیں کس بات کی سزا؟ ان پر کس بات کا غصہ؟ پاپ کے ساتھ ساتھ تو انیائے بھی کرے گی؟ ——————— اور جیسے آنکھ کے پٹ کھل گئے۔ میں نے تمہیں وہاں بٹھا لیا۔

گریش : یہ ناممکن ہے۔ ایک عورت جب ایک بار کسی سے محبت کر لیتی ہے تو دوبارہ کسی کو پیار نہیں کر سکتی۔ تم نے مجھے کبھی پیار نہیں کیا۔

سروج : کیونکہ لوگوں کی طرح تم بھی عورت کی محبت کو ایک شیشہ سمجھتے ہو، جو ٹوٹ کر نہیں جڑ سکتا؟ گریش پہلے میں بھی یہی

اتی تھی۔ میں نے سُنا تھا، کتابوں میں پڑھا تھا اور ایسا کرنا بھی چاہا تھا، لیکن یہ جھوٹ نکلا۔ عورت بھی انسان ہوتی ہے، اس میں بھی زندگی ہوتی ہے اور زندگی مُردہ چیزوں کے سہارے نہیں، زندہ چیزوں کے سہارے رہتی ہے۔ اس کی سوکھی ڈالی کچھ دنوں بعد پھر ہری ہونے لگتی ہے۔ ماں کا بچہ مرتا ہے تو اس وقت وہ دوسرے بچے کی بابت نہیں سوچ سکتی۔ لیکن جب دوسرا ہو جاتا ہے تو اسے بھی پیار سے چومنے چمکارنے لگتی ہے۔

گریش : یہ بالکل دوسری بات ہے۔

سروج : بات دوسری ہو سکتی ہے مگر اصول وہی ہے۔

گریش : اگر اصول وہی ہے تو بتاؤ تم مسکرا کیوں نہیں سکتیں؟ تمہاری آنکھوں میں اتنی جلدی آنسو کیوں آ جاتے ہیں۔ جب میں پیار کرتا ہوں، تو تم اداس کیوں ہو جاتی ہو؟ میں تمہارا قہقہہ سننا چاہتا ہوں تو تم مسکرا کر کیوں رہ جاتی ہو۔ میں نے تمہیں سُرخ رنگ کے کپڑے لا کر دیئے لیکن تم نے پہننے سے انکار کیا۔ کیا تم اندو کے مٹنے کا سوگ نہیں منا رہی ہو۔

سروج : گریش میرے ساتھ تم ہو، میری بچی ہے اور عورت کے سامنے جب دو چیزیں ہوتی ہیں تو وہ سوگ منانا چھوڑ دیتی ہے۔ آس منانے لگتی ہے، ہاں یہ صحیح ہے کہ پہلے جیسی اُمنگ دل میں نہیں اٹھتی ایک تھکن سی رہتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے بہت سا خون نکل گیا ہے اور جسم میں ایک پتلی سی دھار دھیرے دھیرے بہنے کے لیے رہ گئی ہے۔ سکھ پھر بھی مل سکتا ہے اور سیوا بھی کر سکتا ہے اس کے پیار میں سورج کی گرمی نہ سہی، چندرما کی نرمی ضرور آ جاتی ہے۔

گریش : یہ ٹھیک ہو سکتا ہے۔ سچ ہو سکتا ہے، پر یہ کیسے بھول جاؤں کہ تم کبھی کسی سے محبت کر چکی ہو، اپنی آتما کے پھول کسی اور پر چڑھا چکی ہو۔ زندگی کے سبز زریں سپنے تم نے جس چہرے کے گرد بنے تھے وہ میرا چہرہ نہیں کسی اور کا تھا۔

سروج : مگر وہ سب کچھ مر چکا ہے اب کونپلیں پھر سے پھوٹی ہیں۔

گریش : لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب میں تمہارے ساتھ خوش نہیں رہ سکتا، اپنے من کو نہیں سمجھا سکتا۔

سے لگاکر اپنا سر اس کے کاندھے پر رکھ دیتا ہے

سروج جو اب تک جذبات کی سطح سے بہت اوپر اٹھی ہوئی تھی

یک لخت جذباتی ہو اٹھتی ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ

نکلتے ہیں اور سسک سسک کر رونے لگتی ہے۔ گریش تھوڑی

دیر تک کچھ نہیں کہتا، پھر اُسے اپنے سے الگ کرتا ہے، اس

کے ہونٹ سے اُس کے آنسو پونچھتا ہے اور پھر اُس کی کمر میں ہاتھ

ڈال کر کھڑکی کی طرف لے جاتا ہے جہاں رات کی سیاہی کی

جگہ صبح کی سرخی نے لے لی ہے —— دونوں نظریں اُٹھاکر

ایک ساتھ اس صبح کو دیکھتے ہیں جو ابھی ابھی تاریکی کے بطن سے

پیدا ہوئی ہے۔)

پردہ

○

بیمار

سجاد ظہیر

کردار

عزیز

سلیمہ — اُس کی بیوی

بشیر — اُس کا دوست

بدل — اُس کا مُلازم

منظر

(شام کا وقت - ایک کمرہ میں عزیز کوچ پر بیٹھا ہوا ایک کتاب
کے صفحے اُلٹ رہا ہے۔ اِدھر اُدھر میز پر گلدان - اخبار، کتابیں،
بے ترتیبی سے پڑی ہوئی ہیں۔)

(کتاب بند کر کے)

عزیز : (پکار کر) بدل ! بدل ! ابے بدل !!

(بدل، نوکر داخل ہوتا ہے)

اتنی دیر کیوں کی ؟ تجھ سے میں ہزاروں بار تاکید کر چکا ہوں کہ ٹھیک چار بجے چائے تیار رکھا کر۔

(کوچ سے اُٹھ کر) کیوں دیر کی ایں ؟

(بدل چپ رہتا ہے۔ کچھ بولتا نہیں)

اب کی دیر ہوئی تو تنخواہ کٹے گی۔ بس، پھر بچہ تم ٹھیک ہو جاؤ گے ۔

بدل : میاں ہم کا کرن۔ آپ کا حکم مانن، یا بیگم صاحب کا۔ آپ مالک ہیں حجور جاہے تنکھا کاٹو جو چاہے کرو۔ پانچ بجے صبح سے کولھو کے بیل کی طرح تو کام کرت ہن اور پھر حجور آپ ڈانٹت رہن ہم سے ایس نوکری نہیں ہوتی ہے۔

عزیز : ہم یہ سب کچھ نہیں جانتے تو کچھ نہ کچھ بہانہ ڈھونڈ لیتا ہے (کچھ دیر رُک کر) کیا کام کیا تھا ؟ آخر بیگم صاحب کا ؟

بدل : دوا لکھانے گیئں ہن۔ پھرن ہوال رکے کا پڑا۔ تب کہیں جائے کے دوا ملی۔ سایدبشیر میاں کی طبیعت پھر جیادہ کھراب ہوئے گئی۔

عزیز : اچھا خیر اب زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔ جلدی سے جا کر ناشتہ تیار کرو اور ہاں

بیگم صاحب سے جا کر میرا کوٹ مانگ لا۔ کل بٹن ٹانکنے کو دیا تھا۔

(بدل باہر جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد عزیز کی بیوی سلیمہ کمرے

میں داخل ہوتی ہے۔ کوٹ لیے ہوئے)

سلیمہ: یہ لیجیے آپ کے کوٹ میں بٹن ٹانک گئے ہیں۔

عزیز: (کچھ دیر خاموش ہو کر طنزیہ) بڑی عنایت ہوئی۔ معلوم ہے آپ کو کے بجے ہیں؟ اگر بدل تھوڑی دیر بعد دوا لا دیتا، تو کیا بگڑ جاتا؟ اب تو یہ روز کا معمول ہو گیا۔ میں تو اس گھر میں اجنبی ہوتا جا رہا ہوں اپنے نوکروں پر بھی قابو نہیں۔

سلیمہ: آپ کو تو معلوم ہے کہ بشیر کی طبیعت کل رات سے زیادہ خراب ہو گئی۔ بدل کو دوا لانے جانا ضروری تھا، آپ کے رشتہ دار بھی ہیں اور مہمان بھی۔ مگر آپ کو تو مجھ سے خفگی کا ایک بہانہ چاہیے۔

عزیز: درست ہے۔ اب مجھ پر ایک نیا الزام اور لگا۔ بشیر دو مہینے سے یہاں ٹھہرے ہیں کہیں دنیا میں ان کا ٹھکانہ تھا، میں نے اس خیال سے کہ اپنے عزیز ہیں انھیں یہاں بلا لیا، ان کی دوا درمن میں اپنی استطاعت سے زیادہ ہی صرف کیا، ہر طرح کا خیال رکھا۔ اب اس کے یہ معنی تو نہیں کہ میں اپنا گھر چھوڑ کر کہیں اور جگہ چلا جاؤں!

سلیمہ: میں نے آپ سے یہ کب کہا؟ لیکن بشیر کو اپنے گھر ٹھیرانے کا احسان مجھ پر کیوں رکھتے ہیں؟ جہاں تک میرا تعلق اس معاملہ سے ہے کوئی بھی بشیر کی جگہ پر ہوتا، میں اسی طرح اس کی تیمارداری کرتی۔

عزیز: تیمارداری! تیمارداری کی بھی خوب کہی۔ اسے تیمارداری کہتے ہیں۔ خدا آئینے میں اپنی صورت تو دیکھیے گھر کو چھوڑیے، خانہ داری سے تو کبھی آپ کو زیادہ دلچسپی نہیں تھی مجھے بھی جانے دیجیے۔ آج کل آزادی کے زمانے میں شوہر کو کون پوچھتا ہے۔ مگر آپ ذرا اپنی حالت پر تو غور کیجیے۔ نہ تو آپ کو کھانے کی کوئی فکر ہے نہ کپڑے کی۔ ہر وقت بدحواس لاابالی کی طرح ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں ٹہلنا، کپڑے میلے ہیں تو میلے ہی سہی، کھانا کبھی کھایا کبھی نہیں کھایا۔ بس لے دے کے دنیا میں ایک چیز رہ گئی ہے اور وہ بشیر کی تیمارداری، میرے ساتھ کبھی کبھی سیر کو جاتی تھیں، وہ ترک، پاس بیٹھ

کہ بات چیت کرتی تھیں، وہ بند۔ وہ گویا تفاوت کا ساتھ تھا، سو اب وہ بھی نہیں، اس وجہ سے کہ بشیر کو گھڑی گھڑی ٹٹولکر وہ ادبی ہوتی ہے میرے لیے تو آپ کا گھر میں ہونا نہ ہونا ایک برابر ہے۔

سلیمہ: تو یہ کہیے، آپ کو ساری شکایت اس بات کی ہے کہ میں ایک فرمانبردار بیوی کی طرح آپ کی خدمت نہیں کرتی، سنگار پٹار کرکے آپ کے سامنے گرشتہ پن کرنیں آتی جب آپ کھانا کھاتے ہیں تو مورچھل لے کر مکھیاں نہیں اُڑاتی۔ بن ٹھن کر آپ کے ساتھ ٹہلنے کو نہیں جاتی، تاکہ آپ کے دوست مجھے آپ کے ساتھ دیکھ کر آپ پر رشک کریں۔ رات کو میں آپ کے پاؤں نہیں دباتی کہ آپ کو میٹھی میٹھی نیند آئے۔

عزیز: میری ہر بات کو غلط معنی پہنانے سے کیا فائدہ؟ تم کو ماننا پڑے گا کہ جس دن سے تمہاری شادی ہوئی ہے، میں نے کبھی تم پر کسی قسم کا جبر نہیں کیا۔ تم خوب جانتی ہو کہ میں پرانے زمانے کی باتوں کا قائل نہیں ہوں۔ میں نے تم سے پردہ نہیں کرایا۔ حالانکہ تمہارے والدین تمہیں پردے ہی میں رکھتے تھے تمہاری ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کی۔ مگر دو مہینے سے اس کی ہوا ہی بگڑ گئی ہے تم سے بات کرنا بھی ممکن نہیں۔

سلیمہ: اگر ایسی ہی باتیں ہونی ہیں تو بہتر یہی ہے کہ بالکل نہ ہوں، میری کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر آپ دو مہینے سے کیوں بدل گئے ہیں۔ بشیر تو آخر یہاں مہمان کی حیثیت سے ہیں، اچھے ہوں گے چلے جائیں گے مگر آپ کا اور میرا تو ہمیشہ کا ساتھ ہے اگر اسی طرح ایسا ہی ذرا ذرا سی بات پر لڑائی جھگڑا رہا تو کیسے زندگی بسر ہوگی۔

عزیز: یہ خوب کہا کہ میں بدل گیا۔ کبھی تو اپنی غلطی بھی مان لیا کرو۔

سلیمہ: یا اللہ! آخر میں کیا کروں؟

(اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیتی ہے)

(بدل کمرے میں داخل ہوتا ہے)

بدل: بیگم صاحب! بشیر میاں ناشتہ نہیں کھاتے اور باہر گھومنے کو چلے گئیں، کہہ گئے ہیں کہ واپس آ کے کر

ناشتہ کری ہن۔

سلیمہ : (گھبرا کر کھڑی ہو جاتی ہے) کیا ناشتہ نہیں کیا، اور باہر ٹہلنے چلے گئے۔ کب گئے؟ بھلا اُن کو ٹہلنے کی کس نے اجازت دی۔ کدھر گئے ہیں؟ تو نے جانے کیوں دیا؟ جا جلدی ان کے پیچھے دوڑ اور فوراً اپنے ساتھ بلا کر لا۔ رات تو ان کی طبیعت خراب تھی۔ اور آج اتنی سردی میں ٹہلنے جانا۔

(کھڑکی کی طرف دوڑ کر جاتی ہے)

دکھائی نہیں دیتے؛ معلوم ہوتا ہے دُور نکل گئے۔ تُو نے مجھے آکر فوراً اطلاع کیوں نہ کی؟

(عزیز اور بدل دونوں چُپ کھڑے ہو کر سلیمہ کی طرف گھورنے ہیں)

بدل : ہم بجور کہا کہ بیگم صاحب سے اتلا کر دیئی ملا اُو کہن کہ کوئی جرورت نائے ہے اور یو کہہ بس چپ چاپ چلے گئن۔

سلیمہ : اچھا یہاں کھڑا مت رہ۔ دوڑ جلدی، دوڑ کے جا اور اُن کو واپس لے آ، کہنا کہ بیگم صاحب نے بلایا ہے۔

بدل : (کچھ تامل کے بعد) میاں کے ناشتے کی دیر ہوئے جی ہے کہئے تو او کا تیار کر دوں پھر جاؤں۔

سلیمہ : اُن کی جان خطرہ میں ہے اور تجھے ناشتہ کی پڑی ہے۔ میں کہہ رہی ہوں کہ فوراً جا۔

(بدل گھبرا کر چلا جاتا ہے سلیمہ کھڑکی کے باہر دیکھتی رہتی ہے)

عزیز : میں نہیں سمجھتا کہ آخر اتنی پریشانی کی کیا ضرورت ہے۔ بشیر اپنی حالت خود بہتر جانتے ہیں آخر اب نہ واپس آئے تو دس پندرہ منٹ بعد آجاتے۔ میرے ناشتہ کی تو دیر نہ ہوتی۔ آج معلوم ہوتا ہے کہ مجھے بھوکا ہی رہنا پڑے گا۔

سلیمہ : آپ کو آخر کیا ہو گیا ہے؟ آپ جانتے تو ہیں کہ بشیر کی کیا حالت ہے اور پھر بھی ایسی باتیں!

عزیز : جی ہاں! معلوم ہوتا ہے میرا ہی دماغ خراب ہو گیا ہے۔ (غصہ میں) بس اب مجھ سے یہ روز روز کی جھنجھٹ برداشت نہ ہو گی۔ کسی کے ساتھ بھلائی کرنے کے یہ معنی تو نہیں کہ اپنا سارا گھر بار اس کے ہاتھ رہن کر دیا جائے۔ اگر ایسی ہی بشیر کی طبیعت خراب ہے تو ان کے لیے یہاں رہنے سے

ہسپتال میں رہنا بہتر ہے۔ میں آج انتظام کر دوں گا کل سے وہ اسپتال میں چلے جائیں۔

سلیمہ: (اس کی صورت سے پریشانی معلوم ہوتی ہے۔ کھڑکی سے یکبارگی عزیز کی طرف مڑ کر) اُن کے پاس اگر اسپتال میں رہنے کا خرچ ہوتا تو وہ خود ہی نہ چلے جاتے۔

عزیز: اگر خرچ نہیں ہے تو پھر خیراتی حصہ میں رہیں گے۔ بہرحال میرا گھر کوئی اسپتال تو نہیں۔ دو مہینے یہاں رہے اب میں اور کیا کر سکتا ہوں۔

سلیمہ: آپ تو ان سے یوں خفا معلوم ہوتے ہیں جیسے وہ جان بوجھ کر بیمار پڑے ہیں اور یہاں سے جانا ہی نہیں چاہتے۔ اگر آپ کا یہ خیال ہے تو اُسے دل سے نکال ڈالیئے۔ انھیں اس طرح آرام سے بیٹھ کر بیکار زندگی بسر کرنے کی خواہش ہوتی تو وہ شاید بیمار ہی نہ پڑتے۔ اس گھر میں رہنے کی انھیں بالکل ہوس نہیں، اگر وہ ابھی اس قابل ہوتے کہ یہاں سے جا سکیں تو فوراً چلے جاتے۔ دراصل وہ تو میرے اصرار کی وجہ سے یہاں رکے ہوئے ہیں۔ اس وقت انھیں یہاں سے جانے دینا انھیں موت کے منہ میں بھیجنا ہے۔

عزیز: اچھا تو اُن کے یہاں رہنے کا احسان بھی اُلٹا مجھ پر ہے اور یہ آپ جو فرماتی ہیں کہ انھیں آرام سے بیٹھ کر بیکار زندگی بسر کرنے کی خواہش نہیں۔ اس کا کیا مطلب؟ میں کیا بیکار زندگی بسر کرتا ہوں؟ دس بجے سے لیکر چار بجے تک گھس گھس کرنا پڑے، کسی کو تب معلوم ہو۔ ہاں گلیوں گلیوں مارا البتہ نہیں پھرتا۔ یہ ضرور ہے کہ گھربار والا ہوں۔ شریفوں کی طرح سے زندگی بسر کرتا ہوں۔ دوسروں کے یہاں مہینوں مہمان نہیں بنا رہتا۔ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا۔

سلیمہ: (پھر کھڑکی کی طرف مڑ کر) ہاں! اس میں کیا شک ہے کہ آپ شریفوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں اور آپ دوسروں سے اس بات کی توقع رکھتے ہیں کہ وہ آپ کی شرافت کی تعریفیں کریں اور آپ کی تعظیم کریں اور جو ایسا نہ کرے وہ ذلیل سمجھا جائے اور اس سے کھلے بندوں نہیں تو کم از کم دل میں نفرت کی جائے۔ اگر آپ ایسے ذلیل لوگوں سے چند منٹ باتیں کر لیں تو یہ اُن پر بڑا احسان ہو۔ میں جانتی ہوں کہ بشیر کو آپ کیا سمجھتے ہیں اور اُن کے ساتھ جو کچھ آپ نے کیا ہے وہ کس وجہ سے؟

اُفوہ! کبھی کبھی تو مجھے اس دنیا سے اتنی نفرت ہوتی ہے کہ جی چاہتا ہے خودکشی کر لوں۔

عزیز: سلیمہ! آخر تمھیں ہو کیا گیا ہے؟ میری ہر بات تمھیں بُری معلوم ہوتی ہے۔ میں دو مہینے پہلے بھی ایسا ہی تھا جیسا کہ اب ہوں۔ شریف یا ذلیل جو جی چاہے سمجھو۔ اچھا تم خود بتاؤ کہ ہم شادی کے بعد کتنی خوشی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ہر وقت ہنسی، مذاق دوستوں سے ملاقاتیں، سیر، تفریح، ڈیڑھ مہینے پہاڑ پر کتنے اچھے گذرے جو کوئی بھی ہم دونوں کو یوں ساتھ دیکھتا تھا، رشک کرتا تھا۔

سلیمہ: جی ہاں میں خوش تھی، بہت خوش تھی۔ کیا کہنا ہے ایسی خوشی کا۔ ہنسی، مذاق، سیر، تفریح دوستوں سے ملاقاتیں یہ اُسی خوشی کا تو نتیجہ ہے۔ کہ اب مجھے زندگی دوبھر معلوم ہوتی ہے۔ خوشی کا ذکر تو میرے سامنے نہ ہوتا تو اچھا تھا (معلوم ہوتا ہے خود سے باتیں کر رہی ہے) خوشی آخر ہے کیا؛ خصوصاً ایک عورت کی خوشی، ہنسی، مذاق، سیر، تفریح، آرام کی زندگی، اچھا کھانا، اچھا پہننا اور کبھی کبھی اپنی روح کے سکون کے لیے غریبوں کی امداد کر دینا۔ یہ ہے خوشی۔

عزیز: ہر سیدھی بات کو غلط روشنی میں دیکھنا تمھیں خوب آ گیا ہے۔ اب چاہے تم ان باتوں کو اچھا سمجھو یا بُرا مگر واقعہ تو یہ ہے کہ تم نے ڈیڑھ سال تک نہایت خوشی کی زندگی بسر کی۔ یہ نئے نئے خیال جو آپ کے ذہن میں بشیر نے معلوم ہوتا ہے بھر دیئے ہیں ان کی وجہ سے تو جہاں تک دیکھتا ہوں سوائے کڑھن اور بے چینی کے آپکو اور کچھ بھی نہیں حاصل ہوا —————— اسی وجہ سے تو میں نے یہ طے کر لیا ہے کہ بشیر کا یہاں سے اب چلا ہی جانا بہتر ہے۔

سلیمہ: اچھا تو بشیر کو ہسپتال بھیجنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں ایک ناقص العقل عورت ان کے اثر سے بچائی جاؤں۔ اور آپ کے ساتھ پھر دہی پہلے کی سی ہنسی، خوشی والی زندگی بسر کرنے لگوں۔

عزیز: سلیمہ! تم کو ماننا پڑے گا کہ جب سے بشیر یہاں آئے ہیں تم وہ سلیمہ ہی نہیں رہیں۔ میں عورتوں کی آزادی کا قائل ہوں، مگر کچھ بھی تمھارا شوہر ہوں میرے کچھ تو فرائض اور حقوق ہیں جس طرح تمھیں اس بات کا حق ہے کہ مجھے غلط راستے پر جانے سے روکو مجھے بھی تو حق اس بات کا ہے کہ تمھیں غلطی سے

بچاؤں۔

سلیمہ : اور مجھے غلط راستے سے بچانے کی سب سے سہل ترکیب آپ نے یہ سوچی ہے کہ بشیر کو خیراتی ہسپتال میں بھیج دیا جائے جہاں وہ چاہے زندہ رہیں یا مریں، اور اس حرکت کو آپ اخلاقی جامہ پہنانا چاہتے ہیں آپ کہتے ہیں کہ بحیثیت شوہر کے آپ کا یہ حق ہے کہ میری حفاظت کریں اور آپ اپنے کو عورتوں کی آزادی کا قائل بھی بتاتے ہیں، معلوم نہیں کہ آپ کے نزدیک اس آزادی کے کیا معنی ہیں۔ غالباً اپنے شوہر کے ساتھ جیسے تیسے زندگی بسر کرنا ہی عورت کی آزادی ہے۔

عزیز : (غصہ میں) جی نہیں، عورت کی آزادی کے یہ معنی ہیں کہ اپنے شوہر کا۔ تی برابر بھی خیال نہ کرے، دوسرے مردوں سے جتنا جی چاہے ملے اور ان کی باتوں کو قرآن و حدیث سمجھے۔ اپنے شوہر کی ہر بات میں کوئی نہ کوئی عیب نکالے، سیدھی بات کو بھی الٹی سمجھے۔ بشیر کو میں نے دو مہینے اپنے گھر میں رکھا تو یہ اپنی گنہگار روح کے سکون کے لیے تھا شریفوں کی طرح اپنی روزی کما تا ہوں تو گویا میں نے چوری کی تم کو اپنی گزشتہ زندگی کی یاد دلادی تو گویا جرم کیا۔ اور اب جو تم کو اس جنجال اور پریشانی سے بچانے کی کوشش کرتا ہوں تو الٹا میں ملزم ٹھیرا۔ تمھاری عقل پہ معلوم ہوتا ہے پتھر پڑ گئے ہیں۔ ایسی آزادی جائے جہنم میں!

سلیمہ : (بیچ کر) جی ہاں! آپ کی شرافت، آپ کی روشن خیالی، آپ کی رواداری، اسی وقت تک تمام رہتی ہے جب تک دوسرے آپ کی اطاعت کرتے رہیں اور آپ کے اصول کی پابندی کرتے رہیں۔ لیکن اگر کہیں میری یہ ہمت ہو کہ میں آپ کے طرزِ زندگی کو مہمل اور بیکار سمجھوں۔ آپ کے اصول کو غلط اور جھوٹا جانوں، تو میں نرمی کمزور، بیکار، آپ کی لونڈی کے برابر بھی جاؤں: (آہستہ سے) خیر یوں ہی سہی آپ سے بحث کرنا فضول ہے اور بحث ہو بھی کیسے سکتی ہے؛ میری کوئی بھی بات آپ کی سمجھ میں نہیں آتی۔ ہم معلوم ہوتا ہے دو مختلف زبانوں میں گفتگو کر رہے ہیں۔ ہائے ابھی تو اس دنیا سے اٹھ جاتی تو اچھا تھا۔

(چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیتی ہے)

عزیز : (کچھ نرمی کی کوشش کرتے ہوئے) نہیں نہیں! ایسی باتیں مت کرو۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم تھک گئی ہو بہت زیادہ۔ کئی راتوں سے بھی طرح سوئی نہیں ہو۔ میں بھی کیا احمق ہوں، بے کار ذرا سی بات پر غصہ آگیا۔ بات یہ ہے کہ میرے معینہ اوقات میں اگر گڑبڑ ہو جاتی ہے تو پس مجھ سے رہا نہیں جاتا اور یہ کئی دن سے کیا کئی ہفتوں سے مسلسل ہو رہا ہے اب دیکھو اتنی دیر سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ابھی تک ناشتہ نہیں ملا۔ غصہ نہ آئے تو کیا ہو۔

سلیمہ : (عزیز کی طرف مڑتی ہے۔ اس کی طرف بے معنی طور سے گھورتی ہے اور پھر بہت کمزور آواز میں) ہاں شاید یہی وجہ ہو۔ اچھا میں آپ کے لیے چاء تیار کر کے لے آتی ہوں۔

(باہر جاتی ہے۔ عزیز کمرے میں ٹہلتا ہے پھر کھڑکی کی طرف جاتا ہے۔ وہاں سے پکارتا ہے۔)

عزیز : بشیر! اے بشیر! ذرا یہاں آنا۔ تم سے کچھ باتیں کرنا ہیں

(ایک منٹ بعد باہر کے دروازے سے بشیر داخل ہوتا ہے۔ کمزور، مدقوق بیمار، چمکتی ہوئی آنکھیں، اندر آتے ہی کوچ پر جا گرتا ہے پیچھے پیچھے بدل داخل ہوتا ہے۔)

بدل : بیگم صاحب مناکین مدانہ مانیو۔ گھومنے کا چلے گئے۔ بتا بھر مار کھانست ہکان ہوئے گئو۔

(عزیز سے) میاں دوائی جلدی سے دلواؤ ہم کپڑاں کے تو ان کا یہاں تک لائے ہیں حالت بہت خراب ہوئے گئے رہی ہے

عزیز : (بشیر سے) آرام سے کوچ پر لیٹ جاؤ۔ پیر اٹھا کر۔ (بدل سے) اسے ایک کمبل اٹھا کر میاں کے پاؤں پر ڈال دے اور پھر جلدی سے جا کر ناشتہ لا۔

(بدل کمبل اڑھا دیتا ہے اور باہر جاتا ہے)

عزیز : اس حالت میں گھومنے جانا تو سراسر حماقت تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ علاج میں بھی آپ اپنی جدت

کرنا چاہتے ہیں۔ تعریف تو جبھی ہے کہ کوئی بات بھی معمولی انسانوں کے دستور کے مطابق نہ ہو۔

(بشیر آنکھیں بند کیے ہوئے لیٹا ہے۔ لمبی لمبی سانسیں۔ کچھ جواب
نہیں دیتا۔ ——— عزیز تھوڑی دیر تھم کر پھر شروع
کر دیتا ہے۔ ٹہل ٹہل کر)

عزیز: بھئی بشیر! مجھ سے جہاں تک ممکن تھا میں نے تمھاری مدد کی۔ تم بیمار تھے تو مجھ سے نہیں دیکھا گیا میں نے اپنے گھر بلا کر تمھیں ٹھیرایا اور ہر طرح سے تمھارے آرام کا خیال رکھا۔ تمھارے علاج میں میں نے کوئی کمی کی۔ یہاں کے بہترین ڈاکٹروں کو بلا کر تمھیں دکھایا! لیکن تم خود خیال کرو میرے پاس کوئی قارون کا خزانہ تو ہے نہیں اور پھر یہ بھی ہے کہ تمھارے یہاں رہنے کی وجہ سے گھر کا سارا انتظام گڑبڑ ہو رہا ہے سلیمہ کی تو صحت پر میرا خیال ہے کہ اثر پڑنے لگا ہے۔ دن رات وہ بیماری تمھاری تیمار داری میں لگی رہتی ہیں یہاں تک کہ انھیں اپنی کسی بات کا ہوش ہی نہیں ہوتا، انھیں آرام اور سکون کی بے حد ضرورت ہے۔ خیر تو ان سب باتوں کو ذہن میں رکھ کر میں نے یہ طے کیا ہے کہ تمھارے لیے اسپتال میں انتظام ہو جائے تو بہتر ہے۔ میں آج وہاں کے ڈاکٹر سے مل کر باتیں کروں گا۔ کل سے تم وہیں اٹھ جاؤ۔ ہم لوگ دوسرے تیسرے تمھیں آکر دیکھ لیا کریں گے۔ پھر خدا کی ذات سے امید ہے کہ تم جلدی سے اچھے ہو جاؤ گے۔ وہاں دو چار ہفتہ سے زیادہ تمھارا رہنا بھی نہ ہو ——— لیکن اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ جو ڈاکٹر کہے اس پر عمل بھی کرو۔ یہ نہیں کہ وہ آرام کرنے کو کہے، تو تم واک کرنے کی ٹھان لو۔ وہ دوا تجویز کرے تو تم اسے پینے سے ہی انکار کر دو ——— میں نے مانا کہ آزاد روی بہت اچھی چیز ہے، لیکن ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے تم کو تو کم از کم یہ سمجھ لینا چاہیے ——— تم ذرا غور تو کرو تم نے اپنی کیسی حالت کر لی ہے اگر تم نے ذرا بھی اپنے خاندان والوں کی باتوں کا خیال کیا ہوتا تو آج یہ نوبت ہی کیوں آتی۔ نہ تمھارا گھر ہے نہ بار ہے۔ آج اس کے یہاں پڑے ہو، تو کل اس کے یہاں

(بشیر کو کھانسی آتی ہے وہ اپنی جگہ پر ہلتا ہے اور اب آنکھیں

(کھول کر عزیز کی طرف دیکھتا ہے۔ عزیز ایک منٹ کے لیے رک
جاتا ہے اور بشیر کی طرف دیکھتا ہے۔ اس کے بعد پھر ٹہلنے لگتا ہے)

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر تمھیں اس قسم کی زندگی میں کیا مزہ ملتا ہے؟ انسان کو چاہئے کہ پہلے اپنی
خبر لے۔ اس کے بعد دوسروں کی فکر کرے۔ "چیریٹی بگنس ایٹ ہوم"

بشیر: (دھیمی اور کمزور آواز میں) مجھے تو اپنی زندگی میں کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوتی۔ اس بیماری نے البتہ
مجھے پریشان کر رکھا ہے، آپ لوگوں کو بھی میری وجہ سے اتنی زحمت ہو رہی ہے ورنہ اس کے علاوہ
جیسے سب انسان رہتے سہتے ہیں، ویسے ہی میں بھی رہتا ہوں۔

عزیز: (ایک بارگی رک کر) بس تم سے باتیں کرنے میں یہی تو مشکل ہے تم کو اپنی طرز زندگی میں کوئی خاص
برائی ہی نہیں نظر آتی۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمھاری کون سی بات انوکھی نہیں ہے۔ ہمارے یہاں کا دستور
یہ ہے کہ تعلیم ختم کرنے کے بعد انسان اپنی روزی کمانے کی فکر کرتا ہے۔ نوکری کرے یا وکالت
کرے یا تجارت کرے بہرحال کوئی نہ کوئی صورت ایسی ضرور نکالنا چاہئے کہ انسان اپنے پیروں پر
کھڑا ہو سکے، اپنے والدین اور اعزا پر بار نہ ہو، اس کے بعد شادی کرے، اپنا گھر بار درست
کرے۔ بچے ہوں تو ان کی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام کرے، اپنی مقدرت کے مطابق غربا و
مساکین کی مدد کرے۔ یہ ہے ہمارے یہاں کا دستور، اور تم نے کیا کیا؟ تمھارے والد بھائی نے
تمھاری تعلیم میں کسی قسم کی کمی نہیں کی۔ بی اے۔ ایم اے تک پڑھایا۔ اگر تم راضی ہوتے تو تمھارے
خاندان کا خدا کے فضل سے اتنا اثر بھی ہے کہ تمھیں اچھی خاصی نوکری مل جاتی یا اگر تم خوشامد سے
گھبراتے تھے تو ڈپٹی کلکٹری یا آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان دے سکتے تھے۔ کالج میں ہمیشہ تم اچھی طرح
پاس ہوتے رہے۔ غالباً ان امتحانوں میں ضرور تمھیں کامیابی ہوتی۔ مگر نہیں۔ ہر بات سے تم نے
انکار کیا۔ بہرحال تم نے اپنی شادی نہ کیا، اچھے اچھے کھاتے پیتے شریف گھرانوں سے تمھاری شادی کے
پیغام آئے۔ میں خود پرانی رسوم کا زیادہ قائل نہیں، مگر تمھارے لیے جن لڑکیوں کی نسبتیں آئی تھیں، ان
میں کئی پڑھی لکھی، خوش سلیقہ، خوبصورت، غرض سبھی کچھ تو تھیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس سے بہتر

ہاں بھلا تمہیں کہاں مل سکتی ہے، لیکن تم کو ہر بات پر نہیں کہنے کی جیسے عادت سی ہو گئی ہے اور پھر اوپر سے
یہ بھی دعویٰ ہے کہ جیسے سب انسان رہتے ہیں ویسے ہی میں بھی رہتا ہوں۔

بشیر: مجھے تو یہی معلوم ہوتا ہے، آرام سے رہنے کی خواہش دنیا میں ہر انسان کو ہوتی ہے، وہ مجھے بھی ہے
میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے رہبانیت سے بالکل کوئی دلچسپی ہے۔ رہبانیت تو زندگی سے
بھاگنا ہے اور مجھے زندگی پسند ہے ——— (اسے کھانسی آتی ہے) صحت رگوں میں گرم خون
کی روانی، محنت، کام، دوستی، محبت، عشق، زمردیں آسمان اور گھنگھور گھٹائیں، چٹیل میدان
اور لہلہاتے ہوئے سبز کھیت اور سب سے بڑھ کر انسان اور اس کی کاوشیں (کھانسی) انسان اور اس
کی کاوشیں: جدوجہد، دوڑ دھوپ، سعی، کوشش۔

عزیز: (بات کاٹ کر) جی ہاں! کیوں نہیں؛ کوشش، دوڑ دھوپ! خدا کے واسطے اپنے ہوش
کی دوا کرو۔ تم کو اب بھی اس بات کا احساس نہیں ہوتا، کہ اسی بیکار دوڑ دھوپ اور کوشش نے تم کو
کسی کام کا نہیں رکھا! کوشش آخر کس لیے؟ دوڑ دھوپ کس کے واسطے؟ محنت اور مشقت کا
مقصد بھی تو کچھ ہونا چاہیئے۔

بشیر: ہاں! آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ دولت پیدا کرنا انسانی کوشش کا پہلا مقصد ہونا چاہیے
اس سے تو میں نے کبھی انکار نہیں کیا

عزیز: کیا انکار نہیں کیا؟ اگر تم کو اس بات کا انکار نہیں۔ اگر تم یہ سمجھتے تھے۔ کہ ہر شخص کو سب سے پہلے اپنا پیٹ
پالنے کی فکر کرنی چاہیئے تو تم نے پھر اس اصول پر عمل کیوں نہیں کیا؟

بشیر: (کمزور آواز میں ——— جیسے خود سے باتیں کر رہا ہے) اُصول، اُصول، اُصول کی پابندی!
میں نے اصول کی پابندی کیوں نہیں کی؟ کیسا اُصول، کس کا اصول؟ اس دنیا میں لاکھوں کروڑوں
آدمی اصول کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ سارے اُصول، سارے قاعدے اس لیے ہیں
کہ ہم اپنے ہاتھ پیر نہ ہلا سکیں۔ بے شک اپنا پیٹ پالنے کے لیے محنت کرنا انسان کا فرض ہے
لیکن اصول یہ ہے کہ محنت کرنے والے کو اپنی محنت کا پھل نہ ملے۔ دستور یہ ہے کہ بیکاری میں زندگی

بسر کرنے والے محنت مزدوری کرنے والوں کے آقا اور مالک سمجھے جائیں۔ مزدوری کرنے والے
بھوکے مریں اور وہ لوگ جو کچھ کام نہیں کرتے، عیش و عشرت کی زندگی بسر کریں۔ رواج یہ ہے
کہ اگر مزدور اپنی محنت کا پھل مانگے تو وہ سرکش اور باغی کہا جائے۔ اور اس کا سینہ گولی کا نشانہ
بنے (کھانسی) دولت جسے محنت کا پھل ہونا چاہیئے، اپاہج، ناکارہ، احمق، تنگ نظر، جاہل
لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ اور جس کے ہاتھ میں دولت ہے اسی کے ہاتھ میں طاقت بھی ہے اور جس
کے ہاتھ میں طاقت ہے۔ اسی کے بنائے ہوئے اصول، اسی کے بنائے ہوئے قاعدے۔ میرے نزدیک
ان اصولوں کی پابندی انسانیت کے خلاف جرم ہے

(تھک کر چپ ہو جاتا ہے)

عزیز: (غصہ میں چلا چلا کر) بس اب تو تم بالکل خرافات بکنے لگے۔ ہم تو یہ سنتے چلے آئے تھے کہ
دنیا میں تہذیب اور تمدن کی بنیاد اصول اور ضوابط ہیں۔
اور آپ فرماتے ہیں کہ ان اصول کو توڑنا نہیں۔ بلکہ ان کی پابندی کرنا جرم ہے۔ رہا امیری غریبی
کا جھگڑا، یہ تو دنیا میں ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ

اللہ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے۔ جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمیں غریبوں
کی مدد نہیں کرنی چاہیئے، لیکن غریبوں کو بھڑکا کر امیروں کے خلاف کرنے کے سوائے اس کے کہ بدامنی
اور بغاوت پھیلے۔ فائدہ کچھ بھی نہ ہوگا۔

بشیر: (اٹھ بیٹھتا ہے) آپ کی تہذیب اور تمدن کی بنیادیں لاکھوں، کروڑوں مزدوروں اور کسانوں
کے خون آلودہ ہیں۔ اس عمارت کی ہر ہر دیوار جبر اور تشدد سے اٹھائی گئی ہے۔ اس کی سجاوٹ
میں فریب اور دھوکے بازی سے کام لیا گیا ہے، بدامنی اور بغاوت! یہ اس زلزلہ کی ابتدا ہے جس کی
جنبش نے ظالموں کے پیر اکھاڑ دیئے ہیں اور یہی وہ جنبش ہے جو مظلوموں کے خستہ اور مجروح پیکر
میں بجلی کی لہر کی طرح سے دوڑ گئی ہے، دنیا کی کوئی طاقت اس طوفان کو روک نہیں سکتی۔ یہ وہ

آندھی ہے جو بڑے بڑے مضبوط درختوں کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دے گی، لیکن یہ طوفان پہر اول
ہے ہر چیز کی پیدائش درد اور بے چینی کے ساتھ ہوتی ہے۔ دانہ مٹی اور کیچڑ سے مل کر اگتا ہے اُجالا
رات کی تاریکی سے دست وگریباں ہونے کے بعد روز روشن بن کر دنیا پر پھیل جاتا ہے میری نظروں کے
سامنے ———

(کھانسی شدت کی ——— عزیز بالکل ساکت ہے)

(بشیر تھک کر کوچ کے نیچے گر پڑتا ہے۔ سلیمہ دوڑتی
ہوئی آتی ہے۔ بشیر بے ہوش ہے)

سلیمہ: ہائے اللہ! یہ کیا ہوا؟

(عزیز اور سلیمہ دونوں بشیر کو اٹھاتے ہیں۔ دوسرے کمرے کے باہر
لے جاتے ہیں)

(بدل ناشتہ لے کر داخل ہوتا ہے۔

(تھوڑی دیر کے بعد عزیز واپس آتا ہے)

عزیز: (ناشتہ دیکھ کر) خیر شکر ہے خدا کا! آج تو میں بالکل بھوکا مر گیا۔

(ایک منٹ کے بعد سلیمہ کی چیخ کی آواز، اور اس کے بعد
وہ دوڑتی ہوئی کمرہ میں داخل ہوتی ہے)

عزیز: (چڑچڑے پن کے ساتھ) کیوں اب کیا نئی واردات ہوئی؟

(چائے پیتا ہے)

(سلیمہ عزیز کو اس طرح دیکھ کر اک بارگی رک جاتی ہے اور اس
کی طرف گھورنے لگتی ہے۔ عزیز سمجھتا ہے، گھبرا کر اٹھتا ہے
اور کمرے کے باہر جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد واپس آتا ہے)

(بشیر مر گیا ہے۔ سلیمہ کوچ پر منہ چھپا کر پڑی ہے، روتی ہے۔ عزیز

(اس کے قریب بیٹھ کر اُسے چپ کرنے کی کوشش کرتا ہے)

عزیز: (نرمی سے) ہم سب کو ایک نہ ایک دن موت کا منہ دیکھنا ہے ——— بھلا کسے خیال ہو سکتا تھا کہ مرحوم کا اتنی جلدی وقت آجائے گا ——— مگر مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے!
بس کرو ———،

(سلیمہ یک بارگی اس کے پہلو سے اپنے کو چھڑا کر اُٹھ کھڑی ہوتی ہے، اس کا رونا بھی رک جاتا ہے۔ چہرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حواس ٹھیک نہیں ——— کارنس کی طرف جاتی ہے اور ایک شمع ڈھونڈ کر جلاتی ہے۔ اسے ہاتھ میں لے کر)

سلیمہ: بشیر اب زندہ نہیں! بشیر مر گئے؟ کون کہتا ہے؟ بشیر تو ہمیشہ زندہ رہیں گے ———"
لیکن عزیز ——— عزیز ——— مُردہ ——— بلکہ مردہ سے بھی بدتر ——— میں جاتی ہوں۔ خدا حافظ ——— بشیر اندھیرے میں ہیں

(شمع لے کر باہر جاتی ہے۔ عزیز کوچ پر بیٹھا رہ جاتا ہے کمرے اور پھر سارے اسٹیج پر تاریکی چھا جاتی ہے)

(پردہ)

○

ماچس کی ڈبیا

سعادت حسن منٹو

کردار

دیدی
پال
لاجو
لاجو کی ماں

پہلا منظر

ویدی : (کمرا سا نو ہے لر) تو اب مجھے اس کمرے میں رہنا ہوگا ——— کیا کہتے ہیں ممبئی کی۔ یان میں ایسے کمروں کو ؟

پال : کھولی !

ویدی : کتنا واہیات نام ہے ——— غربت کی توہین ایسے ہی بدنما ناموں سے تو ہوتی ہے۔ کھولی ۔ ۔ ——— یعنی جس نے چاہا کھول لی ——— مجھے غربت سے اتنی وحشت نہیں ہوتی، جتنی غربت ظاہر کرنے والی چیزوں سے ہوتی ہے۔

پال : جناب یہ فلسفہ بگھارنے کا وقت نہیں۔ پہلے آپ اپنا سامان ٹھکانے رکھ لیجئے ——— رات آ رہی ہے ۔ ۔ ۔ ——— اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے اس تاریکی دور کرنے کے لیے کوئی بھی چیز نہیں۔

ویدی : چھوڑو یار اس سامان کو ... مجھے کون سا محل سجانا ہے ——— جو چیز جہاں رکھ دی گئی ہے۔ ٹھیک ہے۔ ——— تم تاریکی اور روشنی کی باتیں کرتے ہو، میں تو دونوں میں امتیاز کرنا ہی بھول گیا ہوں ——— مجھے تو دن کو اجالا تاریک نظر آتا ہے اور رات کو اندھیارا روشن دن کو شہر کے ہنگامے میں کچھ سجائی نہیں دیتا لیکن رات کو میں اپنے دل کی ہر بات پڑھ لیتا ہوں ———

پال : قصّہ کیا ہے ؟ آج تم بہت شاعری کر رہے ہو۔

ویدی : شاعری ! (ہنستا ہے) اگر جو کچھ میں نے کہا ہے شاعری ہے تو میرا خیال ہے کہ شاعر بڑے تیرہ بخت انسان ہوتے ہوں گے ——— پال تم نے کبھی محبت کی ہے۔

پال : یہ محبت کا سوال تم بیچ میں کیا لے آئے ؟

ویدی : پال تم سے بڑی سنجیدگی کے ساتھ پوچھ رہا ہوں

پال : اماں ہٹاؤ اس سنجیدگی کو ـــــ میں کیا جانوں محبت کیا بلا ہے ؟

ویدی : تو میری طرح تمھارا دل بھی محبت کا پیاسا ہے ـــــ پال ـــــ میں نے لوگوں سے سنا ہے اور کتابوں میں پڑھا ہے کہ ایک شے کے جسے محبت کے نام سے پکارتے ہیں دل کی لطیف ترین غذا ہے کیا یہ سچ ہے ؟

پال : میرے دل کا ہاضمہ دُرست ہے۔ مجھے کبھی اس لطیف غذا کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی ـــــ تمھارا دماغ خراب ہوگیا ہے نہ جانے تمھارے دل میں یہ محبت کا خیال کب اور کس وقت اندر چلا گیا ـــــ مجھے تو کام دھندوں سے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ اس بارے میں کچھ سوچوں، تم خود ہی غور کرو مل کے اندر مشینوں کی دیکھ بھال کروں۔ ان کے پرزوں میں تیل دوں یا تمھاری اس محبت کو دماغ میں لے کر بیٹھ جاؤں ـــــ ؟

ویدی : پال تمھیں فوراً کسی ڈاکٹر سے اپنا علاج کرانا چاہیے ـــــ مشینوں کے اندر رہ کر تم خود لوہا بن گئے ہو ـــــ تم باتیں تو یوں کرتے ہو گویا تمھارے پہلو میں دل کی بجائے برف کا ڈھیلا ہے جس پر کوئی نقش بیٹھ ہی نہیں سکتا ـــــ عورت کو دیکھ کر جس مرد کا دل اپنے لیے ایک رفیق ڈھونڈھنے کا خیال پیدا نہ کرے اسے سینے سے باہر پھینک دینا چاہیے۔

پال : اب میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ میرا دل سینے سے باہر نکالنا چاہتے ہیں یا اس کے اندر کسی رفیق کو ڈھونڈھنے کا خیال پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

ویدی : پال تم نہیں سمجھتے میں کیا چاہتا ہوں میں یہ چاہتا ہوں، میں یہ چاہتا ہوں۔

پال : ہاں، ہاں، بولو ـــــ تم کیا چاہتے ہو ـــــ پانی کا گلاس دل پینے کے لیے ؟

ویدی : میں یہ چاہتا ہوں تم محبت کرو ـــــ میں محبت کروں۔ سب محبت کریں ـــــ دنیا

میں سب محبت کرنے والے ہیں ——— ہر ایک دل میں محبت ہو ——— آہ پال تم نہیں سمجھتے کہ اس ننھے سے لفظ میں کتنی مٹھاس ہے ——— کتنی راحت ہے ——— محبت محبت ——— ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری آتما شبنم سے لدی ہوئی گھاس پر صبح کی ہوا سے کھیل رہی ہے ۔ تم ضرور محبت کرنے کی کوشش کرو پال ——— بغیر محبت کے کوئی مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔

پال : جنابِ من ! خاکسار بہت کوشش کر چکا ہے مگر خاطر خواہ نتیجہ ابھی تک نہیں نکلا ——— ہر روز رات کو آپ کا یہ خادم ایک خیالی عورت بناکر اس سے محبت کرتا ہے اور صبح ہوتے ہی اپنے دل کے باہر یہ بورڈ لٹکا دیتا ہے کرائے کے لیے خالی ہے کمرہ ہوادار ہے مگر ہوا کے سوا اس میں اور دھرا ہی کیا ہے ۔ آج کل کی عورتیں صرف ہوا پر تو زندہ نہیں سکتیں کمرہ سجا ہوا ہو تو بہت سے کرایہ دار مل سکتے ہیں۔

ویدی : محبت محلوں سے زیادہ جھونپڑوں میں رہتی ہے پال ——— اسے ظاہری سجاوٹوں سے کیا کام ——— اور پھر محبت تو خود ایک سجاوٹ ہے دل کے لیے اس سے خوبصورت زیور اور کیا ہو سکتا ہے۔

پال : یہ شاعری اب کسی اور وقت پر اٹھا رکھو ——— مجھے نائٹ ڈیوٹی پر جانا ہے ——— اگر میرے دل نے یہ زیور اس وقت پہن لیا تو مل کی مشینیں آج رات بند رہیں گی اچھا تو میں چلا ۔

ویدی : جاؤ ، بھئی جاؤ ——— آج کی رات جیسے کٹے گی وہ تو ظاہر ہے

——— وقفہ ———

○

دُوسرا منظر

مشین چلانے کی آواز سنائی دیتی ہے

لاجو : آج یہ ہَوا بھی کتنے زوروں پر چل رہی ہے ——— اُف توبہ ——— لیمپ کی بتی کس طرح پھڑپھڑا رہی ہے۔

لاجو کی ماں : تماشا کیا دیکھتی ہے ذرا اٹھ کے چمنی کے اس طرف لکڑی کا ٹکڑا اٹھا کے رکھ دے اگر یہ بجھ گیا تو تجھے ہی نیچے دیا سلائی لینے کے لیے جانا ہوگا ——— میری بلا سے، نہیں سنتی تو نہ سُن!

لاجو : ماتاجی ——— مجھے اس کی پھڑپھڑاہٹ اچھی معلوم ہوتی ہے ——— ایسا لگتا ہے جیسے میرا اپنا دل اس چمنی کے اندر دھڑک رہا ہے۔

لاجو کی ماں : جانے کیا واہی تباہی بک رہی ہے ——— بولو ——— ہَوا نا وہی ہُوں کا مجھے کھٹکا تھا۔

لاجو : ہائے رام! یہ تو سچ مچ بجھ گیا ——— کتنا اندھیرا ہو گیا ہے۔

لاجو کی ماں : اب یہاں بیٹھ کے باتیں نہ بنا ——— جا بازار سے ایک پیسے کی ماچس لے آ۔

لاجو : مجھ سے تو یہ نہ ہو سکے گا، پانچ سیڑھیاں نیچے اُتروں اور پھر پانچ سیڑھیاں اُوپر چڑھوں میرے گھٹنے تو ابھی سے جواب دے رہے ہیں۔

لاجو کی ماں : تجھے تو کسی نواب کے گھر پیدا ہونا چاہیے تھا، جہاں بیٹھے بٹھائے تجھے ہر چیز مل جاتی ——— میری لاڈو کے پاؤں کی مہندی گھستی ہے۔ سیڑھیاں اُترتے اُوہ! بابا، کیسا زمانہ آیا ہے ——— اس جوانی میں تیرے گھٹنے جواب دے رہے ہیں

تو میری عمر کو پہنچ کر تیرا کیا حال ہوگا؛ جا سامنے والی کھولی میں پڑوسن سے دیا سلائی امگ لا ——— تجھ سے اٹھا جائے گا یا میں ہی جاؤں؛

لاجو: جاتی ہوں ماں! یہ لنگوٹے کپڑے بھی تو بیتے ہیں مجھے ——— اگر صبح تک تیار نہ ہوئے تو چولھے میں آگ کیسے جلے گی ——— جاتی ہوں ——— اس ڈھیر سے پانی ایسی زندگی سے جانے کب نجات ملے گی۔

——— تھوڑا وقفہ ———

دروازے پر دستک دینے کی آواز سنائی دیتی ہے

لاجو: دینو کی ماں، دینو کی ماں!

(پھر دستک کی آواز سنائی دیتی ہے)

لاجو: دینو کی ماں ——— دینو کی ماں ——— ارے سو گئی ہو کیا، نہیں دروازہ تو کھلا ہے (دروازہ کھلنے کی آواز) دینو کی ماں ——— ارے تم نے یہ کمرے میں یہ دھونی کیسی رما رکھی ہے ——— اُف میرا تو دم گھٹنے لگا ہے ——— دینو کی ماں؟ میں پوچھتی ہوں، تم نے یہ بیڑیاں کب سے پینی شروع کر دیں۔

ویدی: کون ہے؟

لاجو: ارے یہ کون بول رہا ہے؟

ویدی: ارے یہ کون بول رہا ہے؟

لاجو: دینو کی ماں کہاں ہے؟

ویدی: دینو کی ماں ——— یہاں دینو کی ماں نہیں رہتی اور میری ماں کو مرے اتنے ہی برس ہو گئے ہیں۔ جتنے کہ مجھے زندہ رہتے ہو گئے ہیں۔ کمرے میں یہ دھواں میں نے اس لیے بند کر رکھا ہے کہ اس سے کمرے کی غلاظت دب جاتی ہے۔

لاجو: تم تو کوئی اور ہو ——— میں ——— میں غلطی سے یہاں چلی آئی۔ ——— مجھے

ونیو کی ماں سے ملنا ہے۔

ویدی : ونیو کی ماں سے ——— جب میں نے اپنی ماں کی شکل نہیں دیکھی ، تو ونیو کی ماں کو میں کیسے جان سکتا ہوں ؟ ——— یہ کمرہ ——— نہیں ، یہ کھولی ! میں نے آج ہی کرائے پر لی ہے۔

لاجو : تو ونیو کی ماں ہمیں اطلاع دیے بغیر یہاں سے چلی گئی ؟ ——— میں اُس سے دیاسلائی کی ڈبیا مانگنے آئی تھی ۔ ہمارا لیمپ بجھ گیا ہے۔

ویدی : تمہارا لیمپ بجھ گیا ہے ——— پر یہاں تو ایک لیمپ روشن ہو گیا ہے۔

لاجو : کیا کہا آپ نے ؟

ویدی : سمجھنے کی کوئی ضرورت نہیں ——— تمہیں ماچس چاہیئے نا ؟

لاجو : جی ہاں !

ویدی : ماچس ——— اور ماچس لے کر تم فوراً ہی یہاں سے چلی جاؤ گی ۔

لاجو : ہاں ہاں ——— مجھے لیمپ بھی تو روشن کرنا ہے ۔ ——— میری ماں اندھیرے میں بیٹھی ہے۔

ویدی : بالکل درست ہے میں سوچ رہا ہوں ——— تمہیں فوراً ہی جیب سے ماچس نکال کے کیوں نہیں دے رہا ——— کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ کیا قصہ ہے کیا تم اس معاملے پر کچھ روشنی ڈال سکتی ہو۔

لاجو : ماچس لائیے۔

ویدی : تم بڑی ——— دہ ہو ———

لاجو ہنستی ہے ——— ویدی ہنستی ہے

لاجو : مجھے دیر ہو رہی ہے لائیے ماچس !

ویدی : ہاں ہاں ! واقعی تمہیں دیر ہو رہی ہے ——— یہ لو ماچس ———

ماچس کی ڈبیہ میں تیلیوں کی کھڑکھڑاہٹ

لاجو : لیجئے ——— اسے ——— آپ کا لیمپ بھی بجھ گیا (دیا سلائی کی ڈبیا گرنے کی آواز) اور ماچس بھی گر گئی ۔

ویدی : اچھا ہوا

لاجو : کیا کہا ؟

ویدی : میں نے کہا الٹا اچھا ہوا ——— اب کیا سچ مچ اسے ڈھونڈنا ہی پڑے گا ۔

لاجو : واہ جناب واہ ——— ڈھونڈنا کیوں نہیں پڑے گا ——— دو لیمپ بجھے پڑے ہیں انکو روشن نہیں کرنا ہے کیا ؟

ویدی : روشنی زیادہ ہو جائے گی ۔

لاجو : کیا کہا ؟

ویدی : میں نے یہ کہا تھا کہ مجھے اب روشنی کی کیا ضرورت ہے ؟

لاجو : پر مجھے تو ہے ۔

ویدی : تو آپ خود ہی ڈھونڈ لو ——— میرا دل بھی اسی میں پڑا ہے ———

لاجو : (ہنستی ہے) آپ کا دل ماچس میں پڑا ہے ——— اور میرا دل بجھے ہوئے لیمپ میں ۔

ویدی : تو پھر ماچس کو فوراً ہی ڈھونڈنا چاہئے ——— اسے میں سوچ کیا رہا ہوں ٹھہرو ——— (زمین پر ہاتھ مارنے کی آواز) یہیں گری تھی اور یہیں ہونی چاہئے (ماچس پر ہاتھ پڑنے کی آواز) یہ لو ——— لیکن ٹھہرو ——— میں لیمپ جلا کر تمہیں تو اچھی طرح دیکھ لوں ——— شاید کل تمہاری کھولی میں کوئی اور آ جائے ۔

لاجو : نہیں ہم نے اس مہینے کا کرایہ پیشگی دے دیا تھا ۔

ویدی : ایک مہینے تک میں اسی کھولی میں ہوں گا ، کیونکہ کرایہ میں نے پیشگی ہی دیا ہے

(لیمپ کی چمنی اور دیا سلائی جلانے کی آواز)

لاجو : ایک تو روشن ہو گیا۔

ویدی : کیا دوسرا روشن نہیں ہوا ؟

لاجو : اب جا کے روشن کروں گی۔ لا یئے ماچس ——— آپکا دل ہے نا، ابھی تک اس میں۔

ویدی : (ہنستا ہے) ——— ہاں ہاں اسی میں ہے (ماچس کی آواز) یہ لو

لاجو : مہربانی ——— تو میں چلتی ہوں۔ ———

ویدی : ہاں ہاں جاؤ ——— لیکن ذرا ٹھہرو ——— نہیں نہیں جاؤ تمہیں اپنا لیمپ بھی روشن کرنا ہے ——— تمہاری ماں اندھیرے میں بیٹھی تمہاری راہ دیکھ رہی ہو گی۔
جاؤ ——— لیکن ٹھہرو تو ——— ہاں ٹھہرو تو۔ ———

لاجو : کچھ کہنا ہے کیا ؟

ویدی : کچھ کہنا ہی تو ہے ——— کچھ کہنا ہی تو ہے ——— پر کیا کہنا ہے
ہاں تو اب تم جا رہی ہو کیا ؟

لاجو : جی ہاں جا رہی ہوں۔

ویدی : تم بڑی اچھی لڑکی ہو ——— اچھا تو میں بھی ہوں۔ پر یہ بیکاری بڑی بلا ہے۔
لیکن اب میں کوئی نہ کوئی کام ضرور ڈھونڈ لوں گا۔ ——— مجھ میں آج بڑی ہمت پیدا ہو گئی ہے ——— دنیا میں اگر عورت نہ ہوتی تو مردوں میں شجاعت کبھی پیدا نہ ہوتی
اگر تم مجھ سے کہو تو میں اس کھڑکی میں سے ابھی نیچے بازار میں کود جاؤں ——— پر میں یہ کیا گفتگو کر رہا ہوں۔

لاجو : میں اب جاتی ہوں۔

ویدی : ہاں اب جاؤ ——— پر اپنا نام تو بتاتی جاؤ ———

لاجو : میرا نام لاجونتی ہے ——— ماں مجھے لاجو کہتی ہے۔ ———

ویدی : لاجونتی ——— لاجو ——— بڑا پیارا نام ہے ——— تم یہاں کیا کرتی ہو؟

لاجو : سلائی کا کام کرتی ہوں ــــــــ اگر آپ کپڑا دیں تو میں آپ کی قمیض سی دوں گی ۔

ویدی : شکریہ ! ــــــ میرا کوٹ کہنیوں پر سے پھٹ رہا ہے ــــــ اگر کبھی اس کو رفو کردو ۔ تو بڑی مہربانی ہوگی ۔

لاجو : میں کل آکے یہیں رفو کردوں گی ــــــ اچھا میں اب جاتی ہوں ۔ ــــــ

ــــ تھوڑا وقفہ ــــ

﴿ دروازہ بند ہونے کی آواز ﴾

ویدی : (فرطِ مسرت کے باعث بلند آواز میں ؛ ویدی ! ــــــ ویدی ! ــــ دوست تمہارا نصیبہ جاگ اٹھا ۔

ــــ سیٹی بجاتا ہے ــــ

وقفہ

تیسرا منظر

دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز

ویدی: آجاؤ!

پال: (دروازہ کھولنے کی آواز) سناؤ بھئی کیا حال ہے۔ یہ کمرہ کیسا رہا؟ ---- [illegible] تم اپنے کوٹ کو بیڑی سے جلا کیوں رہے ہو؟

ویدی: اس لیے کہ اس میں بہت سے سوراخ ہو جائیں۔

پال: سوراخ ہو جائیں ———— سوراخ [illegible] ---- [illegible] میں پوچھتا ہوں کہ یہ منطق کیا ہے؟

ویدی: ایک سوراخ رفو کرنے میں اگر پانچ منٹ صرف ہوں گے تو تین سوراخ رفو کرنے میں پندرہ منٹ صرف ہوا [illegible]

پال: ہاں ہاں! [illegible] صرف ہوں گے۔ پر تمھاری بات سمجھنے میں مجھے کتنے گھنٹے لگیں گے؟

------ ویدی ہنستا ہے ————

پال: تم آج ہنس [illegible] رہے ہو ---- ———— یہ قصہ کیا ہے؟

ویدی: قصہ یہ ہے ———— دروازے پہ دستک ہوئی ———— اور ایک نقرئی آواز آئی ———— دینو کی ماں ———— دینو کی ماں! یہ تم نے بیڑیاں کب سے پینا شروع کر دیں ہیں ———— وہ اندر چلی آئی ————

سن رہے ہو پال ———— میرے خوابوں کی پری اندر چلی آئی ————

پرماتما کی رحمت ہو اُس دینو کی ماں پہ ———— تم جانتے ہو اس دینو کی

لیکن میری طرف، یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیوں گھور رہے ہو۔

ہنسو پال ——— آج خوب ہنسو ——— کیا تم دیکھ نہیں رہے
کہ آج ہر ایک شئے ہنس رہی ہے ——— وہ ابھی آنے کی میرا
کوٹ رفو کرنے — — — میں نے اس میں تین بڑے بڑے سوراخ بنا دیئے ہیں۔
اس لیے میں اسے دیر تک سامنے بٹھا کر دیکھ سکوں گا — — — کیا میں خوش نہیں ؟
لیکن تم خاموش کیوں ہو ؟

پال : میں سوچ رہا ہوں کہ مجھے اب کس بلڈنگ میں نیا کمرہ کرائے پر لینا چاہیئے ؟

پردہ

○

جہاں پناہ

شوکت تھانوی

کردار

وزیرِ اعظم
نائب وزیرِ اعظم
ناظم
سُلطان
نسرین
نرگس
حاذق الدولہ
چپی والا

منظر

(ایک ایوان میں بہت سے لوگوں کی ملی جلی آوازیں گویا حاضرین جمع
ہو رہے ہیں۔ ان ہی آوازوں میں سے چند آوازیں نمایاں ہوتی ہیں)

ایک : جہاں پناہ کے نزولِ اجلال کا، وقت قریب آ گیا مگر عالی مرتبت وزیرِ اعظم ابتک تشریف نہیں لائے۔

دوسرا : ممکن ہے جہاں پناہ کے ہمرکاب تشریف لائیں

ایک : یہ تو غلط ہوگا جب ضروری باتیں پہلے ہی طے ہو جائیں تو اچھا تھا۔

دوسرا : اچھا تو یہی تھا کہ سب ایک ہی بات کہتے۔

ایک : غالباً عالی مرتبت وزیرِ اعظم کو خود بھی اس کا خیال ہوگا۔

دوسرا : لیجئے۔ بڑی عمر۔ وزیرِ اعظم کی پالکی آ پہنچی

(چند آوازیں، وزیرِ اعظم۔ وزیرِ اعظم۔ پھر ایکدم خاموشی)

وزیرِ اعظم : (قریب آکر) کہئے ناظم صاحب، سب ٹھیک ہے، سمجھا دیا ہے سب کو؟

ناظم : یوں تو سب ہی کو معلوم ہے حضور والا۔ اور چپی والے کی گرفتاری پر تمام افسر خوش اور مطمئن ہیں مگر۔

وزیرِ اعظم : مگر کیا؟ اس کے علاوہ اور چارہ ہی کیا تھا۔ اس کمبخت نے سب ہی کو عذاب میں مبتلا کر رکھا تھا۔
ہم جہاں پناہ کو اُمورِ مملکت سے جس قدر دور رکھنا چاہتے ہیں وہ اُسی قدر ان کو آگاہ رکھنا چاہتا تھا، ہر
شب چپی کرتے وقت وہ دن بھر کے حالات سلطانِ عالم کے گوش گذار کرتا تھا۔ ہم میں سے ہر ایک
کی شکایتوں کے دفتر کھول کر بیٹھ جاتا تھا۔

ناظم : یہ تو درست ہے حضور والا۔ اس بات سے تو سب ہی مطمئن ہیں کہ یہ لگائی بجھائی کرنیوالا، اب جہاں پناہ
کے قریب بھی نہ پھٹکنے پائے۔ مگر جہاں پناہ اس کی گم شدگی سے کافی پریشان ہیں۔

وزیرِ اعظم : وہ پریشانی آج دور ہو جائیگی اور ساتھ ہی ساتھ ہماری پریشانی بھی ختم ہو جائے گی۔ اگر جہاں پناہ کو

اسی طرح ایک ایک بات کی خبر ہوتی رہتی تو ہم میں سے کسی کی بھی دال نہ گل سکتی۔

دوسرا: حضور والا! ہر وقت چوکنا رہنا پڑتا تھا نہ جانے ہماری کس کوتاہی کا علم جہاں پناہ کو ہو جائے

وزیر اعظم : بادشاہ وقت اگر اسی طرح رعایا کے کچے چٹھے سے واقف رہنے لگے تو ... حکومت کا تو کام چلنے سے رہا۔

ناظم : بادشاہ وقت کے لیے عیش و طرب اور ناز و نعم کے سامان اسی لیے بہم پہنچائے جاتے ہیں کہ اس کو مملکت کے بکھیڑوں سے بھلا کیا مطلب۔

وزیر اعظم : مگر ہمارے جہاں پناہ ان بکھیڑوں میں اُلجھ چکے تھے اور وہ دن اس جنبی والے کے ہاتھوں دور نہ تھا، ہم سب دودھ کی مکھی کی طرح نکال باہر کیے جاتے۔

دوسرا : یہ تو حضور والا کے تدبر نے بگڑی بات بنا لی۔ اب حضور ہی کا تدبر اس بات کو نباہ بھی لے جائے گا۔

وزیر اعظم : بس آپ سب میرے ہم زبان کی تائید کریں۔ یاد رہے کہ اگر کسی ایک نے بھی مختلف بیان دیا تو کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ اعلیٰ عہدیداروں سے لیکر معمولی چوبدار تک کو جسے بھی اس راز کا علم ہو۔ ہم زبان ہو جانا چاہیے۔

ناظم : اس طرف سے آپ مطمئن رہیں وابستگانِ دولت سب ہی کو اپنے اعتماد میں لے چکے ہیں، اس جگہ ایک شخص بھی اپنے اعتماد سے باہر نہیں۔

وزیر اعظم : اور حاذق الدولہ حکیم غلام بخت خاں ؟

دوسرا : وہ ہمارے ساتھ ہیں وہ کیا حضور والا! سب ہی اپنے ساتھ ہیں۔

(نوبت کی آواز ، رفتہ رفتہ قریب آتی ہے اور ساتھ ہی نقیب کی آواز ایوان میں گونجتی ہے)

نقیب : نیر اقبال تاباں۔ عالم پناہ۔ سلطانِ دوراں۔ ظلِ سبحانی پائندہ باد

(وقفہ اور سکوت)

سلطان : ادب اور احترام سے یہ جھکے ہوئے سر میں چاہتا ہوں کہ ندامت اور شرمساری سے جھک جائیں

یہ جتماع ہے میری حکومت کے ان فرض شناس عہدیداروں کا جو ایوان حکومت کے ستونوں کی حیثیت رکھتے ہیں جو مجھے وفاداری اور اپنی فرض شناسی کا دم بھرتے ہیں مگر عالم یہ ہے کہ کارگذاری کا یہ جیتا جاگتا انسان سوئی کی طرح ڈھونڈا جا رہا ہے اور یہ سراغ لگانے سے قاصر ہیں۔ میں وزیر اعظم نصرت جنگ سے پوچھتا ہوں کہ کیا یہ غفلت اور یہ کوتاہی ان کے جلیل القدر عہدے کے شایان شان ہے؟

وزیر اعظم : جہاں پناہ کا اقبال یاور۔ جان کی اماں پاؤں تو عرض کروں کہ ہم اپنے فرائض سے اس قدر غافل نہیں ہیں جس قدر ہم کو سمجھا جا رہا ہے البتہ مصلحت وقت نے ہمارے ہونٹ سی رکھے تھے اور ہم غفلت اور ناکردگی کے الزامات کے باوجود اب تک خاموش تھے۔

سلطان : میں وزیر اعظم کا مطلب اب تک نہیں سمجھا، کیا کوئی ایسی دلیل بھی ہو سکتی ہے جو اس غفلت کا جواز پیش کر سکے۔

وزیر اعظم : جہاں پناہ! جس گم شدہ کی تلاش کا ہم کو حکم دیا گیا تھا، اس کو خود ہم ہی نے گم کر رکھا تھا۔

سلطان : خود ہی گم کر رکھا تھا؟ ـــ سبب؟

وزیر اعظم : وہ ناگہاں ایک ایسے وبائی مرض میں مبتلا ہو گیا کہ اس کو جہاں پناہ سے دور رکھنا ضروری تھا اور اگر عالم پناہ کو اس کی بیماری کی خبر ہو جاتی تو یقین تھا کہ عالم پناہ اس کی عیادت کو تشریف لے جانا چاہتے جس کی طبیب دربار حاذق الدولہ حکیم غلام نجف خاں نے قطعی ممانعت کر رکھی تھی۔

سلطان : وہ وبائی مرض میں مبتلا تھا ـــ اور ـــ اور اب؟

وزیر اعظم : ہم نہایت افسوس کے ساتھ اس کے متعلق یہ بری خبر سناتے ہیں کہ وہ اسی وبائی مرض میں پانچ روز مبتلا رہ کر آج اس دنیا سے چل بسا۔

سلطان : چل بسا؟ ـــــ افسوس ـــــ جس نے زندگی بھر میری خدمت کی، جو میرے لیے ایک خادم ہی نہیں، ایک یار وفادار کی حیثیت رکھتا تھا میں اس کی عیادت بھی نہ کر سکا۔ اس نے زندگی بھر سکھ پہنچایا اور میں مرنے کے وقت اس کے سرہانے کھڑا بھی نہ ہو سکا۔ کیا محض اس لیے کہ میں بادشاہ وقت ہوں اور وہ ایک ادنیٰ حیثیت والا تھا گویا ہم دونوں میں انسانیت کا رشتہ

بھی نہ تھا۔ کیا مجھ کو اس لیے اس سے دور رکھا گیا کہ آج میں اس کی روح کے سامنے شرمندہ نظر آؤں۔

وزیرِ اعظم : جہاں پناہ کی زندگی ہم سب کی زندگی سے زیادہ قیمتی ہے۔ رعایا کے ایک ایک فرد کو ظلِ سبحانی کی ضرورت ہے۔ مرنے والے کا مرض ہی ایسا تھا کہ عالم پناہ کا اس سے دور رہنا از بس ضروری تھا۔

سلطان : اس کی تجہیز و تکفین کا کیا بندوبست ہوا؟

وزیرِ اعظم : ناظم صاحب نے اپنی خاص نگرانی میں سب انتظام کر دیا ہے۔

سلطان : میں خود اس کے جنازے میں شرکت کروں گا۔ میں خود اس کو کندھا دوں گا۔ کاش کسی کو معلوم ہوتا کہ وہ میرے لیے کیا تھا۔ وہ میرا کتنا بہی خواہ تھا۔ وفا شعاری کا پیکر۔ سچائی اور راست بازی کا مجسمہ وہ میرے لیے جامِ جہاں نما کی حیثیت رکھتا تھا۔ میں اس کی آنکھوں سے اپنی مملکت پر نظر ڈالتا تھا۔ اب اس کے بغیر میری سلطنت میں سیکر بیے اندھیرا ہے۔ اعلان کیا جائے کہ بادشاہ خود اس کا جنازہ اٹھائیگا

حاذق الدولہ : جہاں پناہ۔ یہ غلام بحیثیت طبیب دربارِ ظل اللہ سے عرض کرے گا کہ ایسے وبائی مرض میں مرنیوالے کے جنازے میں عالم پناہ کا شرکت فرمانا طبی نقطۂ نظر سے مناسب نہ ہونے کے علاوہ خطرناک بھی ہے۔

وزیرِ اعظم : ہم عالم پناہ کے عتاب کو سر آنکھوں پر گوارا کرلیں گے مگر جہاں پناہ کو جنازے میں شرکت نہ کرنے دیں گے

ناظم : ہم وابستگانِ دولت آخر جہاں پناہ کی طرف ہی سے تو جنازے میں شرکت کر رہے ہیں۔

وزیرِ اعظم : مرنیوالے کی وفا شعاری اور سلطانِ عالم کے اعتماد کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو گا کہ یہ غلام بھی تمام عمالِ حکومت کے ساتھ جنازے میں شرکت کرے گا۔

سلطان : بے شک آپ لوگوں کو حق ہے کہ مجھے اپنے دوست کی دوستی کے حق سے سبکدوش نہ ہونے دیں۔ اس لیے کہ میں آپ کا بادشاہ ہوں۔ اپنے تاج و تخت کا اسیر بادشاہ ——— بہتر ہے صرف خاص سے شاہی تزک و احتشام کے ساتھ اس کا جنازہ اٹھایا جائے۔ وہ میرا ندیم خاص تھا۔ اس کے لوحِ مزار پر شاہی فرمان آویزاں کیا جائے۔ میرا دستخطی فرمان ——— میں چاہتا ہوں کہ سب سے

ساتھ اس کے لیے دعائے مغفرت میں شریک ہوں۔

(وقفہ ——— پھر سب کی مشترکہ آواز ـــ آمین)

نقیب: تیر اقبال تاباں۔ عالم پناہ۔ سلطانِ دوراں۔ ظلِ سبحانی پائندہ باد۔

(بگل کی آواز۔ ایک قریب۔ ایک ذرا دور۔ ایک بہت دور)

(وقفہ)

وزیر اعظم: رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت ———

ناظم: شکر ہے کہ یہ امتحان بھی گذر گیا۔ مگر داد دینا چاہیئے حاذق الدولہ حکیم نجف خاں کو۔

وزیر اعظم: واقعی حکیم صاحب کی گواہی نے کام بنا لیا۔

حاذق الدولہ: تابعداروں میں اس چھپے والے نے مجھ کو لب بخشا تھا۔ ما دالحم بن منشی اجرا ڈالنے کی خبر نمک حرام نے پہنچا دی تھی۔

وزیر اعظم: اب وہ خبریں پہنچانے یہاں نہ آسکے گا۔ آہنی سلاخوں میں زندگی کے بقیہ دن کٹ جائیں گے۔

ناظم: اس کو زندگی کے دن کاٹنے دیجیئے۔ مگر احتیاطاً اس کی قبر بنوا دینا چاہیئے۔

حاذق الدولہ: ورنہ شاہی فرمان کس پر آویزاں کیا جائے گا۔

وزیر اعظم: صرف قبر ہی نہیں بنوائی جائے گی بلکہ ہم کو اس کا جنازہ بھی اٹھا دینا چاہیئے تاکہ اس کی موت یقینی ہو جائے۔ اور یہ فتنہ اس مفروضہ قبر میں ہمیشہ کیلیے دفن ہو جائے گا۔

دوسرا: بس چند دن کی بات ہے رفتہ رفتہ جہاں پناہ بھول جائیں گے۔

وزیر اعظم: وہ بھول جائیں مگر ہم کو نہ بھولنا چاہیئے کہ جس کی قبر بن رہی ہے وہ زندہ موجود ہے۔

ناظم: میں نے تو پہلے ہی عرض کیا تھا کہ اس کو زندہ رکھنا خطرے سے خالی نہیں۔

وزیر اعظم: خونِ ناحق سے کیا فائدہ جب ہم اس کو زندہ رکھ کر بھی زندہ درگور رکھ سکتے ہیں۔

موسیقی

(محل شاہی کا اندرونی حصہ ایک مطربہ ستار چھیڑ رہی ہے)

نسرین: لو یہ یہاں زمزمے برسا رہی ہیں۔ میں کہتی ہوں، میں کہتی ہوں نرگس تیرا دماغ سچ مچ چل گیا ہے۔ یہاں نہ تیرا وزیر زادہ نہ خود جہاں پناہ کیا ان پھولوں۔ پودوں اور درختوں کو سنا رہی ہے۔

نرگس: ستار سنایا ہی نہیں جاتا، ہم کبھی خود بھی سنا جاتا ہے نسرین۔

نسرین: وزیر زادے کی یاد ان تاروں کی لرزش سے کچھ اور شدید نہیں بن جاتی۔

نرگس: نسرین۔ کیوں تم ایک بھولا ہوا خواب یاد دلاتی ہو۔ کیا دل آزاری کے سوا تمھارا اور کوئی محبوب مشغلہ نہیں؟

نسرین: پگلی کہیں کی۔ بھولا ہوا خواب اس لیے یاد دلا رہی ہوں کہ اب اس کی تعبیر دیکھنے کا وقت آیا ہے۔ جس کمبخت نے وزیر زادے سے تیری خفیہ ملاقاتوں کی خبر جہاں پناہ سے جڑ دی تھی وہ جہنم واصل ہو چکا۔

نرگس: ہو چکا کرے جہنم واصل۔ مگر جو ذلت ان کی ہو چکی ہے۔ اس راز کے کھلنے کے بعد اس کے بعد وہ کبھی ادھر کا رخ بھی نہ کریں گے

نسرین۔ جی اور کیا محبت ایسی ہی غیرت دار ہوتی تو یہ مجنوں اور فرہاد بھلے مانسوں میں شمار نہ ہوتے بخودوا نہ سمجھے جاتے۔

نرگس: خیر تم جو چاہو کہو مگر مجھے اپنی حرماں نصیبی کا روز بروز یقین ہوتا جاتا ہے۔

نسرین: وجہ یہ کہ دماغ میں عقل کے علاوہ باقی ہر قسم کا گودڑ جو موجود ہے۔ تم دونوں کو اس چپ والے نے ایک دوسرے سے جدا کیا تھا اور ملاؤں گی اب میں تم کو

نرگس: چپ چپ: وہ دیکھ سب اسی طرف آرہے ہیں۔ ارے یہ تو جہاں پناہ بھی ہیں۔

نسرین۔ یہ سواری ادھر کیسے نکل آئی۔

نرگس: محل کی ان ہی سیڑھیوں سے اتر کر دریا کی سیر فرماتے ہیں کبھی کبھی۔

نسرین: یہ ستار تو ہٹاؤ۔ اسی طرف تشریف لا رہے ہیں۔

سلطان: (قریب آکر) کون نسرین اچھا نرگس بھی ہے۔ تو نے اپنی آنکھوں میں مستقل طور پر غمناکیاں بسالی ہیں

پاگل لڑکی کاش تجھ کو معلوم ہوتا کہ یہ شاہزادے اور وزیر زادے ذی روح کھلونوں سے کیسی بیدردی کے ساتھ کھیلتے رہیں اور ان کو چکنا چور کرنا اپنے بلند مرتبے کا حق سمجھتے ہیں۔ مگر تو کیا سمجھے گی کھلونوں کو خدا عقل ہی کب دیتا ہے۔ چلو تم دونوں بھی ہمارے ساتھ دریا کی سیر کرنے۔

نسرین : جہاں پناہ! آج تو دریا کی موجیں سہ دری کی سیڑھیوں سے ٹکرا رہی ہیں۔

سلطان : شام کی سرگیں فضا میں مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ دریا کی ہر موج مجھ سے کوئی راز کی بات کہہ رہی ہے۔

نرگس : (چیخ کر) اوئی یہ کون!

نسرین : یہ ——— یہ — (چیخ کر) جہاں پناہ ———

سلطان : کون ہو تم ———؟

چھپی والا : جہاں پناہ بھی مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ میں کون ہوں حسینی کو نہیں پہچانتے۔ اپنے چھپی والے حسینی کو۔

سلطان : میں دیکھ رہا ہوں کہ تم حسینی ہو۔ میں پہچان رہا ہوں کہ تم ہمارے چھپی والے حسینی ہو مگر تم حسینی کیسے ہو سکتے ہو جبکہ حسینی مر چکا ہے۔

نسرین : (چیخ کر بھاگتے ہوئے) حسینی ——— چھپی والا

چھپی والا : جہاں پناہ میری موت ایک فسانہ ہے۔ میں عالم پناہ کے اقبال سے زندہ ہوں اور قید خانے سے جان بچا کر خدا جانے کس طرح دریائی راستے سے محل کی ان سیڑھیوں تک پہنچا ہوں اس لیے کہ مجھے معلوم تھا کہ جہاں پناہ اس وقت دریا کی سیر فرماتے ہیں۔

سلطان : مگر تم زندہ کیسے ہو جبکہ تمھارا جنازہ بھی اٹھ چکا۔ تمھاری قبر بھی بن چکی تمھاری قبر کی طرح پر میرا دستخطی فرمان بھی آویزاں کر دیا گیا۔

چھپی والا : جہاں پناہ! میرا جرم یہ تھا کہ میں چھپی کرتے وقت سلطان عالم کو سلطنت کے حالات سے آگاہ کرتا رہتا تھا۔ یہ بات آخر کار وزیر اعظم اور دوسرے عمال حکومت برداشت نہ کر سکے اور مجھ کو گرفتار

کرکے جہاں پناہ سے شاید یہ کہہ پا کر میں مرگیا۔

سلطان : میں سب کچھ سمجھ گیا۔ یہی وجہ ہے مجھے متعدی مرض میں تمہارے مرنے کی خبر سنا کر تمہاری لاش بھی دیکھنے نہ دی۔ تمہارے جنازے میں شرکت نہ کرنے دی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے درباری اس حد تک آنکھوں میں دھول جھونک سکتے ہیں۔ نرگس ——— یہ نرگس کو کیا ہوا ؟

چھتری والا : جہاں پناہ ! یہ مجھ سے ڈر کر بے ہوش ہو گئی ہے شاید۔

سلطان : اور نسرین ؟ ——— نسرین کہاں گئی۔

چھتری والا : وہ چیخ مار کر پہلے ہی بھاگ گئی ہے جہاں پناہ۔

سلطان : نرگس کو اٹھا کر اوپر لاؤ۔

موسیقی

وزیر اعظم : مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے تم نے خود دیکھا ہے حسینی چھتری والے کو۔

نسرین : جی ہاں ! میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہی ہوں۔

ناظم : یہ تو غضب ہی ہو گیا۔

وزیر اعظم : غضب کیا ہو گیا۔ اگر عقل اسی حد تک ہمارا ساتھ دے سکتی تھی تو لعنت ہے اس عقل پر۔ ادھر آئیے تو غور سے میری بات سنئے۔ نسرین تم یہیں ٹھہرو۔ اگر جہاں پناہ ادھر تشریف لائیں تو فوراً اطلاع دینا۔ بلکہ تم جب تک حاذق الدولہ کو بلا لاؤ۔ لپک کر وہ رہے سامنے۔

نسرین : (آواز دے کر) حکیم صاحب (آگے بڑھ کر) میں نے کہا حکیم صاحب ذرا جلدی سے ادھر آیئے۔ غضب ہو گیا۔ وہ چھتری والا آ گیا ہے اور جہاں پناہ اس کو ساتھ لے کر آ رہے ہیں اسی طرف۔

حاذق الدولہ : کیا بکتی ہے خرافات۔ وہ کیسے آ سکتا ہے۔

نسرین : آپ کی قسم حکیم صاحب۔ وہ آ گیا ہے۔

حاذق الدولہ : جھوٹ اور پھر میری قسم کے ساتھ۔ یہ ممکن کیسے ؟

ناظم : جواب نہیں ہے حضور والا۔

وزیرِ اعظم : حکیم صاحب کو بھی سمجھا دو۔ میں جب تک دربان اور باقی لوگوں کو سمجھا سے دیتا ہوں۔ جلدی کرو۔

ناظم : سن لیا آپ نے حکیم صاحب۔ میں پہلے ہی منع کرتا تھا کہ یہ کھیل نہ کھیلو ورنہ اس کو جہنم واصل کر دو مگر میری سنتا کون ہے۔

حاذق الدولہ : مگر اب ہوگا کیا۔ سب سے زیادہ مجھے اپنی فکر ہے یعنی مجھ پر نوجہاں پناہ کو گویا ایک قسم۔ اسے بھی ایک قسم کا کیا یعنی بہتری اعتماد ہے۔

ناظم : اب ایک ترکیب یہ سوجھی ہے کہ کان ادھر لائیے ذرا۔ ورنہ دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں۔

نسرین : ناظم صاحب۔ وہ ـــــ وہ دیکھیے جہاں پناہ ـــــ اور وہ ساتھ بیٹھے کسی مردار میں تو پلی۔

ناظم : تو سمجھ گئے آپ حکیم صاحب۔

حاذق الدولہ : وہ مالک ہے صاحب۔ اب اسی کے ہاتھ عزت ہے بلکہ عزت کیا جان بھی۔

سلطان : (دور سے) حاذق الدولہ۔ ناظم صاحب ادھر تشریف لائیے۔

ناظم : (قریب آکر) جہاں پناہ !

سلطان : کون ہے یہ پہچانتے ہو اسے ؟

ناظم : کسے جہاں پناہ۔

سلطان : اسے۔ اسے میں اس کے متعلق پوچھ رہا ہوں۔

ناظم : مجھے تو ذاتِ ہمایوں کے علاوہ اور کوئی نظر نہیں آتا۔

چھتری والا : جہاں پناہ میرے متعلق پوچھ رہے ہیں آپ سے۔

سلطان : سن رہے ہو یہ کس کی آواز ہے ؟

ناظم : اپنے جہاں پناہ کی آواز سن رہا ہوں۔

سلطان : میں پوچھتا ہوں یہ کون ہے ؟

ناظم : مجھے تو کوئی نظر نہیں آرہا ہے جہاں پناہ۔

سلطان: یہ ۔ یہ ۔ یہ ۔ حاذق الدولہ یہ کون ہے ؟

حاذق الدولہ: کہاں ہے جہاں پناہ ۔

چپتی والا: حکیم صاحب مجھے دیکھیے ۔ ہیں ۔ ہیں ۔

سلطان: کون ہے یہ ؟

حاذق الدولہ: سلطان عالم ذرا نبض دکھائیں اپنی ۔

سلطان: جہنم میں گئی نبض ۔ میں پوچھتا ہوں یہ کون ہے ؟

حاذق الدولہ: جہاں پناہ کی یہ کیفیت کب سے ہے ؟

سلطان: میں جو کچھ پوچھ رہا ہوں تم اس کا جواب دو ۔ کہ یہ کون ہے ؟

حاذق الدولہ: کیا جہاں پناہ کو کوئی نظر آ رہا ہے ؟

چپتی والا: اور آپ کو میں نظر نہیں آ رہا ہوں حکیم صاحب ۔

سلطان: (کڑک کر) نصرت جنگ !

وزیر اعظم: جہاں پناہ !

سلطان: یہ کون ہے دیکھو اسے اور پہچانو ۔

وزیر اعظم: یہ ناظم صاحب ہیں جہاں پناہ اور یہ حاذق الدولہ

سلطان: نہیں نہیں ۔ میں اسے پوچھ رہا ہوں یہ ، یہ ، یہ کچھ

چپتی والا: حضور مجھے دیکھتے ہیں ؟

سلطان: یہ کس کی آواز ہے ۔

وزیر اعظم: عالم پناہ کی آواز ۔

سلطان: لوگو ! میں دیوانہ ہو جاؤں گا ۔ میں پوچھ رہا ہوں میرے ساتھ یہ کون ہے ۔ میرے علاوہ یہ کس کی آواز ہے جو تم سن رہے ہو ۔

حاذق الملک: اس کیفیت میں بید مشک مفید ثابت ہوگا، ایک رتی جواہر مہرہ کے ساتھ ۔

لطان: لعنت بھیجو بیدمشک پر۔ میں پوچھ رہا ہوں کہ یہ حسینی کہاں سے آگیا۔

یراعظم: حسینی؟ یہ آپ کیا فرما رہے ہیں جہاں پناہ۔ حکیم صاحب خدا کیلئے دیکھئے جہاں پناہ کو کیا ہو گیا۔

ظسم: کچھ پڑھ کر دم کیجئے جہاں پناہ پر۔

ی والا: دیکھئے میں آپ کا ہاتھ پکڑتا ہوں

اذق الدولہ: (چیخ کر) اُف۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم: خدا مجھے بھی محسوس ہوا کہ
جیسے کسی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا ہو۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

لطان: اور تمہیں حسینی نظر نہیں آیا۔ یہ رہا۔ یہ دیکھو۔ یہ جیتا جاگتا حسینی۔ میرا وہ چینی والا جس کا تم جنازہ بھی
اٹھا چکے ہو، جس کی تم قبر بھی بنا چکے ہو۔

یراعظم: جہاں پناہ اس وقت کہاں سے تشریف لا رہے ہیں؟

لطان: میں دریا کی سیر کو گیا تھا۔ وہاں مجھ کو حسینی ملا ہے جو اس قید سے بھاگ کر مجھ تک پہنچا ہے جس میں
تم نے اس کو گرفتار کر رکھا تھا۔

ظم: جہاں پناہ! چھوٹی اوقات بڑی بات۔ ہزار مرتبہ منع کیا کہ حضور دن ڈھلے دریا کے کنارے نہ جایا
کریں ہزار بدروحیں ہوسکتی ہیں۔

زیراعظم: وبائی مرض کا مُردہ تو اللہ ہی بچائے اُس سے۔

لطان: میں کہتا ہوں تم کو کوئی نظر نہیں آ رہا ہے۔ یہ تم سب کیا کہہ رہے ہو۔ میں کسی بدروح کا قائل نہیں
میں اس وہم میں مبتلا نہیں ہوسکتا۔ میرے سامنے جیتا جاگتا حسینی موجود ہے۔

اذق الدولہ: جہاں پناہ تین مرتبہ لاحول پڑھیں اور میں بھی کچھ پڑھ کر دم کرتا ہوں۔

لطان: حاذق الدولہ! تم پڑھے لکھے سنجیدہ اور ہوش مند انسان ہو کر ان توہمات میں مبتلا ہو۔ غور سے
دیکھو اسے یہ حسینی ہے۔ وہی حسینی جس کا مفروضہ جنازہ اٹھایا گیا ہے۔ وہی چینی والا جس کو مخبری کے
جرم میں مجھ سے دور رکھنے کیلئے قید رکھا گیا۔

اذق الدولہ: اللہ تعالیٰ جہاں پناہ پر رحم فرمائے اور اس خبیث روح کے اثر سے نجات دے جہاں پناہ

تین مرتبہ لاحول پڑھکر دیکھیں یہ شیطانی طلسم انشاء اللہ ٹوٹ جائے گا۔

وزیر اعظم : میں خود ارواح خبیثہ کا آج تک قائل نہ تھا مگر آج یقین ہوگیا۔

سلطان : (ذرا خوفزدہ لہجہ میں) خبیث روح یہ کیسے ممکن ہے۔

چیچی والا : جہاں پناہ یہ بالکل جھوٹ ہے آپ کا۔ یہ غلام آپ کے اقبال سے زندہ ہے۔

سلطان : سنی یہ آواز۔ کیا یہ آواز حسینی کی نہیں ہے۔

ناظم : ہماری اولاد جہاں پناہ پر قربان۔ جہاں پنا : لاحول کا ورد فرماکر تو دیکھیں یہ اثر ضرور دور ہو جائے گا۔

سلطان : (خوف زدہ لہجہ میں) وبائی مرض کا مُردہ۔

چیچی والا : جہاں پناہ ! میں مُردہ نہیں ہوں۔

سلطان : وہ پھر بولا۔ وہ پھر میری طرف بڑھا۔

حاذق الدولہ : لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم

سلطان ۰۰۰ وہ - وہ، دہ! —— جھُے —— نی

وزیر اعظم : حکیم صاحب سنبھالیے گا۔ جہاں پناہ پر غشی کا دورہ پڑا۔

(سب بڑھ کر جہاں پناہ کو تھام لیتے ہیں)

ناظم : سہارا دیکر محل میں لے چلیئے حکیم صاحب ہاں بس یوں ہی آہستہ آہستہ۔

وزیر اعظم : (ذرا بلند آواز سے) لے چلیئے میں بھی حاضر ہو رہا ہوں۔

چیچی والا : حضور کیا میں اب بھی آپ کو نظر نہیں آ رہا ہوں۔

وزیر اعظم : آ رہا ہے تو نظر۔ مگر اب کسی کو نظر نہ آئے گا۔ اب تجھ کو آہنی سلاخوں والا زنداں نہیں بلکہ وہ تیرہ و تار تہ خانہ ملے گا جہاں سورج کی روشنی کیلئے بھی تجھ کو ترسنا پڑے گا اور اگر اس مرتبہ بھی فرار کی کوشش کی تو تیری نقلی قبر میں تیری اصل لاش اتار دی جائے گی۔

چیچی والا : للہ ! مجھ کو چھوڑ دیجئے۔

وزیر اعظم : (آواز دے کر) نیزہ بردار۔ لے جاؤ اسے اور مشکیں باندھ کر تہ خانے میں بند کر دو۔
پیپی والا : للہ مجھے چھوڑ دیجیے۔ میں اب کبھی ادھر کا رُخ بھی نہ کروں گا۔ مجھے چھوڑ دیجیے۔ میں کہیں دور نکل جاؤں گا۔ مجھے چھوڑ دیجیے۔
وزیر اعظم : (ڈانٹ کر) لے جاؤ اسے۔ میں محل سے سیدھا تہ خانے کی طرف آرہا ہوں۔
پیپی والا : مجھے چھوڑ دیجیے —— (ذرا دور کی آواز) مجھے چھوڑ دیجیے۔ (بہت دور کی ڈوبتی ہوئی آواز) للہ مجھے چھوڑ دیجیے۔

پردہ

○

اُجالا

ظہیر کاشمیری

کردار

دیوار
کتّا
پاگل
تنہائی

وقت : ۲ بجے رات

○

منظر

(ایک محراب دار کمرہ ـــــــ دیواریں بوسیدہ، ستون شکستہ۔
چھت جالے سے اٹی ہوئی۔ محراب کے آگے ایک ناپختہ سڑک جس میں
گہرے شگاف پڑے ہوئے ہیں۔ سڑک کے اُدھر کنارے پر ایک لیمپ
پوسٹ جو نظر نہیں آتا۔ لیمپ کی روشنی سامنے والی دیوار کو اُجاگر کر رہی ہے
جس کا پلستر اکھڑ چکا ہے۔ چھت کے قریب جا بجا اینٹیں باہر نکلی ہوئی
ہیں۔ اس دیوار پر سڑک سے گذرنے والی ہر چیز کا عکس پڑتا رہتا ہے۔
دفعتہً پاؤں کی چاپ بلند ہوتی ہے اور دو سائے سامنے والی
دیوار پر حرکت کرنے لگتے ہیں۔ پاگل کالے کمبل میں منہ چھپائے چوروں کی
طرح سرکتا ہوا محراب میں داخل ہوتا ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک کتا
چلا آ رہا ہے ـــــــ بھورے رنگ کا مریل سا کتا۔ پاگل منہ
سے کمبل سرکا کر سامنے والی دیوار کے آگے مودبانہ انداز میں کھڑا ہو جاتا
ہے۔)

پاگل : (دیوار سے) ماں میں آگیا ہوں ـــــــ تو میرے بغیر اداس ہو گئی تھی نا،
آج تیرے سینے پہ کوئی سایہ سرکتا نظر نہیں آتا ـــــــ تو شاید میرا انتظار کرتے کرتے
سو گئی۔

دیوار : اڑا اڑا دھم ـــــــ

(اینٹیں گرتی ہیں)

پاگل : میں سمجھا تو ابھی جاگ رہی ہے ـــــــ بچہ رات گئے تک واپس نہ آئے تو ماں بھی نہیں

سوسکتی ——— مَیں تیری ماتا کو جانتا ہوں ماں۔

کُتّا : عف عف۔ (بھونکتا ہے)

پاگل : (کُتے سے) بھیّا! بڑوں کی باتوں میں دخل نہیں دیا کرتے (قریب جاکر اسے پچکارتا ہے)
تمہیں بھی نیند آرہی ہے کیا؟ اچھا تو تم بھی سو جاؤ۔ ماں کے گرم پہلو میں ——— سو جاؤ
سڑک بھی سو چکی ہے — راہگیر بھی سو چکے ہیں اور دیکھو، لیمپ کی شعاعیں اونگھنے لگ گئی ہیں
——— سو جاؤ بھیّا!

(کُتا زمین سونگھتا ہُوا دیوار کے پاس لیٹ جاتا ہے، پاگل دیوار
سے ذرا ہٹ کر بیٹھنے ہی لگتا ہے کہ دیوار پر ایک اور سایہ نمودار ہوتا ہے)

پاگل : (چونک کر سائے سے) کون ہو تم؟ میری ماں کی نیند میں خلل ڈالنے والے — چلے جاؤ۔

(ہذیانی پیر دن منظر سے جواب دیتا ہے)

ہذیانی : مَیں صبح سے کسی اُجاڑ کی تلاش میں تھا۔ لیکن یہ جگہ بھی انسان کے گندے سانسوں سے اٹی پڑی ہے۔

کُتّا : عف عف (بھونکتا ہے)

پاگل : (کُتے سے) بھیّا! یہ کوئی پڑھا لکھا مہمان ہے ——— اسے اندر آجانے دو۔ (محراب
کی طرف منہ پھیر کر) آجاؤ۔

(کھٹ کی آواز کے ساتھ ہذیانی داخل ہوتا ہے، لمبا تڑنگا انسان
سر پہ گھنے بال، داڑھی فرنچ کٹ)

کُتّا : (ہذیانی کو دیکھ کر) عف عف، عف عف عف،

ہذیانی : (کُتے سے) گالیاں دے رہے ہو مجھے ——— ان گالیوں میں اور زیادہ زور پیدا کرو انہیں
زیادہ مہلک بناؤ تاکہ تمہیں بھی اشرف المخلوقات کے نام سے پکارا جائے (چاروں طرف دیکھ
کر افسردہ لہجے میں) مجھے اُجاڑ کی تلاش ہے۔

(بیٹھ جاتا ہے)

پاگل : (ہذیانی سے) مجھے افسوس ہے کہ تم (کتے کی طرف اشارہ کرتا ہے) میرے بھائی کو غلط سمجھے ہو۔ یہ بڑا ہی شریف النفس ہے یہ در اصل تمھیں خوش آمدید کہہ رہا ہے (سر کھجاتا ہے) اور ہاں تمھیں اجاڑ کی تلاش ہے! ——— کیوں؟

ہذیانی : اس لیے کہ میں جس شہر میں جاتا ہوں، لوگ میرے لامحدود دماغ کو تجارتی منڈیوں میں بند کرنے لگ جاتے ہیں۔

پاگل : (حیرانی سے) یہ کیوں؟

کتا : عف عف عف۔

ہذیانی : (کتے سے) تم میری باتوں میں دخل نہ دو۔ (پاگل سے) ہاں تو وہ کہتے ہیں کہ تمھارے خیالات کی تاثیر گرم ہے، اس سے جنگلوں اور مال گوداموں میں آگ لگ جانے گی اور پھر وہ کہتے ہیں کہ جب گندم بک سکتی ہے تو خیالات کیوں نہیں بک سکتے۔

پاگل : ٹھیک ہی تو کہتے ہیں، تم جواب دے سکتے ہو کہ ایک ننھے سے خیال کے بدلے میں گندم کے بیس دانے لوں گا۔

ہذیانی : (ہوش میں کھڑے ہو کر چلاتا ہے) بکتے ہو، بکتے رہو تم، سب لوگ بکتے رہو ——— خیالات کبھی نہیں بک سکتے۔ مجھے اجاڑ کی تلاش ہے۔

(ہذیانی شور مچاتا ہے۔ کتا عف عف کرنے لگ جاتا ہے، دیوار کی اینٹیں اڑا اڑا دھم گرتی ہیں)

پاگل : (ہذیانی سے) بس! بس!! اڑا اڑا دھم کی آواز سنی تم نے؟ تمھارے شور سے میری بوڑھی ماں کی نیند اچٹ گئی ہے (دیوار سے) ماں! یہ پڑھا لکھا مہمان بڑا بدتمیز ہے۔ تم سو جاؤ۔

ہذیانی : تم نے پہلے بھی ماں کا لفظ استعمال کیا تھا۔ دیوار بھی کسی کی ماں ہو سکتی ہے؟

پاگل : اور یہ کتا میرا بھائی ہے۔

کُتا : عف عف عف ۔

پاگل : دیکھو! اپنا نام سُن کر چونک پڑا ہے۔ ایسا ذہین بھائی آج تک کسی کو نصیب نہیں ہُوا ۔

ہذیانی : (بڑبڑاتا ہے) بڑے بد مذاق سے پالا پڑا ہے (پاگل سے) جس طرح سورج شعاعوں سے زمین کو جکڑے ہوئے ہے، جس طرح ستارے زنجیروں کے بغیر ہُوا میں لٹکے ہیں، اسی طرح دیوار بھی ماں نہیں ہو سکتی ۔

پاگل : تمھارے خیالات بہت پرانے ہیں ۔ کل سورج کی شعاعیں زمین کو جکڑے ہوئے تھیں آج زمین کے ذرے سُورج کو جکڑے ہوئے ہیں۔ کل ستاروں کا وجود ایک حقیقت تھا آج وہ زنجیر ایک حقیقت ہے، جو آسمان اور ستاروں کے درمیان رشتہ قائم رکھنے کے باوجود نظر نہیں آتی ——— اور اسی طرح آج مائیں پتھر بن گئی ہیں اور پتھر کی دیواروں نے ماؤں کا رُوپ دھار لیا ہے ۔

ہذیانی : یہ سب بکواس ہے ۔ پتھر کی دیوار انسان کو جنم نہیں دے سکتی ۔

پاگل : عام لوگوں کا بھی یہی خیال ہے، لیکن مجھ جیسے عالموں نے اس بھید کو پوری طرح پالیا ہے کہ انسان عورت کے بطن سے پیدا نہیں ہُوا بلکہ پتھروں سے اُگا ہے ۔

دیوار : اڑا اڑا دھم ۔

(اینٹیں گرتی ہیں)

پاگل : (دیوار سے) ماں معاف کرنا، ہم ذرا فلسفے کی باتیں کر رہے ہیں ۔

ہذیانی : تم نے ابھی کہا کہ تم جید عالم ہو اور پھر تم فلسفی بھی معلوم ہوتے ہو ——— تم نے یہ علم اور فلسفہ کہاں سے حاصل کیا ؟

پاگل : (دیوار کی طرف اشارہ کرکے) اس نے میرے ضمیر میں علم کے چراغ جلائے، اس نے میرے خیالوں میں فلسفہ کے رنگ بھرے

کُتا : عف عف، عف عف عف !

پاگل : (کتے کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے) اوہ بھائی! میں تمہارا ذکر کرنا بھول ہی گیا ——
(ہذیانی سے) اس نے میری ماں سے تعلیم حاصل کی، یہ بھی جیّد عالم ہے۔

ہذیانی : خیر تم کافی عجیب و غریب آدمی ہو، —— تم فلسفی نہیں، پاگل بھی ہو۔

پاگل : تم ایسے لوگ مجھے پاگل سمجھتے ہیں، لہذا میں عقل مند ہوں —— میری ماں نے مجھے اور میرے بھائی کو تعلیم کیسے دی؟ —— لو سنو میری ماں کے پاس لاتعداد تصویریں ہیں اور لاتعداد آوازیں۔ یہ تصویریں اور آوازیں مختلف سانچوں میں ڈھل کر میرے اور میرے بھائی کے ذہن میں حلول کر گئی ہیں اور ہم حیرت انگیز طور پر عقل مند ہو گئے ہیں۔

ہذیانی : (کھوئے ہوئے) وہ کیسے؟

پاگل : نہیں سمجھے؟ (دیوار کی طرف اشارہ کرتا ہے) وہ دیکھو تین سائے، ہمارے تین سائے، میری ماں کے پاس ایسی لاکھوں تصویریں ہیں، ہر اس گاڑی بان یا شہزادے کی تصویر جو محراب کے باہر گذر رہا ہو

ہذیانی : (سوچتا ہے) ٹھیک!

(وقفہ)

پاگل : میری آواز کی گونج سن رہے ہو نا —— میری ماں کے پاس ایسی لاکھوں آوازیں ہیں —— میدانوں اور جنگلوں میں بجتی ہوئی شہنائیاں میری ماں کی گود میں چکر کاٹ کر ہمارے کانوں میں اتر جاتی ہیں۔ میری ماں دنیا میں سب سے بڑی معلمہ ہے یہ کمرہ دنیا کی سب سے بڑی درسگاہ ہے —— اور ہم یعنی میں اور میرا بھائی یہاں کے سب سے بڑے عالم ہیں۔

دیوار : اڑا اڑا دھم۔

(اینٹیں گرتی ہیں)

ہذیانی : (دیوار کی طرف اشارہ کرکے) اگر یہ تمہاری ماں ہے تو اسے کہو کہ سو جائے، اڑا اڑا دھم کی کرخت آواز سے میرے کانوں کے پردے پھٹنے لگتے ہیں۔

پاگل : شاید اسے آج نیند نہ آئے —— یہ تین دن سے بیمار ہے۔

ہذیانی : بیمار ہے ؟ ـــــ کیا بیماری ہے اسے ؟ (دیوار کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھتا ہے)

پاگل : تین دن ہوئے، قریب ہی کسی نے برف خانہ کھولا ہے جس کی گرانبار مشین نے اردگرد کی زمین پر بڑا ہی ناگوار اثر ڈالا ہے۔ اس سے میری ماں کی صحت خراب ہو گئی ہے۔ اسے رعشہ ہو گیا ہے۔ اور اس کے اعضا ایک ایک کرکے گرتے جا رہے ہیں۔

دیوار : اڑ اڑا دھم۔

(اینٹیں گرتی ہیں)

پاگل : ایک عضو اور گر گیا ـــــ ماں تجھے مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔

ہذیانی : تم اپنے بھائی کو ساتھ لے کر برف خانے پر حملہ کیوں نہیں کر دیتے۔

کتا : عف عف، عف عف عف۔

ہذیانی : تو تمہارا بھائی بھی تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہے۔

پاگل : میں نے شہر والوں کو کہتے سنا ہے کہ برف خانہ کھلنے سے انھیں بہت فائدے ہو گئے ہیں۔ میری ماں خود مر جائے گی لیکن برف خانہ تباہ نہ ہونے دیگی ـــــ وہ شہر والوں کے دکھ نہیں دیکھ سکتی ـــــ وہ ماں ہے سب کی ماں (دیوار کو دیکھ کر) ـــــ ماں!

دیوار : اڑ اڑا دھم۔

(اینٹیں گرتی ہیں)

ہذیانی : ایک اور عضو گر گیا بیماری خطرناک صورت اختیار کر رہی ہے۔

پاگل : جب کوئی بیمار مر رہا ہو تو اس کے رشتہ دار اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور دیئے کی دھیمی روشنی میں اس کے بیتے ہوئے دنوں کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں۔ میری ماں مر رہی ہے میں اس کی گذری ہوئی زندگی دہرانا چاہتا ہوں، تم سنو گے کیا؟

ہذیانی : کوئی نئی بات سناؤ، تم اپنی مرتی ہوئی ماں کا ذکر کروگے تو میں قہقہے لگانا شروع کر دوں گا، جانتے دیکھ دیکھ کر میری آنکھیں منجمد ہو گئی ہیں۔ میں تمھیں ایک آنسو بھی پیش نہیں کر سکتا۔

کتا : عف عف عف۔

ہذیانی : (کتے سے خوفزدہ ہوکر) اچھا بھائی سنتا ہوں لیکن یہ بدلحاظی اچھی نہیں۔ (پاگل سے) سناؤ۔

پاگل : چالیس برس کی عمر میں داخل ہوتے ہی مجھے محسوس ہوگیا کہ میں بچہ ہوں، چنانچہ میں کسی ماں کی تلاش میں شہر شہر گھومنے لگا۔

ہذیانی : چالیس سال کا ——— مذاق کرتے ہو۔

پاگل : تمھاری عمر کیا ہے؟

ہذیانی : ساٹھ برس!

پاگل : تم ابھی بچہ ہو ——— تو خیر ماں کی تلاش میں میں نے کائنات کا چپہ چپہ چھان مارا۔ اونچے پہاڑ، پست وادیاں، زمین دوز غاریں، میں نے سب کچھ دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ ہر شے کی آستین میں نشتر چھپے ہوئے ہیں۔ ماں کہیں نہ مل سکی۔

ہذیانی : (دلچسپی لیتے ہوئے) پھر؟

پاگل : آخر ایک دن تھک ٹوٹ کر میں اس محراب میں آکر لیٹ گیا اور یہ دیوار؟ ——— اس کے خشک سایوں نے مجھے تھپک تھپک کر سلا دیا۔ جب میں سو کر اٹھا تو مجھے محسوس ہونے لگا، جیسے اس دیوار کی آستین میں کوئی نشتر نہیں، میں نے ماں کہہ کر اس کے پاؤں پکڑ لیے۔

ہذیانی : تمھارے آنے سے پہلے تو تمھاری ماں کی گود صدیوں تک خالی رہی ہوگی ——— جب سے عقل باریک ہوگئی ہے۔ بیٹوں کا قحط پڑ گیا ہے۔

پاگل : (غصہ سے) پہلے مجھے اپنی بات ختم کر لینے دو۔ بیٹھ گئے فلسفہ بگھارنے۔

ہذیانی : تم بھی تو جوش میں نہ آؤ، اپنی مرتی ہوئی ماں کا سوگ منانے بیٹھے ہو یا مجھ سے جنگ کرنے؟

پاگل : (منہ بسور کر) واقعی مجھے تو عورتوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہیے، تم ہی بتاؤ، رونا شروع کروں یا پھر اپنی کہانی جاری رکھوں

ہذیانی : مجھے تمھارا رونا پسند نہ آئے گا، تمھارے گلے میں رس نہیں اس لیے کہانی سناؤ۔

پاگل : تو دوسرے ہی دن میں نے اپنی ماں کو ساری دکھ بھری داستان سنا دی۔ میں نے کہا، ماں! میں پاگل بچہ ہوں بالکل اکیلا ہوں، بجلیاں میرا پیچھا کر رہی ہیں، بگولے مجھ پر کمندیں پھینک رہے ہیں، پُراسرار خلا میرے خلاف سرگوشیاں کر رہی ہے، مجھے بچاؤ۔ (ہاتھ کی جنبش سے ہذیانی کو متوجہ کرتے ہوئے) اور تم جانتے ہو میری ماں نے مجھے کیا جواب دیا؟

ہذیانی : کیا جواب دیا؟

پاگل : اس کا جواب یہی تھا کہ اس نے مجھے بجلیوں، بگولوں اور طوفانوں کی زد سے بچا لیا۔ ایک دفعہ بجلیاں میرا تعاقب کر رہی تھیں، میری ماں بڑھ کر درمیان میں آگئی، اس کا آدھا جسم جل کر سیاہ ہو گیا لیکن مجھے آنچ نہیں آنے دی۔ اسی طرح بگولوں اور طوفانوں نے مجھ پر کئی بار حملے کیے، لیکن میری ماں اپنے سینے پر چوٹ سہہ کر مجھے بچا لیتی رہی۔ دیکھو تو ان چوٹوں کے نشان، بچاری کا جبڑا اتر چکا ہے، سینہ پھٹ گیا ہے، ایک طرف ہڈیاں باہر کو ابھر آئی ہیں۔ اس نے میرے لیے کیا کچھ نہیں کیا ——— ہائے میری ماں!

ہذیانی : تمھاری باتیں سن کر میرے ذہن کے تمام افق روشن ہو گئے۔ اب مجھے اُجاڑ کی تلاش نہ ہوگی۔

پاگل : میں نے جان بوجھ کر آسان زبان میں باتیں کی ہیں تاکہ تم انھیں بخوبی سمجھ سکو۔

ہذیانی : پتھر بولتے ہیں، پھول محسوس کرتے ہیں، آندھیاں سنتی ہیں، زندگی سب جگہ موجود ہے جس کے سینہ میں دل ہے، اس کے لیے ہر اجاڑ امید و بیم کا شورش کدہ ہے ——————— سنو سنو! کائنات کے سب ذرے مل کر گا رہے ہیں۔

(ہذیانی اٹھ کر ناچنا شروع کر دیتا ہے)

پاگل : میری ماں مر رہی ہے اور تم ناچ رہے ہو ——— بیٹھ جاؤ!

ہذیانی : (بیٹھتے ہوئے) لو میں بیٹھ گیا (کُتّے کو دیکھ کر) ایں! یہ کیا؟ ——— تمھارا بھائی تو خراٹے لے رہا ہے۔

پاگل : بے چارہ تین راتیں جاگتا رہا۔ ماں کی تیمارداری کرتا رہا۔ میں ابھی اسے جگا دوں گا تاکہ اپنی مرتی

ہوئی ماں کا آخری بار منہ دیکھ لے

ہذیانی : یہ تمھارا بھائی کیسے بنا ؟

پاگل : برسوں اُدھر ——— مَیں ایک تاریک گلی میں سے گذر رہا تھا کہ چند انسان بھوت بن کر مجھ سے چمٹ گئے۔ اس نے انسان بن کر ان کا مقابلہ کیا اور مجھے خلاصی دلوائی۔ ان دنوں یہ بہت تندرست تھا اور بلیغ سے بلیغ تقریریں کر سکتا تھا۔

ہذیانی : تمھاری ماں دیر سے چُپ ہے، بیماری میں افاقہ ہو گیا ہے شاید ؟

پاگل : نہیں! اس پر سکرات کا عالم طاری ہے، وہ دیکھو! شعاعیں ماند پڑ گئی ہیں، لیمپ بجھنے ہی والا ہے۔ اب ہاتھ اٹھاؤ، ماں کے حق میں دعا کریں۔

ہذیانی : کس سے دعا مانگوں ؟ مَیں خُدا کو نہیں جانتا، ذرّہ ذرّے سے ٹکرا رہا ہے، خلا خلا کو نگل رہا ہے انسان انسان سے الجھا ہوا ہے ——— خدا کا نام لے کر ہر شئے تباہی مچا رہی ہے۔

(وقفہ)

(لیمپ بجھ جاتا ہے، کمرے میں تاریکی پھیلتے ہی دیوار لرز کر گر جاتی ہے۔ کُتا ملبے کے نیچے دب جاتا ہے، دیوار کے اُس پار سورج طلوع ہو رہا ہے، ملگجے اُجالے میں ایک ٹنڈ منڈ درخت چُپ چاپ کھڑا ہے۔ ہذیانی اور پاگل دونوں آہستہ آہستہ اٹھتے ہیں۔)

پاگل : میری مہربان ماں مر گئی ——— تصویریں اور آوازیں منتشر ہو گئیں۔ آج سے یہ گہوارہ بھی اُجڑ گیا۔

ہذیانی : تمھاری ماں مرتے ہوئے تمھارے بھائی کو بھی ساتھ لے گئی۔

پاگل : دونوں سہارے ٹوٹ گئے، دونوں ساتھی بچھڑ گئے ——— ہائے مہربان ماں !

ہذیانی : تمھارا سہارا ٹوٹ گیا اور مَیں بے سہارا ہوں آؤ آج سورج کی روشنی میں کوئی موزوں جگہ تلاش کریں۔ آؤ ——— وہ دیکھو! سورج طلوع ہو رہا ہے (ہذیانی پاگل کو بازو سے کھینچتا ہے)

پاگل : (جاتے ہوئے) ماں کی لاش کو آخری سلام! مَیں جا رہا ہوں اپنا سہارا آپ بننے۔

(دونوں جاتے ہیں)

سُرودِ زندگی

عشرت رحمانیؔ

کردار

رحیمن

حسنی

منجو

فیضو

پہلا منظر

رات کا وقت

(قصبہ کے مختصر سے غریبانہ گھر میں ایک مزدور کا
مختصر خاندان موجود ہے۔ مزدور فیضو کی بیوی بیٹی اور کئی
بچے بھوک سے بے تاب جاگ رہے ہیں اور فیضو کا انتظار
کر رہے ہیں کہ کچھ کما کر لائے تو کھائیں اور پیٹ بھریں
بیٹی ایک طرف بیٹھی کپڑا سی رہی ہے۔ مٹی کا چھوٹا سا
چراغ ٹمٹما رہا ہے۔
اس کی ماں پاس ہی ایک بچے کو لیے لیٹی ہے اور لوری
دے کر سلا رہی ہے۔ بچے بھوک سے رو رہے ہیں۔ فیضو
کی روزانہ آمدنی ہی اوّل تو بہت تھوڑی ہے۔ اس پر
مصیبت یہ ہے کہ جو کچھ کماتا ہے۔ اس کا بڑا حصہ
نشے پانی میں اُڑا دیتا ہے۔ گھر کے لوگوں کا گذارہ بہت
تکلیف سے ہوتا ہے۔
(فیضو ابھی تک غائب ہے۔ گیارہ بجنے والے ہیں)

رحمن (لوری الاپ رہی ہے)

(ایک بچہ ادھر سے روتا ہے۔ وہ چپ ہو جائے تو دوسرے
کی آواز)

سوجا! میرے بالے سوجا
پیارے مُکھڑے والے سوجا ——— سوجا ———
آجا ننھی چڑیا آجا!
میرے ننھے کو تو سُلا جا
آکے دودھ ملائی کھا جا
سوجا اللہ والے سوجا

سوجا میرے بالے سوجا .... سوجا - سوجا - سوجا - سوجا

(بچے روتے ہیں۔ ماں کھسیانی ہو کر ڈانٹتی ہے)

رحیمن : اونھ۔ سوتا کیوں نہیں۔ کیا بلا ہے۔ کون سی آفت تمھارے سر پر آگئی۔ روتے روتے سارا گھر سر پر اٹھا لیا۔ (بچے روتے رہتے ہیں) اونھ! بدنصیب چُپ نہیں ہوتے، ابھی مار کے کچل ڈالوں گی۔ چُپ رہو۔ دیکھو وہ چڑیا آئی (لوری گاتی ہے۔) آجا ننھی چڑیا آجا۔
(ایک بچہ چُپ ہو جاتا ہے۔ دوسرا روتا ہے، سب ایک ایک کرکے روتے ہیں۔)

حسنا : ماں! بھیا بھوک سے روتا ہوگا؟

رحیمن : تو پھر میں کیا کروں، بھوکا تو ہے! کیا میں نہیں جانتی؟

حسنا : صبح ایک ہی پیسے کا دودھ پیا تھا۔ بس جب سے کچھ نہیں ملا ہے۔

رحیمن : میرے تمھارے منہ میں تو کل سے کھیل کا دانہ بھی اُڑ کر نہیں گیا۔ میں کہاں سے لاؤں۔ کیا جتن کروں۔ تم اپنے باپ کو دیکھ رہی ہو۔ انھیں آوارہ پھرنے سے فرصت ہی کہاں ہے۔ بھوکو مر جاؤ۔ انھیں پروا بھی نہیں۔ نہ جانے کیا آفت سر پہ آ گئی۔

حسنا : گیارہ بج چکے ہیں۔ آدھی رات کا وقت ہے۔

رحیمن : آدھی رات گذری۔ اور ان کا پتہ بھی نہیں۔ کارخانہ میں کب کی چھٹی ہو چکی ہوگی۔

(منجو داخل ہوتا ہے جو بیس سال کا تندرست توانا مضبوط نوجوان ہے)

منجو: بھائی جی کیا ہو گیا۔ یہاں بیٹھے ہوئے کیا ہو۔ خیر تو ہے؟

رحیمن: آؤ منجو۔ یہاں صبر کا کیا کام۔ کہو تمھارے ساتھی کہاں ہیں۔ کہیں تم نے دیکھا ہے؟

منجو: ہاں بھابی جی۔ فضو بھائی اور میں دونوں دن بھر کارخانے میں ساتھ کام کرتے رہے۔ ہم نے سات بجے کام ختم کر دیا تھا۔ ہم میں سے چھ کاریگر رات کو کام کرنے کے لیے روک لئے گئے تھے۔ وہ اسی وقت چلے آئے تھے۔ میں اب تک کام پر تھا۔

رحیمن: مگر وہ کارخانے سے کس طرف نکل گئے۔ اب تک نہیں آئے۔ [illegible] میں بھی نہیں معلوم۔

منجو: مجھے تو کچھ خبر نہیں۔ میں نے انھیں کو دیکھا تھا۔ شاید دو چار دوست مل گئے ہوں گے۔ کہیں کسی دکان پر بیٹھ گئے ہوں گے۔

رحیمن: دکان پر؟ ہشت۔ ایسے ہی ان دوستوں کے بدلے انھیں ملک موت (یعنی ملک الموت کا بگڑا ہوا لفظ تھا) [illegible] کہیں مل لیتے۔ دو سے جاتے تو صبر آ جاتا منجو۔

منجو: نہیں نہیں بھابی، ایسے نہ کہو۔ خدا فضو بھائی کو نیک [illegible]۔ بے چارے دوسروں کی بری صحبت سے مجبور ہو جاتے ہیں۔

رحیمن: کیوں مجبور ہو جاتے ہیں؟ منجو تم دوستوں سے کیوں مجبور نہیں ہو جاتے۔ تم بھی تو انسان ہو۔ زیادہ کماتے ہو۔ تمھارے پاس بھی تو دل ہے۔ تمھیں کوئی مجبور کر کے رات رات بھر نہیں روکتا۔ انھیں اپنے گھر بار، بچوں تک کا کچھ دھیان نہیں۔

منجو: ہاں بیچارے کی قسمت ہی کچھ ایسی ہے۔ بھابی اب آج ہی مصیبت میں غریب پر ——— آ پڑا جاتا ہے۔

رحیمن: ہاں ہاں کہو، کیا ہوا غریب پر۔ رک کیوں گئے منجو۔

منجو: کیا کہوں۔ اللہ رحم کرے۔ بڑی بپتا پڑی ہے۔

رحیمن: آج کوئی نئی آفت اور پڑی سر پر۔ کہو تو کچھ۔

منجو : کچھ نہیں کوئی ڈرکی بات نہیں۔ یہ ہُوا کہ دوسرے کاریگر نے منیجر سے فیضو بھائی کی شکایت کر دی اور ان کے کام پر خود قبضہ کرنا چاہا۔ انہیں اُس پر غصہ آیا اور آنا چاہیے تھا۔ انھوں نے اس کاریگر کو خوب ٹھونکا۔ منیجر کو جو خبر ہوئی تو دو روپے جرمانہ کر دیا۔ ایک روپیہ آج کی مزدوری کا روک لیا اور ایک کل کا۔

رحیمن : دو روپے جرمانہ ——— ہائے بدنصیبی ——— دو روپے یا اللہ! اب چار پانچ دن ہمیں فاقے سے گذارنا ہوں گے۔ یہ مصیبت کیسے سہی جائیگی؟

منجو : اسی پریشانی میں فیضو بھائی کچھ کاریگروں کے ساتھ دل بہلانے چلے گئے ہوں گے۔

رحیمن : وہ پریشانی میں دل بہلانے گئے ——— اور ہم مرنے رہیں؟

منجو : اللہ رحم کرے بھابی! میں اسی لیے اسی وقت آیا تھا کہ دیکھوں وہ پریشان تو نہیں؟

رحیمن : ایسے مصیبت زدوں پر اللہ رحم نہیں کیا کرتا منجو۔

منجو : نہیں بھابی! اللہ مصیبت میں زیادہ مہربان ہوتا ہے۔ ہر حال میں اس پر بھروسہ رکھنا چاہیئے۔ تعجب ہے وہ اب تک کیوں نہ آئے۔ اچھا میں جاتا ہوں اب تمھارے آرام کا وقت ہے۔

رحیمن : نہیں منجو بیٹھو۔ ہمیں آرام خدا نے نہیں دیا۔ تمھارے دوست ابھی آتے ہوں گے۔ میں ذرا بچہ کو سلا دوں۔

حسنا : آپ نے منیجر سے معافی کیوں نہ مانگ لی۔ کہہ دیتے اس دفعہ معاف کر دیں۔ پھر کبھی ایسی غلطی نہیں ہوگی اب بھی کل کو ایک روپیہ معاف کرالیں۔

منجو : شاید معاف ہو جاتا۔ اگر وہ اپنی غلطی مان لیتے۔

حسنا : ہاں کارخانہ کے لیے تو دو روپے کچھ بھی نہیں۔ ہمارے لیے بہت بڑی بات ہے۔

(لمبا سانس بھر کر رونے کی سی آواز)

منجو : (ماں کو) حسنا تم بھی ابھی تک جاگ رہی ہو؟

حسنا : ہاں یہ کپڑا آج ہی کر پورا کرنا ہے۔ ابھی کئی گھنٹے کا کام باقی ہے۔

منجو : تو ابھی تم زیادہ رات گئے تک کام کرو گی۔ صبح اُٹھ کر کیوں نہ پورا کر لو۔ ایسی کیا جلدی ہے

حسنا : ہاں جلدی کا کام ہے۔ کل صبح مالک کو دینے کا وعدہ ہے۔ اور جتنی جلدی ختم ہو جائے پھر بھی مزدوری ملے۔

منجو : اور کیا! فائدہ تو اسی میں ہے کہ جلدی جلدی کام پورا ہو گا۔ گاہک بھی خوش ہو کر زیادہ کام لائے اور سلائی بھی جلدی ملے گی۔

حُسنا : اور کیا۔ مگر جلدی کا کام اچھا تھوڑی ہوتا ہے؟

منجو : یہ بھی سچ ہے حُسنا۔ بڑی سمجھ کی بات کہی تم نے۔ مگر گاہک اس کو کب دیکھتے ہیں۔ انہیں تو بس جلدی اپنا کام چاہئے۔

حُسنا : اللہ میاں ہم پر رحم کرے۔

منجو : ہاں حسنا! تمھاری سلائی سے ہی گھر کا سارا خرچ چلتا ہے۔ فیضو بھائی کی بُری صحبت پر افسوس ہوتا ہے۔ اُن کی ساری آمدنی گھر میں آ جاتی تو ————

حُسنا : پھر رونا ہی کاہے کی تھی۔ سب دِلدر دور ہو جاتے۔

منجو : خدا مصیبت دور کرنیوالا ہے حُسنا! پریشان مت ہو۔

حُسنا : میں تو پریشان نہیں۔ امّی اور ننھے بھیا کے دکھ سے کڑھتی ہوں۔ ابا اگر کچھ بھی لے آتے تو

منجو : ہاں اگر فیضو بھائی محنت کریں تو دو تین روپے روز کمانا بہت آسان ہے۔ ہم لوگ کارخانے والوں کو بدنام کریں تو غلطی ہے۔ کارخانے کے مالک تو اُن کاریگروں سے خوش ہو کے زیادہ سے زیادہ مزدوری دیتے ہیں۔ جو محنت سے کام کریں۔

حُسنا : محنت ہی سب کچھ ہے۔

منجو : بے شک محنت سے عزت ہے۔ محنت ہی دولت ہے۔ کام چور کاہل گھر کاہلی سے وقت گزارتے ہیں اور مالک کو بدنام کرتے ہیں۔

سنا : مگر ابا تو محنت کرتے ہیں۔ ————

منجو : حسنا فیضو بھائی محنت کرتے ہیں وہ کام چور نہیں ان کی کمائی تو سب سے زیادہ ہوتی تھی
ہو جاتی ہے۔ اب مجھے دیکھو نا آسانی سے پچاس ساٹھ روپے روز کما لیتا ہوں میرا خرچ ہی
کم ہے جس سے بہت زیادہ محنت [illegible] تو [illegible] زیادہ کام [illegible]

حسنا : (تعجب سے) پچاس ساٹھ روپے [illegible]

منجو : اور کیا۔ میں سوچتا ہوں اور زیادہ محنت کیوں کروں [illegible] سے ہی پھیر
[illegible] [illegible] کا

حسنا : (تعجب سے) منجو تمہارا بیاہ کب ہوگا؟ کب کروگے بیاہ؟

منجو : ابھی بیاہ کا کیا ذکر [illegible] تو میں [illegible] چاہوں مگر؟

حسنا : مگر کیا؟

منجو : حسنا بیاہ کے لیے تو بہت لوگ میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں کل ہی ایک کاریگر اپنے
ایک رشتہ دار کی لڑکی کے لیے کہہ رہا تھا اور بہت ضد کر رہا تھا کہ منگنی کر لو جہیز کا بھاری
سامان ملے گا۔ لڑکی کو دیکھنے کے لیے بھی کہا

حسنا : پھر دیکھنے گئے تم؟

منجو : اس کے گھر تو نہیں گیا۔ راستہ پر جاتے ہوئے اس نے دکھایا تھا۔ کنوئیں سے پانی لینے جا رہی
تھی آجکل بیٹی والوں کے لیے تو ڈھونڈھنا مشکل ہو رہا ہے۔ الٹا دہی پیسے دینے لگے ہیں۔
زمانہ ہی بدل رہا ہے۔

حسنا : تو دیکھ آئے نا؟

منجو : بہو کیسی؟ راستہ چلتی عورت کو دیکھ لیا تو بہو ہو گئی؟ واہ!

حسنا : پسند کرنے تو گئے تھے آخر؟

منجو : ایسے سیکڑوں باتیں ہوتی ہیں چلتے پھرتے دیکھنے سے کوئی کسی کو پسند نہیں کرتا

حسنا : بے سوچے سمجھے کسی کو دیکھ کے شادی کر لینا بے وقوفی ہے۔

حسنا : کیوں اس کیا حرج ہے ؟

منجو : نہیں کوئی راستہ چلتے دیکھے اور تمہارے ابا سے آکر کہے کہ میرے ساتھ شادی کر دو، تو تم اسے قبول کر لو گی ؟

حسنا : واہ ! یہ تو الٹی بات کہنے لگے تم۔ میں بیٹی ہوں۔ مجھے کیا اختیار ہے۔ بیٹی کا سب اختیار ماں باپ کو ہوتا ہے ؛

منجو : تو وہ چاہے تمہیں کسی کے حوالے کر دیں۔ تم چپ چاپ چلی جاؤ گی۔ بس بیاہ ہو گیا۔

حسنا : ان باتوں کو چھوڑو اور کیا کروں گی، وہی مالک ہیں۔

منجو : واہ ! جان نہ پہچان۔ کسی اجنبی مرد کو پکڑ کے اس کے ساتھ تمہارا رشتہ جوڑ دیں۔ بس وہ دولہا اور تم دولہن

حسنا : [illegible] ان باتوں کا کیا وقت ہے۔ چھوڑو بھی۔

منجو : اچھا حسنا تم اکیا کہتی۔ تو جانے دو۔ آرام کرو میں جاتا ہوں۔ بھائی تو تھک کے کبھی کی سو گئیں

حسنا : تمہارے آرام کا وقت ہے منجو۔ میرا کیا ہے ابھی تو بہت کام پڑا ہے۔

منجو : [illegible] پھر کام کئے جاؤ گی چھوڑو بھی، اب آرام کرو

حسنا : [illegible] میرے [illegible] میں آرام کہاں

منجو : [illegible] ستہ ہے [illegible] مایوس نہ ہو اس میں سب طاقت ہے اچھا میں چلا

(منجو کا جانا)

حسنا : منجو جلے لیٹے ان کو خدا نے آرام دیا ہے۔ اطمینان دیا ہے۔

(مایوس ہو کر)

خدا میں سب طاقت ہے مگر ہماری مدد کیوں کرے جب ہمارے نصیبوں میں ہی مصیبت بھگتنا ہو۔ دن رات محنت کریں۔ آنکھیں پھوڑیں اور پھر بھی پیٹ بھر کھانے تک کو نہ ملے۔ اللہ !

تیرا شکر ہے جس حال میں رکھے۔ تو مالک ہے۔ مگر ننھے بھیا کا دکھ ــــــــ

(روتی ہے۔ رونے کی آواز بے اختیار ہوکر بڑھتی ہے اور سسکیوں کی آواز سے ماں جاگ اٹھتی ہے)

رحیمن: ہوں۔ ہوں۔ کیا ہے یہ۔ حسنا کون ہے؟

حسنا: (رونے کی آواز بدل کر) کچھ ــــ بھی نہیں۔ ماں کیا ہوا؟

رحیمن: ابھی کسی کے رونے کی آواز سے میری آنکھ کھلی۔ کون رو رہا تھا؟

حسنا: یہاں تو کوئی بھی نہیں اماں۔ رونا کون ہے؟

رحیمن: میں بھی شاید بچہ رونے لگا۔ میرا لال بھوکا سو رہا ہے۔ روتے روتے سویا۔ اللہ تو ہی مالک ہے ــــــــ حسنا! کیا بات ہے تیری آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں۔ میری بچی کیا بھوک بہت ستا رہی ہے۔

حسنا: (آواز سنبھال کر) نہیں تو ــ ماں۔ آنکھوں میں درد ہونے لگا تھا۔ اس سے پانی نکل آیا زیادہ جاگنے سے نا؟

رحیمن: میری بچی۔ دو راتوں سے برابر جاگ رہی ہے۔ آنکھیں کیسے نہ دکھیں۔ سوج جائیں گی۔ سو جا بیٹی۔ اب سو جا۔

حسنا: ابھی کام پڑا ہے ماں۔

(آواز بھرائی ہوئی)

رحیمن: حسنا! تیری آواز بھرائی ہوئی ہے۔ تو ضرور رو رہی تھی۔ پانی نہیں یہ آنسو ہیں۔

حسنا: نہیں ماں۔

رحیمن: جھوٹ بولتی ہے بچی۔ مگر ٹھیک ہی تو ہے۔ سچ کیا بولے۔ تیری آنکھیں نہیں دکھتیں۔ بچی! تیرا دل دکھتا ہے۔ بھوکوں کی مصیبت کا مارا ننھا سا دل۔ میری بیٹی ماں کے دل سے پوچھو وہ اولاد کا دکھ درد خوب سمجھتا ہے۔ اس سے کچھ نہیں چھپ سکتا۔ میں کیا نہیں جانتی۔

میری دکھیا بچی

(حسنا کے رونے کی آواز نکل جاتی ہے۔ اب وہ ضبط نہیں
کر سکتی)

رحیمن : روئے مت۔ میری بچی روومت۔ صبر کر۔ تو تو بہت صابر بچی ہے۔ آ ادھر آ۔ میرے سینے سے
لگ جا۔ حسنا روئے گی تو یہ کپڑا کون سیئے گا۔ صبح کو پورا نہیں ہوگا۔

(رونا)

حسنا : ماں تم۔ مت روؤ۔

رحیمن : آہ! تو روئے اور میں نہ روؤں۔ پتھر کی سِل چھاتی پر رکھے بیٹھی ہوں۔ اسی لیے کہ تو مجھے دیکھ کر
پریشان ہوگی روئے گی۔ اللہ مجھے موت دیدے۔ کسی گڑھے میں ڈبو دے ایسے جینے سے
مرنا بھلا ہے۔

(رونا)

حسنا : (ہچکیاں لیتے ہوئے) ماں مت روؤ۔ لو میں بھی چپ ہوگئی۔ اللہ میاں ہم پر رحم کریں۔ گھبراؤ
نہیں کبھی ہم دکھیوں کے دن بھی پھریں گے۔

رحیمن : کیا خبر حسنا کب دن پھریں گے۔ اچھے دن برے ہوگئے۔ تو اب کیا بدلیں گے۔ میری تو موت
میرے اچھے دن لائے گی۔

(بچہ جاگتا اور رونے لگتا ہے)

ننھا بھوک سے بلبلا رہا ہے معصوم کو بھوک میں کیسے نیند آئے (جمائیاں لیتی ہے)

لوری ۔ آ ــــ آ ــــ آ سو جا میرے لال

سو جا)

(نیند میں بھرائی آواز)

ہوں ہوں سو جا۔ سو جا۔

حسنا : ہاں۔ سردی کیسی تیز ہو رہی ہے۔ ابا ابھی تک نہیں آئے۔ اللہ میاں ان کو خیر سے لائے گھٹا بھی چھا رہی ہے۔

(ہوا کی سائیں سائیں)

رحیمن ۔ ہاں بیٹی! جو اللہ کی مرضی۔ (بچہ روتا ہے) بچے کو سردی لگ رہی ہے۔ کانپ رہا ہے میں اس کو اندر کوٹھری میں سلا دوں۔

گانا

سو جا بھوک کے مارے سو جا   سو جا میرے پیارے سو جا
سو جا سو جا پیارے سو جا   سو جا سو جا سو جا سو جا

دوسرا منظر

راستہ

(اُسی دن پانچ بجے صبح کو حسنا اپنے باپ کو ڈھونڈھنے
نکلی ہے۔ وہ رات بھر نہیں آیا۔ تیز سردی ہے۔ ہوا کی
سائیں سائیں، بادل چھائے ہوئے ہیں۔ بجلی بھی چمک
رہی ہے۔ سردی اور بارش کے ڈر سے جانور بھی باہر
نہیں نکلتے۔ حسنا راستہ پر چلی جا رہی ہے۔ ایک
پگڈنڈی کے پاس پہنچتی ہے)

حسنا: میرے اللہ ابا کو کیا ہوا۔ تو خیر سے انھیں ملا دے۔ رات بھر نہیں آئے۔ اب اس سے بھی ان کی لڑائی ہو لی۔ یہ اور مصیبت ہے۔ کہاں کہاں ڈھونڈوں۔ سارے قصبے میں ڈھونڈ آئی سب کے گھر اور دکانیں بند ہیں۔ ابھی تو اندھیرا ہے۔ نہ جانے کیا وقت ہے۔ ہائے گھٹا کیسی چھائی ہوئی ہے۔ بجلی اُف کس زور سے بجلی چمکی۔ اللہ میاں مینہ نہ برسنے لگے۔ میں کیا کروں گی۔ یا اللہ! ابا کو کہاں ڈھونڈوں۔ کہیں غم کے مارے ان کے دشمن کچھ ....

(روتی ہے۔ ہچکیوں کی آواز اور ہوا کی سائیں سائیں)

(کارخانے کی سیٹی کی آواز آتی ہے اور بادل گرجتا ہے)

حسنا: پانچ بج گئے ہوں گے۔ کارخانے کی سیٹی بجنے لگی۔ ابا کے کارخانے جانے کا بھی وقت ہو گیا۔ اب کیا ہوگا۔ کارخانہ جاگ رہا ہے۔ سوتوں کو جگانے کے لیے۔ پر نہ جانے ابا کہاں سو گئے۔

(منجو کارخانے کو جاتے ہوئے راستہ سے گذرتا ہے)

حسنا : لوگ اب کارخانے کو جانے لگے ——— وہ کوئی جا رہا ہے۔ کیسا اندھیرا ہے۔ گھر جاؤں۔ شاید ابا گھر پہنچ گئے ہوں۔ اللہ کرے آ گئے ہوں

(ٹھوکر لگتی ہے)

منجو : کون ——— کون حسنا؟

حسنا : منجو ———!

منجو : تم کہاں؟

حسنا : ابا رات بھر نہیں آئے۔

منجو : تو اب تم فیضو بھائی کو ڈھونڈ رہی ہو؟ رات بھر نہیں سوئیں ———

حسنا : ہاں۔ نصیب سوتا ہے تو انسان جاگ کر دن گزارتا ہے ———

منجو : تم بہت عقل مند ہو حسنا۔ مگر، فیضو بھائی یہاں کہاں حسنا تمہیں نہیں مل سکتے ———

حسنا : کیوں۔ وہ کہاں ہیں منجو۔ تمہیں خبر ہے۔ بتاؤ کہاں ملیں گے؟

منجو : گھبراؤ نہیں حسنا۔ وہ آپ آ جائیں گے۔ یہاں سے ذرا دور رہیں وہ تمہارے جانے کی جگہ نہیں۔

حسنا : میرے اللہ۔

(تھکی ہوئی آواز)

منجو : جاؤ حسنا۔ تم گھر جا کر آرام کرو۔ فیضو بھائی کو میں ڈھونڈھ کے لاتا ہوں۔

حسنا : تمہارے کارخانہ جانے کا وقت ہے۔ سیٹی بج چکی ہے۔

منجو : ہاں مگر ابھی دیر ہے۔ پہلی سیٹی بجی ہے۔

حسنا : تم کیوں تکلیف کرو۔ میں دیکھ لوں گی۔ گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ کہیں مینہ نہ برسنے لگے۔

منجو : مینہ برسے گا تو تم بھی بھیگ جاؤ گی حسنا۔

حسنا : میرا کیا ہے؟

منجو : اور مجھے کیا ہو گا ———؟

حسنا : تم ــــــ !

(وقفہ)

تم کام پر نہ جا سکو گے۔

منجو : حسنا تم بہت نیک ہو۔

حسنا : بہت بدنصیب۔

منجو : بہت بھولی۔

حسنا : کیسا اندھیرا ہے۔ لو بوندیں بھی آ گئیں

منجو : چلو حسنا۔ میں تمہیں گھر پہنچا دوں۔

حسنا : اُف کیسی ٹھنڈ ہے۔

منجو : اوہو حسنا۔ تم کچھ گرم کپڑا بھی تو نہیں لائیں۔

حسنا : (بے خیالی) گرم کپڑا۔ جو آرام سے سوتے ہیں وہ اوڑھتے پہنتے ہیں۔

منجو : گھر سے اوڑھ کے باہر نکلنا چاہئے تھا۔ ٹھنڈ بہت ہے نا ؟

حسنا : (ٹھنڈی سانس) گھر سے ــــــ ہوں ــــــ ماں اوڑھے تھیں۔

منجو : خدا تمہیں بہت سے کپڑے دے حسنا۔ تم بہت نیک اور بھولی ہو۔

(مینہ اور بادل کی گرج)

حسنا : اوہ مینہ برسنے لگا۔ اب کہاں جائیں۔

منجو : اس پیڑ کے سایہ میں۔ جلدی چلو حسنا۔ مینہ تیز ہے۔

حسنا : تم کارخانہ جاؤ منجو۔ تمھارے پاس تو چھاتا ہے۔

منجو : ہاں مگر تم جو بھیگ جاؤ گی۔

حسنا : میری فکر مت کرو۔

منجو : تمھاری فکر ؟

حُسنا : اُف کیسی تیز بارش !

منجو : بس یہیں بیٹھ جاؤ حُسنا۔ لو یہ میرا کمبل اوڑھ لو۔ تمھیں سردی لگ جائے گی۔

حسنا : اور تم کیا اوڑھو گے ؟

منجو : مجھے سردی بالکل نہیں لگتی۔ میں ہٹا کٹا ہوں۔

حسنا : اللہ میاں ! جانے ابا کہاں ہوں گے۔ انہیں سردی ستاتی ہوگی۔

(روتی ہے)

منجو : حسنا۔ ان کا غم مت کرو۔ وہ کہیں اندر بیٹھے ہوں گے۔

(بادل گرجتا ہے)

حسنا : میرے اللہ ! جی ڈرا جاتا ہے۔ ماں گھر میں اکیلی ہیں مینہ نہیں تھمتا۔

منجو : (آہستہ) حسنا۔ تم کانپ رہی ہو۔

حسنا : نہیں منجو (رونے کی سی آواز) یہ بجلی مجھ پر گر جائے۔ کیسا اچھا ہو۔

منجو : (جلدی) کیوں حسنا۔ کیا میرے یہاں ہونے سے تم خفا ہو۔

حسنا : خفا کیوں ہوتی۔

(روتی رہتی ہے)

منجو : تمھارے رونے کی آواز سے میرا دل دھڑکنے لگا۔ رو مت حسنا۔ ادہو۔ تم بہت بھیگ گئیں چھپنے کی جگہ بھی نہیں

حسنا : (کپکپی) میرے لیے۔ تم بھی تکلیف اٹھا رہے ہو۔ مجھ سے زیادہ تم بھیگ رہے ہو۔ مینہ بہت تیز ہے۔

منجو : نہیں حسنا۔ مجھے تو افسوس اس کا ہے کہ آج تک تم لوگوں کی کوئی خدمت نہیں کر سکا۔ ہم دونوں ہی بھیگ رہے ہیں۔

حسنا : تمھارا ڈھارس بندھانا ہی ہمارے لئے بہت ہے۔

منجو : خالی ڈھارس دینا بیکار ہے۔ حسنا۔ میں کسی قابل نہیں ہوں۔ کئی بار میں نے کچھ کوشش کی تو فیضو بھائی اور بھابی دونوں نے میری مدد قبول نہ کی۔ وہ تکلف کرتے ہیں۔

حسنا : منجو تم کیوں ایسی تکلیف کرو۔

منجو : یہ تکلیف کچھ نہیں۔ فیضو بھائی کو میں اپنا بھائی سمجھتا ہوں۔ ان کی خدمت میرا فرض ہے مگر وہ بہت خود دار ہیں اور تم لوگ فرشتے ہو۔

حسنا : اچھے آدمی سب کو اچھا ہی سمجھتے ہیں۔ ہمارے پاس سوائے دکھوں کے اور کیا ہے۔

منجو : تمہارے دکھ کی پکار مجھے بے چین کرتی ہے حسنا میرا دل ہل جاتا ہے جب تمہارے رونے کی آواز سنتا ہوں۔

(حسنا کے رونے کی ہچکیوں کی آواز)

منجو : (جیسے خود سے کہہ رہا ہے) حسنا کا دل دکھوں سے رونا ہے۔ دکھ درد کی تکلیف میں جانتا ہوں۔ کارخانے میں کام کرتے وقت کبھی میرے ہاتھ میں چوٹ لگ جاتی ہے خون بہنے لگتا ہے۔ ایک دن میرے پاؤں میں ہتھوڑا لگ گیا بہت درد ہوا۔ مگر یہ سارے درد دل کے درد کی برابری نہیں کر سکتے۔ دل کا درد اور ہی کچھ ہے۔

حسنا : (روتی آواز) منجو کیا تمہارے دل کو بھی کچھ دکھ ہے۔ تم تو بہت کماتے ہو۔ کھانے پینے کو سب کچھ ہے۔ پھر تمھیں کیا دکھ ہے۔

منجو : میں یتیم اور تنہا ہوں۔ میرے ابا کب گزرے مجھے کچھ یاد نہیں۔ مگر اماں کے مرنے کے وقت میں مشکل چار سال کا تھا کہتے ہیں۔ مجھے یاد نہیں میری عمر آٹھ سال کی تھی جب روٹی کمانے مجھے گھر سے اکیلا نکلنا پڑا ——— مجھے کبھی کسی دکھ نے اتنا نہیں ستایا۔ مگر دل کے درد کی تکلیف ——— کچھ اور ہی ہے ———

وقفہ

دونوں خاموش ہیں ——— بادل گرجتا ہے)

حُسنا : اب تمہیں دیر ہوگی منجو۔ چلنا چاہئیے۔

منجو : ابھی تم کیسے جا سکتی ہو حسنا۔ راستے میں پانی بہت ہے۔

(باہر سے بانسری کی آواز سنائی دیتی ہے۔ بارش ہو رہی ہے)

حُسنا : وہ سنو منجو کوئی بانسری بجا رہا ہے۔ مینہ کی جھڑی لگی ہے۔

منجو : ہاں! مینہ کی جھڑی میں کوئی چھن کی بانسری بجاتا ہے۔ کوئی آنسوؤں کی جھڑی لگاتا ہے۔

حُسنا : (ٹالنے کو) سنو تو منجو کیسی پیاری آواز ہے۔

منجو : حسنا! میرا جی تو تمھاری کہانی سننے کو چاہتا ہے۔

حسنا : کہانی۔ اس وقت یہاں۔

منجو : ہاں کیا ہرج ہے۔ جی چاہتا ہے۔ وہی کہانی بار بار سنتے جاؤں۔ بہت دن ہوئے ایک رات کو میں تمھارے یہاں آیا تھا۔ تو تم نے کہانی سنائی تھی۔ یاد ہے ! کجری بن کے پار پہاڑیوں کے پیچھے۔ دُور ——— حسنا! وہی کہانی سنا دو۔ —— یاد ہے۔ اس دن وہ کہانی پوری نہیں ہوئی تھی۔ ابھی تو تھوڑی دیر یہاں بیٹھنا ہے نا ———

کمبل اچھی طرح اوڑھ لو۔ کہو کہانی حسنا !

حسنا : اچھا سنو! کجری بن کے پار پہاڑیوں کے پیچھے سنہری دیس میں۔ ایک ماہی گیر رہا کرتا تھا۔ ——— وہ جوان تھا اور بہت خوبصورت۔ اس کے پاس ہی ایک گوالن رہتی تھی۔ وہ ایسی خوبصورت تھی۔

منجو : کہ چاند کو شرمائے تمھاری طرح۔

حسنا : ہوں۔ جاؤ بھی۔ خوبصورت گوالن تھی گوالن پہاڑوں کے پیچھے اپنی بھیڑوں کا گلہ چرایا کرتی تھی اور بے چاری اتنی غریب تھی۔

منجو : اور ایسی معصوم تھی جیسے بھولی بھالی بھیڑ۔

حسنا : اچھا تو ماہی گیر نے ایک دن گوالن کو دیکھا۔ اور روز دیکھنے آنے لگا۔

منجو : دیکھنے کی چیز کو ہونہ دیکھنے آنا ہی چاہیے حسنا
حسنا : تو ماہی گیر گوالن کو دیکھتا۔ اور گوالن ماہی گیر کو۔
منجو : ماہی گیر کا کیسا اچھا نصیب ؛
حسنا : دونوں آپس میں بہت محبت کرنے لگے۔ روزانہ دونوں ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتے۔ گوالن ماہی گیر کو شہزادہ سمجھتی۔ اور دونوں ہمیشہ ساتھ رہتے۔
منجو : اور ماہی گیر خوبصورت گوالن کو شہزادی جانتا ہوگا ؟
حسنا : ہاں
منجو : حسنا !

(آواز بھرائی ہوئی)

حسنا : منجو !
منجو : اگر تم گوالن ہوتیں اور میں ماہی گیر ؛
حسنا : تو کیا ہوتا منجو ؛
منجو : کیا ہوتا —— جانتی ہو ؟
حسنا : منجو تم ——

(بات کاٹ کر)

منجو : (بے قابو) حسنا۔ مجھے بھی ایسی ہی محبت ہے جیسی ماہی گیر کو تھی۔ بالکل ایسی۔ (رک رک کر) مجھے تم سے —— محبت ہے —— حسنا ! ——— تم سے ———
حسنا : تمھیں منجو —— مجھ سے ؛
منجو : ہاں ہاں تم سے حسنا ! مدتوں سے میں تمھیں ماہی گیر کی طرح شہزادی سمجھتا ہوں۔
حسنا : شہزادی ——— میں !
منجو : سچ سچ حسنا۔ تم شہزادی ہو —— اور تم اپنے دل کی بات کہو —— تم ———

حسنا : (بے اختیار) تم شہزادہ ہو منجو ——— مدتوں سے ——— میں ———
منجو : گوالن کی طرح ———
حسنا : شہزادہ سمجھتی ہوں۔ اسی سنہری دیس کا ———
منجو : اور تم مجھ سے بیاہ کرو گی۔ جیسے گوالن راضی تھی۔
حسنا : اگر ماں باپ راضی ہوں۔
منجو : اور تم میرے ساتھ رہو گی ؟
حسنا : ہوں۔
منجو : ہمیشہ — ہمیشہ ———
حسنا : ہمیشہ ———
منجو : آہا۔ حسنا دن رات محنت مزدوری کیا کروں گا اور اتنا کما کر لایا کروں گا کہ روپے سے تمہارا گھر بھر جائے۔ ہم پھر کبھی الگ نہ ہوں گے ہمیشہ پاس رہا کریں گے۔ مل کر ساتھ بیٹھا کریں گے ہاتھ میں ہاتھ لیے ہوئے۔ دل سے دل ملے ہوئے۔ ابھی الگ بیٹھے ہیں۔ پھر دونوں ایک ہو جائیں گے۔ آہا ہم کتنے خوش ہوں گے۔ سدا سکھ کی نیند سوئیں گے اور آرام خوشی سے جاگیں گے ———
حسنا : آہ ——— سدا سکھ ——— کی نیند ———
منجو : جب میں کارخانہ سے آیا کروں گا۔ تو اسی طرح تمہارے ساتھ بیٹھ جاؤں گا اور تم دور دور کے سنہری دیس کی کہانیاں۔ مزے دار پیاری پیاری کہانیاں سنایا کرو گی۔ کیوں حسنا۔
حسنا : پھولوں کے دیس کی ——— سوتے جاگتے شہزادے کی ! ———
منجو : میری سنہری پری حسنا ———
حسنا : منجو ! (وقفہ) بارش تھم گئی ہے۔
منجو : ہاں ! طوفان رک گیا ہے۔

(وقفہ)

منجو : مگر ہماری محبت کبھی نہ تھمے گی

حسنا : کبھی نہیں ———— !

منجو : چلو موقع ملا تو آج ہی تمھاری اں سے ذکر کروں گا۔

حسنا : جانے ابا کہاں ہوں گے۔ اللہ انھیں خیریت سے لائے۔

منجو : خدا ہمارا مددگار ہوگا حسنا ———— !

حسنا : سیٹی بجی تم کارخانے جاؤ گے اب ؟

(روانگی) کارخانے کی سیٹی راستے میں مزدوروں کے

گذرنے کی آوازیں اور چہل پہل)

منجو : دیکھا جائے گا۔ ابھی تو کاریگر جارہے ہیں۔ وہ دیکھو قطار کی قطار۔ تم گھر چلو میں کسی کاریگر سے کہہ کر آتا ہوں کہ مجھے دیر ہو جائے تو میرا کام ذرا دیکھ لے۔

○

تلمیر منظر

(دری فیضو کا مکان۔ بچہ کے رونے کی آواز۔ ماں لوری
دے رہی ہے)

رحیمن : اللہ میرے۔ رات بھی گذر گئی۔ بچے کو بلکتے بلکتے بہ وقت ہوگیا۔ جانے کب سے بے چین
ماری ماری گلیوں میں پھر رہی ہے۔ مگر اس کے باپ کا پتہ نہیں۔ اُن کو کسی طرح ہوش رہی
نہیں۔ کیسی طوفانی رات آنکھوں میں کٹی ——— تو ہی رحم کرنے والا ہے
یا اللہ رحم !

(باہر سے فیضو بدمستی کے عالم میں گرتا پڑتا گاتا۔ اور
تالیاں بجاتا آ رہا ہے۔

گانا

ہاں دیکھ ہر اک ذرہ ہے اک باغِ جہاں دیکھ
گلشن پہ ہے گھنگھور گھٹاؤں کا دھواں دیکھ
(ہا ہا ہا ہا) ہاں دیکھ ———
ہاں پیرِ مغاں پیرِ مغاں پیرِ مغاں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں دیکھ ———
(مستانہ آواز)
(ہا ہا ہا ہا)
پیرِ مغاں دیکھ بادل برس چکے۔ اب تو اُٹھ شراب کا مینہ
برسا دے جاگ اُٹھ۔

ہاں پیرِمغاں۔ پیرِمغاں۔ پیرِمغاں دیکھ"

رحیمن : (غصّے میں چلاتی ہوئی اٹھتی ہے) خدا کا غضب تم پر نازل ہو۔ رات رات بھر غائب! نہ گھر بار کی خبر۔ نہ بچوں کا خیال۔ بھوک کے پیاس سے تڑپ رہے ہیں۔ ایسی طوفانی رات میں جوان بیٹی سارے گاؤں میں ڈھونڈتی پھرتی ہے۔ گم جائے تو صبر آ جائے۔ شرم نہیں آتی ننھی بچی رات بھر کپڑے سی کر آنکھیں پھوڑے اور چار بجے سے اس طوفان میں باپ کو ڈھونڈنے نکلے۔ ڈوب مرو بے شرم۔ اب آئے شور مچاتے نشہ میں ہوش نہیں۔ گانا بجانا سوجھا ہے —— یہ ساری بدنصیبی نہیں تو کیا ہے مجھے تو موت ہی آئے بس!

(روتی ہے)

فیضو : ہا ہا ہا ہا۔ بس کر چکیں۔ اور اب آپ ہی روتی رہو۔ ہا ہا ہا ہا! میں نے کیا کیا؟ نشے میں کسے ہوش نہیں مجھے۔ بالکل جھوٹ۔ میں نشہ میں نہیں۔ میں ہوشیار ہوں۔

رحیمن ۔ اور کیا تم ہوش میں گا بجا رہے ہو؟

فیضو : نہیں میں نشے میں نہیں۔ سچ کہدوں۔ ذرا دوستوں کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔ بے چارے میرا غم غلط کرنے کو یوں ہی بہے تھے۔ تھوڑے کچھ پینے پلانے کا بھی شغل کر لیا۔ دل بہلانے کو۔ بس اور کچھ نہیں۔ صرف دل بہلانے میں کیا حرج ہے جسا کی ماں یہ بھلا نشہ ہوا۔ ہا ہا ہا! میں نشے میں نہیں

رحیمن : پینا پلانا نشہ نہیں۔ تو کیا ہے۔ میری قسمت پھوٹی ہے۔ موت بھی نہیں آتی۔

فیضو ، ہا ہا ہا ہا! موت کیا کرے گی۔ زندگی تو یہی ہے۔

(گاتا ہے۔ ہاں پیرِمغاں ۔ پیرِمغاں ۔ پیرِمغاں دیکھ۔)

رحیمن : میں کہتی ہوں۔ آپ چپ رہو۔ یہ گانا بند کرو۔ بچہ بھوک کا روتے روتے سویا ہے۔ پھر جاگ جائے گا۔

فیضو : کیا حرج ہے۔ جاگنے دو۔ جاگو اور جگاؤ۔ میں نے بہت دیر سے اُسے نہیں دیکھا ہے۔

رحیمن : بس یہ جھوٹی محبت رہنے دو۔ رات بھر بچے بھوک سے تڑپیں اور آپ دل بہلاتے نشہ پانی کرتے پھرو ——— نشہ باز کہیں کے۔

فیضو : پھر وہی نشہ باز۔ تم ہو ——— میں نشے میں نہیں ہوں

رحیمن : شور میں مچا رہی ہوں یا تم ؟

فیضو : دیکھو حسنا کی ماں تم دیوانی ہو گئی ہو۔ ہاں تمہیں نیند آئی ہو گی ——— خیر سو جاؤ۔ شور مت کرو ——— اور ——— سو جاؤ ———

رحیمن : (جل کر) سو جاؤں۔ رات بھر جاگتے گذری اب دن نکلے سو جاؤں۔

فیضو : ہا ہا ہا ہا۔ دیوانی۔ کچھ پی لیا ہے کیا ؟ آدھی رات کو دن۔ ہا ہا ہا سو جاؤ ——— سو جاؤ چپ رہو۔ پڑوس کے لوگ جاگ جائیں گے۔ ارے پیر مغاں۔

گانا

(حسنا باہر سے آتی ہے)

حسنا : ابا آ گئے۔ ابا خیریت سے آئے۔

فیضو : حسنا! ہا ہا ہا ہا! میری بیٹی۔ تو بھی جاگ اٹھی۔ تیری ماں نے اتنا شور مچایا۔ میں اتنی دیر سے منع کر رہا تھا۔

حسنا : میں سو نہیں رہی تھی ابا۔

رحیمن : (رات کاٹ کر) بھوکی پیاسی، نشہ باز باپ کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ یا غریب بچی سو رہی تھی۔ شرم نہیں آتی۔

حسنا : ماں ابا خفا ہو جائیں گے۔ چلاؤ نہیں۔ ابا اب تو دن ہے۔ میں سوتی کیوں ؟

فیضو : ہا ہا ہا ہا! ماں کے ساتھ تو نے بھی کچھ پیا ہے۔ آدھی رات کو دن۔ تم سب نے مل کے دیوانہ بنانے کی سوچی ہے۔ جاؤ۔ سو جاؤ دیوانیو !

(گانا)

ہاں پیرِ مغاں پیرِ مغاں پیرِ مغاں دیکھ ــــــ !

(منجو کا داخلہ)

منجو : فیضو بھائی۔ بہت مزے دار گیت گا رہے ہو۔ کہو اچھے تو ہے۔

فیضو : آؤ۔ آؤ۔ منجو۔ اس وقت تم کیسے؟ کیا ابھی تک کارخانہ سے چھٹی نہیں ملی۔ بہت کام کرتے ہو یار۔

منجو : کیا وقت ہے بھائی۔ دن کے سات بجے ہیں۔ کارخانے جانے کا وقت ہے چھٹی کا نہیں۔

فیضو : ہا ہا ہا ہا ہا! میرا گھر آج دیوانوں کا دڑبہ ہے۔ جو آتا ہے وہی دن کا راگ الاپتا ہے۔ منجو تمہیں کیا ہو گیا۔ آدھی رات کو دن بتاتے ہو۔ گھر والے سب پاگل تھے۔ تم یہاں آتے ہی پاگل بن گئے۔

منجو : آہا! میرے یار میں سمجھا نہیں تھا۔ اب خیال آیا تم تو دوسرے رنگ میں ہو۔ ہاں بھئی سچ ہے آدھی رات ہے۔ کہو مزاج کیسے ہیں فیضو بھائی۔

فیضو : مزاج۔ آدھی رات کو کیا مزاج۔ جاؤ اب سو جاؤ۔ صبح بتائیں گے۔

منجو : نہیں بھائی مجھے سونا نہیں ہے۔ تم سے کچھ کام تھا۔

فیضو : کام۔ اس وقت کچھ نہیں یار، صبح کو کارخانے میں بات کریں گے۔ اب تو سونے دو۔

منجو : کارخانے میں مشینوں کی گڑبڑ میں کان بہرے ہوئے جاتے ہیں۔ وہاں کیا خاک بات ہو گی ایک ضروری بات کہنا ہے۔

فیضو : دن بھر پڑا ہے۔ باتوں کیلئے۔ کیا بات ہے ایسی ضروری۔

منجو : ذرا علیحدہ چلو۔ سب کے سامنے نہیں۔

فیضو : خیر چلو کہہ ڈالو۔

منجو : (سرگوشی کی طرح آہستہ آہستہ رُک رُک کے) فیضو بھائی۔ میں ــــ تم ــــ جانتے ہو میرے خیال میں تم مجھے خوب جانتے ہو ــــ میں ــــ میں ــــ

فیضو : پھر بات کیا ہے ؟ کہو تو ——— ،

منجو : بات یہ ہے کہ مَیں تمھاری بیٹی ——— ۔

فیضو : ہاں میری بیٹی حسنا ہے ؛

منجو : مَیں حسنا کے ساتھ بیاہ ———

فیضو : کس کا بیاہ اپنا حسنا کے ساتھ ؟

منجو : ہاں ——— مَیں کوئی بُری بات نہیں کہتا۔ فیضو بھائی۔ تم خفا نہ ہونا ——— اگر مرضی نہ ہو تو مجھے معاف کر دینا۔ اس میں کوئی بُرائی نہیں۔ تم جانتے ہو مَیں محنتی کاریگر ہوں۔ میرے چال چلن کا حال تمہیں ———

فیضو : سب معلوم ہے منجو میں تمھیں خوب جانتا ہوں۔ تو تم کیا حسنا کو چاہتے ہو ؟

منجو : بے شک فیضو بھائی۔ مَیں حسنا کو بہت خوش اور آرام سے رکھوں گا ——— مَیں عہد کرتا ہوں تم ہمیشہ مجھ سے خوش رہو گے ۔

فیضو : بے شک تم خوش رکھ سکتے ہو۔ تم شریف ہو محنتی ہو۔ مگر حسنا کی ماں سے بھی پوچھ لیا۔ تم میرے ساتھ کیوں دل لگی کرتے ہو۔

منجو : اگر تم راضی ہو جاؤ، تو وہ بھی راضی ہو جائیں گی۔ مَیں اُن سے بھی کہوں گا۔

فیضو : حسنا کی ماں۔ حسنا کی ماں کیا سو گیئں۔ ارے دن نکلا آ رہا ہے۔ اِدھر تو آؤ۔ خوشی کی بات تو سناؤں

رحیمن : (آواز) کیا ہے۔ یہ پھر کیوں شور مچانا شروع کر دیا۔ ابھی آدھی رات تھی۔ ابھی نشہ دور ہو گیا تو بس دن نکل آیا۔ مَیں کیا سو رہی تھی۔

فیضو : (آہستہ سے) حسنا کی ماں۔ آہستہ بولو۔ دیکھو وہ تمھارا ہونے والا داماد بیٹھا ہے۔ یہ نشے کا کیا ذکر کر رہی ہو۔

رحیمن : کیا کون داماد۔ کیا الاپ رہے ہو ؟

فیضو: تم تو ہر وقت شور مچاتی رہو بستی بھی ہو۔ جاؤ چلاتی پھرو۔

رحیمن: تو کہو کیا بات ہے۔ ایسی کیا خوشی کی بات آگئی۔ یہ تو منجو بیٹھے ہیں۔

فیضو: ہاں اور کیا۔ یہی تمہارے داماد بننے کی خواہش کرتے ہیں۔ بولو۔ منظور ہے ؟

رحیمن: کیوں منجو کیا بات ہے۔ یہ کیا کہتے ہیں ؟

منجو: بھابی کہتے تو ٹھیک ہیں میری آرزو یہی ہے۔

رحیمن: میری خوشی کیا پوچھتے ہو۔ مجھے ابھی منظور ہے۔

فیضو: تو میں نے کب انکار کیا ہے۔ منجو کو میں مدت سے جانتا ہوں اس سے زیادہ شریف اور نیک محنتی آدمی

رحیمن: حسنا کے لیے مجھے ایسا ہی دولہا چاہیئے۔

فیضو: ہاں ہماری حسنا بھی کیسی محنتی ہے !

رحیمن: حسنا کے لیے مجھے ایسا ہی دولہا چاہیئے۔

منجو: تو آپ کی خوشی ہے۔ میں سامان

رحیمن: کیا کہتے ہو پھر ؟

فیضو: فیضو۔ مجھ سے کیا پوچھتی ہو مجھے منظور ہے۔

رحیمن: مجھے تم سے پہلے منظور ہے۔ مگر میاں منجو دیکھو تم جانتے ہو۔ ہمارے پاس جہیز کے پیسے۔

منجو: نہیں آپ جہیز کا بالکل خیال نہ کریں۔ مجھے اس کی بالکل خواہش نہیں۔

رحیمن: نہیں ہم کچھ دنوں میں تھوڑا بہت جوڑ جوڑ کے جمع کر دیں گے۔

منجو: نہیں بھابی! اس کی تکلیف بالکل نہ کریں۔ بس مجھے آپ کی خوشی چاہیئے۔

فیضو: بس تو جب چاہو سامان کر لو۔

رحیمن: میری حسنا کو ذرا تسلی سے رکھنا۔ غریب اور نیک بچی ہے۔ تمہیں معلوم ہے۔

منجو: بھابی کیا کہہ رہی ہو۔ دیکھنا حسنا کی ہر خوشی میرے سر آنکھوں پر ہوگی۔

فیضو ۔ ہاں بھئی! تم محنتی ہو۔ خوب کماتے ہو۔ خدا آرام سے رکھے گا۔ حسنا حسنا کہاں ہے ؟

رحیمن : کیوں وہ یہاں آکے کیا کرے گی۔ بچے کے پاس ہے۔ رہنے دو ۔

فیضو : خیر۔ حسنا کی ماں تمھیں یاد ہے۔ اسی طرح بالکل اسی طرح اب سے برسوں پہلے کوئی بیس برس پہلے میں تمہارے باپ کے پاس گیا تھا۔

رحیمن : ہاں! خدا بخشے ابا سے بھی تم نے اسی طرح مجھے مانگا تھا۔

فیضو : ہمارا بھی یہی ہوا تھا چٹ منگنی پٹ بیاہ ۔ دوسرے ہی دن ہم دولہا ۔ دلہن ساتھ بیٹھے تھے خوش خوش ——————— !

رحیمن : ہاں سچ تو کہتے ہو۔ بہت خوش ہے ۔ مگر یہ خوشی دو سال ہی رہی ہو گی۔ پہلے تم خوب کماتے تھے اور دونوں مزے سے کھاتے تھے ۔

فیضو : کیوں پھر دو سال بعد کیا ہوا۔

رحیمن : یہی ناکہ حسنا پیدا ہوئی۔ اس کے بعد دوسرے سال لڑکا ہوا جو مر گیا۔

فیضو : ہاں ہاں پھر تو ہر سال ایک بچہ ہوا اور پھر کیا تھا۔ بیتی اور برخوردار بچوں پر بچے۔ بس تم دلہن کے بدلے ایک لوری گانے والی ماں بن گئیں۔ ہاں کچھ دن بعد یہ بھی وہی راگ الاپیں گے ——

رحیمن : کون ——— ؟

فیضو : یہی ہمارے بچے حسنا اور منجو ۔ ———————

رحیمن : کیا باتیں کرتے ہو۔ ابھی تک تمہارا نشہ نہیں اُترا۔ منجو تمھاری طرح نہیں۔ خدا نہ کرے دولت سے گھر بھر دے گا۔ میری حسنا عیش کرے گی۔

فیضو : ہاں ہاں یہ تو ہو گا۔ مگر ایک دو سال ——— اس کے بعد ———————

رحیمن : (ٹھنڈی سانس لے کر) بس کے بعد ———————

(بچہ روتا ہے حسنا ماں کو پکارتی ہے)

رحیمن : کیا ہے۔ آتی ہوں۔

(حسنا بچے کو لاتی ہے۔ رحیمن لوری سناتی ہے

"سوجا میرے پالے سوجا۔ سوجا۔ سوجا۔ سوجا۔ سوجا

(بچہ کو لے کر جاتی ہے)

فیضو : منجو تم سامان کرلو۔ ہمیں خوشی سے منظور ہے۔

منجو : مجھے یہی امید تھی۔ فیضو بھائی۔ مَیں آپ کا غلام ہوں۔

فیضو : نہیں تم ہمارے عزیز ہو۔ جگر ہو۔ اچھا چلو اب کارخانے چلیں۔ پھر آکے تیاری کریں گے۔

منجو : چلئے۔ چلیں۔

فیضو : ذرا ٹھہرو۔ مَیں تیار ہو جاؤں۔

منجو : (آہستہ سے حسنا کو بلاتا ہے) حسنا۔ سنو تو کیا کر رہی ہو۔ وہ راضی ہو گئے۔ اب تم میری ہو۔ کل ہم تم دولہا دلہن ہوں گے۔

حسنا : منجو کوئی دیکھ نہ لے۔ اب ہمیں ساتھ بیٹھتے شرم کرنی چاہئے۔

منجو : ادھر ہو میری شرمیلی شہزادی حسنا۔ ایک بار وہ تو پھر سنا دو۔ کجری بن کے پار

حسنا : ایک بار نہیں ہزار بار سنو۔ کجری بن کے پار۔ پہاڑیوں کے پیچھے دور۔ شہر سے دیس میں

(اپنے بچے کا رونا۔ رحیمن کی لوری کی آواز۔ سوجا سوجا سوجا)

منجو : فیضو بھائی سچ کہتے تھے۔ ایک دن ہم بھی یہی گیت گاتے ہوں گے۔ کیوں نہ گائیں یہی تو زندگی کا راگ ہے۔ بچپن سے بڑھاپے تک۔ کوئی گاتا ہے۔ کوئی سنتا ہے۔ سوتے جاگتے۔ یہ راگ جاری ہے۔

(لوری کی آواز۔ ساتھ میں دُور سے کارخانہ کی سیٹی سنائی دیتی ہے)

دلہن کیسی

عصمت چغتائی

کردار

چھمی خالہ : ایک مکمل خالہ

حمیدہ : بے چین اور بے صبر بھانجی

اماں : چھمی خالہ کی بہن مگر ان سے میلوں پیچھے

شفیق : حمیدہ کا بھائی۔

○

منظر

حمیدہ : بھیا بھیا ذرا ٹھہریئے۔ کہاں جا رہے ہیں ؟

شفیق : تمہیں اس سے کیا۔ جہاں ہمارا جی چاہے ؟

حمیدہ : تو پھر جائیے۔ ہمیں کیا۔ آپ ہی کا نقصان ہوگا۔

شفیق : نقصان۔ بھلا ہمارا کیا نقصان ہوگا۔

حمیدہ : سنئے۔ چھمی خالہ۔ آپ کی دلہن دیکھنے گئی ہیں سمجھے (ہنستی ہے) ہاں۔

شفیق : ایں ؟ ..... اَ .. .. ہشت کیسی دلہن ؟

حمیدہ : نہیں بتاتے۔ جائیے نا۔ اب جانتے کیوں نہیں ؟

شفیق : کیا بات ہے حمیدہ ——— ہم سمجھ گئے یونہیں بک رہی ہو۔

حمیدہ : سچ کہتی ہوں۔ بس آتی ہی ہوں گی۔

شفیق : اَ ——— اچھا ہوگا۔ امی جان آرہی ہیں۔ سنو۔ دیکھو بھئی حمیدہ کل ہم جا رہے ہیں دور پر بھئی دیکھو کالی والی ہوئیں تو ہم نہیں کریں گے۔ ہاں !

حمیدہ : واہ کالی کیوں ہوگی۔ کالی ہوگی تو ہم دوسری چاندی ڈھونڈ لائیں گے۔ اور کیا اماں جان آ رہی ہیں۔ آپ اپنے کمرے میں بیٹھئے۔ میں آپ کو بتا دوں گی۔ جیسے ہی چھمی خالہ آئیں گی۔

شفیق : دیکھو زیادہ دیر نہ لگانا۔ مجھے کام سے جانا ہے۔

(جاتا ہے)

اماں : کیا کہتا تھا شفیق۔

حمیدہ : یہ کہہ رہے تھے کہ کالی ہوئی تو ہم نہیں کریں گے۔ واہ بھلا ہماری بھابی کالی کیوں ہونے لگی۔

اماں : ادنھ۔ تجھے کالی پیلی کی پڑی ہے اور میں کہتی ہوں لعنت ہو۔

حمیدہ : ہاں نقشہ بھی ۔ ویسا روشن جیسا ہو تو کیا کہنے ۔ کیوں اماں ۔ اُونھ چھمی خالہ نہ جانے کب آچکیں گی ۔

اماں : اے بس آتی ہی ہوں گی ۔ صبح کی گئی ہیں ۔

حمیدہ : اوٹھ دل بھڑک رہا ہے کہ نہ جانے کیسی ہوگی دلہن ؟

اماں : اے بیٹی تو تڑپی کیوں جاؤ ہو ۔ جیسی ہوگی ۔ وہ ذرا سی دیر میں معلوم ہوا جاتا ہے ۔ چھمی آئی اور ایسی تصویر سی کھینچ دے گی ۔ اللہ جانے اسی لیے تو میں نے چھمی کو بھیجا ۔ کہ شفیق کو تسلی ہو جائے گی ۔ دیکھ تو میں بھی آتی ۔ پر جو بات چھمی میں ہے وہ مجھ میں کہاں ۔

حمیدہ : پر کتنی دیر تو ہو گئی ۔ بھئی ہم تو یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ آنکھیں کیسی ہیں ۔ اللہ کرے ممبوجی جیسی ہوں ۔

اماں : خاک پڑے تمھاری ممبوجی پہ ذرا ہانڈی تو دیکھ آئیں ۔ اے میں جانوں ۔ آ گئی چھمی ۔ ذرا دیکھیو حمیدہ ۔

میدہ : آہا ۔ ہا ۔ آ گئیں چھمی خالہ —— خالہ بی —— خالہ بی —— کیسی ہے دلہن کی صورت ؟

(چھمی خالہ ایسے آتی ہیں گویا چھکڑا گھسیٹ کر آئی ہیں ۔
بُری طرح ہانپ رہی ہیں)

می : اوئی بچی ۔ پیر تلے رکھتے دیر نہیں ہوئی اور —— اے ہے آپا بس مر گئی —— نگوڑی گرمی سی ہے ۔

یدہ : گوری ہے نا خالہ بی ۔

لہ : خاک پڑے خالہ مُردی کی صورت پہ ۔ اے بچی چھُری تلے دم تو لینے دے ۔

ل : بیٹھو چھمی ۔ بیٹی حمیدہ ذرا پنکھا کرو خالہ کو ——

یدہ : خالہ بی آنکھیں ۔ آنکھیں ۔

لہ : اوئی تو تو سچ مچ دیوانی ہو گئی ۔ اے دیکھتی ہو آپا ۔ اللہ مارا سانس تو پورا سماتا نہیں

ـــــ اور ـــــــ اے یہ نہیں ہوتا کہ دو بوند پانی حلق میں چوا دے۔ سچ کہتی ہوں آپا تالو تڑخ گیا۔

اماں : ہاں بہت ہی گرمی ہے۔ بھئی ذرا سا شربت گھول دے خالہ کے لیے۔

حمیدہ : اُونھ ـــــ گرمی گرمی ـــــ اونھ ـــــ یہ نہیں بتاتیں کہ ـــــ ۔

خالہ : ایں! بچی گرمی سی گرمی ہے۔ ایسی گرمی تو اللہ ماری دوزخ میں بھی نہ ہوگی۔ یہ معلوم ہوتا تھا ڈولی میں جیسے کسی نے کھولتے پانی میں بند کر کے ڈھکن ڈھک دیا اور آپا اوپر سے اللہ ماری نائن موئی نے موٹی رضائی ڈال دی۔ یہ نائن تو اللہ قسم کوڑی کام کی نہیں۔ بادی سڑن۔

حمیدہ : لیجئے شربت۔ ہاں خالہ بی تو

خالہ : (گھونٹ لے کر) کہو کچھ اور سنے گی کچھ۔ میں کہتی ہوں۔ تم وہی اپنی پرانی والی کیوں نہیں بلا لیتیں۔

حمیدہ : کون خالہ بی۔

اماں : اے ہے کچھ نہیں۔ نائن کا ذکر ہے۔ تو کیا اسی کو بندو کی بہو کو بلاؤں۔

خالہ : اے چولہے میں جھونکی تھی۔ جھاڑو پھری بندو کی بہو ـــــــ آپا ـــــ زمانہ کی چور ـــــ دوتی وہ ـــــ ادھر کی ادھر لگانا اس کا کام۔ اے تم نے سنا حرام خور نے اپنی بھیا کی دلہن سے کیا لگایا جا کے۔

حمیدہ : خالہ بی۔ چھوڑیئے کم بخت نائنوں کے ذکر کو۔

خالہ : اے بچی! ذرا دم تو لے ـــــ ہاں آپا۔ اے وہ میں کیا کہہ رہی تھی حمیدہ کتنی دفعہ کہا۔ بیٹی بیچ میں یوں نہ نہیں ٹپکا کرتے ـــــ اے کیا مزے کی بات کہہ رہی تھی۔ خاک پڑے چھیتے کو۔ اس نمہے نے تو کام کا نہیں رکھا۔ کیا مجال جو کوئی بات یاد رہ جائے۔

حمیدہ : وہ نائن کا ذکر تھا۔ مگر میں کہتی ہوں کہ خالہ بی بتایئے نا۔

خالہ : نہیں سنتیں۔ ہاں ناں۔ خدا [illegible] ہے۔ میں نے کہا۔ اللہ کی بندی یہ اُدھی [illegible] بنی ہیں مُرغ منزی ؟ اسے کچھ تیرا دماغ چل گیا ہے۔ گھر آیا میری۔ یہ تنگ ذات کپڑا پہنا کیا جائیں وہ تو کچھ۔

(دُور سے آواز آتی ہے)

شفیق : حمیدہ ——— ارے حمیدہ

حمیدہ : آئی بھیا۔ (جاتی ہے)

شفیق : کیوں کیسی ہے۔ کچھ بتایا ———

حمیدہ : بس ذرا ٹھہریئے۔ ابھی بتاتی ہیں۔

شفیق : اُوہنہ ——— تو میں جا رہا ہوں۔

حمیدہ : (واپس جاتی ہے) ابھی بس دو منٹ میں

(واپس جاتی ہے تو خالہ کہہ رہی ہے)

خالہ : اے اُنھیں۔ اس کی کیا پروا۔

حمیدہ : خالہ بی۔ ہاں تو کیسی ہے دلہن۔ اچھی ہیں کیوں نہیں لے گئیں۔

خالہ : لو اور سنو ——— جی ! ——— آیا یہ تمھاری لاڈلی تو بس (نقل کرکے) ہمیں کیوں نہیں لے گئیں اسے دماغ تو نہیں چل گیا۔ کنواری بالیاں کہیں گھر گھر لد کرٹے لگاتی پھرتی ہیں۔ خیر سے اب ننھی تو ہو نہیں تم جو گھروں میں جھنکایا جائے۔ اللہ رکھے اب بیاہ شادی کے دن ہیں۔

حمیدہ : تو خالہ بی۔ خیر جانے دیجئے۔ یہ بتایئے کہ ہماری بھابی کیسی ہے پسند آئی آپ کو ——— ؟

خالہ : اے اللہ جانتا ہے۔ سچ مچ تو دیوانی ہے پرائی بچی کو شادی سے پہلے ہی بھابی بنا لیا واہ یہ تو وہی بدنصیبن کی سی مثل ہوگی کہ ———

حمیدہ : اچھی خالہ بی۔ بتایئے نا آخر آپ نے دلہن کو دیکھا تو ———

خالہ : اے دیکھا نہیں تو پھر گئی کیوں تھی۔ بیٹھے بٹھائے بچی مجھے یاد ئے کہتے تے تو کاٹا نہیں تھا کہ چلچلاتی دھوپ میں دو کوس ٹپ ٹوئیاں مارتی جاتی۔ تمھارے خالو موٹر گاڑی تو چھوڑ نہیں گئے کہ مزے سے فراٹے بھرتے چلے جاتے ——— یہ موا نندو کمہار ایک حرام خور ہے۔ پیا رو ل بیٹیا۔ یوں یوں کو ٹھے مٹکا ناچلتا ہے کہ آپا تمھیں کیا بتاؤں اللہ قسم جوڑ جوڑ ہل گیا۔ ارے بہتیرا کہتی ہوں ——— مری پیٹھے ہوئے ہوئے۔ اسے وہ یاد ہے آیا۔ جب ہم چھوٹی چھوٹی تھیں تو ماموں میاں جی کے ہاں جایا کرتی تھیں۔ بھولا کمہار تھا ——— اے کیا رساں رساں سے جایا کرتا تھا۔ کہ بس نیند آ جائے یہ نہیں کہ جیسے جامنوں کی طرح جھکول کے رکھ دیا اور پھر دھوپ۔ چہ چہ۔ بڑا بول نہیں بولتی آتا پھر بھی کہوں گی کہ

حمیدہ : اوہ خدہ۔ تو بھی یہ بتائیے ناکہ پھر آپ نے دلہن دیکھی۔ اچھی لگی ——— گوری ہے۔ ———

خالہ : اے تو بتاتی ہوں۔ آپا ذرا ایک ٹکڑا پان کا دینا۔ بس بس بہت ہے۔ اے آپا کیا بتاؤں۔ ایسے کرارے پان تھے۔ تمھاری سمدھن نے کھلائے کہ جی خوش ہو گیا۔ میں تو یہی سوچتی رہی۔ ...

شفیق : حمیدہ بات سنو۔

حمیدہ : اچھا بھیا !

(جاتی ہے اور شفیق سے کہتی ہے)

بھیا۔ بس نہ جانے کیا کم بخت کماروں اور نائنوں کا ذکر کر رہی ہیں ——— بس آپ ذرا ٹھہریے۔

شفیق : ہم جا رہے ہیں۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔

حمیدہ : اچھا بھائی میرے بس ذرا ——— ہاں !

(جاتی ہے)

اماں : اے ہے۔ گرمی تو پیٹے جا رہی ہو۔ میں کہتی ہوں یہ تو بتا دو کیا کیا خاطر ہوئی ؟

خالہ : اونہوں۔ سارا منہ کٹ کے رہ گیا۔ خیر تھی۔ خیر ذرا سا چونا دے۔ نہیں وہ اللہ مارا کتھا۔ میت پڑے میری عقل کو

اماں : ہاں تو پھول پانی بھی ہوا ؟

خالہ . اے لو۔ ہوتا کیسے نہیں۔ تم سنتی تو جاؤ۔ خیر خدا خدا کرکے ڈولی پہنچی۔ کہار چلائے۔ بڑے مرزا صاحب کے یہاں سواریاں آئی ہیں۔ اے ہے۔ اب میں چپ۔ بدذات کہیں کا۔ یہ تجھ سے کس نے کہا تھا کہ گلا پھاڑ کے چیخ مار کر ——— آخر آیا جب اللہ رکھے بات چیت ہو رہی ہے تو پھر بھلا۔ بیٹی ذرا اگالدان دیجیو۔ موئی کیا کڑوی نیم پیک ہے۔ اخ تھو۔

(پیک تھوکتی ہے)

حمیدہ : ہائے اللہ یہ نہیں کہ ذرا دلہن کا بھی ذکر کریں۔

خالہ . خیر بھئی اب آدھ گھنٹہ لگ گیا۔ سامنے چبوترے کے نیچے موگرہ لدا کھڑا تھا۔ ایسا میرا جی لوٹا۔ کہ اسے کوئی پکی پکی چاند کلیاں توڑ دے۔ تم جانتی ہو آپا مجھے بھر بھر کے پھول پہننا اچھا نہیں لگتا۔ موا طباق سا منہ لگنے لگتا ہے۔ اللہ بخشے تمھارے بہنوئی سے ہمیشہ اسی بات پر چلی (حمیدہ ہائے اللہ کہتی ہے) کہ پھول پہنتی ہو تو ڈھنگ سے پہنو۔ یہ کیا دو دو کلیاں پڑ گئیں۔ مگر آپا بھئی مجھ سے تو یہ کبھی کانوں میں گٹھڑیاں باندھی گئیں اور نہ باندھی جائیں۔ کیوں کیا رائے ہے تمھاری ——— ؟

اماں : ہاں۔ مگر پھر بتاؤ۔ کہ اتریں تو ——— ؟

خالہ : ایلو۔ اترتی کیسے نہیں۔ معلوم ہے کون سے دروازے سے اتری۔ بیٹھک والے سے تھی ——— نا بہن میں نے تو کہہ دیا کہ ڈھال پہ اللہ مارے کہار کیسے چڑھیں گے۔ لے تم ہی بتاؤ یہ موا ڈیل اور یہ نفقتے کہار۔ ہاں بھولا کی اور بات تھی۔ اے آپا یاد ہے مجھے تمھیں اور منجھو کو لے کے کیا جھپا جھپ گھٹیا والی چچی کے یہاں لے جاتے تھے دوسرے بہن وہ موریاں اس دروازے پر پردہ ہے۔ ادھر سے اتر آؤ۔ ——— تو بندی تو

لوٹ آئی۔ ہاں آپا۔ سچ کہتی ہوں اور وہ سناتی سمدھن کو کہ

حمیدہ : ہنہ۔ میں نے جو ابھی بھائی کہا تھا تو ڈانٹ رہی تھیں اور خود جب سے سمدھن سمدھن کئے جا رہی ہیں۔ تو کچھ نہیں۔ مگر یہ تو بتائیے کہ

خالہ : اے ہے حمیدہ بیٹی۔ تو زبان تو بچ لو۔ ہاں کہ بولنا قسمت (شاید قیامت میں نے صرف سنا ہے یعنی نہیں معلوم) کر دیا ہے۔

حمیدہ : ہنک ہنک بھی خالہ بی تو ——

(شفیق پکارتا ہے۔ ذرا ڈانٹ کر۔)

حمیدہ : آئی بھیا۔

خالہ : اے میں کہتی ہوں (سوں سوں سونگھتی ہیں) اے ہے یہ ہانڈی کہاں جل رہی ہے۔

حمیدہ : اے ہے بھول آئی۔ اچھی خالہ بی ابھی آئی۔ میں جاؤں تب بتائیے گا کہ دلہن کیسی ہے۔

(آئی بھیا —— (شفیق سے)

حمیدہ : بھیا —— نہ جانے کیا بکے جا رہی ہیں۔ ایک بات بھی نہیں بتاتی دلہن کی وہ کم بخت نہ جانے کس کا رونا رو رہی ہیں۔

(جلدی جلدی ہانڈی چلاتی ہے)

شفیق : لاحول ولا قوۃ۔ یعنی۔ چہ۔

حمیدہ : اچھی میرے بھیا بس ذرا سی دیر اور —— اتنے میں آپ اخبار دیکھئے۔

شفیق : ارے اخبار تو تین دفعہ پڑھ چکا —— بئی ——

حمیدہ : آپ کو میری قسم بس ذرا دیر۔

(بھاگتی ہے جب آتی ہے تو خالہ بی کہہ رہی ہیں)

خالہ : ہاں تو یہ طریقے ہیں بڑے گھرانوں کے یہ تھوڑا ہی کہ بس تو چل میں آیا۔

حمیدہ : ہائے اللہ! خالہ بی ہم نہیں بئی۔ نہیں پھر سے بتائیے

خالہ : نہیں بی تمہارے سننے کی بات نہیں ہے۔

حمیدہ : کیوں۔ کیوں بی آخر بتائیے نا آنکھیں تو بڑی بڑی ہیں۔ ہم نے اور نوری نے شرط لگائی ہے کہ دلہن کی آنکھیں بڑی ہیں۔ کیوں خالہ بی۔ آنکھیں بڑی ہیں نا ؟

خالہ : اے بیٹی الٹی سیدھی تو نہ کو نہیں۔ ہاں تو آپا چار دن رکیں۔ لے پھر میرا جی تلملایا کہ جھٹ سے چار پانچ کلیاں توڑ لوں۔ پھر میں نے کہا سمدھن سے کہوں گی وہ اچھی پکی پکی تڑوا دیں گی۔ آخر کو پان پھول ہوں گے ہی۔ ـــــ خیر اللہ اللہ کر کے اتری ڈولی سے۔ اے ہاں۔ یہ ـــــ یہ دیکھو آپا۔ اللہ قسم ہم تم سے پجامہ رکھوالیں گے۔ اللہ جانے کور اچھا مرتھا ہم تمہارے بیٹے کے لیے بہو دیکھنے گئے تو یہ بڑا سا کھونٹا لگ گیا۔ میرا کلیجہ ہل کے رہ گیا کہ چالیس ہزار کا پٹا۔ اے آپا اندھیر ہے کہ نہیں اس دن پٹا لینے گئی تو سوا سو روپے گز اور موا اچھا کتنے کا کفن۔

حمیدہ : ہوں چاہے کتنے کفن پہنتے نہ ہوں۔ مگر۔

خالہ : (نہیں سنتیں) اب میں نے جھاڑو پھیرے بزاز کے منہ پر مارا ـــــ سوا روپے گز تو اچھا خاصہ تنزیب آتا ہے۔ میں نے رابعہ کے چلے پہ جوڑ اپنا بنایا تھا تو سوا سات روپے میں پجامہ پڑا تھا۔ اور اللہ قسم یہ موٹا روٹی سا کپڑا اور اب

اماں : اے چھمی سچ کہتے ہیں تیرے دولہا بھائی کہ ایک بات کرے گی تو ہزار پھلجھڑیاں لگائے گی اے ہاں نہیں تو۔ بتا۔ بھی چپک کر نگوڑی لونڈیا گھنٹہ بھر سے منہ تک رہی ہے۔

چھمی : اے آپا۔ سنتی جاؤ۔ ـــــ چہ ـــــ وہ ـــــ اے وہی اللہ ماری کیا ہوتی ہے وہ ـــــ وہ

(نہیں یاد آتا)

حمیدہ : ہم کہتے ہیں خالہ بی ـــــ اچھا بتائیے بال لمبے ہیں نا سلمہ باجی جیسے۔ اچھن آپا کہتی ہیں کہ نہیں۔

خالہ : اے تمہاری اچھن آپا بڑی سیدانی ہیں کہ دکھانہ بھالا اور ہلانے لگیں۔ نفرت ہے مجھے اچھن سے ——— سدا کی اترونی اے آپا وہ کرن پھول جھمکے کیا ساس نے چڑھا دیئے کے پٹی تلے پیر نہیں دھرتیں اور موئے ۰۰ ہیں کس کرم کے۔ نگوڑی پھلیاں اور نگوڑے مچھو سے مجھے تو پھوٹی آنکھ نہیں بھاتے۔

حمیدہ : تو سلمہ باجی جیسے بال ہیں نا۔ اور کیسی ہے؟

خالہ : اے میں کہتی ہوں آپا یہ سلمہ کے ایسے کیا لمبے بال ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کسی زمانہ میں ہماری آپا کے ایسے بال تھے کہ کیا بتایئے۔ گز بھر سے تو کیا کم ہوں گے۔ کیوں آپا؟

اماں : اے ہٹ۔ تو تو بس اندھیر کرتی ہے۔ میری چٹیا نگوڑی سدا کی چوہے کی دم ہزار جتن کیے پر نہ بڑھے۔

خالہ : اے ہاں خاک پڑے میری یاد کو سچ کہتی۔ نزنسہ نے تو ڈبو دیا ہاں تو منجھلی آپا کے تھے۔ اللہ بخشے کیا بال تھے۔ جب دھوتی تھیں تو مونڈھے پر بیٹھ کر دھوتی تھیں اور پھر بھی گز گز بھر زمین پر رُکتے تھے۔

اماں : اے ہے چھمی اندھیر کرتی ہو۔ اے نگوڑی منجھلی سدا کی روگی۔ اس بے چاری کے بال ہی کب ہوئے۔

خالہ : اے سچ تو ہے۔ اے آپا کیا ہو گیا ہے یہ مجھے؟ ——— ہاں لو یاد آیا۔ کہہ تو رہی علاج کیا اماں نے سانپ کی بانبی کی مٹی تک منگائی مگر خاک جو بڑھتے ہوں۔ اے یہ ہمارے لوگوں کے بال خاندانی اُجڑے ہوئے ہیں۔ آپا خدا بخشے سدا کے گنجے۔ خی۔

اماں : تو سچ ہوتے گنجے۔ اے دماغی کام کرنے سے بال سبھی کے اڑ جاتے ہیں۔

چھمی خالہ : ہاں! یہ بڑی کچھ بھی ہو۔ ہمارے تو بال ایسے ہی رہے۔ اور سچی بات ہے وہی اپنا سرسوں کا تیل اور کھلی السی سے دھویا۔ یہ مارے گئے ——— انگریزی تیل چھچھوندر کی بو کے اللہ جانتا ہے میری تو اس دن اسحاق کی دلہن ذرا دیر کو آن بیٹھی تو ناک سڑ کے رہ گئی۔ میں

نے تو کہہ دیا ہوا ۔ ــــــ

حمیدہ : اللہ ــــ بتا چکیئے نا۔ کہ دلہن کو دیکھا؟ پسند آئی آپ کو؟

خالہ : بچی میری اُترتے ہی تو انھوں نے مجھے دلہن دکھا نہیں دی۔ اور نہ میں ایسی دِوانی کہ مچل جاتی کہ دکھاؤ دلہن۔ دکھاؤ دلہن

حمیدہ : جبھی تو ہم کہتے تھے کہ اس سے ہم چلے جاتے۔ شفیق بھیا نے بھی کہا تھا۔

خالہ : (اطمن سے) تو تنو میری اب چلی جاؤ۔ اور اپنی میاں کو بھی ساتھ لے جاؤ ــــ نحی ــــ اور کیا ــــ اور دیکھ آئیں تو بڑی ناک کٹوا دے

اماں : چُپ رہ حمیدہ۔ اچھا تو پھر ؟

حمیدہ . گھنٹہ بھر ہو گیا ــــ ایک بات بھی دلہن کی نہیں بتائی۔ سارا دن تو انتظار میں مرتے رہے اور ــــ

خالہ : تم سارا دن مرتی رہیں۔ بیٹی تو ہم بھی بھری دوپہر یا میں گلی ڈنڈا کھیلنے نہیں گئے تھے۔ لڑکی ہی دیکھنے گئے تھے۔ اور ہی یہ کوئی مذاق تھوڑا ہی ہے کوئی گر سے بڑے خاندان کی لڑکی ہو تو اور بات تھی ــــ پر ــــ

حمیدہ : واہ ہم تو کہہ دیتے کہ ہئی ہم تو لڑکی دیکھنا چاہتے ہیں۔

خالہ : ہاں بچی! بنرا کیا ہے تو تو چھاتی پر چڑھ بیٹھتی کہ دکھاؤ اپنی لڑکی نہیں تو ــــ دابتی ہوں ٹینٹوا ــــ سو بچی نہ یہاں آتا لوتا اور نہ اماں باوا نے پہلوانی سکھائی ہاں اور کیا ــــ

اماں : اے چھچی تو بگڑنے کی کیا بات ہے میرے جی میں بھی کھد بد ہو رہی ہے۔ اگر تمھیں لڑکی پسند آ گئی تو بس میرے شفیق کو بھی آ جائے گی۔ مگر تم بتا چکو جب نا۔

شفیق : حمیدہ! ذرا ایک بات سنو۔

حمیدہ : آئی بھیا! ــــ ذرا چائے لے آؤں آپ کے لیے۔ ہاں خالہ بی تو آپ کو پسند ہے؟

خالہ ۔ مَیں کہتی ہوں اُنز کے سیدھی تو آئی دلان میں ۔ پہلے سمدھن ملیں وہ صوفیانہ پیازی دوپٹہ ـــــ اے آپا کیا چھینٹ تھی پجامے کی کہ بس مَیں تو دیکھتی رہی رہ گئی جیسے مکھن اور یہ ڈھیٹ کی ڈھیٹ ـــــ دلّی سے منگائی تھی ۔ ـــــ اب کہاں ملی جاسکے ہے ـــــ یہ نگوڑی لڑائی نے ساری چیزیں ـــــ

اماں : اُونہہ ـــــ ہاں تو ؟ اے چھوڑو سمدھن کو ـــــ پھر ـــــ

خالہ : اے آپا! تمھاری سمدھن تو بس اللہ میاں کی گائے بھی جاتی تھیں کہ قالین پر بیٹھو اور مَیں کہوں آپ بزرگ ہیں آپ بیٹھئے پھر مَیں ۔ اور سچ تو ہے آپا آج کل اللہ رکھے قالین پہ بیٹھا کس سے جائے ہے ۔ جیسے جلتے توے پہ بیٹھ گئے اور وہ بھی اُونی قالین ۔ ـــــ میرے تو دیکھتے ہی آبلے پڑنے لگے ۔ خیر مَیں تو چاندنی پہ کھسک آئی ۔ اے تم ہی بتاؤ کہ آخر ـــــ تھی ـــــ

حمیدہ : تو پھر دلہن کو لائیں وہ لوگ ـــــ کیسی ہے خالہ بی ؟

خالہ : نہیں بی ، ابھی کہاں دلہن کو لائیں ۔ پہلے تو اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں تب مَیں نے موقعہ پاکر ایسے کہا کہ چُپ رہ گئیں ۔ پہلے تو بولیں کیا دیکھو گی ایسی ہے اپنی بہنوں جیسی ۔

حمیدہ : بہنیں کیسی ہیں ؟ اچھی ہیں خالہ بی ؟

خالہ : اچھی خاک نہیں ـــــ ایک تو نگوڑی بیچاسی اور اس پہ اددا ددوٹھہ جی لوٹ گیا میرا تو ـــــ

حمیدہ : خیر ہوگی ـــــ رہیں اس سے ـــــ وہ دلہن ـــــ

خالہ : اور دوسری کا منہ ڈونگے کی وضع کا ـــــ

حمیدہ : اُونہہ ۔ بھلا یہ ڈونگے کی وضع کے منہ ، سے کیا کوئی سمجھے ۔ دلہن بتایئے ۔

خالہ : اے ہے حمیدہ کان کھا گئی ، کاہیں کاہیں ایک سان کان بھرے جا رہی ہے ۔ کہتی جاتی ہوں کہ بڑی مشکل سے تو لڑکی دکھانے پہ راضی ہوئیں ۔ کہنے لگیں اچھا پہلے ناشتہ کر

لیجئے پھر لڑکی بھی دکھا دی جائے گی۔

حمیدہ : تو پھر دکھائی ؟

خالہ : ناشتہ تھا آپا کہ پورا دسترخوان پٹا پڑا تھا۔ دال بھری پوریاں۔ شامی کباب۔ آلو میتھی کی بھجیا ـــــــ وہ مرچیں تھیں آپا کہ بس کیا بتاؤں۔ الو بھی ذرا اچھے رہ گئے تھے

حمیدہ : اُوفوہ بی !

خالہ : امرتیاں۔ گلاب جامن۔ موتی چور کے لڈو۔ میں نے تو بس چکھ چکھ کے چھوڑ دیئے بیٹی ذرا اگلدان دیجیو (تھوکتی ہیں) مُوا پان ہے کہ پیپل کا پتہ ـــــــ توبہ ـــــ

حمیدہ : ہاں تو پھر ناشتہ کے بعد ؟

خالہ : ہاں تو ناشتہ پر نمک پارے اچھے تھے اور خرمیاں تو آپا بالکل ویسی تھیں جیسی سلمہ کی منگنی پہ آئی تھیں۔

اماں : (جل کر) اسے خاک سلمہ کی منگنی پر لڈو بٹے تھے کہ خرمیاں۔ چھبن کی کہو۔

خالہ : ہاں چھبن کی منگنی پہ پھٹکی پڑے میری بھول ہے، ہاں تو میں نے دکان کا پتہ پوچھ لیا ہے

اماں : دُکان کا پتہ ؟

خالہ : ہاں اور کیا ـــــــــ اور بندی نے یوں تھوڑی پوچھا۔ بڑی حکمت سے پوچھا کہو کیسے ؟

حمیدہ : بی ہمیں دکان دکان کا پتہ نہیں چاہئیے ہمیں تو دلہن کی صورت

خالہ : خاک پڑے تمھاری جلدی پہ کہ کان کاٹ لیتی ہو۔ بیٹی یہ گن کنواری لڑکیوں کے ایک آنکھ نہیں بھاتے۔

حمیدہ : ہونے دیجئے ہمارے گن ـــــ یہ بتایئے دلہن کیسی ہے ؟

اماں : چُپ رہ حمیدہ۔ ہاں چھمی اب تو خدا کے لیے چوٹھے میں ڈال ان خرمیوں کو اور بھاڑ میں گئی دکان۔

خالہ : (منہ بنا کر) اے تو آپا میں نے تو تمھارے ہی بھلے کو خرمیوں کا پتہ پوچھ لیا۔ اب کچھ منگنی کروگی تو کچھ لے جانا نہ پڑے گا؟ اللہ قسم کہتی ہیں۔ پانچ من تو معلوم بھی نہ ہوگی ماشاء اللہ لمبا چوڑا کنبہ ہے سسرال میکہ اور پاس پڑوس سات من سے کم نہ لیں گی۔ میں نے کہا بیوی ہم کوئی چھپر سے ہیں کہ خرمیوں کے لیے وہ کریں۔

حمیدہ : آگ لگ جائے ان خرمیوں کو۔ ہاں نہیں تو۔

خالہ : آگ لگ جائے تیری زبان کو کہ —— وہ مجھے کیا سمجھا ہے۔ واہ۔

حمیدہ : تو جب سے خرمیوں کا رونا رو رہی ہیں۔ یہ نہیں بتاتیں کہ دلہن کیسی ہے۔

خالہ : جا نہیں بتاتے۔ کچھ بتا دیا کھاتے ہیں۔ لو اور سنو بڑی آئی وہاں سے دلہن کی چہیتی کہ بات نہیں کرنے دیتی۔

اماں : اے سچ تو ہے گھنٹہ بھر سے میرا تو جی بھی لوٹ گیا۔

خالہ : آپا تم بھی اس فتنی کی طرف داری کر رہی ہو واہ۔ واہ۔ واہ !

حمیدہ : اس میں طرفداری کی کیا بات ہے۔ ذرا سی بات ہے اور آپ بتا ہی نہیں سکتیں۔ کئی دفعہ شفن بھیا کو روک کر آئی ہوں وہ جانے کو بیٹھے ہیں اور آپ ہیں کہ کبھی ڈولی کا رونا تو کبھی ناشتہ تو کبھی خرمیاں۔

خالہ : (بہت بگڑ کر) اب دیکھو تو آپا ٹمانک برابر کی چھوکری میرے منہ لگ رہی ہے واہ !

اماں : ارے پھر تم بھی تو اندھیر مچا رہی ہو چپ رہ ری حمیدہ !

حمیدہ : مے کے دماغ ہلا دیا ہاں نہیں تو

خالہ : آئی بڑی دماغ کی سگی۔ لو ہم کل کی لونڈیا کی جوتیاں سہیں گی۔ سلام ہے بابا اس کنبے کو۔ اللہ میرے جیٹھ دیور کو سلامت رکھے کوئی تمھاری روٹیوں پہ نہیں پڑی ہوں۔ اور اماں جان شہ دے رہی ہیں صاحبزادی کو ——

اماں : اے چھٹی ناحق غصہ ہو رہی ہے تو —— سن تو

خالہ : (جانے لگتی ہے) بس بس سن لیا۔ کیا اور کچھ کسر باقی رہ گئی ہے۔ کیا سمجھا ہے مجھے (روہانسی

رہ جاتی ہے) سلام آپا تمھارے گھر میں قدم بھی رکھوں تو چھی نہیں بھنگن کتنا ۔ ابھی تو باتیں ہی سُنی ہیں آگے نہ جانے کیا لکھا ہے قسمت ہیں ۔

اماں اے چھمی تجھے میری قسم میرا ہی مرا ہی منہ دیکھے سن تو ۔

خالہ : نہیں بی ! مَیں ایسی گری پڑی نہیں ۔ جو جس کا جی چاہے کہہ دے ۔

اماں : اے چھمی ۔ چھمی ۔ اے حمیدہ روک خالہ کو ۔ دیکھا بگڑ کر چلی گئی ۔ بس تُو تو بلا ہے ۔

حمیدہ : چلی گئیں تو اچھا ہُوا ———— اماں سر گھوم گیا ۔ اللہ قسم ———— وہ تو دس برس بھی نہ بتاتیں کہ دلہن کیسی ہے ۔

اماں : اے ذرا تو صبر کرتی تو شاید بتا ہی دیتی ۔

حمیدہ : آپ بھی مجھی کو الزام دے دیجیئے ہاں اور کیا ۔ بھیا آئیں گے تو ———— ہائے اللہ

اماں : نہ رو حمیدہ ———— ہم کل خود جا کر دیکھ آئیں گے کہ کیسی ہے دلہن ———— نہ رو بیٹو ————

(حمیدہ سسکیوں سے روتی ہے اور اماں دلاسہ دیتی ہے)

پردہ

○

سُرخ فیتہ

قدرت اللہ شہاب

کردار

سیکرٹری
جائنٹ سیکرٹری
ڈپٹی سیکرٹری
انڈر سیکرٹری
اسسٹنٹ سیکرٹری
سپرنٹنڈنٹ

مقام

کانفرنس روم
وقت
صبح دس بجے

منظر

ایک سرکاری دفتر کا کمرہ

سیکرٹری: میرے خیال میں کارروائی شروع ہونی چاہیے۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صاحب آپ کیس کو وضاحت سے بیان فرمائیے۔

سپرنٹنڈنٹ: یس سر۔ یس سر! جناب کو غالباً یاد ہوگا کہ جب ٹائپسٹ کلرک مس سلیمہ کی تقرری زیرِ غور تھی تو خاکسار نے بصد ادب و احترام عرض کیا تھا کہ شاید یہ تجربہ مہنگا پڑے۔ ذاتی طور پر یہ نابکار آزادی نسواں کا مخالف نہیں۔ بلکہ میں نے ہفتہ وار "جلترنگ" اور ماہنامہ "پروانہ" میں حقوق نسواں پر بڑے معرکے کے مضامین لکھے ہیں۔ اگر جناب والا ارشاد فرمائیں تو ان کے تراشے پیش کروں! اتفاق سے میری جیب میں چلے آئے ہیں۔

جائنٹ سیکرٹری: یہ بات موضوع سے دور ہے۔ آپ محض کیس بیان کیجئے۔

سپرنٹنڈنٹ: یس سر جی ہاں! میں گذارش کر رہا تھا کہ ذاتی طور پر خاکسار آزادی نسواں کا مخالف نہیں لیکن اصولی طور پر دولت خداداد پاکستان میں۔

سیکرٹری: آپ اصولی بحثوں سے برکنار رہنے کی کوشش کیجئے۔ ہم صرف کیس سننا چاہتے ہیں۔

اسسٹنٹ سیکرٹری: اور جناب اس کے علاوہ سرکاری ملازمتوں میں عورتوں کا تناسب بحوالہ سرکلر نمبر ۲۵۲۴ الف مورخہ ۶ دسمبر ۱۹۴۷ء مقرر ہو چکا ہے اب اس موضوع پر کسی قسم کی اصولی بحث کرنا غیر مناسب ہے۔ اگر جناب ضروری خیال فرمائیں، تو سرکلر مذکورہ پیش کیا جائے

انڈر سیکرٹری: میرے خیال میں سرکلر پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ایسا اہم سرکلر تو سب کو ازبر ہونا چاہیے۔ افسوس تو یہ ہے کہ حکومت کے احکام پر مناسب عمل نہیں کیا جاتا۔ ورنہ اب تک دفتروں میں حسین چہروں ———— میرا مطلب ہے، صنفِ نازک کو اپنا جائز حصہ مل چکا ہوتا۔ جناب میں سمجھتا ہوں کہ بہ پیش نظر کیس کی سماعت کے وقت مس سلیمہ کو بھی اس میٹنگ میں موجود ہونا چاہیے۔

اگر کوئی اعتراض نہ ہو تو اُسے بلا بھیجا جائے۔

ڈپٹی سیکرٹری: انڈر سیکرٹری کی رائے نہایت معقول ہے۔ قانونی لحاظ سے اس کیس سے متعلقہ سب لوگوں کو یہاں موجود ہونے کا حق پہنچتا ہے۔

جائنٹ سیکرٹری: یہ دلیل بعید از موضوع ہے۔ ہم ایک محکمانہ معاملے پر غور کر رہے ہیں اور محکمانہ کارروائیاں عدالتی اصولوں کی پابند نہیں ہیں۔

سکرٹری: میرا رجحان بھی جائنٹ سیکرٹری کی رائے سے متفق ہونے کی طرف آمادہ ہے۔ ویل، سپرنٹنڈنٹ صاحب بیان جاری رہے۔

سپرنٹنڈنٹ: جناب غلام گزارش کر رہا تھا کہ خاکسار کی مودبانہ گزارشات کے باوجود جب مس سلیمہ کی تقرری منظور ہو گئی، تو میں نے عرض کی تھی کہ کم از کم اسے میرے سیکشن میں تعینات نہ کیا جائے۔ حضور جانتے ہیں کہ میرے سیکشن میں پہلے ہی سے عجیب عجیب مخلوط عناصر بھرے ہوئے ہیں جو کام کی نسبت باتیں اور جھگڑے زیادہ کرتے ہیں مثلاً ناصر علی تیرا جو ہونے کو تو بل کلرک ہے لیکن اندر ہی اندر شاعر بھی ہے اور فائلوں پر اپنی نظموں کی مشق کرنے کا عادی ہے کبھی ہتھوڑے پر نظم، کبھی درانتی پر غزل کبھی سڑک کوٹنے والے انجن کی شان میں قصیدہ۔ اللہ اللہ! یہ بھی کیا زمانہ آیا ہے حضور! ورنہ شاعری جیسی صنف لطیف کو ان بھونڈے مضامین سے کیا واسطہ۔ وہ مرزا اسد اللہ خاں غالب نے فرمایا ہے ع

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

جائنٹ سیکرٹری: براہ مہربانی آپ شاعری سے ہٹ کر کیس پر رہیے۔

سیکرٹری: مجھے اس بات سے قطعی اتفاق ہے۔ ویل!

سپرنٹنڈنٹ: اور جناب میرے سیکشن میں ناصر علی تیر کے علاوہ وہ خبطی، سودائی نصرت اللہ خیال بھی ہے جو اپنے آپ کو دور حاضر کا بہترین نثر نگار سمجھتا ہے۔

انڈر سیکرٹری: میرے خیال میں آپ اپنے سیکشن کا تجزیہ کرنے کی بجائے مس سلیمہ کے متعلق باتیں کرتے

جائیں تو بہتر ہوگا۔

ڈپٹی سیکرٹری: انڈر سکرٹری کا مطلب ہے کہ آپ اپنی گفتگو کو کیس کے موضوع سے بہت دور نہ جانے دیجئے۔ مجھے اس خیال سے پورا اتفاق ہے۔

سپرنٹنڈنٹ: جی ہاں! بے شک۔ میں عرض کر رہا تھا کہ میرے سیکشن میں پہلے ہی سے مخلوط العناصر مخلوق کی کھچڑی پکی ہوتی تھی۔ اس پہ طرہ یہ کہ مس سلیمہ بھی پوسٹ ہوئی تو اسی سیکشن میں میرے ناچیز خیال میں تنظیمی لحاظ سے یہ ایک غلطی تھی۔

اسسٹنٹ سیکرٹری: حکومت کے منظور شدہ احکامات پہ نکتہ چینی کرنے سے سپرنٹنڈنٹ کو باز رہنا چاہیئے۔

سپرنٹنڈنٹ: جی ہاں! بہت خوب! میں معافی چاہتا ہوں۔ چنانچہ جناب عالی، مس سلیمہ کے آنے پر میرے سیکشن میں گڑبڑ اور بھی زیادہ بڑھ گئی اور باوجودیکہ

اسسٹنٹ سیکرٹری: کیا مطلب؟ یعنی آپ کے سیکشن میں ہمیشہ کچھ گڑبڑ موجود تھی؟ تنظیمی لحاظ سے یہ اقبال قابل غور ہے۔

انڈر سیکرٹری: میرے خیال میں سپرنٹنڈنٹ صاحب کو ایڈمنسٹریشن کا خاطر خواہ تجربہ نہیں۔ کسی سیکشن میں گڑبڑ کا احتمال تک قابل گرفت ہونا چاہیئے چہ جائیکہ گڑبڑ ہوا اور پھر ہمیشہ سے ہو؟

ڈپٹی سیکرٹری: سپرنٹنڈنٹ صاحب یہ فرمائیے کہ آپ اس پوسٹ پر کب سے مقرر ہیں؟ اور آپ کی سروس کے پچھلے تجربات کیا ہیں؟

سپرنٹنڈنٹ: جی حضور! میں معافی کا خواستگار ہوں۔ دراصل میری گزارش کا مطلب یہ تھا کہ

ڈپٹی سیکرٹری: آپ اپنا مطلب چھوڑیئے اور فی الحال میرے سوالوں کا جواب دیجئے۔

سپرنٹنڈنٹ: جناب عالی! خاکسار نے ۱۹۲۵ء میں آگرہ یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ حسن اتفاق سے اسی سال مسٹر جان ایٹن صاحب بہادر سپرنٹنڈنٹ ہوم ڈیپارٹمنٹ حکومت ہند اپنی میم صاحبہ کے ہمراہ تاج محل کی زیارت کرنے آگرہ تشریف لائے۔ خداوند ذوالجلال دونوں کو غریق رحمت کرے۔ بڑی خوبیوں کے لوگ تھے جن میرت سے مالامال۔ رحمدل۔ غریب پرور

تاج محل کے باہر ان کے تانگے کا گھوڑا اپد کنے لگا۔ میں کلو نیواڑی کی دکان کے سامنے بیٹھا بیڑی سلگا رہا تھا۔ ان دنوں کلو نیواڑی کی دکان تاج محل کے عین سامنے والے

جائنٹ سیکرٹری: مجھے شک ہے کہ انتظامی نااہلیت کے علاوہ اس سپرنٹنڈنٹ کو ضرورت سے زیادہ باتیں کرنے کا بھی مرض ہے یہ دونوں نہایت سنگین نقائص ہیں۔ اگر ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی بنیادوں کو اس قسم کی نااہلیت اور باتونیت پر استوار کیا جا سکتا ہے تو یقیناً ہم جنت الحمقا میں بستے ہیں میرے خیال میں اس سپرنٹنڈنٹ کی اہلیت کا جائزہ لینے کے لیے مکمل انکوائری کی ضرورت ہے

سیکرٹری: مجھے اس رائے سے حرف بحرف اتفاق ہے۔ نااہلیت کو دیدہ دانستہ برداشت کرنا قومی غداری کے مترادف ہے۔ ویل سپرنٹنڈنٹ صاحب! آپ جا سکتے ہیں یہ فائل یہیں چھوڑتے جایئے۔

(سپرنٹنڈنٹ جاتا ہے)

سیکرٹری: میرے خیال میں اس سپرنٹنڈنٹ کے کام، تجربے اور دیگر کوالی فیکیشنز کا جائزہ لینے کے بعد میرے پاس ایک مفصل نوٹ پیش ہونا چاہیئے۔

جائنٹ سیکرٹری: (ڈپٹی سیکرٹری سے) آپ اس انکوائری کو اپنی ذاتی نگرانی میں نہایت احتیاط کے ساتھ منعقد کریں۔

انڈر سیکرٹری: (اسسٹنٹ سیکرٹری سے) اگر اس معاملے میں آپ کو میری مدد کی ضرورت پڑے تو بلا تکلف مجھے بتا دیجیئے گا

اسسٹنٹ سیکرٹری: بہت خوب! لیکن اب مسئلہ یہ کہ آگے جانچ کیا جائے؟

انڈر سیکرٹری: شاید یہ بہتر ہوگا کہ سپرنٹنڈنٹ کی غیر موجودگی میں کیس پر روشنی ڈالنے کے لیے مس سلیمہ کو یہاں بلا لیا جائے۔

جائنٹ سیکرٹری: جیسا کہ فیصلہ ہو چکا ہے مس سلیمہ کو اس میٹنگ میں بلانے کے لیے کوئی معقول وجہ نہیں ہے اسسٹنٹ سیکرٹری ہی فائل سے کیس پر روشنی ڈال سکتا ہے۔

سیکرٹری : میں جائنٹ سیکرٹری کی رائے کے ساتھ اپنے اتفاق کو دہراتا ہوں۔ ویل۔ ویل کیپ بیان کرو۔

اسسٹنٹ سیکرٹری : جناب شکایت کا لب لباب یہ ہے کہ کلرک ناصر علی تبسم جو اندر ہی اندر شاعر بھی ہے
دفتر میں بیٹھ کر اپنی نظمیں گنگنانے کا عادی ہے اس کی نظم پر سپرنٹنڈنٹ صاحب کو شدید اعتراض
ہے ان کا خیال ہے کہ اس نظم کے پہلے حصے میں مس سلیمہ کی طرف رومانی اشارات ہیں اور یہ
ایک اخلاقی جرم ہے۔ دوسرے حصے میں حکومت پر حملہ ہے جو ایک قانونی جرم ہے اور اس
کے علاوہ ایک ادبی جرم ہے کہ نظم سر سے پاؤں تک بے قافیہ و بے ردیف ہے۔

ڈپٹی سیکرٹری : جہاں تک سپرنٹنڈنٹ صاحب کے ادبی اعتراضات کا تعلق ہے انھیں موضوع
بحث سے الگ رکھنا چاہیے۔

انڈر سیکرٹری : میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ مس سلیمہ کے متعلق رومانی اشارات منظوم کرنا کوئی جرم نہیں
البتہ اگر مس سلیمہ کو خود کوئی وجہ شکایت ہو۔ تو دوسری بات ہے۔ اس لیے شروع ہی سے
میرا یہ خیال رہا ہے کہ مس سلیمہ کی رائے معلوم کرنے کے لیے اسے اس میٹنگ میں بلانا حد درجہ
مناسب ہوگا۔

جائنٹ سیکرٹری : مجھے افسوس ہے کہ ہم پیش از مرگ واویلا کر رہے ہیں نظم سننے سے پہلے اس کے متعلق
کوئی رائے قائم کرنا ایک مہمل سی بات ہے۔

سیکرٹری : بالکل ٹھیک - میری رائے کا پلڑا بھی اسی طرف جھکنے کی طرف مائل ہے - ویل اسسٹنٹ
سیکرٹری صاحب آپ نظم بیان فرمائیے۔

اسسٹنٹ سیکرٹری : جناب نظم کا عنوان ہے " سرخ فیتہ " عرض کیا ہے :-

تو نے جب کھایا پان
تیرے ہونٹوں پہ لگا فیتۂ سرخ -

جان جاں

شوخ جاں

تیری آنکھوں میں گلابی ڈورے
تیرے گالوں پہ وہ غازے کی بہار
تیرے حلقوم کی شہ رگ میں مچلتا سا، چھلکتا سا، لپکتا سا ہوا گرم لہو
تیری شلوار پہ ریشم کا رین
تیرے پُرپیچ غرارے پہ گلابی سی حنائی سی کشیدہ کاری
ہیہات!
تجھ پہ موقوف ہے کیا؟
جانِ جاں
جانِ جہاں
سُرخ فیتے میں بندھی رہتی ہے سرکار مری!
اس میں حاکم بھی ہیں، محکوم بھی ہیں
خانم بدہن
اس میں ظالم بھی ہیں مظلوم بھی ہیں
اس کے ہر پیچ میں پوشیدہ ہے اک دار و رسن
اس کے پھندے میں لٹکتی ہے، جھٹکتی ہے ادا پھانسی کی۔
جس میں سر ڈال کے آہ
مر گئی فائل میری!

انڈر سیکرٹری: واہ وا، واہ وا، سبحان اللہ! کیا خوب کہا ہے۔ ظالم نے واہ وا۔
ڈپٹی سیکرٹری: بہت خوب! بہت خوب، جیسے ن۔م راشد کا کلام۔
انڈر سیکرٹری: میرے خیال میں فیض کا رنگ بھی غالب ہے "تیری آنکھوں میں گلابی ڈورے"
تیرے گالوں پہ وہ غازے کی بہار واہ وا، واہ وا۔

ڈپٹی سیکرٹری: کچھ کچھ میراجی کا اثر بھی نمایاں ہے ——— تیرے حلقوم کی شہ رگ میں مچلتا سا، چھلکتا سا، لپکتا سا ہوا گرم لہو! آہا! اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

جائنٹ سیکرٹری: کیا آپ صاحبان داد دے چکے۔

انڈر سیکرٹری: جی صاحب! ہم کیا اور ہماری داد کیا ——— میں نے کہا، آپ نے غور فرمایا، کہ ہمارے دفاتر کی گدڑیوں میں کیسے کیسے لال پوشیدہ ہیں! مجھے یقین ہے کہ جب تک حکومت خود ان گنج ہائے گراں مایہ کو تلاش کرکے . . . .

جائنٹ سیکرٹری: مجھے ڈر ہے کہ یہ حکمانہ کارروائی مجلس مشاعرہ کی صورت اختیار کرتی جا رہی ہے

سیکرٹری: میں خود بھی محسوس کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ صاحبان! ہمیں سنجیدگی کا دامن پکڑنا چاہیے اس کے بغیر امورِ سلطنت بعنوان شائستہ طے نہیں کئے جا سکتے۔

انڈر سیکرٹری، ڈپٹی سیکرٹری: بہت خوب، جناب!

سیکرٹری: ویل، اسسٹنٹ سیکرٹری صاحب!

اسسٹنٹ سیکرٹری: جناب سپرنٹنڈنٹ صاحب کو شکایت ہے کہ نظم کے پہلے آٹھ مصرعوں میں مس سلیمہ پر اشارات ہیں اور باقی حصے میں سرکار والامدار کے نظام کارکردگی کی شان میں گستاخی ہے۔

انڈر سیکرٹری: کیا اس نظم میں کسی جگہ مس سلیمہ کا نام آیا ہے؟

اسسٹنٹ سیکرٹری: جی نہیں، تو

انڈر سیکرٹری: اس صورت میں یہ شکایت بے بنیاد ہے۔

ڈپٹی سیکرٹری: اور اگر مس سلیمہ کو یہ خوش فہمی ہے کہ نظموں میں اس کے سوا اور کسی خوبصورت لڑکی کا ذکر نہیں ہو سکتا۔ تو اس وہم کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں۔

انڈر سیکرٹری: اس کے علاوہ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ اشارہ مس سلیمہ کی طرف ہے تو پہلے ہمیں ان امور پر تحقیقات کرنا ہو گی کہ کیا وہ پان کھاتی ہے؟ کیا پان کھانے کے بعد اس کے ہونٹوں پر سرخ فیتے سے لہرانے لگتے ہیں؟ کیا اس کی آنکھوں میں گلابی ڈورے ہیں، کیا اس کے گالوں پہ غازے کی بہار

ہوتی ہے ؟ کیا وہ ایسی شلوار پہنتی ہے جس کے پائنچوں پر سرخ ربن لگا ہو ؟ کیا اس کے غرارے پر ریشم کے پھول ہوتے ہیں ؟

جناب عالی : میں بصد ادب و احترام گزارش کروں گا کہ جب تک ہم مس سلیمہ کو سامنے بٹھا کے ان اُمور کا مفصل جائزہ نہ لیں ۔ ہماری انکوائری پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتی ۔ کم از کم انصاف کا تقاضا تو یہی ہے ۔

ڈپٹی سیکرٹری : بالکل درست ہے ۔ لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ ہمارے دفاتر میں مس سلیمہ کے علاوہ اور بھی ایسی لڑکیاں ہوں جو پان کھاتی ہوں جن کے گالوں پہ غازے کی بہار ہو جن کی آنکھوں میں گلابی ڈورے ہوں ۔

جائنٹ سیکرٹری : مجھے اس نکتے سے معقولیت کی بُو آتی ہے ۔

سیکرٹری : میرا خیال ہے کہ میں بھی یہی سونگھ رہا ہوں ۔

انڈر سیکرٹری : جناب ! اس صورت میں مَیں یہ تجویز پیش کرنے کی جرأت کروں گا کہ مزید انکوائری کے لیے ایک بین الوزارتی میٹنگ منعقد کی جائے ۔ اور اس میں سب محکموں میں کام کرنے والی لڑکیوں کو بھی طلب کیا جائے ۔

جائنٹ سیکرٹری : مَیں سمجھتا ہوں کہ اس کی بھی چنداں ضرورت نہیں ۔ لیکن جناب ! جو خیال مجھے دِق کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ یہ نظم مس سلیمہ بائسی اردو فتری لڑکی کے متعلق ہے تو کیا ہم کسی قسم کا ایکشن لینے کے مجاز ہوں گے

اسسٹنٹ سیکرٹری : جناب ! کیس کے اس پہلو پر فی الحال غور نہیں کیا گیا ۔ میرا خیال ہے انکوائری مکمل ہونے کے بعد ایکشن تجویز کرنا مشکل کام نہ ہوگا ۔

سیکرٹری : بہت خوب ! آپ گاڑی گھوڑی کے آگے باندھنے کے شوقین نظر آتے ہیں ، کیا مَیں دریافت کر سکتا ہوں کہ اس کیس پر ابتدائی کارروائی کا ذمہ دار کون ہے ؟

اسسٹنٹ سیکرٹری : جناب ! ابتدائی کارروائی اس خاکسار نے مکمل کی تھی ۔

سیکرٹری : مجھے نہایت افسوس سے یہ اعلان کرنا پڑتا ہے کہ آپ نے اس قسم کا مبہم اور ناپختہ کیس ابتدا

پر رہلمد کہ ہم سب کا وقت ضائع کیا ہے اگر آپ سمجھتے ہیں کہ حکومت کے قیمتی وقت کو یوں ضائع کر کے آپ ملک اور قوم کی خدمت سر انجام فرما رہے ہیں تو بے شک آپ کسی شدید مجرمانہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ ہمیں آپ کی صلاحیتوں کا از سر نو جائزہ لینا ہو گا۔ اسسٹنٹ سکرٹری صاحب آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔ یہ فائل یہاں چھوڑ جائیے۔

(اسسٹنٹ سیکرٹری جاتا ہے)

سیکرٹری: (جائنٹ سیکرٹری سے) آپ اسسٹنٹ سیکرٹری کی صلاحیتوں کا بغور جائزہ لے کر مجھے ایک تفصیلی نوٹ ارسال فرمائیں تو مشکور ہوں گا۔

جائنٹ سیکرٹری: (ڈپٹی سکرٹری سے) آپ اس کام پر اپنی خاص توجہ صرف کیجئے۔

ڈپٹی سیکرٹری: (انڈر سکرٹری سے) اگر آپ کو کسی پوائنٹ پر میری مدد کی ضرورت محسوس ہو تو بلا تکلف فرما دیجئے۔

انڈر سیکرٹری: بہت خوب۔ جناب۔ کیا اب مس سلیمہ کا کیس مزید بیان کیا جائے۔

جائنٹ سیکرٹری: میں سمجھتا ہوں کہ یہ ناچیز کیس محض تضیع اوقات ہے میری رائے میں اسے داخل دفتر کر دیا جانا چاہئے۔

سیکرٹری: میں محسوس کرتا ہوں کہ میری رائے کا پلڑا بھی اس تجویز کے حق میں جھکا ؤ کی طرف مائل ہونے پر آمادہ ہے۔

پردہ

○

سرائے کے باہر

کرشن چندر

کردار

اندھا بھکاری

منّی : اندھے بھکاری کی ایک نوجوان لڑکی

بھکارن : اندھے بھکاری کی بیوی۔

جانی لنگڑا : ایک چالاک پرفن بھیک منگا

ایک آوارہ شاعر

سرائے کا مالک

بی بی : سرائے کی نوکرانی

چند شکاری اور اُن کی بیویاں

پہلا منظر

(ایک پہاڑی قصبے کی سرائے کے دروازے پر۔ دروازے سے چند گز کے فاصلے پر اندھا بھکاری اور اس کی بیوی آلاؤ پر بیٹھے آگ تاپ رہے ہیں۔ منّی سرائے کے بڑے دروازے پر کھڑی سرائے کی نوکرانی سے باتیں کر رہی ہے ۔)

منّی : بی بی۔ کچھ کھانے کو دو گی؟ صبح سے بھوکی ہوں ۔

بی بی : پرے ہٹ مردار۔ کیوں اندر گھسی چلی آتی ہے۔ جا کسی مشٹنڈے کی بغل میں بیٹھ اور چین سے رہ۔ تیری جوانی کو آگ لگے ۔

منّی : بی بی! کیوں ناحق گالی دیتی ہو ؟

بی بی : گالی۔ اری دو ٹکے کی بھکارن تجھے بھی لگتی ہے۔ اسے بہے میری قسم کی ماری لاجونتی دن بھر دیدے مٹکاتی پھرتی ہے اور سرائے کے مسافروں کو تاکتی پھرتی ہے اور اب رات کے وقت بڑی معصوم، بڑی شریف، بڑی دہ ، اُونہہ چڑیل ۔

منّی : بی بی۔

بی بی : بی بی کی بچی! اری اگر میں تجھے گالی دیتی ہوں تو اُس کے بدلے تجھے کھانا بھی تو دیتی ہوں تجھے اور تیرے بوڑھے بھکاری باپ کو اور تیری ماں چڑیل کٹنی کو۔ دو گالیوں میں کیا بسوا جھنڈ گا ہے مجھے دیکھ اس سرائے میں صبح سے لے کر شام تک جھوٹے برتن مانجھتی ہوں، کنوئیں سے پانی نکالتی ہوں، مالکن اور مالک کی سو سو خوشامدیں کرتی ہوں اور ——— اچھا دیکھ اس وقت مجھے نہ ستا، مسافر خانے کے اندر اس وقت بہت لوگ جمع ہیں، مجھے کیوں کی دیکھ بھال کرنی ہے جب یہ لوگ کھانا کھا چکیں گے، اس کھڑکی کی طرف آ جائیو اور جو کچھ تیری قسمت میں ہوگا لے جائیو۔

اری دیکھا اب ان موٹے موٹے دیدوں میں آنسو نہ چھلکا ہائے رام، ان فقیروں نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے۔ میں مالکن سے کہتی ہوں کہ ان بھک منگوں کو کم از کم سرائے کے باہر میں دروازے پر تو جمع ہونے نہ دیا کرے۔

(سرائے کے دروازے بند کر دیتی ہے)

بھکارن: منّی!

منّی: آئی اماں۔

بھکارن: کیا ہوا منّی۔

(وقفہ)

اندھا بھکاری: منّی، بیٹیا بڑی بھوک لگی ہے۔

منّی: تو مجھے کھا لو۔ ابا، بھوک لگی ہے، جب سنو بھوک لگی ہے، جانے یہ پیٹ ہے کہ بلا کبھی بھرتا ہی نہیں، اُدھر بی بی الگ گالیاں دیتی ہے اور ادھر یہ میری جان کو کھائے جاتے ہیں۔ بھوک لگی ہے، تو میں روٹی کہاں سے لاؤں، بی بی کہہ گئی ہے کہ جب کھڑکی کھلے گی، جب روٹی ملیگی۔

اندھا بھکاری: کھڑکی کب کھلے گی؟

منّی: جب مسافر کھانا کھا چکیں گے۔

اندھا بھکاری: مسافر کب کھانا ختم کریں گے۔

منّی: جب کھڑکی کھلے گی۔

اندھا بھکاری: جب کھڑکی کھلے گی ——— کب کھڑکی کھلے گی؟ میں نہیں جانتا، میں کچھ نہیں جانتا، منّی تو کیا کہہ رہی ہے۔ ——— جب سے میری آنکھوں میں روشنی نہیں رہی مجھے وقت پر بھیک کی روٹی بھی کوئی نہیں لا دیتا۔ منّی کی اماں کیا تمھارے پاس تھوڑی سی روٹی بھی نہیں ہے ——— ہاں نہیں ہوگی۔ ——— میں اندھا ہوں ——— بوڑھا ہوں ——— اپنی گستاخ بیٹی کا محتاج ہوں۔

بھکارن : صبر کرو، اب تھوڑی دیر میں بی بی کھڑکی کھولے گی، پھر تمھیں پیٹ بھر کر کھانا ملے گا۔ آج سرائے میں بہت سے مسافر آئے ہیں، میں تو ہر روز دعا مانگتی رہتی ہوں کہ سرائے مسافروں سے بھری رہے تاکہ ان کی پلیٹوں سے بہت سا جھوٹا کھانا ہمارے لیے بچ جایا کرے۔

منی : لیکن اماں! بعض مسافر تو اتنے پیٹو ہوتے ہیں کہ پلیٹیں بالکل صاف کر دیتے ہیں اور کھانا تو ذرا بھی نہیں بچتا۔ ایسے موقع پر اگر بی بی سچ مچ مہربان نہ ہو تو

بھکارن : بُری باتیں نہ منھ سے نکال وہ سب کا والی ہے ۔ توبہ، توبہ! آج کتنی سردی ہے، یہ تیز برفیلی ہوا جسم کو چیرے جاتی ہے، منی آگ ذرا تیز کر دے۔

(الاؤ کی لکڑیاں ادھر اُدھر کرتی ہے)

منی : یہ چیڑھ کی لکڑیاں دھواں زیادہ دیتی ہیں، آگ کم۔

بھکارن : تو جنگل سے کاؤ کی لکڑیاں چن لایا کرو۔ میں نے تجھے کئی بار سمجھایا ہے۔

منی : ہاں کاؤ کا جنگل بہت گھنا ہے مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے۔

بھکارن : باؤلی ہوئی ہے، ڈر کاہے کا؟

اندھا بھکاری : منی! دیکھا بھی کھڑکی کھلی کہ نہیں، یہ کون آ رہے ہیں؟

منی : مسافر ہیں، سرائے کے اندر جا رہے ہیں، اچھا میں جا کر کھڑکی کے پاس کھڑی ہوتی ہوں، ابا امید ہے کہ اب کے کچھ نہ کچھ ضرور ہی ہوگا۔

(چلی جاتی ہے)

بھکارن : تم نے سنا منی کو کاؤ کے جنگل میں لکڑیاں چنتے ڈر لگتا ہے

اندھا بھکاری : ہاں منی جوان ہو گئی ہے۔

بھکارن : تم اس کا بیاہ کیوں نہیں کر دیتے۔

اندھا بھکاری : اس قصبے میں تو کوئی ایسا بھک منگا ہے نہیں سنا ہے شہروں کے بھک منگے بڑے امیر ہوتے ہیں۔ مجھے ایک دفعہ سرائے کا ایک مسافر بتا رہا تھا کہ اس نے ایک دفعہ اخبار میں

پوچھا تھا کہ ایک شہر میں ——— مجھے اس شہر کا نام یاد نہیں رہا، بھلا سا نام تھا، ایک بھیک منگا رہتا تھا۔ جب وہ مرا تو منّی کی اماں ساٹھ ستّر ہزار روپیہ چھوڑ کر مرا، ساٹھ ستّر ہزار روپیہ کتنا ہوتا ہے تمھیں معلوم ہے ؟

بھکارن: نہیں۔ پر میں سوچتی ہوں کہ میری منّی کو بھی کوئی ایسا ہی بھیک منگا مل جائے۔

اندھا بھکاری: تم نے تو میری بات نہیں مانی۔ وہ بنیا پانسو روپیے دیتا تھا۔ اسی کے پلّے باندھ دیتے منّی کی زندگی بھی سُدھر جاتی اور ہم بھی۔

بھکارن: تم کیا کرتے، اُن پانسو روپے سے ؟

اندھا بھکاری: اُن پانسو روپے سے ——— بس پھر ایک زمین کا قطعہ خرید لیتا۔ گائیں رکھتا، بھیڑ بکریاں۔ میرا ایک چھوٹا سا خوبصورت گھر ہوتا۔ کچی مٹی کا بنا ہوا۔ کھڑیا مٹی سے پتا ہوا منّی کی ماں! تجھے کیا معلوم ہے کہ بھکاریوں کی ٹولی میں داخل ہونے سے پہلے میں ایک کسان تھا۔

بھکارن: مجھے معلوم ہے تم ایسی باتیں مجھے کئی بار سنا چکے ہو۔

اندھا بھکاری: تم ایک بوڑھے اندھے کی باتوں پر کب اعتبار کروگی۔ لیکن منّی کی اماں! میں نے بھی اچھے دن دیکھے ہیں جہاں میں رہتا تھا، وہاں چاروں طرف خوبصورت کھیت تھے۔ کھیتوں سے پرے پہاڑ۔ ایک اُجلی اُجلی ندی، دھان کے کھیتوں میں میٹھے میٹھے گیت گاتی ہوئی بہتی تھی اس ندی کے ساتھ چلتے چلتے میں اپنی بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کو رکھ میں لے جایا کرتا تھا۔ جہاں لمبی لمبی دوب تھی اور بنفشے کے پھول اور کھٹے اناروں کے جنگل اور ———

بھکارن: اور پھر تمھارا باپ مرگیا اور تمھارے باپ کو گاؤں کے بنئے کا بہت سارا روپیہ قرض دینا تھا۔ اور بنئے نے تمھاری زمین قرق کرالی اور تم ہوتے ہوتے ایک بھک منگے بن گئے اور پھر تم ہمارے ٹولے میں آملے۔ میں یہ سب باتیں اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم ہمیشہ سے ایک بھک منگے تھے ہمیشہ رہوگے اور ایک بھک منگے کی موت ہی مروگے۔ صرف یہ بات سچ ہے باقی سب جھوٹ ہے۔ نہ تمھارا باپ کسان تھا نہ میری ماں امیر زادی تھی۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں

میری ماں کون تھی، ایک کھتری سی چڑیل کی یاد ہے، جو میرے سائے پیسے جو مَیں بازار سے لوگوں کے پیچھے بھاگ کر اکٹھے کیا کرتی تھی، سب چھین لیا کرتی تھی اور اکثر راتوں کو بھی بھوکا رکھا کرتی تھی، تاکہ مَیں کہیں موٹی نہ ہو جاؤں۔

(دو مسافر داخل ہوتے ہیں)

بھکارن: کون ہے؟

اندھا بھکاری: کون ہے؟

شاعر اور جانی لنگڑا: مسافر ہیں بابا۔ ذرا آگ تاپ لیں۔

اندھا بھکاری: مسافر ہو تو سرائے میں جاؤ، ہم فقیروں کے پاس کیا کام ہے؟

جانی لنگڑا: سرائے کے اندر جانے کی توفیق ہوتی تو تم سے بات ہی کیوں کرتے۔

اندھا بھکاری: تم کون ہو؟

جانی لنگڑا: میرا نام جانی لنگڑا ہے۔ پہلے مَیں نور پور میں بھیک مانگتا تھا پر وہاں پولیس والوں نے تنگ کر رکھا ہے۔۔ بیچارے بھکاریوں کی ہر روز پیشی، ہر روز بلاوا۔ یہ میری ٹانگ لنگڑی تھی کچھ اس پر پرانے دو چار گھے سڑے ناسور بھی ہیں، مزے سے بیٹھے روٹی مل جاتی تھی لیکن بُرا ہو ان پولیس والوں کا۔

اندھا بھکاری: اور تمھارے ساتھ یہ دوسرا ساتھی کون ہے؟

جانی لنگڑا: یہ اِسی سے پوچھ لو۔

شاعر: میں ——— مَیں ——— میں شاعر ہوں۔

اندھا بھکاری: شاعر کیا ہوتا ہے بھئی، بڑے بڑے بھک منگے دیکھے قسم قسم کے بھکاری لیکن یہ قسم آج ہی سُننے میں آئی۔

جانی لنگڑا: ارے بابا یہ شاعر کبت بناتا ہے اور گاؤں گاؤں سنا کر اپنا پیٹ پالتا ہے۔

اندھا بھکاری: آں ہاں، تو بھاٹ کہو نا۔ کہو کر مَیں بھاٹ ہوں شاعر! عجیب نام ڈھونڈا ہے

اس لئے بھی

جانی لنگڑا: یہ راستہ میں مجھے مل گیا تھا میں نے کہا، سفر میں دو ہوں تو راستہ آسانی سے کٹ جاتا ہے

اسی لیے اسے ساتھ لیتا آیا! بابا تم تو میاں بڑے مزے میں ہو، یہ بڑھیا کون ہے؟

اندھا بھکاری: یہ میری بیوی ہے۔

(قدموں کی آواز)

اور یہ میری منی آ رہی ہے، میری لڑکی منی! یہ جانی لنگڑا ہے یہ شاعر ہے، کبت بناتا ہے —

— بی بی نے کھڑکی کھولی؟ ہاں تو جلدی سے کھانا دے مجھے۔

منی: لیکن بی بی کہتی ہے کہ ابھی کھانے کے بعد ملے گا۔ آج سرائے میں مسافروں کی بہت بھیڑ ہے۔

اندھا بھکاری: تو کچھ تھوڑا سا ہی اُس نے دیدیا ہوتا میں تو بھوک سے مرا جا رہا ہوں۔

شاعر: یہ ایک مکئی کا بھٹا ہے بھائی اسے بھون کر کھالو۔

اندھا بھکاری: کدھر ہے؟ کدھر ہے؟ کہاں ہے منی بیٹیا! ذرا اسے آگ پر بھون ڈال اُف کتنی

سردی ہو رہی ہے آج۔ اس گرم گدڑی میں بھی جان نکلی جا رہی ہے۔ —— کون ہے؟

کسی امیر آدمی کی گاڑی آ کر رکی ہے، منی جاؤ ذرا بھاگ کر۔

جانی لنگڑا: میں بھی چلتا ہوں تمہارے ساتھ، شائد ایک دو چھدام مجھے بھی مل جائیں، منی ذرا مجھے سہارا

دینا آہ!

(سرائے کے دروازے پر ایک گھوڑا گاڑی آ کر رکتی ہے)

پہلا شکاری: اُف آج تو یار تھک کر چور ہو گئے۔

پہلے شکاری کی بیوی: یہ تو بڑی ذلیل سی سرائے معلوم ہوتی ہے ذرا مجھے سہارا دینا! تھینک یو

دوسرے شکاری کی بیوی: اور بھئی ہمیں تو بہت بھوک لگی ہے۔ جان نکلی جا رہی ہے اور پھر یہ بلا کی

سردی، شکر کریں گے، جب کل گھر پہنچیں گے۔

دوسرا شکاری: شکار پر مردوں کے ساتھ آنا بھی تو کوئی ہنسی کھیل نہیں۔

دوسرے تشکاری کی بیوی: تشکار پہ مردوں کے ساتھ آنا بھی تو کوئی ہنسی کھیل نہیں دیکھی آج ہم نے تمھاری دلیری

OH HOW BRAVE YOUARE MYCOURAGEOUS KNIGHT

منی: صاحب ایک پیسہ میم صاحب کی جوڑی بنی رہے ایک پیسہ مل جائے۔

جانی لنگڑا: غریب محتاج لنگڑے پر ترس کر جاؤ رے بابا۔

تیسرا تشکاری: اوڈیم یہ کم بخت ہر جگہ موجود ہیں۔ اب کسے خیال تھا کہ اس OUT OF THE WAY سرائے میں بھی یہ مخلوق مغز چاٹنے کے لیے موجود ہوگی۔

منی: میم صاحبوں کی جوڑی سلامت، صاحب کا اقبال بلند ہو میم صاحب جی آپکے گھر ایک کھوبصورت پیارا بچہ ——

پہلے اور دوسرے تشکاری کی بیویاں: آؤ HOW INDELENT HUSH HUSH چلو جلدی اندر چلیں۔ ورنہ یہ بھک منگے تو ہماری جان کھا جائیں گے

(سرائے کے اندر داخل ہوتی ہیں)

پہلا تشکاری: ہاں آپ چلئے ہم ذرا سامان اترا دالیں —— بھئی دسکی کدھر ہے۔

تیسرا تشکاری: CARIER میں، فکر نہ کرو، اسے میں کیسے بھول سکتا ہوں۔

منی: کچھ مل جائے حضور۔

دوسرا تشکاری: بیرہ انھیں کچھ دینا۔

(بیرہ منی کو ایک دونی دیتا ہے)

سرائے کا مالک: آیئے آیئے حضور، اندر تشریف لے آیئے

پہلا تشکاری: اوہ تم اس سرائے کا مالک ہے؟

جانی لنگڑا: حضور کا اقبال بلند ہو اس غریب محتاج لنگڑے کو بھی کچھ مل جائے۔

پہلا تشکاری: اوہ —— بیرہ، جلدی سے اس بلڈی (BEGGER) کو کچھ دیکر

ٹالو، اور تم اس سرائے کا مالک ہے اور دروازے پر بھیک منگوں کو بٹھلائے رکھتا ہے !

دوسرا افسرکاری: مسافروں کو دونوں طرح سے لوٹتا ہے، اندر بھی اور باہر بھی۔

سرائے کا مالک: حضور اندر تشریف لائیے سرائے کی باہر کی زمین کا میں مالک نہیں ہوں۔ اندر تشریف لائیے حضور۔

منّی: صاحب جی، آپ بھی !

تیسرا افسرکاری: (I SAY PAL) یہ بھکارن لڑکی تو مجھے خاصی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ ارے، تمھارا کیا خیال ہے اس بارے میں ——————

دوسرا افسرکاری: ہش، بڑے بے ہودہ ہو تم، بیرہ سب سامان ٹھیک ہے؟

بیرہ: جی حضور !

پہلا افسرکاری: چلو بھئی اندر چلیں، یہاں کھڑے کھڑے تو لہو بھی جم جائے گا۔

سرائے کا مالک: اندر تشریف لے چلیے حضور۔

منّی: صاحب جی! آپ بھی ایک دونی۔

(صاحب لوگ سرائے کے اندر چلے جاتے ہیں)

بیرہ: بھاگو، بھاگو، یہاں سے کس وقت سے کھڑی چلا رہی ہے مشٹنڈی کہیں کی۔

(معدوم)

اندھا بھکاری: کچھ ملا؟

جانی لنگڑا: ایک اکنی۔

منّی: اور ایک دونّی مجھے بھی۔

جانی لنگڑا: جوان عورتوں کو لوگ یوں بھی زیادہ خیرات دے دیتے ہیں، اور تمھاری لڑکی تو ——————

اندھا بھکاری: ہاں ایک بنیا اس کے پانسو دیتا تھا لیکن منّی کی ماں نے ——————

جانی لنگڑا: منی ماں نے عقل مندی سے کام لیا۔ اگر تم بھی عقل مندی سے کام لو تو یہ لڑکی تمھاری ساری

عمر کے لیے روٹیاں مہیا کر سکتی ہے۔ کیوں شاعر میاں تمھارا کیا خیال ہے۔

(وقفہ)

جانی لنگڑا: شاعر جانی۔

شاعر: ایں کیا کہا، معاف کرنا، میں نے سنا نہیں۔

جانی لنگڑا: ہی ہی ہی! اچھا ہوا، تم نے نہیں سنا۔ اب یہ بتاؤ تم کیا کوئی نیا گیت بنا رہے تھے؟

شاعر: ہاں! ایک نیا گیت ہی تھا۔

جانی لنگڑا: ذرا سناؤ اور اس سارنگی کو کاندھے پر سے تو اتار دو۔

گانا

میں ہوں ایک بھکاری میرا جیون ہے کشکول

پھیلی پھیلی دھرتی پر میں پھرتا ہوں آوارہ

نہ میں کسی کا پریمی ہوں نہ کوئی میرا پیارا

دیکھتا ہوں جب زخمی آہیں یا نینوں کی دھارا

سونے گانے گاتا ہے من ہو کر ڈانواں ڈول

میں ہوں ایک بھکاری میرا جیون ہے کشکول

میری طرح یہ گیت ہیں میرے ننگے بھوکے مارے

میری طرح یہ گیت ہیں میرے آوارہ بے چارے

دن کو پھرتے ہیں یہ در در رات کو گنتے تارے

دنیا والے ان کی خاطر پیٹ کا مندر کھول

میں ہوں ایک بھکاری میرا جیون ہے کشکول

(وشنو مہتر عادل)

شاعر: تم کیوں رو رہے ہو بابا!

اندھا بھکاری : مجھے اپنے سُکھ کے دِن یاد آ گئے۔ وہ دھان کے پیارے پیارے کھیت وُہ بہتی ندی کا نرمل شفاف پانی۔ وہ رکھ جہاں مَیں اپنا ریوڑ چرایا کرتا تھا۔ میری ماں جو مجھے لوریاں دیا کرتی تھی، میرا باپ جو مجھے کاندھے پر بٹھا کر قصبے کے بازار میں سیر کرانے کے لیے لایا کرتا تھا۔

بھکارن : جھوٹ ہے، یہ بالکل جھوٹ ہے۔ مَیں نے اسی قصبے کے بازار میں اسے بھیک مانگتے ہوئے دیکھا ہے کسان کا بیٹا، اُونہہ، رہنا سرائے کے باہر اور خواب دیکھنے محلوں کے۔

شاعر : ہاں، ہاں تم سچ کہتی ہو، ہم سرائے کے باہر رہنے والی مخلوق ہیں جتنے اور بھکاری ہیں جو مسافروں کا بچا کھچا کھانا کھا کر اپنا پیٹ بھرتے ہیں اور اکثر اوقات تو پیٹ بھی نہیں بھر سکتے، ہمیں ایسے سنہرے خواب نہیں دیکھنے چاہئیں کبھی نہیں دیکھنے چاہئیں۔

جانی لنگڑا : میاں اِن باتوں کے سوچنے سے کیا ہوتا ہے، اپن نے تو بس یہ سمجھ رکھا ہے کہ جیو بھکاری اور مرو بھکاری۔ ایمان کی بات ہے کہ یہ پیشہ کوئی اتنا بُرا نہیں بیٹھے بٹھائے روٹی مل جاتی ہے۔ لوگ دو چار گالیاں ہی دیتے ہیں نا۔ لیکن سچ پوچھو تو گالیاں کس پیشے میں نہیں ہم نے بڑے بڑے لوگوں کو دیکھا ہے کہ گالیاں کھاتے ہیں اور چوں نہیں کرتے یار اپن نے تو بس یہی پیشہ پسند کیا ہے۔

(وقفہ)

منّی : شاعر؟ کیا تمھارے گیت سبھی ایسے ہوتے ہیں؟

شاعر : کیا مطلب ہے تمھارا منّی؟

منّی : تمھارا گیت بڑا اچھا تھا۔ اُس نے بابا کو رُلا دیا اور مجھے بھی۔

شاعر : تم بھی۔

منّی : ہاں، میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

شاعر : منّی میرے پاس آنسوؤں کا ایک خزانہ ہے اُسے مَیں نے دھرتی کے مختلف کونوں سے چُن چُن کر اکٹھا کیا ہے۔ اِن آنسوؤں میں انسان کی کہانی ہے۔ کیا تم نے کبھی ان گول گول مدوّر آنسوؤں کے

اندر جھانک کر دیکھا ہے ان میں میلوں تک سُرخ سرخ انگاروں کے میدان ہیں اور لاکھوں شعلے اپنی خوفناک زبانیں پھیلائے ہوئے آسمان کی طرف بڑھ رہے ہیں ان میں زخمیوں کی چیخ و پکار ہے اور کمسن بچوں اور بیوہ عورتوں کے شیون۔ ان آنسوؤں کے اُفق پر ہمیشہ کالی گھٹا چھائی رہتی ہے جس میں کبھی کبھی ایک ایسی خوفناک بجلی کا کوندا لہراتا ہے کہ بڑے بڑے جیالوں کے دل دہل جاتے ہیں۔

منّی : ہائے تم نے مجھے ڈرا دیا ہے۔

شاعر : لیکن ان آنسوؤں کے پیچھے کبھی کبھی سات رنگوں والی دھنک کا نرم و نازک جھولا نظر آجایا کرتا ہے۔ بس ایک ہی لمحے کے لیے پھر وہ اسی کالی گھٹا میں غائب ہوجاتا ہے اور لاکھوں شعلوں کی سُرخ تپتی زبانیں آسمان سے باتیں کرنے لگتی ہیں۔

منّی : میں آج تک کبھی کسی جھولے پر نہیں بیٹھی۔ شاعر! کیا میں اس سات رنگوں والی دھنک پر بیٹھ سکتی ہوں۔ بس ایک لمحے کے لیے۔

شاعر : تم بڑی بھولی ہو منّی! ابھی تک کسی انسان نے اس دھنک کو نہیں چھوا ہے، چھونا تو کیا بہت سوں نے تو اُسے دیکھا بھی نہیں ہے۔ میں نے بھی تو کبھی کبھی اسے دیکھا ہے۔ یہ دھنک ہر ایک آدمی کے آنسوؤں میں نہیں جھلملاتی۔ ہاں جب میں گیت گاتا ہوں اور جب میرے گیت سُن کر کسی معصوم بچے کی آنکھوں میں آنسو مچلنے لگتے ہیں اس وقت میں اس دھنک کو ایک لمحے کیلئے دیکھ لیتا ہوں۔ اگر وہ دھنک ہر ایک آنسو میں دکھائی دے تو یہ آگ کے جہنمی شعلے ہمیشہ کے لیے بجھ جائیں۔

منّی : تو پھر کیا ہوگا شاعر! تم بڑے ہی عجیب آدمی ہو۔

شاعر : پھر کیا ہوگا منّی؟ پھر وہ ہوگا جو تمھاری آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا جس کھڑکی کے کھلنے کی تمنا تم ہر دم کرتی رہتی ہو وہ کھڑکی ہمیشہ کے لیے کھل جائے گی۔

منّی : تو کیا تم اسی واسطے دھرتی کے مختلف کونوں سے آنسو جمع کرتے رہتے ہو؟

شاعر : ہاں !

منّی : ابّا، ابا ! یہ مسافر کہتا ہے کہ میں دھرتی کے مختلف کونوں سے آنسو جمع کرتا رہتا ہوں تاکہ ہماری بوسیدہ والی کھڑکی ہمیشہ کے لیے کھُلی رہے۔

(لنگڑا جانی منی کی اماں اور ابّا اور منی خوب ہنستے ہیں)

جانی لنگڑا : یہ کبت بنانے والے سبھی پاگل ہوتے ہیں۔

(ہوا کا تیز جھونکا، دور جنگل میں گیدڑوں کے بولنے کی آواز)

اُف یہ ہوا کتنی سرد اور برفیلی ہے تب بے چارے انسانوں پر تو آفت رہے ہی، یہ جنگل میں گیدڑ تک سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے چلاّ رہے ہیں۔

اندھا : کیا تم نے وہ کہانی نہیں سُنی ؟ ایک تھا راجہ، اس نے جب سردی کے دنوں میں گیدڑوں کو یوں چلاّتے ہوئے سنا، تو اپنے وزیر سے پوچھا کہ کیا ماجرا ہے۔ وزیر نے بتایا کہ مہاراج ان گیدڑوں کو سردی لگتی ہے۔ مہاراج نے حکم دیا کہ اسی وقت ان گیدڑوں میں کمبل اور لحاف مفت تقسیم کئے جائیں۔

(شاعر ہنستا ہے)

اندھا : (خفا ہوکر) کیوں ہنستے ہو شاعر ؟

شاعر : میں پوچھتا ہوں کیا اُس راجہ کے شہر میں کوئی بھکاری نہ تھا :

(ہنستا ہے)

اندھا : بھکاری کیوں نہ ہوں گے۔ یہ شاعر کیسی باتیں کرتا ہے بھلا جہاں راجہ ہوگا، وہاں بھکاری بھی ہوں گے لیکن اس بات کا میری کہانی سے کیا تعلق ؟ میں کہانی سُنا رہا ہوں اور یہ بیچ میں سے ٹوک دیتا ہے خواہ مخواہ ! یہ کیسا آدمی ہے تمھارا دوست جانی ؟

جانی لنگڑا : معاف کرو بھئی اسے، تم جانتے ہی ہو، یہ کبت بنانیوالے اسی طرح بے سر و پا باتیں کیا کرتے ہیں۔

منّی کی ماں : گیدڑوں والی کہانی سے مجھے بھی ایک بات یاد آگئی۔ ایک دفعہ میں سڑک پر بیٹھی بھیک

مانگ رہی تھی اور کہہ رہی تھی "کوئی روٹی، کوئی پیسہ، بھکارن بھوکی ہے کوئی روٹی، کوئی پیسہ بھکارن بھوکی ہے" اتنے میں میرے قریب سے ایک خوبصورت عورت گزری اُس کا لباس ریشم کا تھا اور سر سے پاؤں تک زیوروں میں لدی پھندی تھی اس کے ساتھ ایک نہایت پیاری سی ننھی لڑکی تھی، یہ ننھی دیکھ کر اور عمگین آواز میں کہا "کوئی روٹی، کوئی پیسہ بھکارن بھوکی ہے" اس پر وہ ٹھٹک کر کھڑی ہوگئی اور اس نے اپنے بٹوے سے ایک پیسہ میری ہتھیلی پر رکھا ننھی بول اُٹھی کہنے لگی، ماں یہ بھوکی ہے؟ اس نے کہا ہاں بیٹا یہ بھکارن ہے غریب ہے بھوکی ہے ننھی لڑکی بولی "ماں یہ بھوکی ہے تو بسکٹ کیوں نہیں کھاتی" بسکٹ؟ سُنا تم نے منی کے آما بسکٹ (کھوکھلے انداز میں ہنستی ہے) اس کی ماں نے اُسے ایک زور کا طمانچہ لگایا اور پھر اپنی روتی ہوئی لڑکی کو لے کر آگے نکل گئی۔

(کھوکھلے انداز میں ہنستی ہے)

اندھا۔ ابھی میری کہانی تو پوری ہوئی نہیں کر لوگوں نے بیچ میں سے

بی بی: (دور سے آواز دیتی ہے) منی، منی، منی بیٹا!

اندھا: کھڑکی کھل گئی ہے۔ منی کھڑکی کھل گئی ہے۔ بی بی تجھے بلا رہی ہے۔ بھاگ کر جا

بی بی: منی، منی۔

جانی لنگڑا: بی بی کھڑکی پر نہیں ہے وہ تو سرائے کے دروازے پر کھڑی آوازیں لگا رہی ہے۔

بھکارن: منی، جا بھاگ کر۔

منی: آئی بی بی جی۔

(دوڑتی ہوئی جاتی ہے)

منی: اب کھانا دوگی؟

بی بی: ہاں، ہاں، چڑیل! تجھے کھانا بھی دونگی اور بہت سی اچھی اچھی چیزیں بھی دوں گی چل سرائے کے اندر چل، سرائے کے مالک تجھے بلا رہے ہیں۔

شاعر: ہاں!

منّی: ابا ابا! یہ مسافر کہتا ہے کہ میں دھرتی کے مختلف کونوں سے آنسو جمع کرتا رہتا ہوں تاکہ ہماری یہ سرائے والی کھڑکی ہمیشہ کے لیے کھلی رہے۔

(لنگڑا جانی منی کی اماں اور ابا اور منی خوب ہنستے ہیں)

جانی لنگڑا: یہ کبت بنانے والے سبھی پاگل ہوتے ہیں۔

(ہوا کا تیز جھونکا، دور جنگل میں گیدڑوں کے بولنے کی آواز)

اُف یہ ہوا کتنی سرد اور برفیلی ہے جیسے جاڑے انسانوں پر تو آفت ہے ہی، یہ جنگل میں گیدڑ تک سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے چلا رہے ہیں۔

اندھا: کیا تم نے وہ کہانی نہیں سنی؟ ایک تھا راجہ، اس نے جب سردی کے دنوں میں گیدڑوں کو یوں چلاتے ہوئے سنا تو اپنے وزیر سے پوچھا کہ کیا ماجرا ہے۔ وزیر نے بتایا کہ مہاراج ان گیدڑوں کو سردی لگتی ہے۔ مہاراج نے حکم دیا کہ اسی وقت ان گیدڑوں میں کمبل اور لحاف مفت تقسیم کیے جائیں۔

(شاعر ہنستا ہے)

اندھا: (خفا ہوکر) کیوں ہنستے ہو شاعر؟

شاعر: میں پوچھتا ہوں کیا اُس راجہ کے شہر میں کوئی بھکاری نہ تھا:

(ہنستا ہے)

اندھا: بھکاری کیوں نہ ہوں گے۔ یہ شاعر کیسی باتیں کرتا ہے بھلا جہاں راجہ ہوگا، وہاں بھکاری بھی ہوں گے لیکن اس بات کا میری کہانی سے کیا تعلق؟ میں کہانی سنا رہا ہوں اور یہ بیچ میں سے ٹوک دیتا ہے خواہ مخواہ! یہ کیسا آدمی ہے تمہارا دوست جانی؟

جانی لنگڑا: معاف کردو بھئی اسے، تم جانتے ہی ہو، یہ کبت بنانے والے اسی طرح بے سر و پا باتیں کیا کرتے ہیں۔

منّی کی ماں: گیدڑوں والی کہانی سے مجھے بھی ایک بات یاد آگئی۔ ایک دفعہ میں سڑک پر بیٹھی بھیک

مانگ رہی تھی اور کہہ رہی تھی "کوئی روٹی، کوئی پیسہ، بھکارن بھوکی ہے کوئی روٹی، کوئی پیسہ بھکارن بھوکی ہے" اتنے میں میرے قریب سے ایک خوبصورت عورت گزری اس کا لباس ریشم کا تھا اور سر سے پاؤں تک زیوروں میں لدی پھندی تھی اس کے ساتھ ایک نہایت پیاری ننھی لڑکی تھی، میں نے مجھیں دیکھ کر اور بھی مسکین آواز میں کہا "کوئی روٹی، کوئی پیسہ بھکارن بھوکی ہے" اس پر وہ ٹھٹھک کر کھڑی ہوگئی اور اس نے اپنے بٹوے سے ایک پیسہ میری ہتھیلی پر رکھا ننھی بول اٹھی کہنے لگی، ماں یہ بھوکی ہے، ماں نے کہا ہاں بیٹا یہ بھکارن ہے غریب ہے بھوکی ہے ننھی لڑکی بولی "ماں یہ بھوکی ہے تو بسکٹ کیوں نہیں کھاتی" بسکٹ؟ سنا تم نے منی کے ابا، بسکٹ (کھو کھلے انداز میں ہنستی ہے) اس کی ماں نے اُسے ایک زور کا طمانچہ لگایا اور پھر اپنی روتی ہوئی لڑکی کو لے کر آگے نکل گئی۔

(کھوکھلے انداز میں ہنستی ہے)

اندھا۔ ابھی میری کہانی تو پوری ہوئی نہیں کہ ان لوگوں نے بیچ میں سے

بی بی: (دور سے آواز آ رہی ہے) منی! منی! منی بیٹا!

اندھا: کھڑکی کھل گئی ہے منی کھڑکی کھل گئی ہے، بی بی تجھے بلا رہی ہے بھاگ کر جا

بی بی: منی! منی۔

حیاتی لنگڑا: بی بی کھڑکی پر نہیں ہے وہ تو سرائے کے دروازے پر کھڑی آوازیں لگا رہی ہے۔

بھکارن: منی، جا بھاگ کر۔

منی: آئی بی بی جی۔

(دوڑتی ہوئی جاتی ہے)

منی: اب کھانا دو گی؟

بی بی: ہاں، ہاں، چڑیل! تجھے کھانا بھی دونگی اور بہت سی اچھی اچھی چیزیں بھی دوں گی چل سرائے کے اندر چل، سرائے کے مالک تجھے بلا رہے ہیں۔

منّی : !!! (تالی بجا کر) کہاں ہیں سرائے مالک ؟

(سرائے کا دروازہ بند ہو جاتا ہے)

بھکارن : منّی سرائے کے اندر چلی گئی ؟

جانی لنگڑا : بی بی منّی کو لے کر سرائے کے اندر چلی گئی ۔ سرائے کا دروازہ بند ہو گیا ہے ۔

اندھا بھکاری : سرائے کے اندر چلی گئی ۔ کیا کہہ رہے ہو جانی میری منّی تو آج تک کبھی سرائے کے اندر نہ گئی تھی ——— منّی کیسے سرائے کے اندر چلی گئی ، سرائے کے اندر

منّی ——— منّی ——— منّی ———

شاعر : آخر ایک نہ ایک دن اسے سرائے کے اندر جانا ہی تھا ۔

اندھا بھکاری : نہیں ! میری بیٹی ۔

شاعر : اور آج سرائے کی دہلیز نے اُس کی زندگی کے دو ٹکڑے کر دیئے ۔ سرائے کے اندر اور سرائے کے باہر ۔ اور اب منّی کی لاج اسی سرائے کی دہلیز کے محور پر آوارہ ہو کر بھٹکا کرے گی ذرا آگ تیز کر دو جانی میرے گیت اس برفیلی رات میں سردی سے ٹھٹھرے جا رہے ہیں ، وہ اُن آوارہ گیدڑوں کی طرح ہیں جنھیں سردیوں میں کوئی کمبل نہیں دیتا ۔ وہ ان اندھے بھکاریوں کی طرح ہیں جن کی بوسیدہ اور پرانی گدڑی میں ہوا برف کے کانٹے بن کر چبھتی ہے میرے گیت بھوکے ننگے اور پیاسے ہیں انھیں کوئی بسکٹ نہیں دیتا میرے گیت کائنات کے گلے سڑے ناسور ہیں ان رِستے زخموں پر آج تک کسی نے پھاہا نہیں رکھا ۔

(سارنگی بجانے لگتا ہے)

جانی لنگڑا : ہی ہی ہی ۔ دماغ چل گیا ہے سردی سے بے چارے کا ۔

گیت

میری طرح یہ گیت ہیں میرے ننگے بھوک کے مارے

میری طرح یہ گیت ہیں میرے آوارہ بے چارے

دن کو پھرتے ہیں بے در در رات کو گنتے تارے

دُنیا والے اُن کی خاطر پریت کا مندر کھول
مَیں ہوں ایک بھکاری میرا جیون ہے کشکول

ان کی خاطر پریت کا مندر کھول او دنیا والے
اس میں پھر اک سُندر سی آشا کی جوت جگا دے
تن کی دولت کو ٹھکرا دے من کی دولت پا لے

من کی دولت ڈھونڈنے والے سُن لے میرے بول
مَیں ہوں ایک بھکاری میرا جیون ہے کشکول

(اندھا بھکاری اپنی گدڑی سمیٹنے لگتا ہے)

بھکارن : کہاں جا رہے ہو منی کے ابا ؟

اندھا : مَیں اپنی منی کو واپس بلانے جا رہا ہوں۔ مَیں سرائے کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا، شور وغل مچاؤں گا، چیخوں گا، چلاؤں گا، گالیاں دوں گا، سمجھا کیا ہے انھوں نے۔ مَیں بھی کسان تھا میرا بھی گھر تھا بیلوں کی جوڑی تھی، خوبصورت کھیت تھے ——— میری منی ———

جانی لنگڑا : چلو چلو، مَیں بھی تمھارے ساتھ چلتا ہوں، آؤ شاعر میاں !

(آہستہ آہستہ جاتے ہیں)

جانی لنگڑا : دروازہ کھٹکھٹاؤ۔

(کھٹ کھٹ)

جانی لنگڑا : کوئی نہیں بولتا۔

(کھٹ کھٹ)

جانی لنگڑا : سرائے میں خاموشی ہے۔

(کھٹ کھٹ)

جانی لنگڑا : سب سو رہے ہیں۔

(کھٹ کھٹ)

شاعر : (طنز سے) منی بھی سو رہی ہوگی؟

اندھا : (چیخ کر) دروازہ کھول دو دروازہ کھول دو، سرائے بدمعاش کتو، دروازہ کھول دو، میری منی کو میرے حوالے کردو، دروازہ کھول دو، میری بیٹی کو میرے حوالے کردو، میں منی کا باپ ہوں، دروازہ کھول دو۔

(کھٹ کھٹ کھٹ)

آہ ظالمو، شیطان کے جہنمی بیٹو! میری معصوم منی کو مجھے واپس دیدو، اس نے تمہارا کیا بگاڑا ہے میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ تم نے مجھ سے میرا گھر چھینا، میرے سنہرے کھیت چھینے میرے خوبصورت بیلوں کی جوڑی، میری آنکھیں بھی تم نے مجھ سے چھین لیں، اب میں اندھا ہوں تمہارے دروازے کا بھکاری، آہ! یہ دروازہ کھول دو (کھٹ کھٹ) کھول دو، ظالمو ایک اندھے بھکاری پر رحم کرو، اس کے بڑھاپے کا سہارا، اس کی اندھی زندگی کی جوت اسے واپس دے دو، ہاں میری منی مجھے واپس کردو، میں اب تم سے کبھی کچھ نہیں مانگوں گا، چپ چاپ یہاں سے چلا جاؤں گا، اور جنگل کے گیدڑوں میں جاکر بسیرا کروں گا، چپ چاپ چلا جاؤں گا چپ چاپ۔

(کھٹ کھٹ ہلکے ہلکے)

(سسکیاں لیتا ہے)

شاعر : (دکھ بھرے لہجے میں) میں جانتا ہوں یہ سرائے کبھی نہ بولے گی، سرائے کا ہر سانس جامد ہوتا ہے اس کا سینہ پتھر کا ہوتا ہے، یہ پتھر جو ہر روز تمہارے ننگے پاؤں سے ٹکراتے ہیں اور ان میں زخم پیدا کر دیتے ہیں یہ پتھر جن سے اس کی سرائے کی دیواریں بنی ہیں، صرف دیواریں ہی نہیں اس کا سلسلہ بھی پتھریلی کا ہے، اس سینے میں دھڑکن پیدا نہیں ہوتی اور جہاں دھڑکن نہ ہو وہاں آواز

بھی نہیں ہوتی، ابھی یہ سرائے خاموش ہے لیکن گھبراؤ نہیں، اس بے آواز سرائے میں
جس طاقت نے مٹی کو نگل لیا ہے وہ وقت آنے پر خود بخود اُسے اُگل کر باہر پھینک دیگی
آؤ اپنے الاؤ پر چلیں۔

جانی لنگڑا: ہاں، ہاں، الاؤ کی طرف چلیں، بڑھیا بے چاری اکیلی رو رہی ہوگی۔

(آہستہ آہستہ الاؤ کی طرف مڑ جاتے ہیں: (معدوم)

(قصبے کا کلاک ایک بجاتا ہے اندھیرا چاروں طرف گھرا ہے)

شاعر: ایک!

(وقفہ)

(قصبے کا کلاک دو بجاتا ہے)

(وقفہ)

شاعر: دو!

(وقفہ)

(کلاک تین بجاتا ہے)

شاعر: تین!

(خراٹوں کی مدھم آوازیں)

شاعر: سو گئے۔ سب سو گئے، اندھا، لنگڑا، بھکارن، سب سو گئے، الاؤ کے تپتے ہوئے
سرخ شعلے بھی جاگ جاگ کر سو گئے۔ اب کالی برفیلی رات ہے اور ہواؤں کے تیز فراٹے
لیکن یہ تیز فراٹے سرائے کے منجمد سینے کو نہیں چیر سکتے جس طوفان کا تو منتظر ہے وہ یہاں کبھی
نہیں آئے گا، اس لنگڑے کو اپنے ناسوروں سے محبت ہے، اس بھکاری کو اپنی بھوک سے
اور تو ——— تو اپنی اس بے مصرف سارنگی کے بوجھ کو کاندھے پر اٹھائے اس
بجھتے ہوئے الاؤ کے کنارے کیوں بیٹھا ہے، اٹھ چل، پگڈنڈی کی پرانی راہ تجھے بلا رہی ہے

تو راہی ہے، عاشق نہیں، تو مسافر ہے محبت کرنے والا نہیں۔

(قدموں کی آہٹ)

شاعر: کون ہے!

منی: میں ہوں منی ——— من ——— نی ——— من نی سرائے کی ملکہ ہے اُس نے کہا تھا۔

شاعر: کس نے کہا تھا؟ یہ تیرے قدم کیوں ڈگمگا رہے ہیں؟ یہ تیرے ——— تیرے منہ سے کیسی بو آرہی ہے۔

منی: بو آرہی ہے ——— ری ہی ہی بو کہ خوشبو، تم شاعر ہو کر بو اور خوشبو میں بھی تمیز نہیں کر سکتے۔ ہاہاہا!

جانی لنگڑا: (جاگ کر) کون؟

اندھا: یہ منی کی آواز تھی۔

بھکارن: منی! میری بٹیا! تو اتنا عرصہ کہاں رہی؟

منی: س ——— س سرائے کے اندر، اور اب سرائے کے باہر ہوں، آج میں بہت خوش ہوں۔ آج میں نے انگوروں کا رس پیا ہے۔ ریشم کے کپڑے پہنے ہیں لذیذ اور میٹھے کھانے کھائے ہیں، تمھارے لیے بھی لائی ہوں لو ——— لو ——— اس رومال میں سب کچھ بندھا ہے اور یہ ——— یہ ——— یہ بھی لو۔

بھکارن: یہ کیا؟

جانی: نوٹ، دس، بیس، تیس، چالیس، واہ میرے یار! یہ لونڈیا تو بڑی ہوشیار ہے۔

بھکاری: چالیس! وہ بنیا تو پانسو دیتا تھا۔

اندھا: (چلا کر) منی ——— منی ——— ذرا میرے قریب آ میری بیٹی۔

منی: کیا بات ہے ابا؟

اندھا : اور قریب آ، میرے قریب آجا، میری بیٹی۔

(اندھا منی کا گلا دبانے کی کوشش کرتا ہے، منی چیختی ہے، شاعر اور
جانی ان دونوں کو الگ کر دیتے ہیں۔)

منی : کیا بات ہے آبا ـــــــ کیا بات ہے ـــــ تم تو مجھے (لمبی لمبی سانسیں لے کر) جان
ہی سے مارے ڈالتے تھے میں نے کیا کوئی بُری بات کی ہے، میں تمہارے لیے کھانا
لائی ہوں، اپنے لیے یہ خوبصورت کپڑے دیکھو شاعر یہ میرے بدن پر کیسے سجتے ہیں، اچھے
لگتے ہیں نا۔ وہ بہت ہی اچھا آدمی ہے وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے، کہتا تھا، جب میں
نے تمہیں سرائے کے باہر دونی دی تھی، اسی لمحے سے میں تم سے محبت کرنے لگا، اس کی باتیں
بہت ہی رسیلی تھیں اس نے مجھے بہت بہت پیار کیا، شاعر وہ کہتا ہے میں تم سے شادی کر
لوں گا، وہ کل اپنے گھر جائے گا، پھر وہاں سے وہ سرائے کے مالک کو خط لکھے گا اور
پھر میرے لیے ایک خوبصورت چار گھوڑوں والی گاڑی آئے گی اور میں اس میں بیٹھ کر اپنے خاوند
کے گھر جاؤں گی، اماں انھیں یاد ہے نا، ایک بار ایک بھکاری نے تم سے میرا ہاتھ دیکھ کر
کہا تھا کہ یہ لڑکی بڑی ہو کر شہزادی بنے گی بھکارن سے شہزادی، اماں وہ بہت ہی امیر ہے
میلوں تک اس کے کھیت پھیلے ہوئے ہیں اس کے پاس بیلوں کی جوڑیاں اَن گنت ہیں اس کا
گھر سُرخ اینٹوں کا بنا ہُوا ہے اور اس کے چاروں طرف ایک وسیع باغ ہے، وہ بہت اچھا آدمی
ہے، میں نے اس سے کہا کہ میں اپنے آبا اور اماں کو بھی ساتھ لے چلوں گی، وہ کہنے لگا یہ تو
بہت ہی اچھی بات ہے میں ان دونوں کے لیے ایک الگ مکان بنوا دوں گا، اور تمہارے
آبا کے لیے کھیت اور بیلوں کی جوڑی بھی خرید دوں گا۔ تم میرے ساتھ چلو گے نا آبا؟ ـــــ اماں
تم بھی، اب ہم بھکاری نہیں رہیں گے، در بدر بھیک نہیں مانگیں گے، بی بی کی گالیاں نہیں سُنیں گے
سرائے کے باہر سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے الاؤ کی مدھم آگ نہیں تاپیں گے۔ ہاں جانی کو بھی ساتھ
لیتے چلیں گے، میں اس سے کہہ دوں گی وہ بڑا اچھا آدمی ہے، شاعر تم بھی ہمارے ساتھ چلنا

تمھارے میٹھے گیت سُن کر اس کی یہ آنکھوں میں آنسو آجائیں گے۔ کیوں ٹھیک ہے نا، ٹھیک ہے نا ابا؟ (وقفہ) اماں (وقفہ) جانی (وقفہ) تم سب چُپ کیوں ہو، شاعر! کیا بات ہے، تم بھی نہیں بولتے! تم بھی نہیں بولتے (مدھم آواز میں سسکیاں لیتے ہوئے) تم بھی نہیں بولتے!

(سسکیاں لیتی ہے)

شاعر: رومت منی، آج تم واقعی اس کالی اندھیاری رات کی شہزادی ہو اس سرائے کی ملکہ ہو، تمھارا لباس ریشم کا ہے تمھارے بالوں میں گلاب کے پھول ٹنکے ہوئے ہیں تمھارے لبوں پر تمھارے محبوب کے بوسے چمک رہے ہیں آج کی رات تم نے سات رنگوں والی قوس قزح دیکھی ہے۔ آج کی رات وہ تمھیں اپنے چار گھوڑوں والی گاڑی میں بٹھا کر اپنی بیاہتا بنا کر اپنے گھر لے گیا ہے آج کی رات اس نے تمھیں اپنے سونے اور جواہرات کے بنے ہوئے محل کی سیر کرائی ہے تمھاری کمر میں ہاتھ ڈالے اپنے وسیع باغات میں پھرایا ہے، رومت منی، ان خوشی کے آنسوؤں کو سنبھال کر رکھ۔ ان آنسوؤں کو تو دوبارہ حاصل نہ کر سکے گی آج کی رات تو نے کیا کھویا ہے اور کیا پایا ہے؟ یہ شاید تو اس وقت نہیں جان سکتی، کل صبح جب وہ مسافر اپنی چار گھوڑوں والی گاڑی میں سوار ہو کر اپنے سونے کے محل میں واپس چلا جائے گا اس وقت تجھے معلوم ہوگا کہ تو اس ظالم سرائے کی پتھریلی دہلیز سے بیاہی گئی ہے کہ جس کے آستانے کی جبہ سائی کرتے کرتے تیرا باپ اندھا ہو چکا ہے، رومت منی، روئے کے ہیے ساری عمر پڑی ہے، کل تجھے معلوم ہوگا کہ وہ قوس و قزح غائب ہو چکی ہے، وہ سونے کا محل راکھ کا ڈھیر ہو گیا ہے وہ وسیع باغات اور کھیت بنجر اور ویران ہو گئے ہیں ان میں تپتی ہوئی ریت کے بگولے اڑتے ہیں اور غول بیابانی چیخیں مارتے ہیں اور تو اپنے چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی ہاتھ پھیلائے بھیک مانگتی پھرتی ہے، کوئی روٹی، کوئی پیسہ، بھکارن ہوں!

منی: نہیں، نہیں، شاعر یہ کیسے خوفناک الفاظ ہیں، ایسا کبھی نہیں ہو سکتا، میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے۔

شاعر: تیری بدنصیبی یہی ہے کہ تو نے ابدی مسرت حسن کے چند لازوال لمحے اپنی پاک و صاف روح کی پہنائیوں سے نکال کر ایک ایسے آدمی کو بخش دیئے جو ان کی قدر و قیمت نہیں جانتا، وہ لمحات جن کا

ہم اب چاند اور سورج کی دُنیاؤں کے پاس بھی نہیں —— لیکن انسان ابھی انسان نہیں ہے وہ ہر اُس چیز کو گزند پہنچاتا ہے جو خوبصورت ہے مقدس ہے اور معصوم ہے اور ہر اُس چیز کا پجاری ہے جو اس پر ظلم کرتی ہے۔ اس کی روح کچل کر اس کے نازک احساسات کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتی ہے۔

جانی لنگڑا: سچ سچ، بہک گیا ہے بے چارہ، دماغ چل نکلا ہے اس کا، چاند اور سورج، اور شعلے اور قوس و قزح، بھلا ان باتوں کا بھلا چالیس روپوں سے کیا تعلق؟ جا بھائی جا، بہت مغز چاٹ لیا تو نے، اب اگر یوں سیدھی طرح نہیں جائے گا تو جانی لنگڑا تجھے اپنی لنگڑی ٹانگ کے کرتب دکھائے گا، یہ میری لنگڑی ٹانگ ایسے موقعوں پر خوب چلتی ہے، بڑا آیا مستی کو سمجھانے والا —— چلا جا یہاں سے ——

شاعر آہستہ آہستہ پگڈنڈی کی طرف قدم بڑھاتا ہے

(وقفہ)

مستی: شاعر، ٹھہرو۔

مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو

شاعر: نہیں! میں اب ٹھہر نہیں سکتا، میں تمھارے آنسو اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں مستی، محبت کرنا یا زخمی زندگیوں پر پھاہا رکھنا میرا کام نہیں میں تو صرف دھرتی کے آنسو جمع کرتا ہوں۔

(چلا جاتا ہے)

(خاموشی، پھر جنگل میں گیدڑوں کے بولنے کی آواز)

پردہ

○

فسانے اور تبصرے

کمال احمد رضوی

کردار

آبا
امّی
نزہت
راحت
مجّو
جاوید
مجیدن

○

پہلا منظر

(سول لائن میں واقع ایک درمیانے درجے کی کوٹھی کا ایک کمرہ جو نہایت
بڑی نفاست اور سلیقے سے آراستہ کیا گیا ہے۔ کمرے میں کوئی قیمتی فرنیچر نہیں
ہے۔ بید کی کرسیاں اور دیوار کی چھوٹی چھوٹی تپائیاں بڑے سگھڑاپے کے
ساتھ کمرے کے بیچ میں رکھی ہوئی ہیں۔ تپائی کے اوپر جھالر دار ہاتھ کا بنا
ہوا تپائی پوش بچھا ہوا ہے۔ کمرے میں دو دروازے ہیں۔ ایک دروازہ
بائیں جانب برآمدے میں کھلتا ہے۔ دوسرا دروازہ داہنے ہاتھ کو
کمرے میں کھلتا ہے۔ سامنے ایک بڑا سا دریچہ جو سڑک کی طرف رخ کئے
ہوئے ہے جس پر چق پڑی ہے۔ جب پردہ اٹھتا ہے تو مارچ کی ایک
چمکیلی اور خوشگوار صبح کا منظر ہے۔ کمرے میں دریچے سے دھوپ
کی روشنی آرہی ہے۔ امّی شال لپیٹے بید کی کرسی پر بیٹھی عینک صاف کرتی
دکھائی دیتی ہیں۔ امّی ۳۵ کے لگ بھگ کی خوش شکل عورت ہیں۔ ان
کے بال ابھی تک سیاہ ہیں البتہ چہرے کے اوپر چربی کی زیادتی ہے
اس لیے تمام چہرہ گول مٹول سا ہو کر رہ گیا ہے۔ ان کا قد لانبا ہے۔
چھریرے بدن کی منحنی سی عورت ہونے کا شبہ گذرتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں
ہے کیونکہ انھوں نے اپنے اوپر حد سے زیادہ سگھڑاپا طاری کر لیا ہے۔
امّی کے سامنے بید کی کرسی پر راحت دونوں پاؤں کرسی پر رکھے ٹنگ
میں مصروف ہے۔ تپائی کے اوپر اون کا گولا رکھا ہوا ہے۔ جوں جوں
راحت آگے بُنتی جاتی ہے گولا میز پر ادھر ادھر لڑھکتا رہتا ہے

راحت چودہ یا پندرہ سال کے لگ بھگ ایک نہایت ہی صحت مند لڑکی
ہے اس کے چہرے کو دیکھ کر اس میں ایک گھڑ پنے کا احساس ہوتا ہے
اکثر و بیشتر نچلے لب کو دانتوں تلے دابے ہوئے نظر آتی ہے اس کی
یہ حرکت اس میں ایک معصومیت کا حسن پیدا کرتی ہے۔

دریچے کے باہر کوٹھی کے احاطہ میں تانگہ داخل ہونے کی آواز
سنائی دیتی ہے آواز لحظہ بہ لحظہ قریب ہوتی جاتی ہے۔ گھوڑے
کے ٹاپ مدھم ہو کر رک جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازے پہ
گھنٹی کی آواز سنائی دیتی ہے)

امی : (عینک کو آنکھوں پر چڑھاتے ہوئے) راحت ! بس ہو بھی چکی ٹنگ۔ چلو اندر جاؤ اپنے کمرے
میں کوئی تمہارے ابا سے ملنے آئے ہیں۔

(گھنٹی پھر بجتی ہے راحت اون کے گولے کو بیدلی سے اٹھاتی ہے)

آنچل تو ٹھیک کرو۔ تم سے سلیقہ ہی نہیں (دوسرے کمرے کی طرف منہ کر کے پکارتی ہے) مجیدن
او مجیدن !

مجیدن کی آواز : آئی بی بی جی !

امی : (اسی متوازن آواز کے ساتھ) دیکھو دروازے پہ کون ہے۔ خان بہادر صاحب کا لڑکا آنیوالا
تھا۔ اگر وہ آئے تو اسے ڈرائنگ روم کھول کر بٹھاؤ۔

مجیدن کی آواز : اچھا —— !

راحت : وہ لڑکا جو امتحان دینے کے لیے لاہور آ رہا تھا ؟

امی : خان بہادر کو تم نہیں جانتیں ؟ نینی تال والے خان بہادر ۔ تم تو اُن کی گود ی کھیلی ہو۔

راحت : (کرسی پہ دوبارہ بیٹھتے ہوئے) اچھا وہ خان بہادر جن کے فرنچ کٹ ڈاڑھی تھی اور موناکل ۔۔۔

امی : (بات کاٹ کر) خیر ان کا لڑکا ہفتے بھر یہیں ٹھہرے گا۔ امتحان ختم ہونے کے بعد چلا جائے گا

تم ڈرائنگ روم کی طرف آنا جانا بند کر دو ــــــ اور ہاں زور زور سے باتیں کرنے کی بھی ضرورت نہیں (راحت بے دلی سے گرمے کو اچھالتی ہے اور پھر ہاتھوں میں تھام لیتی ہے اس عمل سے اُس کی چوڑیوں کی نقرئی صدا بلند ہوتی ہے) راحت تمھاری چوڑیاں بھی بہت زور زور سے بجتی ہیں۔ اب تم بچی نہیں ہو۔ ان باتوں کا خیال رکھنا ہوگا۔ ڈرائنگ روم کے ساتھ والا کمرہ تمھارے کمرے کی پشت پر ہے اس لیے ان باتوں کا اور بھی خیال رکھنا ہوگا۔ میں نے وہی کمرہ اس لڑکے کے لیے تجویز کیا ہے۔

راحت : مگر وہ تو آپا کا کمرہ ہے۔

امی : نزہت آج سے تمھارے کمرے میں چلی آئے گی۔

(مجیدن اندر داخل ہوتی ہے۔ شلوار اور قمیض پہنے ہوئے ہے)

مجیدن : بی بی جی! کوئی جاوید صاحب ہیں۔ ان کے ساتھ ان کا سامان بھی ہے۔ کہتے ہیں وہ یہیں ٹھیریں گے۔

امی : تم نے ڈرائنگ روم کھول دیا؟

مجیدن : جی ہاں! اُنھیں وہیں بٹھا رکھا ہے۔

امی : کیا کیا سامان ہے ان کے ساتھ؟

مجیدن : ایک سوٹ کیس ہے ایک بستر ایک کتابوں سے بھری ہوئی ٹوکری۔ اور ایک تھرموس۔

امی : وہ سارا سامان اس کمرے میں لا کر رکھ دو۔

مجیدن : بہتر (جانے کو مڑتی ہے)

امی : اور سنو۔

مجیدن : جی!

امی : بہ ظاہر کتنی عمر کی لڑکے کی ــــــ (جلدی سے) جاوید نام بتلایا نا؟

مجیدن : جی ہاں! تئیس چوبیس کا لگتا ہے۔ بڑا خوبصورت لڑکا ہے بی بی جی۔ راحت بی بی کے قد کا۔

امی : (راحت کی موجودگی کو محسوس کر کے) مجیدن تیرے ہاتھ بنانے کی عادت کب چھوٹے گی؟ میں نے اس کی عمر پوچھی تھی۔ اس کا [illegible] اور قد نہیں پوچھا تھا۔

مجیدن : (آستباکر) جی !

امی : اچھا کپڑے کیا پہنے ہوئے ہے ؟

مجیدن : بڑے صاحب جیسا کالا سوٹ ۔ آسمانی رنگ کا کالر میں کان لگا ہوا ہے ۔

امی : کان ؟

راحت : (ہنس کر) بو کو کان کہہ رہی ہے ۔

امی : اچھا اور ؟

مجیدن : پائپ بھی دبا رکھا ہے ہونٹوں میں ۔ بڑے صاحب کی طرح ۔

امی : اچھا نفاست پسند لڑکا معلوم ہوتا ہے ۔ میں نے تو اسے جب دیکھا تھا وہ ذرا سا تھا ۔ نزہت اور اس پیدائش میں ایک ہی رات کا فرق تو تھا ۔ کتنی ہی دفعہ میری گود میں کھیلا ہے مگر اسے وہ باتیں کہاں یاد ہوں گی

مجیدن : (چونک کر) اوہ ! میں تو بھول ہی گئی ۔ انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ چچی جان کو سلام پہنچا دینا ۔

امی : (لپک کر) اچھا ! —— مجیدن تو بھی بڑی عجیب عورت ہے کم از کم شربت یا چائے کو تو پوچھا ہوتا ۔
جا —— جلدی کر —— شربت کا گلاس جلدی لے جا ۔

مجیدن : اچھا بی بی !

امی : ہاں سُن ۔ گلاس طشتری میں رکھ کے لے جائیو ۔ سمجھیں ؟ اس کے بعد پان —— اور پان خاصدان میں رکھ کر لے جائیو —— اور ہاں ان سے پوچھنا کہ کس وقت کھاتے ہیں —— اور سنو ان سے کہنا —— ان کے چچا جان کچہری سے واپس نہیں آئے ہیں —— آرام سے بیٹھیں ۔
ان کا اپنا گھر ہے ۔ ——

مجیدن : (دروازے سے) بہت اچھا بی بی ! (چلی جاتی ہے)

راحت : آپی کالج سے ابھی تک نہیں آئیں ؟

امی : آجائے گی —— تجھے فکر کیوں پڑ گئی —— یہ اون کا گولا تو اٹھا دو —— لڑھکتا لڑھکتا کہاں چلا گیا ہے ؟

راحت : اوہ ! (جھک کر اون کا گولا فرش پر سے اٹھا لیتی ہے)

امی : اون کو بھی میلا کر کے رکھ دیا۔ تمام رات کاتی جو پھرتی ہو ؟

راحت : مجو نے میلا کر دیا ہے۔ میں نے کب کیا گیسندنا کے کھیل رہا تھا گوسے کو۔

امی : اچھا تو آ لینے دو اسے بھی خبر لیتی ہوں۔

(مجیدن سوٹ کیس اٹھائے اندر داخل ہوتی ہے)

امی : ادھر کو نے میں رکھو —— یہاں —— (داہنی دیوار کے بائیں کونے کی طرف اشارہ کرتی ہے) بستر کو کھول کر ڈرائنگ روم کے ساتھ والے کمرے میں مسہری پر لگا دو۔ اور یہ کتابیں اسی کمرے کے شیلف میں سجا کر رکھ دو (مجیدن سوٹ کیس رکھتی ہے) اسے دیکھنا مجیدن —— سوٹ کیس پر اس کا نام لکھا ہوا ہے ؛ —— جاوید اختر (سوٹ کیس کو کھولتی ہے) بڑا قیمتی سوٹ کیس معلوم ہوتا ہے — بالکل نیا ہی تو لگتا ہے —— اندر کا استر کتنا خوبصورت ہے۔ مخمل ہے —— یہ ——قمیض —— کا رکتنی خوبصورتی سے استری کئے ہوئے ہیں۔ (البم اٹھاتی ہے) یہ البم ہے —— یہ فاؤنٹین کی سیاہی —— یہ کیمرہ —— یہ —— (رک جاتی ہے) یہ اس کی تصویر ہے

(چونک کر بکس بند کر دیتی ہے) (راحت سے) راحت تم اپنے کمرے میں جاؤ۔

راحت : (بے بس ہو کر) اچھا امی جان ! (جیسے تم کا ہے کو ٹھیرنے دو گی (جانے لگتی ہے)

امی : اور یہ چوڑیاں زور زور سے نہ کھنکیں۔ اور چیخ چیخ کر باتیں کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے کمرے کی تمام آواز ڈرائنگ روم میں سنائی دیتی ہے۔ اچھا چلو جاؤ۔

مجیدن : بی بی جی !

امی : (دوبارہ سوٹ کیس کھولتے ہوئے) کیا بات ہے مجیدن ؟

مجیدن : یہ آپ کا رشتہ دار ہے ؟

امی : اسے تو خان بہادر کو نہیں جانتی وہی جو نینی تال میں ہماری کوٹھی کے ساتھ رہتے تھے وہی فرنچ کٹ داڑھی والے

مجیدن . وہ تو نہیں جن کی آنکھوں پر ایک آنکھ کا چشمہ ہوتا تھا ؟

امی : ہاں ہاں وہی جو مونا کل رکھا کرتے تھے ۔ ٹھیک وہی ۔

مجیدن : کیسا خوبصورت لڑکا ہے ۔ بی بی جی ! بڑا اخیشن نے بل گتا ہے ۔ انگریزی بال کٹوا رکھے ہیں پیشانی پر ایک بکھری ہوئی لٹ بڑی اچھی لگتی ہے ۔

امی : (تصویر نکال کے) واقعی اُس کی پیشانی پر بالوں کی ایک بکھری ہوئی لٹ کتنی اچھی معلوم ہوتی ہے ۔

مجیدن : بالکل بالکل ۔ اسی تصویر کی طرح بی بی جی ! ——— دیکھا آپ نے ؟

امی : ہاں اپ دبانے سے لیوا ہی کتنا خوبصورت خم پیدا ہو گیا ہے ۔

مجیدن : (امی پر جھکی ہوئی) بالکل اسی طرح ۔ بالکل ———

امی : اور پیشانی کتنی بلند ہے ۔

مجیدن : اور بی بی جی ! ناک بھی تو دیکھئے ۔ کیسی ہے ۔

امی : اور آنکھیں تو دیکھو کیسی پیاری پیاری ہیں ؟ (سانس لے کر) کتنی ہی دفعہ میری گود میں کھیلا اور مچلا ہے اور اب ——— اب کیسا جوان ہو گیا ہے ۔ ——— اب وہ مجھے کیا پہچانے گا ۔ اسے تو میری شکل تک یاد نہ ہو گی ——— سترہ سال ہو گئے ان اتوار ...

مجیدن : ہاں بچپن کی باتیں اُسے بھلا کہاں یاد ہوں گی ۔

امی : اور دوبارہ بکس کا جائزہ لیتی ہیں ، تمام ٹائیلٹ کی ڈبے کے استعمال کرتا ہے سینٹ تیل ۔ پاؤڈر ۔ کریم ۔ صابن ——— سب ہی کچھ تو ہے ——— اور یہ سوٹ کتنا قیمتی معلوم ہوتا ہے ڈریس سوٹ ہے ——— یہ نائٹ سوٹ ——— معلوم ہوتا ہے ۔ خان بہادر صاحب اپنے بچے سے بہت پیار کرتے ہیں ——— اس دفعہ امتحان پاس کرنے کے بعد ولایت بھیجنے والے ہیں اب ہو تو ایسا ۔

مجیدن : بڑے لوگ ہیں بی بی جی !

امی : (جلدی سے یاد کر کے) تم نے شربت پلایا مجیدن ؟

مجیدن : (سیدھی کھڑی ہو کر) جی ہاں : اور اُس کے بعد پان کی گلوریاں بھی ——— اور کھانے کے لئے پوچھا ہے

بھی پوچھا تھا۔ کہنے۔ تجھ بیسترہ پیسہ کسی تکلف کی ضرورت نہیں جس وقت سب لوگ کھا چکے ہوتے ہیں میں بھی کھاؤں گا۔

امی : ماں باپ نے کیسی اچھی تربیت دی ہے اسے۔ ذرہ بھر خودسری نہیں سیکھی (بکس کو بند کرکے) اچھا مجیدن! اس تصویر پہ راحت کی نظر نہ پڑے۔ سنا تم نے:

مجیدن : جی! (کچھ نہ سمجھتے ہوئے) جی!

امی : میرا مطلب ہے تم اس بکس کا خیال رکھنا۔ اچھا تم جاکر کھانا تیار کرلو اور ہاں الماری میں سے نیا ڈنر سیٹ نکال لینا اور کھانے کے بعد بازار سے تھوڑا سا پھل بھی منگوا لینا۔ فروٹ سیٹ بھی نکال دیتی ہوں۔

مجیدن : اچھا بی بی جی! (مجیدن چلی جاتی ہے)

امی : (پکار کر) مجیدن!

مجیدن : (دور سے) جی!

امی : (اسی متوازن آواز کے ساتھ) گلدان میں پھول بھی تازہ لگوانے ہیں ——————

مجیدن : (دور سے) اچھا ——————

پردہ گرتا ہے

○

دوسرا منظر

(دو دن بعد ..... تمام منظر وہی ہے ..... آپی کرسی پر بیٹھی کر "پکچر گوئر" پڑھ رہی ہے۔ عمر کوئی اٹھائیس کے لگ بھگ۔ صحت مند۔ چہرے کے نقوش بے حد موٹے ہیں۔ شلوار اور قمیض پہنے ہوئے ہے۔ سر پر ایک بڑا سا بھدا جوڑا باندھ رکھا ہے جو اس کے چہرے کی مناسبت سے ذرا نہیں جچتا۔ سامنے والی کرسی پر راحت بیٹھی ہے۔)

آپی : (رسالے کا مطالعہ کرتی ہوئی) راحت کتنی بار کہا ہے کہ کمرے کے دریچے کو بند نہ رکھا کرو دم گھٹتا ہے میرا۔ سردی کے دنوں ہی میں تو دریچے کا لطف ہے۔ انگور کی بیل سے چھن چھن کر کمرے میں آتی ہوئی دھوپ ہی میں تو سارا حسن ہے۔

راحت : امّی کا حکم ہے کہ باہر کی طرف کھلنے والے دریچے بند رہیں۔

آپی : وہ تمھاری وجہ سے کہتی ہونگی۔ مجھے تو کبھی نہ کہا یہ کرو یہ نہ کرو۔ بھئی اگر تم ایسی چھوٹی موٹی ہو تو میرے ساتھ گذارا مشکل ہے۔

راحت : وہ خان بہادر صاحب کا لڑکا جب سے آیا ہے امّی نے تو اور بھی ——

آپی : (کرسی سے اچھل کر) ارے ہاں راحت! میں تو بھول ہی گئی۔ عجیب اوٹ پٹانگ قسم کا آدمی ہے یہ —— میں نے ایک دفعہ ڈرائنگ روم کے چکر کاٹے۔ لیکن بھلا آدمی یوں کتاب میں آنکھیں گاڑے بیٹھا رہا کہ نظر اٹھانے کی بھی توفیق نہ ہوئی۔

راحت : (اس جرأت پر حیران ہو کر) تو تم ڈرائنگ روم میں چلی گئی تھیں؟

آپی : امّی سے نہ کہہ دینا —— ہاں یوں ہی ذرا جی چاہا کہ دیکھوں ہمارا نیا مہمان کیسا ہے؟

راحت : کیسا ہے آپی؟

آپی : اچھا خوبصورت لڑکا ہے۔ پر جانے کیوں عورتوں کی طرح جھینپتا ہے۔

راحت : نیک لڑکا معلوم ہوتا ہے۔

آپی : ارے شروع شروع میں سب ایسے ہی ہوتے ہیں۔ میں جانتی ہوں۔ ذرا سا نئے سے پرانے ہوئے اور پھر ایسے پر نکالتے ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔

راحت : آہستہ بولو آپا۔ کہیں ڈرائنگ روم میں کوئی سن نہ لے۔

آپی : ٹھیرو! میں روشندان سے دیکھتی ہوں ——— تپائی دینا!

راحت : نہیں آپی ایسا غضب نہ کرو۔ کوئی دیکھ لے گا!

آپی : تو بھی بڑی بور لڑکی ہے ——— ذرا سا دیکھنے میں کیا حرج ہے۔ اچھا تو دروازہ بند کر دے۔ پھر تو کوئی نہیں دیکھے گا!

راحت : نا بابا مجھے ڈر لگتا ہے۔

آپی : اوہو ——— لگا دے نا ——— ڈر کی کیا بات ہے۔ تجھے بھی دکھاؤں گی۔ لے میری بہن شاباش (اُسے بازو سے پکڑ کر اٹھاتی ہے) شاباش۔

راحت : آپی ——————— (راحت دروازہ بند کر دیتی ہے)

آپی : شش! (آپی تپائی کو اٹھا کر روشندان کی دیوار کے ساتھ رکھ دیتی ہے اور اوپر چڑھ جاتی ہے۔ پھر آہستہ سے سرگوشی میں راحت سے) راحت!

راحت : (بالکل سہمی ہوئی) جی آپی!

آپی : ادھر آنا ——— دیکھ تو سہی

راحت : نہیں نہیں ——— میں نہیں آپی۔

آپی : ارے بڑا مزہ آئے گا۔ تجھے کوئی نہ دیکھے گا آجا۔ شاباش! (راحت کی اوڑھنی پکڑ کر کھینچتی ہے راحت مجبوراً تپائی پر چڑھ جاتی ہے) دیکھا! کس اسٹائل سے بیٹھا ہوا ہے، ادھر ابا کے سامنے ——— ہاں ہاں وہی ——————— ابھی صرف پروفائل نظر آ رہی ہے۔ منہ ادھر گھمائے گا تو پورا چہرہ نظر

تمسے گا تو۔ گھما دیا —— اب نشانے پر بیٹھا ہے —— وہ دیکھ کس طرح باتیں کر رہا ہے
ابا سے —— شش شش —— آہستہ آہستہ ذرا باتیں سن۔ آ رہا ہے مزہ!

(معاً اسٹیج پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔ جب دوبارہ روشنی ہوتی ہے تو ایک
کھانے کی میز کے گرد ابا، جاوید اور مجو بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ابا ۵۰
کے لگ بھگ عمر کے آدمی ہیں چشمہ پہنے ہوئے ہیں طبیعت کے سنجیدہ واقع
ہوئے ہیں۔ جاوید چھبیس سال کا لڑکا ہے اور جو شکل و شباہت کردار وں کی بات
چیت نے پچھلے مکالموں میں تراشی ہے۔ اس کی تصویر ہے۔ مجو ۵ سال کا لڑکا
ہے۔ نکر اور قمیض پہنے ہوئے ہے)

ابا : (کھانا چباتے ہوئے) خوب —— خوب —— میاں زمانہ گذر گیا۔ کتنے انقلاب آئے
اب تو وہ باتیں خواب معلوم ہوتی ہیں۔ کیا زمانہ تھا۔ ہم اور تمہارے خان بہادر اکٹھے اسکول میں پڑھتے تھے
آپس میں بیسیوں بار لڑائی ہوئی۔ پر ہمیشہ خان بہادر ملنے میں پہل کرتے (ہنستے ہیں) شوربہ لو نا

جاوید : (سیدھی پلیٹ میں نظر ڈال کر) شکریہ!

ابا : پھر ہم لوگ نینی تال آ گئے اس زمانے میں مجھے اسٹیمر (STEEMER) کے ڈاک کا ٹھیکہ مل گیا
تھا۔ گنگا میں چلنے والی تمام اسٹیمر ہماری ہوتی تھیں —— دو اسٹیمروں کا تو نام بھی میں نے اپنی بچیوں
کے نام پر رکھا تھا۔ یعنی زہرت اور راحت —— اس وقت مجو پیدا نہ ہوا تھا (مجو پلیٹ سے آنکھ
ہٹا کر ابا کی طرف دیکھتا ہے پھر اسی تیز رفتاری سے کھانا شروع کر دیتا ہے) اس وقت تم بہت ننھے تھے۔
کئی دفعہ میری گود میں کھیلے ہو۔

جاوید : جی ہاں! اس وقت میں کافی چھوٹا ہوں گا۔

ابا : (ہنس کر) کافی چھوٹا (ہنس کر) ارے اس وقت تو تم کھانا میری گود میں کھاتے تھے۔

جاوید : (ندامت کو چھپا کر) جی ہاں۔ بجا فرمایا۔

ابا : اور اب تو وہ خواب و خیال کی باتیں ہو گئیں اسٹیمر کے ڈاک کا ٹھیکہ ٹوٹ گیا۔ الہ آباد جا کر دوبارہ بیرسٹری

شروع کرنی پڑی اور پھر کہاں ہم اور کہاں خان بہادر ۔ اب تو بال سفید ہو گئے ۔

جاوید : آبا کے بال بھی سفید ہونا شروع ہو گئے ہیں ۔

ابا : اچھا ! انہیں تو ویسے ہی زمرے کی شکایت تھی غالباً ۔

جاوید : جی ہاں !

ابا : اچھا تو جائداد ساری ٹرانسفر کرالی ؟

جاوید : ساری تو نہیں البتہ تھوڑی بہت ہو ہی گئی ۔ وہ بھی بہ ہزار خرابی ۔

ابا : مَیں تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ چلا آیا ۔ خدا کے بھروسے پر ——— اچھا اِن دنوں کار کون سی ہے

ان کے پاس ؟ میرے زمانے میں تو ان کی بیبی ماڈل تھی ۔

جاوید : ان دنوں شیورلیٹ ہے ۔ ۵۲ ماڈل ۔

ابا : (متاثر ہو کر) اچھا خوب ! یہ مرغ تو لو نا ۔ تم تو شرما رہے ہو ۔ بھئی یہ بھی اپنا ہی گھر ہے

(پلیٹ میں بوٹیاں ڈالتے ہیں)

جاوید : جی …… جی !

ابا : پنشن کی بھی تو کافی رقم ملتی ہو گی انھیں ؟

جاوید : جی ہاں پانسو روپے کے لگ بھگ پڑ ہی جاتی ہے ۔

ابا : شوربہ تو لو نا ——— یہ لو (چمچہ بڑھاتے ہیں) ہاں کیا بتایا ! پانسو روپے ۔ مجھے بھی

تقریباً اسی قدر آمدنی ہو جاتی ہے مگر میرے اور ان کے اخراجات میں زمین و آسمان کا فرق ہے ۔

بھئی ان کے اولاد ہی کتنی ہے لے دے کر ناک میں کان تم ہو ایک بیٹا ——— تمھاری بہنوں

کا پتہ نہیں ——— ایک تو ——— ۔

جاوید : ایک ہی تو ہے عفت آپا !

ابا : اب تو ماشاء اللہ خاصی سیانی ہو گئی ہو گی ۔

جاوید : جی ہاں ۔ مجھ سے دو سال بڑی ہیں ۔

ابّا : (گھبرا کر) اچھا؟ شادی وادی کا ہوا۔

جاوید : ابّا کہتے ہیں میڈیکل پاس کرلے پھر سوچا جائے گا۔ یہ آخری سال ہے۔

ابّا : اچھا! میڈیکل میں پڑھا رہے ہیں عفت کو۔ یہ تو بڑا نیک کام کیا۔

جاوید : آپ کو تو معلوم ہے ابا کتنے روشن خیال آدمی واقع ہوئے ہیں انھوں نے ہماری تعلیم پر بے دریغ روپے خرچ کیے۔

ابّا : درست ہے ——— درست ہے ——— لیکن لڑکی ذات پر اتنا روپیہ خرچ کرنا ایک طرح سے فضول ہی ہے ——— پھر وہ نزہت کو لے لو۔ اصرار کرکے کالج میں اس سال داخل کرایا ورنہ تمھاری چچی تو بالکل رضامند نہ ہوتی تھیں۔ بیٹی ذات ہے اسے کون سی ملازمت کرنی ٹھیری ہمارے خاندان میں ایسی کوئی مثال ہے!

جاوید : بہرحال اس زمانے میں تعلیم کی قدر و قیمت تو آپ کو معلوم ہی ہے۔

ابّا : ٹھیک ہے۔ لیکن شریف گھرانے کی لڑکیاں اس مہمل آزادی سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتیں اب مجو کے پڑھنے کا وقت آرہا ہے انشاءاللہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلواؤں گا۔

جاوید : (مجو سے) کیوں بھئی مجو تم کہاں تک پڑھوگے؟

مجو : (بمشکل کھانے سے منہ کھولتے ہوئے) میں ڈپٹی کلکٹر صاحب بنوں گا!

جاوید : بھئی خوب! آپ سے تو ڈرنا چاہیے۔

ابّا : (مجو کو سرزنش کے انداز میں گھورتے ہوئے) مجو! سالن لیتے وقت رکابی تو قریب کرلیا کرو۔ شوربے سے سارا دسترخوان خراب کر ڈالا (جاوید سے) تعلیم کے بعد تمھارا کیا ارادہ ہے؟

جاوید : بیرسٹری کا!

ابّا : سنا ہے کہ تمھارے ابا تمھیں ولایت بھیجنے والے ہیں!

جاوید : جی ہاں۔ اگلے سال تک امید ہے۔

ابّا : لو نا۔ فروٹ تو کھاؤ ——— بھئی میں ایک دفعہ پھر کہہ دوں گا۔ شرم کی کوئی بات نہیں۔ یہ بھی

تمہارا اپنا گھر ہے۔ میں نے ڈرائیور کو تاکید کر دی ہے کہ تمہیں یونیورسٹی روزانہ صبح چھوڑنے اور لانے جایا کریگا
——— سیر و تفریح کے لیے بھی ادھر اُدھر چلے جایا کرو ——— ہر وقت پڑھتے رہنا ٹھیک نہیں
میں خود امتحان کے وقت ذہن کو آزادی دے دیتا تھا ——— یہ آزادی بڑی فائدہ مند ثابت ہوتی ہے
——— تو بیٹے ——— کہنے کا مطلب ہے کہ یہ بھی ایک طرح سے تمہارا گھر ہے آج تمہاری چچی جان
بھی کہہ رہی تھیں ——— (مجھ سے) بس کرو تم ——— زیادہ انگور نہ کھاؤ ——— کھانسی ہو جائے گی۔

جاوید : اگر گستاخی معاف فرمائیں تو آپ کے مکان کی حدود تعریف کروں گا بڑے پُر فضا مقام پر ہے۔

ابا : مگر تمہاری نینی تال والی کوٹھی تو اس سے کہیں زیادہ خوبصورت تھی۔

جاوید : نینی تال کی بات نینی تال کے ساتھ تھی۔

ابا : تمہارے ابا کو چاہیے کہ یہاں جو گلبرگ میں زمینیں مل رہی ہیں وقت سے پہلے ایک کوٹھی بنوا چھوڑیں
اپنی طرف کے سارے لوگ ایک جگہ رہیں گے۔

جاوید : واقعی مجھے یہ جگہ بہت پسند ہے۔

ابا : اچھا ٹھہرو جاوید میں خان بہادر صاحب کو ایک خط لکھتا ہوں اور پھر کیا کہا کراچی میں تو انہیں ایک کوٹھی
الاٹ ہوئی تھی نا؟

جاوید : نہیں، وہ تو ہم نے پگڑی پر لی ہے۔ پندرہ ہزار کی پگڑی دی گئی تھی۔

ابا : معاذ اللہ! پندرہ ہزار ——— توبہ ——— اندھیر ہے بھئی!

جاوید : اسی کے اب بیس ہزار روپے مل رہے ہیں۔

ابا : کیا بات ہے؟

جاوید : مگر کراچی رہنے کی جگہ نہیں۔ مجھے دیکھئے کالا ہو گیا ہوں۔

ابا : اور میں نے سنا ہے کہ تعلیم کا بھی معقول انتظام نہیں؟

جاوید : درست ہے۔

ابا : تو پھر میں انہیں لکھتا ہوں۔

جاوید : کبھی آپ بھی تو تشریف لایئے نا ——— ابا آپ کا ہمیشہ تذکرہ کرتے رہتے ہیں مجھے تو بڑی تمنا تھی
آپ سے ملنے کی ——— اماں نے آپ کے بارے میں اتنی باتیں بتائیں کہ میری تمنا اور شدید ہو گئی۔

ابا : تمہاری اماں کی صحت تو اب ٹھیک رہتی ہے ' بھئی سچ تو یہ ہے کہ اتنے دور دراز کا سفر بہت مشکل ہے
خدا سے دعا کرو ایک دفعہ واقعی جانا چاہتا ہوں۔

جاوید : ضرور آیئے۔ یہ تو ہوائی جہاز کا زمانہ ہے ابھی لاہور ابھی کراچی۔

(اسٹیج پر پھر تاریکی چھا جاتی ہے اور پہلا منظر لوٹ آتا ہے۔ دروازے پر
زور زور کی کھٹ کھٹ سنائی دیتی ہے)

راحت : آپی !

آپی : اماں دروازہ کھٹکھٹا رہی ہیں جلدی کرو اٹھو !

امی کی آواز : کھولو بھی نا ——— کیا کانفرنس ہو رہی ہے اندر ——— راحت ! نزہت !

راحت دروازہ کھولنے بڑھتی ہے اتنے میں پردہ گرتا ہے

○

تیسرا منظر

(منظر وہی ہے۔ اس دوران میں مزید تین دن کا عرصہ گذر چکا ہے۔ پردہ اٹھنے
پر کمرہ خالی رہتا ہے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد راحت او مجّو ٹہلتے ہوئے داخل ہوتے ہیں
مجو راحت کا ہاتھ پکڑے ہوئے ہے)

مجو : راحت آپا ! جاوید بھائی کہتے ہیں ان کے بکس سے سرخ مفلر اور سفید کوٹ نکال دیجئے ۔

راحت : مجو ! (آہستہ سے) امی کہاں ہیں ؟ ابا کے کمرے میں ؟

مجو : ہاں !

راحت : تو دروازے پر کھڑا رہ ۔ میں نکالتی ہوں مفلر۔ امی آتی دکھائی دیں تو مجھے بتانا ۔ ہیں ؟

مجو : (اس راز کو سمجھتے ہوئے) اچھا اچھا ۔ کھولو بکس ۔ میں دیکھتا ہوں ۔ پر تم سے وہ لال والی پنسل لوں گا ؟

راحت : اچھا بھیا ! میں دے دوں گی تجھے ۔

مجو : (للچا کر) چھوٹی آپا ! ـــــ وہ ـ ـ ۔ وہ رومال بھی دیدو گی نا ! خوشبودار رومال ۔

راحت : اچھا دیدوں گی (بکس کھولتی ہے) مجو ! کون سا مفلر مانگا تھا ؟

مجو : (للچا کر) آپا جی ! یہ ٹکٹائی کتنی خوبصورت ہے ـــ ارے واہ ـــــ تتلی سی !

راحت : (مجو کو ہٹاتے ہوئے) اسے چھوڑ دو ـــــ یہ لو مفلر ـــــ اور کیا مانگتے تھے ؟

مجو : اور ؟ ـــــ اور ـــــــــ اور سفید کوٹ ۔

راحت : سفید کوٹ ۔ سفید کوٹ ۔ یہ رہا سفید کوٹ (مجو کو نکال کر دیتی ہے) بس ؟

مجو : اور کھانسی کی گولیاں ـــــــ میٹھی میٹھی کیا نام تھا ؟

راحت : (وکس کی ڈبی نکالتی ہوئی) وکس ؟

مجو : ہاں ہاں وکس !

راحت : کیا انھیں کھانسی ہے ؟

مجو : ہاں ! کھانسی ہی تو

راحت : اچھا یہ لو (اسے ٹکیہ دیتی ہے)

مجو : ایک ٹکیہ مجھے بھی دو آپا ۔ بس صرف ایک ٹکیہ ۔

راحت : بہت — بس — چلو یہاں سے — جاؤ جلدی سے دے کر آؤ ۔

مجو : اچھا! —— (دوڑ کر چلا جاتا ہے،

(راحت ۔ کمرے کے گرد احتیاط سے جائزہ لے کر جاوید کی تصویر نکالتی ہے ۔ پھر آنچل سے فریم کو صاف کرکے دریچے کی روشنی میں جاوید کی تصویر کو دیکھنے لگتی ہے ۔ دیکھتے دیکھتے راحت کھو سی جاتی ہے ۔ پھر وہ تصویر کو اٹھا کر منہ کی طرف لیجاتی ہے ۔ جیسے چومنا چاہتی ہو لیکن اتنے میں کسی کے آنے کی آواز آتی ہے اور راحت جلدی سے تصویر کو پیچھے کی طرف چھپا لیتی ہے اس کے دونوں ہاتھ پیچھے ہوتے ہیں ۔

اندر مجو داخل ہوتا ہے ۔)

مجو : آپا ۔ دیکھو جاوید بھائی نے مجھے کیا دیا ہے ؟ (رومال دکھاتا ہے)

راحت : دیکھوں مجو ۔ ذرا دینا ؟

مجو : (اترا کر) نہیں نہیں ۔ میں نہیں دوں گا ۔ یہ میرے جاوید بھائی نے مجھے دیا ہے ۔

راحت : (آہستہ سے) لاؤ دیکھوں تو سہی ۔ شاباش میرا بھیا ! (رومال جھپٹ کے لیتی ہے) ارے واہ بڑا خوبصورت رومال ہے (پیار سے) مجو وہ خوشبودار رومال دے گا ۔ وہ ہی جو تو ابھی مانگتا تھا ؟

مجو : (سر ہلا کر) ہاں !

راحت : اور لال والی پنسل ؟

مجو : ہاں ہاں دونوں چیزیں آپا! دو گی نا ؟

راحت : دُوں گی —— پر یہ رومال تو مجھے دیدو مجو۔

مجو : (بسور کر) نہیں —— نہیں ——

راحت : میں اس کے بدلے تمہیں دو رومال دُوں گی اور ایک سینٹ کی شیشی بھی۔

مجو : (اچھل کر) سینٹ کی شیشی بھی (رومال بڑی فیاضی کے ساتھ دیدیتا ہے) لے لو۔ لے لو آپا۔

راحت : شاباش میرا بھیّا۔ پر کسی کو بتانا نہیں ؟

مجو : اچھا۔

راحت : جاوید بھائی نے یہ تو نہیں پوچھا کہ ان کے کپڑے کس نے نکال کر دیئے ؟

مجو : نہیں تو۔ کیوں ؟

راحت : یوں ہی پوچھ رہی تھی۔ (مجو کی بند مُٹھی کو دیکھ کر) یہ تیری مُٹھی میں کیا ہے مجو ؟

مجو : مُٹھی میں ؟ کچھ نہیں۔ کچھ تو نہیں (ہاتھ پیچھے کر لیتا ہے)

راحت : تُو نے کس کی گولیاں نکال لیں ؟

مجو : (مجرمانہ انداز میں) ہوں۔ میں نے کہاں نکالیں یہ تو جاوید بھائی نے دی ہیں۔

راحت : (اس کی مٹھیاں کھولتے ہوئے) دیکھوں ایک دو — تین — چار — پانچ —— جھوٹا!

مجو : اللہ کی قسم۔ انھوں نے خود ہی دی ہیں۔

راحت : اچھا۔ اچھا۔ قسم مت کھا۔ ہاں تو کیا کر رہے تھے تیرے جاوید بھائی ؟

مجو : کرسی پر بیٹھے تھے۔ (پھر کی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے اور تپائی کے اوپر ٹانگیں پھیلا دیتا ہے) اس طرح ٹانگیں پھیلائے (انگلی کو منہ میں دبا کر) اور یوں پائپ پی رہے تھے۔ اور ہاں کچھ گا بھی رہے تھے۔

راحت : (اشتیاق سے) کیسے بھلا ؟

مجو : (گنگنانے کی کوشش کرتا ہے) یاد نہیں رہا۔

راحت : ہٹ پگلا تجھے تو کچھ یاد نہیں رہتا۔

مجو : (کرسی سے اُٹھ کر) آپا! آج مجھے جاوید بھائی بکھرے بکھرے سے لگے۔

راحت : اچھا! بکھرے جائیں گے — مجو، تو میرے بارے میں کچھ بھی نہیں کہتے تھے!

مجو : اوہوں! میں اُن سے تمہارے بارے میں کچھ پوچھوں!

راحت : نہیں نہیں۔ میرا مطلب ہے وہ یہ نہیں پوچھتے کہ ان کے کپڑے کون نکال کر دیتا ہے ان کی میز ان کی غیر حاضری میں کون درست کرتا ہے ان کی ٹائیوں کو پریس کون کرتا ہے؟ اور ان کے لیے کھانا کون بھجواتا ہے۔

مجو : وہ ایسی باتیں نہیں کرتے، وہ تو ہر وقت کتاب لیے پڑھتے رہتے ہیں۔ ہر وقت بس پڑھتے ہی رہتے ہیں۔

راحت : (خود سے) آج دس تاریخ ہو گئی ہے۔ پرسوں ان کا امتحان ختم ہو جائے گا۔

مجو : پھر وہ یہاں سے چلے جائیں گے؟

راحت : ہاں: شاید ہمیشہ کے لیے۔

مجو : آپا! میرا جی چاہتا ہے وہ ہمیشہ یہیں رہتے مگر انکے ابا اور امی اور آپا بھی ہوں گے اس لیے وہ چلے جائیں گے۔ ہے نا!

راحت : ہوا کے راہی کہاں رکتے ہیں۔

مجو : میرے جاوید بھائی ولایت بھی جائیں گے آپا۔ کتنے تھے وہ وہاں سے ہمارے لئے غبارے لائیں گے؛

راحت : (مدہوشی کے انداز میں) غبارے —— ہوا کے راہی — خوش نما اور رنگین غبارے جیسے مجھے اپنے پیچھے رتھ پر بٹھا کر دور سے جانا چاہتے ہوں تخیل کی رنگین وادیوں میں۔

مجو : (گھبرا کر) آپا!

راحت : (چونک کر) مجو! تو نے مجھے کچھ کہا؟

مجو : تم جانے کیا بول رہی تھیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

راحت : (مسکرا کر) میں خواب دیکھ رہی تھی۔ تو تو بہت پیارا ہے۔ آ — میرے پاس آ (اُسے گلے سے

چمٹا لیتی ہے۔ مجو سہم جاتا ہے) مجو تو میرا بھیا ہے نا ؟

مجو : ہاں آپا !

راحت : اور بہنیں پرائی ہوتی ہیں نا ؛

مجو : جی !

راحت : (اُسے اور شدت سے بھینچ لیتی ہے) میرا ننھا بھیا (اسے چھوڑ دیتی ہے)

مجو : تم رو رہی ہو آپا ؛

راحت : (ہنس کر) پگلے میں کہاں رو رہی ہوں۔ میں تو ہنس رہی ہوں۔

مجو : (لپٹ جاتا ہے) تم بہت اچھی ہو آپا ——— آپی سے بھی اچھی۔

راحت : مجو میرا ایک کام کرے گا ؟

مجو : ہاں ہاں ! ضرور کر دوں گا۔

راحت : اگر میں ——— اگر میں تجھے ایک خط دوں ——— تو تو جاوید بھائی کو یہ خط کس طرح دے گا ؛

مجو : (چونک کر) جاوید بھائی کو تم خط لکھو گی !

راحت : نہیں۔ میں تو مذاق کر رہی تھی۔ میرا مطلب ہے اگر میں لکھوں تو تو کس طرح سے جا کر دے گا۔ میں لکھوں گی نہیں۔ بس یونہی پوچھ رہی ہوں تجھ سے۔

مجو : جیسے آپی کا لفافہ دے آیا تھا۔

راحت : (یکدم ٹھٹھک کر) آپی نے تجھے لفافہ دیا تھا ؟

مجو : ہاں ! بڑا خوبصورت سا لفافہ۔ بڑا خوشبو دار۔

راحت : تو تو نے وہ کس طرح دیا ؟

مجو : میں نیکر میں ٹھونس کر لے گیا تھا۔ آپی نے مجھے بہت سا پاوڈر اور کریم بھی دیا تھا۔

راحت : اچھا تو تو نے لفافہ جاوید بھائی کو دے دیا ؟

مجو : دینے کو نکالا ہی تھا مگر ڈر کے مارے میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ انھوں نے خود ہی اٹھا لیا

مگر لفافہ کو دیکھ کر مجھے واپس دے دیا ۔

راحت : (جس کی پریشانی ذرا کم ہوگئی ہے) واپس کیوں دیدیا ؟

مجو : مجھ سے پوچھا کہ یہ خط کس کا ہے ۔ میں نے کہا آپ کھول کر پڑھ لیجئے ۔

راحت : (اشتیاق سے) پھر انھوں نے کھول کر پڑھا ہوگا ؟

مجو : نہیں مجھے واپس دیدیا اور کہا کہ دوسروں کا خط نہیں پڑھتے ۔

راحت : اچھا! ——— تو تم نے لفافہ آپی کو واپس دیدیا ؟

مجو : نہ ——— ہاں ہاں دیدیا ۔

راحت : یہ نہ اور ہاں کیا ہوا ؟

مجو : آپا ——— میں نے ڈر کے مارے آپی کو واپس نہیں دیا ۔ انھوں نے کہا تھا کہ اگر تو نے خط انھیں نہ دیا تو ماروں گی ۔

راحت : اچھا تو وہ لفافہ کہاں ہے ؟

مجو : وہ میں نے پھاڑ کر پھینک دیا ۔

راحت : بے چاری آپا ——— تو نے بے چاری آپا کے ارمانوں کا خون کر دیا ۔ شاید اس سے آپی کی بے رنگ زندگی میں کوئی امید کا کونپل پھوٹ پڑتا ۔

مجو : (حیران ہو کر) کیا ؟

راحت : کیا پتہ آپی ابھی تک اس خط کے جواب کا انتظار کر رہی ہوں ۔ انھوں نے شاید اس خط کی بنیادوں پر امیدوں کا ایک محل تیار کر لیا ہو ——— وہ محل ۔ مجو تو نے کچے گھروندوں کی طرح اپنے پیروں تلے روند ڈالا ۔

مجو : (ڈر کر) تم آپی سے کہو گی ؟

راحت : نہیں ——— تو تو معصوم بچہ ہے مجو ۔ تجھے کیا پتہ آگ سے کھیلنے سے ہاتھ کس طرح جلتا ہے تیرے ہاتھ ابھی بہت ننھے ہیں ۔

مجو : (خوفزدہ سے) تو تم بھی خط دو گی آپا؟

راحت : (سنجیدگی سے) نہیں مجو۔ میں تو مذاق کر رہی تھی۔ یونہی! میں تجھے کوئی خط نہ دوں گی۔

مجو : کیوں؟ میں کسی سے نہیں کہوں گا آپا!

راحت : پگلا! میں تو تجھ سے کھیل کھیل میں پوچھ رہی تھی۔ میں ایک غیر آدمی کو خط کیوں لکھوں گی وہ تو مجھے جانتے بھی نہیں۔ انھوں نے تو مجھے کبھی دیکھا بھی نہیں۔

مجو : تم نے جاوید بھائی کو دیکھا ہے؟

راحت : بھلا میں کس طرح دیکھ سکتی ہوں؟

مجو : وہ جو تم نے ابھی بکس میں تصویر دیکھی تھی نا۔ بس وہی ہیں جاوید بھائی!

راحت : (ہنس کر) اچھا تو وہ ہیں تیرے جاوید بھائی۔ مجھے تو اچھے نہیں لگتے۔

مجو : کیوں؟ امّی تو کہتی ہیں کہ میرے جاوید بھائی بہت خوبصورت ہیں؟

راحت : امّی اور کیا کہتی ہیں؟

مجو : اور —— اور ——

راحت : (بیچ میں ٹوک کر) اب تو جھوٹ موٹ باتیں بنانے کو سوچ رہا ہے۔

مجو : نہیں اللہ قسم! آپا وہ کچھ اور بھی کہتی تھیں مگر مجھے دیکھ کر چپ ہو گئیں۔

راحت : ہاں کیوں نہ چپ ہوں تیری لگائی بجھائی کی عادت جو ٹھہری یہاں کی بات وہاں، وہاں کی بات یہاں (پھر رُک کر) اچھا مجو! میں تجھے لال والی پنسل اور رومال دیدوں پر یہ بات کسی سے نہ کہیو۔ ہیں۔

مجو : نہیں نہیں! میں نہیں کہوں گا۔ کیونکہ پھر اماں تمھیں پیٹیں گی نا آپا؟

راحت : (ہنس کر) لو! میں کوئی بچہ ہوں جو پیٹیں گی تیری طرح؟

مجو : اب تم بڑی ہو گئی ہو نا آپا؟ اماں بھی یہی کہتی تھیں اس دن ابا سے جب ہی تمھیں نہیں پیٹتیں۔ میں بھی بڑا ہو جاؤں گا تو نہیں پیٹیں گی میرا اتنا دل چاہتا ہے بڑا ہونے کو اتنا دل چاہتا ہے آپا!

راحت : اچھا! اچھا اب چل بہت مجو باتیں بنانا تو کوئی تجھ سے سیکھے چل اپنی لال والی پنسل اور رومال تو لے لے۔

مجو : (راحت کا ہاتھ پکڑ کر) ایسے لال والی پنسل —— ہی ہی —— ہی ہی ——

چوتھا منظر

(یہ منظر جو پچھلے تین منظروں سے وابستہ ہے تیسرے اور چوتھے منظر کے
درمیان ایک ہفتے کا وقفہ ہے۔ امّی سجادیہ کا بکس ٹھیک کر رہی ہیں۔ دیوار کی گھڑی
نو بجاتی ہے۔ امّی چونک کر آواز دیتی ہیں)

امّی : مجیدن جلدی کرو نا ناشتہ ابھی تک بھجوایا کیوں نہیں۔ گاڑی کا وقت ہو چلا ہے۔

مجیدن کی آواز : ناشتہ جا چکا ہے بی بی جی! میں کافی تیار کر رہی ہوں۔

امّی : تانگہ بھی تو لانا ہے اڈے سے۔ اور یہ سامان بھی تو اٹھا کر لے جاؤ گی۔

مجیدن کی آواز : تانگہ آ چکا ہے۔ سامان ابھی اٹھاتی ہوں آ کر۔

امّی : ہاں تو جلدی کرو۔ (راحت تولیے سے منہ صاف کرتی ہوئی داخل ہوتی ہے) راحت منہ دھو چکیں؟

راحت : ہاں!

امّی : خیر! آپی کا کمرہ خالی ہو جائے گا تو آج وہاں چلی جانا۔ اس کی پڑھائی کا بھی خوب ستیاناس ہوا ہے۔

راحت : (خاموشی سے بکس کو دیکھتی رہتی ہے)

(مجو آتا ہے)

امّی : مجو ابا کو تو بلاؤ، یہ منہ میں کیا دبائے پھر رہا ہے ندیدہ کہیں کا، سارے لڈو جھکو سے جا رہا ہے اتنی
بھی تمیز نہیں کہ مہمان کے سامنے زیادہ نہیں کھاتے۔

مجو : (منہ میں لڈو بھرے ہوئے) ہوں۔ میں نے کہاں بہت سے کھائے ہیں؟

امّی : اچھا اچھا! ابا سے کہہ امی بلا رہی ہیں۔ (مجو چلا جاتا ہے)
(راحت سے) راحت! آپی کو پکار کر تم دونوں بہنیں بھی یہیں ناشتہ کر لو۔

راحت : اچھا (پکارتی ہے) آپی جان

امّی : (بیچ میں ٹوکتے ہوئے چلّا کر) راحت یہ کیا بدتمیزی ہے۔ اتنے زوروں سے بھی پکارتے ہیں کہ زنانخانے کی آواز باہر جا رہی ہے تم لوگوں سے جوانی کسی طرح سنبھالے نہیں سنبھلتی۔ توبہ

آپی : (اندر داخل ہو کر) امّی! آپ اتنا چیخ چیخ کر کس پر برس رہی ہو۔ زنانخانے سے باہر آواز جا رہی ہے۔

امّی : میری اور بات ہے۔

آپی : خواہ مخواہ غریب راحت کو جھاڑتی رہتی ہو۔ دیکھو تو کیسا منہ بن گیا اس کا اب۔ رونی کرتب۔ رونی صورت بنی راحت (چمکار کر) نہیں بھئی ٹھیک نہیں۔

راحت : (رونی آواز میں) میری زبان سبھی کو لمبی نظر آتی ہے۔

آپی : مجھے تو نہیں، اماں کو شاید نظر آتی ہو؟

امّی : گھر میں کوئی مہمان ٹھہرا ہوا ہے اتنی تو تمیز ہونی چاہیے۔ میں تمہارے ہی بھلے کو کہتی ہوں۔ ہمارے ہاں تو چوڑیوں کی جھنجھناہٹ تک پر جو تم بیزار ہوتی تھیں۔ شکر کرو تم لوگوں پر اتنی پابندیاں نہیں ورنہ تمہارا تو دم گھٹ جاتا۔

آپی : تو تم اس تمام جبر کا بدلہ ہم لوگوں سے لے رہی ہو۔ تھوڑا بہت بدلا تو ہے۔

امّی : تم بڑی بہن ہو۔ چھوٹی بہن کو تمہیں تمیز سکھانی چاہیے نہ کہ الٹی اسے شہ دینی چاہیے۔

آپی : میں ایسی دقیانوسی تمیز داری کی قائل نہیں۔

امّی : یہ سب کالج کی ہوا لگنے سے ہوا ہے۔ میں اسی دن کو منع کرتی تھی تمہارے باپ کو۔

(ابا آتے ہیں)

ابا : کیوں بھئی سب کچھ ٹھیک ہو گیا؟

امّی : (آنسو ٹپکا کر) یہ دو تمہاری شہزادیاں تو چین لینے دیں۔ بات کرنا مشکل ہو گیا ہے۔

ابا : کیوں بھئی تم لوگوں نے ناشتہ کر لیا؟

آپی : حمیدن لائے بھی تو کروں۔

امّی : حمیدن بھی کام کے وقت ہاتھ پاؤں پھلا دیتی ہے اب اس وقت جلدی ہے نوج گاڑی کا سوا گھڑی

نہیں ملتا (پکار کر) مجیدن ——— او مجیدن !

مجیدن کی آواز : آئی بی بی !

امی : (اور زور سے پکار کر) ناشتہ لاؤ لڑکیوں کا ۔

آپی : اب یہ آواز تو ماہر نہ گئی ۔

امی : (ابا سے احتجاج کرتے ہوئے) ۔ دیکھتے ہیں جی ! زبان ہلانا مشکل ہے ۔

ابا : (ہنس کر) مگر تم اتنے زور سے پکارتی کیوں ہو ۔ جب دوسروں کو منع کرتی ہو تو خود بھی خیال رکھو نا ۔

امی : آپ ہی نے تو دونوں کو بگاڑا ہے ۔

(مجیدن ناشتہ لے کر آتی ہے ۔ راحت اور زینت کھانے بیٹھ جاتی ہیں ۔)

مجیدن : بکس لے جاؤں ۔

امی : ہاں ! پہلے بستر تو باندھ دو اور تھرموس میں چائے بھی ڈالنی ہے اور ناشتہ دان بھی ٹھیک کرنا ہے

مجیدن : اچھا ! (بکس اٹھا کر چلی جاتی ہے)

امی : (ابا سے) گاڑی میں جلدی تو نہیں ؟

ابا : نہیں ابھی کافی وقت ہے ۔

امی : کیا کر رہے ہے جاوید ؟

ابا : اخبار پڑھ رہا تھا ۔

امی : ہوں ——— کچھ ذکر چھیڑا تھا

ابا : موقع نہیں آیا ——— اور ویسے بھی میرا خیال ہے کہ اس معاملے میں خان بہادر سے ذاتی طور پر گفت و شنید بہتر رہے گی ۔

امی : مگر لڑکے کا دل بھی ٹٹولنا چاہئے ۔ خان بہادر ہیں نئی روشنی کے آدمی ۔ وہ لڑکے کو بھی اتنی ہی آزادی دیں گے ۔ ہماری تمہاری طرح کی بات نہیں ۔

ابا : (ریکیوں کی مروہ نگاہ کو محسوس کرتے ہوئے) ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔

امی : مطلب یہ ہے کہ نادر موقع ہے ہاتھ سے جانا چاہئے۔

ابا : جلدی بازی بھی تو اچھی نہیں ہوتی۔ بلکہ کوئی نہ کبھی کرنے کا دیکھتے ہی منہ میں پانی بھر آیا۔ ذرا سا بھی ضبط نہ ہو سکا۔

امی : (راحت اور آپی سے) کیوں بیٹی ناشتہ ختم کر لیا؟

راحت : جی ہاں!

امی : تو نہ آپی کا سامان تو اس کے کمرے میں رکھوا دو اور جاؤ نزہت آج سے اپنی پڑھائی شروع کر دو۔ کافی وقت ضائع ہو چکا ہے۔

آپی : اچھا ———— (دونوں بہنیں چلی جاتی ہیں)

امی : (اپنی کرسی ابا کی کرسی کے قریب گھسیٹتی ہوئی) ویسے ایمان سے کہو ہے نا لڑکا۔

ابا : بڑا نیک اور حلیم طبیعت کا انسان ہے۔ اس میں کیا شک ہے۔

امی : نزہت بھی اس دفعہ بی اے کرے گی۔

ابا : (چونک کر) مگر نزہت کی بات شاید خان بہادر کو پسند نہ آئے۔

امی : کیوں پسند کیوں نہ آئے گی؟

ابا : تمہیں معلوم ہے اس کی صورت شکل کچھ ایسی نہیں کہ ————

امی : کہ؟

ابا : یعنی جاوید کے مقابلے کی نہیں۔

امی : حسین نہ سہی تعلیم یافتہ تو ہے اور تعلیم کس لیے دلوائی جا رہی ہے اسی نقص کو تو چھپانا تھا۔

ابا : میرا خیال ہے۔ راحت کے لیے یہ بات زیادہ موزوں رہے گی۔

امی : تمہاری عقل پر خدا رحم کرے۔ بعض دفعہ تو تم حیران ہی کر دیتے ہو۔ بڑی لڑکی گھر میں بیٹھی رہے گی اور چھوٹی کی شادی ہو جائے گی۔ دنیا کیا کہے گی۔

ابّا : تمھاری مرضی۔ لیکن نزہت کی بات کرنی فضول ہوگی۔ لیلے شرمندگی اٹھانا پڑے گی۔

امّی : کمال کی منطق ہے آخر اس میں کیا عیب ہے ؟

ابّا : میں نزہت کے پیچھے یہ بات چھیڑ کر بے وقوف نہیں بننا چاہتا۔

امّی : آخر کیوں ؟

ابّا : بس مجھے معلوم ہے۔ کوئی شخص اتنا اندھا نہیں ہوتا کھری چیز کے کھرے دام ہوتے ہیں۔

امّی : تم سے تو یہ ذکر ہی چھیڑنا بری بے وقوفی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ تم وقت آنے پر یہی کچھ کروگے۔

ابّا : عقل سے کام لو۔

امّی : اس کی تمھیں ضرورت ہے ورنہ تم یہ بھی سوچتے کہ اتنا تعلیم یافتہ لڑکا ایک جاہل لڑکی سے شادی کیوں کرے گا ؟

ابّا : خان بہادر بھی تعلیم یافتہ تھے، لیکن ان کی بیوی کون سی تعلیم یافتہ تھیں البتہ شکل صورت میں اپنی برادری میں ایک ہی لڑکی تھیں۔ یا دور کیوں جاؤ، برا نہ مانو تو خود تمھاری مثال دوں۔

امّی : اس زمانے اور اس زمانے میں بہت بڑا فرق ہے۔

ابّا : اس زمانے میں تعلیم ہی کہاں تھی ؟ میں اپنے خاندان کا پہلا گریجویٹ تھا۔

امّی : اتنی باتیں کیوں بناتے ہو ؟ صاف کیوں نہیں کہتے تم نزہت کی بات نہیں کروگے ؟ قصہ ختم۔

ابّا : میں مجبور ہوں۔

امّی : اور راحت کے معاملے میں مجبور نہیں ہو ؟

ابّا : راحت کے معاملے میں تو پھر بھی کوئی قرینے کی بات معلوم ہوتی ہے۔

امّی : کیونکہ جس طرح تم خاندان میں ایک قرینے کے گریجویٹ ہوئے اسی طرح راحت بھی تمھارے خاندان میں پہلی حسین لڑکی ہے نا ؟

ابّا : خواہ کچھ بھی کہو۔

امّی : کچھ بھی نہیں ——— میں صاف صاف کہتی ہوں کہ اگر نزہت کی بات نہیں کی تو میں راحت کی بھی نہ

ہونے دو گی۔ اچھی طرح سمجھ لو۔

ابا : اگر تمھاری یہی ضد ہے تو یہی سہی۔ قصہ ختم۔

مجیدن کی آواز : بڑے صاحب کو باہر بُلا رہے ہیں۔

ابا : اچھا! میں چلتا ہوں پھر تمھاری طرف سے کچھ کہنا ہے دُعا سلام کوئی۔

امی : چولہے بھاڑ میں جاؤں میں اور میری دعا سلام

ابا : کچھ خان بہادر کو پیغام بھجوا دیتی تم دونوں میں تو گہری چھنتی تھی۔

امی : نوج ایسی چھننے کی۔

ابا : (لاجواب ہو کر) اچھا تمھاری خوشی۔

مجیدن کی آواز : گاڑی کا وقت قریب ہے

ابا : (پکار کر) آیا ——— (ابا چلے جاتے ہیں۔ مجو داخل ہوتا ہے)

مجو : امی! جاوید بھائی آپ کو سلام کہتے ہیں۔

امی : ہٹ پرے ——— (تنک کر) کیا کہنا؟ سلام کہتے ہیں (ہلک کر) میری طرف سے دُعا کہنا

اور کہنا اپنی امی کو بھی میرا سلام پہنچا دیں

مجو : اچھا ——— (دروازے کے قریب کھڑا ہو کر) اور کچھ؟

امی : دفان ہو۔

مجو : (چیخ کر) اور کیا کہوں؟ دفان ہو؟

امی : (غصے سے نیچی آواز میں جھڑک کر) ندیدے میں تجھے کہہ رہی ہوں۔ وہاں جا کر نہ کہہ دینا۔ تیرے کھٹے میں گاؤ پھوٹے۔

(نزہت اور راحت آتی ہیں)

آپی : گئے؟

امی : بس جانے ہی والے ہیں اب کوڑ کڑے لگاتی پھرنا۔ (راحت سے) راحت تم نے سارا سامان ٹھیک کر لیا!

راحت : ہاں !

امی : بس ٹھیک ہے۔ آنچل ٹھیک کر لو۔

آپی : گھونگھٹ ہی کاڑھ لو راحت۔ مزے میں رہو گی۔

امی : ہر بات میں سر پر سوار نہ ہوا کرو نزہت۔ قسمت دیکھو اپنی، ہونہہ۔ سدا جلتی ہی رہو گی۔ (تانگے کی آواز سنائی دیتی ہے) لو تانگہ چل پڑا۔ دیکھوں ذرا! (امی جلدی جلدی سلیپر گھسیٹتی ہوئی دروازے سے نکل جاتی ہے)

آپی : (ہنس کر) راحت وہ سامنے دیکھ رہی ہو امی کس طرح بجری سے لگی باہر دیکھ رہی ہیں۔

راحت : کہاں ؟

آپی : ادھر! وہ سامنے، وہاں ——— میں بھی چلتی ہوں۔ (نزہت بھی چلی جاتی ہے)

راحت : (جس کی آنکھیں دریچے پر جمی ہوئی ہیں۔ یکدم خواب آلود لہجہ میں) تانگہ چل پڑا (تانگے کی گھنٹی اور کوٹھی کے احاطہ میں بجری کے اوپر پہیئے کے گذرنے کی آواز)

(خوابیدہ انداز میں انگلی اٹھا کر) اسی طرح پہیوں کی آواز ایک دفعہ گونجی تھی۔ اسی طرح ننھی ننھی بجریاں بج اٹھی تھیں (انگلی آہستہ آہستہ گر جاتی ہے اور تانگہ کی آخری گھنٹی دم توڑ دیتی ہے) مگر اس دفعہ تو آواز ادھر سے ادھر کی طرف آئی تھی۔ اس دفعہ یہ آواز کدھر سے آ رہی ہے۔ کدھر جا رہی ہے۔

مجو : (دوڑتا ہوا آتا ہے) ہی ہی ——— آپا ——— ہی ہی ———

(مجو راحت کے گلے میں لٹک جاتا ہے اور

آہستہ آہستہ پردہ گر جاتا ہے)

پسِ دیوار

مجتبیٰ حسین

کردار

سرکار
منشی جی
ناہید
فلسفی
شاعر
جمال
فرخ

پہلا منظر

(سرکار ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ منشی جی کو آواز دیتے ہیں آواز نرم اور باوقار ———)

سرکار: منشی جی؟

منشی جی: جی سرکار آیا۔ (آنے کی آواز)

سرکار: کیا ہو رہا تھا۔ منشی جی؟

منشی جی: کچھ نہیں سرکار۔ وہی جائداد کا حساب کتاب دیکھ رہا تھا اور کرنا ہی کیا ہے۔ دن بھر سرکار آپ تو جانتے ہیں۔ اسی میں مصروف رہتا ہوں۔ وصولی۔ تحصیلی۔ مقدمے کے کاغذات۔ خرید و فروخت۔ گھر کے اخراجات۔ دنیا بھر کا حساب کتاب ہے ——— آپ تو جانتے ہی ہیں سرکار۔ جائداد کا بندوبست۔

سرکار: منشی جی مجھے معلوم ہے کتنی دشواری ہوتی ہے۔ بہت تھک جاتے ہوں گے منشی جی آپ کچھ آرام کر لیا کیجئے

منشی جی: سرکار اسی دیکھ بھال میں عمر گذری ہے۔ اب تو یہی عادت ہو گئی ہے (رک کر) سچ کہتا ہوں سرکار۔ اگر کسی دن کوئی کام نہیں ہوتا۔ تو دن نہیں کٹتا اور اب تو جائداد (ذرا گلا صاف کرتے ہیں) اور اب تو جائداد ——— (پھر کھانس کر گلا صاف کرتے ہیں)

سرکار: ٹھیک ہے۔ منشی جی اب اتنا کام نہیں رہ گیا ہے۔

منشی جی: سرکار میری ساری عمر اسی ڈیوڑھی پر بسر ہو گئی ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا سرکار اور ایک یہ۔ مگر سرکار پھر بھی ہزاروں کام ہیں۔

سرکار: منشی جی! جمال میاں کے بارے میں کیا خیال ہے؟ میرا مطلب ———

(جملہ ادھورا چھوڑ دیتا ہے)

منشی جی: بہت مناسب سرکار۔ جائداد ہے شرافت ہے۔ بھلے خاندان کے ہیں تعلیم یافتہ ہیں اور شکل و صورت

کے اعتبار سے کہنا ہی کیا ہے۔

سرکار : ہوں ! تو مناسب آدمی ہیں جمال میاں ؟

منشی جی : سرکار، مجھ سے کیا پوچھتے ہیں ہر لحاظ سے بہت خوب آدمی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کی جائداد پر اب تک کوئی بار نہیں ہے بالکل محفوظ ہے۔

سرکار : ہوں ——— !

منشی جی : مجھے تو بہت پسند ہیں جمال میاں اور خاندان ان کا معلوم ہی ہے۔ بڑا پکے آدمی ہیں۔

(باہر ایک ٹرک گھڑ گھڑاتی ہوئی نکل جاتی ہے)

سرکار : اچھا منشی جی اس ماہ میں گھر کے اخراجات کتنے ہوئے ؟

منشی جی : یہی دیکھ رہا تھا بیٹھا ہوا سرکار۔ تین ہزار کے قریب ہوئے ہیں۔ میری تو خود سمجھ میں نہیں آتا۔ مجھ سے ہی کہیں حساب میں غلطی ہوئی ہے۔

سرکار : نہیں تو ٹھیک ہی ہوگا۔

منشی جی : سرکار وہ دعوت ہوئی تھی نا۔

سرکار : ٹھیک ہے۔

منشی جی : اور بٹیا پہاڑ پہ گئی تھیں۔

سرکار : ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ اچھا منشی جی ! اب اس مکان کے پیچھے کتنی اور زمین رہ گئی ہے ؟

منشی جی : سرکار ابھی کافی زمین ہے اور آپ تو جانتے ہی ہیں۔ سرکار یہ فیکٹری جو بن رہی ہے۔

(پھر ایک ٹرک شور کرتی ہوئی نکل جاتی ہے)

اس فیکٹری کے بننے سے عجیب قباحت ہو گئی ہے۔ بات کرنی دشوار ہے۔ ہاں تو اور سب زمین تو اس فیکٹری کے مالک نے پہلے ہی خریدلی تھی۔

(کھانس کر گلا صاف کرتا ہے)

اور سچ تو یہ ہے فیکٹری سے جو زمین بچی ہے وہ اس مکان کے اردگرد ہے اب بھی کافی ہے سرکار

سرکار : اچھا ! (توقف کے بعد) منشی جی - جمال میاں کو تو اس خرید و فروخت کے بارے میں نہیں معلوم ہے ؟

منشی جی : توبہ کیجیے سرکار - میں نے عمر بھر اس گھر کا نمک کھایا ہے - اس گھر کی عزت میری عزت ہے - جمال میاں کو اگر معلوم ہو جاتا تو میں کیسے منہ دکھاتا - مجھے کیا معلوم نہیں جمال میاں اور بٹیا ———

سرکار : میں منشی جی یہی دریافت کرنا تھا - دیکھئے منشی جی - بٹیا کو بھی کچھ معلوم نہ ہو -

منشی جی : نہیں سرکار - ایسی بات ہو سکتی ہے - میں نہیں جانتا کیا - بٹیا کو اگر یہ معلوم ہو گیا تو ان کا دل ٹوٹ جائے گا

سرکار : یہ خیال تھا منشی جی - تمہیں معلوم ہے میں نے اسے کس طرح پالا ہے اس کی ماں کے انتقال کے بعد میں نے ایک لمحہ کے لیے اسے رنجیدہ نہیں ہونے دیا - میں نے اسے ہر طرح خوش رکھا - روپیہ پانی کی طرح بہایا - اس کی ہر ضد پوری کی - میں یہ برداشت ہی نہیں کر سکتا کہ اسے خبر ہو کہ اس کا باپ رفتہ ——— رفتہ ——— دھیرے ——— دھیرے ———

منشی جی : کیا فرماتے ہیں سرکار ! اب بھی آپ کسی سے کم نہیں - آپ بالکل اطمینان رکھئے سرکار - بٹیا کو مطلق خبر نہ ہو گی - رہ گئے جمال میاں انہیں کیا معلوم زمین کتنی ہے کتنی نہیں - ایک مرتبہ پوچھ رہے تھے -

سرکار : کون جمال میاں ؟

منشی جی : جی ہاں سرکار ! پوچھ رہے تھے یہ فیکٹری جو بن رہی ہے کس کی زمین پر ہے ؟

سرکار : پھر ؟

منشی جی : پھر کیا - میں نے دھوپ میں بال سفید نہیں کیے ہیں - میں نے کہا - یہ زمین کسی دوسرے کی ہے -

سرکار : تو وہ دریافت کر رہے تھے ؟

منشی جی : جی ہاں سرکار - انہیں شک تھا کہ یہ زمین جو بیچی گئی ہے - یہ سرکار ہی کی ہے اور یہ فیکٹری اسی زمین پر بن رہی ہے -

(قدموں کی آواز آتی ہے)

سرکار : منشی جی بٹیا آ رہی ہیں ؟

منشی جی : بٹیا آ رہی ہیں سرکار (آواز گھبرائی ہوئی)

(ناہید آتی ہے)

سرکار: آؤ بیٹی آؤ! کہاں سے آ رہی ہو؟

ناہید: کہیں سے نہیں ابا جان، کمرے میں تھی۔

منشی جی: کہیں گئی نہیں بیٹیا۔ شام ہو رہی ہے اور آپ کمرے میں بیٹھی ہیں۔ یہ تو ٹھیک نہیں ہے۔

ناہید: منشی جی، آج بالکل طبیعت باہر جانے کو نہیں چاہی۔ دن بھر کتاب پڑھتی رہی۔

منشی جی: آنکھوں پر زور پڑے گا بیٹیا۔

ناہید: منشی جی آپ اور ابا جان میری صحت کے بارے میں ہر وقت فکرمند رہتے ہیں۔

سرکار: منشی جی ٹھیک کہتے ہیں بیٹی (رک کر) ارے ہاں آج وہ تمہارے دوست فلسفی اور شاعر آئے نہیں:

ناہید: نہیں ابا جان! آج تو نہیں آئے۔ اُن کا کیا ٹھکانہ ہے۔ جدھر نکل گئے نکل گئے۔

منشی جی: ٹھیک ہے بیٹیا! عجیب لاابالی لوگ ہیں۔

سرکار: کیوں نہ ہو۔ ایک فلسفی ہے دوسرا شاعر (رک کر) اچھا منشی جی۔ بڑی زحمت دی میں نے آپ کو۔

منشی جی: نہیں سرکار نہیں سرکار یہ تو میرے لیے عین راحت ہے اچھا سرکار تو اجازت ہے؟

(منشی جی جاتے ہیں)

سرکار: بیٹھ جاؤ بیٹی تم کھڑی کیوں ہو؟ ہاں تو کون سی کتاب پڑھ رہی تھیں بیٹیا؟ بھئی شاعری تو میری سمجھ میں آ بھی جاتی ہے مگر اور دوسری چیزیں میں نہیں سمجھ پاتا اور نہ تم سمجھاتی ہو رہ گئے وہ فلسفی اور شاعر وہ تو اپنی بحث میں اس قدر اُلجھے رہتے ہیں کہ دوسروں سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔

ناہید: ابا جان وہ دونوں تو عجیب ہی ہیں۔

سرکار: ہاں کچھ عجیب ہی ہیں مگر جمال بہت صحیح آدمی ہے کیا خیال ہے تمہارا بیٹی؟

ناہید: جی ابا جان۔

سرکار: بیٹی! تم جانتی ہو۔ مجھے تم کتنی عزیز ہو۔ میں نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ کسی طرح تم خوش رہو۔ تمہاری خوشی میری خوشی ہے تمہاری پسند میری پسند ہے اور بیٹی اب میری زندگی کا کیا ٹھکانہ ہے۔ چلا جا رہا ہوں جب تک

چلا جا رہا ہوں نہ جانے کس دن ایک جھونکا آئے اور مجھ کر رہ جاؤں گا ۔ (رک کر) تو بیٹی میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی میں ——— بیٹی تمھاری ماں زندہ نہیں ہے میں چاہتا ہوں کہ ——— اگر غلط نہیں سمجھتا تو ؛

ناہید : ابا جان میں آپ کی بیٹی ہوں آپ میرے بارے میں غلط کیسے سمجھ سکتے ہیں ۔

سرکار : نہیں بیٹی ! میں غلط بھی سمجھ سکتا ہوں ۔ بہت سی باتیں میں غلط سمجھتا رہا ۔ اور مجھے ڈر ہے ۔ یقین مانو بیٹی میں کبھی کبھی ڈر جاتا ہوں ۔ صرف یہ سوچ کر کہ تم بھی غلط سمجھ سکتی ہو مجھے خود اپنے ر ——— حال کو ——— پھر کیا ہوگا ۔ میں ڈر جاتا ہوں بیٹی اس لیے میں نے تم سے پوچھ لینا بہتر سمجھا میں نے عمر بھر زمینوں کا سودا کیا ہے بالکل غیر جذباتی طور پر میں جانتا ہوں کہ زندگی میں بھی سودا کیا جاتا ہے ۔ جذبات سے ہٹ کر ——— بہت سوچ سمجھ کر ۔

ناہید : اباجان ! آپ جو فرما رہے ہیں بجا ہے مگر جذبات سے تو انسان نجات نہیں پا سکتا زمین اور انسان میں فرق تو ہے ہی ۔

سرکار : ٹھیک ہے ، بیٹی ٹھیک ہے تم نے بھی فلسفی اور شاعر کی باتیں شروع کر دیں ؛ ہاں بیٹی خوب یاد آیا سنا ہے کل شام کو تم اپنے دوستوں کو چائے پر بلا رہی ہوں ؛ ہوں ؟

ناہید : یہ منشی جی کہہ رہے تھے ؟ میں نے اُن سے بندوبست کے لیے کہا تھا ۔

سرکار : بھئی کوئی بھی کہہ رہا ہو مگر تم نے ہمیں کیوں نہیں مدعو کیا ؟ اب کے ہم بغیر بلائے آئیں گے ۔ بھئی یہ بھی کوئی بات ہوئی بھلا ؟

آخر ہم بھی تو تمھارے دوست ہیں ؟

ناہید : واہ اباجان یہ الٹی شکایت ؛ ہم سب لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ ہم تو بلاتے ہیں اور آپ نہیں آتے ہمیشہ کہہ دیتے ہیں بوڑھا آدمی ہوں ، ہاں کہاں جاؤں اور آج آپ شکایت کرتے ہیں ۔

سرکار : اوہو ——— بھول گیا تھا بھئی آخر بوڑھا ہو گیا ہوں نا ۔ حافظ کام نہیں کرتا ۔ مگر دیکھو بھئی تم بھول نہ جانا ۔ اگر میں نہ آؤں تو تم مجھے بلا لینا ضرور ——— بھولنا نہیں ——— ہوں

ناہید: میں طبعی اور ثنا سو دونوں کو اس کام پر تعینات کر دوں گی۔

سرکار: تب تو بھی خیر نہیں وہ مجھے بیکر کہیں اور چلے جائیں گے۔

(ہنستا ہے)

ناہید: اچھا! جان تو میں ذرا بندوبست کرنے جاتی ہوں

سرکار: ضرور —— ضرور ——

(جانے کی آواز)

○

دوسرا منظر

چائے کی پارٹی ——— ہلکی ہلکی آواز ہنسی۔ قہقہے

ناہید: ابھی تک جمال صاحب نہیں آئے؟

فلسفی: جو نہیں آیا اس کی فکر مت کرو۔ جو آیا ہے اس کا شکر چاہیئے۔

شاعر: بھئی ——— تم سمجھیں ناہید فلسفی کا مطلب انھیں چائے پلاؤ۔

(دونوں ہنستے ہیں)

فلسفی: تم دونوں بہت ہنستے ہو؟

شاعر: پھر۔

فلسفی: پھر کیا ——— میں نے ایک بات کہی

شاعر: آخر اس کا کچھ مطلب بھی ہے۔ یا یونہی تمہارے فلسفے کی طرح ہے۔

فلسفی: دیکھو شاعر ہر بات میں مطلب مت تلاش کیا کرو۔ ورنہ تم شعر نہ کہہ سکو گے۔

شاعر: تمہارا مطلب ہے میں تمہاری طرح فلسفی ہو جاؤں گا۔

(ناہید اور شاعر ہنستے ہیں)

فلسفی: تم دونوں پھر ہنسے۔

ناہید: فلسفی معلوم ہوتا ہے کہ تم چائے کیلئے بے چین ہو۔

فلسفی: میں کسی کے لیے بے چین نہیں ہوتا۔ میں نہ شاعر کی طرح ہوں نہ تمہاری طرح۔

شاعر: تم بالکل اپنی طرح ہو۔ یعنی جھوٹے۔

فلسفی: شاعر ——— تم ہر لفظ کو بغیر سمجھے بوجھے استعمال کر دیتے ہو تمھیں جھوٹ اور سچ کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم۔ کچھ بھی نہیں۔ جھوٹ سچ بھی ہو سکتا ہے اور سچ جھوٹ بھی۔ مگر تمھیں کیا معلوم، تم تو

شعر کہتے ہو۔ لفظ پرست ہو۔ احتیاط۔ احتیاط۔ بڑی احتیاط کیا کرو۔ لفظوں کے استعمال میں۔

شاعر : احتیاط کرتے کرتے تو یہ نوبت پہنچ گئی جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کہنے لگے۔ میاں فلسفی سچ میں بھی احتیاط چاہیئے۔

(باپ کا آنا)

ناہید : دیکھئے ابا جان دونوں بحث کئے جا رہے ہیں۔ چائے کیلئے دونوں بے چین ہیں اور ابھی تک جمال صاحب نہیں آئے۔

سرکار : میں ابھی اُن کے ہاں فون کرواتا ہوں۔

شاعر : آتے ہی ہوں گے ــــــ گھبراہٹ کیوں ہے ناہید ــــــ

سرکار : نہیں گھبراہٹ تو کوئی نہیں ہے۔ آپ لوگ چائے کے بغیر بحث کئے جا رہے ہیں۔ یہ ذرا تشویش ناک ہے

(ایک ٹرک کی آواز دُور سے آتی ہے)

شاعر : آ رہا ہے جمال۔ کار کی آواز آ رہی ہے۔

(ٹرک گھڑگھڑاتی ہوئی نکل جاتی ہے)

(وقفہ)

فلسفی : تمھارا اندازہ ہمیشہ غلط ہوتا ہے۔

شاعر : میں اندازہ نہیں کرتا۔ قیاس تمہیں مبارک ہو۔ میرے سامنے ہر شئے مجسم ہو کر آ جاتی ہے

فلسفی : جی ہاں! ٹرک کار بن کر آ جاتی ہے۔ چہ ــــ چہ ــــ بے چارا شاعر!

(موٹر کے ہارن کی آواز آتی ہے ــــ پوں ــ پوں ــ)

ناہید : آ گئے جمال صاحب۔

سرکار : ہاں معلوم تو ہوتا ہے۔

(زینے پر قدموں کی آواز آتی ہے ــ جمال آتا ہے)

جمال : ہیلو لیڈی ہاڈی ــــ ارے ابا جان بھی آج موجود ہیں! آداب عرض ہے۔

سرکار : بیٹھئے رہو میاں ! بھئی جمال میاں بڑا انتظار تھا تمھارا بیٹھو ——— بیٹھو بھئی ——— ابھی بڑی دلچسپ بحث ہو رہی تھی۔

جمال : فلسفی اور شاعر ہیں؟ وہ تو میں جانتا ہی تھا۔

فلسفی : جمال نہ تم کچھ جانتے تھے۔ نہ جانتے ہو۔ نہ جانو گے۔

جمال : یہ تو ٹھیک ہے اور خدا کا شکر ہے میں تمھاری طرح کچھ بھی نہیں جانتا۔

شاعر : سبحان اللہ جمال میاں ! کیا خطبہ کہا ہے۔ ذو معنی۔

جمال : آداب بجا لاتا ہوں حضور۔ مگر میرا اشارہ حضور کی طرف بھی تھا۔

سرکار : اچھا بھئی تم لوگ بحث کرو میں چائے بنوا تا ہوں

ناہید : اباجان آپ تکلیف نہ کیجئے۔ میں بنوا لوں گی۔

سرکار : نہیں نہیں تم بیٹھو بیٹا ——— بیٹھو تم ———

(کئی ٹرکیں گھڑگھڑاتی ہوئی گذر جاتی ہیں)

جمال : ناہید اس مکان کے سکون کو اس گھڑگھڑاہٹ نے چھین لیا۔

ناہید : ہاں یہ عجیب آفت سر پہ آگئی ہے۔ دن رات موٹریں چلا کرتی ہیں شور و غل ہوا کرتا ہے جب سے یہ فیکٹری یہاں بننے لگی ہے پڑھنا لکھنا سب دشوار ہو گیا ہے کبھی کبھی تو نیند بھی نہیں آتی۔

فلسفی : اس کی وجہ ٹرک کی آواز نہیں۔

ناہید : پھر کیا ہے؟

فلسفی : جمال سے پوچھو

جمال : تم ہمیشہ کے بے وقوف ہو فلسفی تمھیں سلیقہ نہیں آتا۔

فلسفی : بے وقوف ہم دونوں ہیں البتہ سلیقہ تمھیں آتا ہے اور سلیقہ جسے تم سلیقہ کہتے ہو چالاکی ہے اور کچھ نہیں۔

ناہید : فلسفی تم فضول باتیں بہت کرتے ہو۔

فلسفی : ساری دنیا کرتی ہے اور ہمارا شاعر بھی کرتا ہے جو ساری دنیا ہے۔

جمال : ساری دنیا ہی نہیں، دنیا سے بلند کیوں شاعر؟

شاعر : جمال صاحب! آپ شاعری اور شاعر سے سروکار نہ رکھیے۔ ادھر خسارہ ہی خسارہ ہے۔

جمال : وہ تو ظاہر ہے۔

فلسفی : ظاہر تو کچھ بھی نہیں ہے۔

جمال : فلسفی یہاں بات یہ ہے کہ دن کو تمہیں کچھ سجھائی نہیں دیتا

(باہر بہت سے لوگوں کی آواز آتی ہے۔ جیسے وہ کوئی بہت بھاری

بوجھ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں)

شاعر : اس فیکٹری نے اس مکان کا سارا حسن چھین لیا ہے۔

فلسفی : اور جو کچھ رہ گیا ہے اسے جمال چھین لے گا۔

ناہید : فلسفی تمہاری زبان بہت تیز ہے۔

فلسفی : جی نہیں ذہن بہت تیز ہے۔

شاعر : جی نہیں۔ بھوک بہت تیز ہے۔

(قہقہہ)

جمال : گھبراؤ نہیں شاعر۔ چائے آ رہی ہے۔

(پھر وہی چیخ و پکار آتی ہے)

شاعر : کیا ستم ہے۔ شام کو بھی یہ لوگ چین نہیں لینے دیتے۔

جمال : واقعی ناہید جو تو دن رات کی کوفت ہے کتنا سکون تھا پہلے اس مکان میں۔ شہر سے دور۔ آس پاس کھلی ہوئی فضا۔ کھلی ہوا اور اب سر پر موٹریں چلتی ہیں۔ شور و غل، چیخ و پکار۔ آخر تم نے اپنے ابا جان سے کہا کیوں نہیں کہ وہ فیکٹری والی زمین خود ہی خرید لیتے۔ بجائے اس کے کہ یہاں سر پر فیکٹری قائم کی جائے یہ تو ایک وبال ہے۔

فلسفی : زمین وبال ہے۔ فیکٹری وبال ہے۔ آدمی وبال ہے۔ زندگی وبال ہے۔ سکون سکون سکون یہاں کہاں؟

شاعر : اور اب یہاں شہر کھنچ کے چلا آئے گا۔ (کچی سڑکیں گندھاتی ہیں) دیکھا جمال۔ کس قدر غیر مہذب جگہ ہو گئی ہے

یہ کچھ دنوں میں تو یہاں کوئی نہ رہ سکیگا۔ دنیا بھر کے لوگ اس دیوار کے پیچھے جمع ہو جائیں گے۔ گنوار، جاہل میلے کچیلے ——— لڑتے جھگڑتے ہوئے برباد ہو گئی یہ زندگی ———

ناہید۔ میں ابا جان سے کہوں گی کسی اور مکان میں چلے چلیں (ابا جان آتے ہیں)

سرکار: چلو بھئی چائے لگ گئی ہے۔

جمال: لو میاں فلسفی مبارک۔

فلسفی: مبارک باد میری طرف سے بھی قبول فرمایئے۔

شاعر: اور میری طرف سے بھی۔

جمال: کیوں؟

شاعر: ناہید اور آپ دونوں کو مبارک باد۔

(ہنستا ہے)

فلسفی: اس دفعہ تم میری بات سمجھ گئے شاعر۔

شاعر: میں تو تمہاری بات سمجھ جاتا ہوں۔ مگر تم میری بات نہیں سمجھتے۔

سرکار: ارے بھئی بحث پھر کر لینا۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔

فلسفی: چلو بھئی چلو۔ (برتنوں کی آواز)

جمال: ناہید چائے بہت اچھی ہے۔

سرکار: ان معاملات میں ناہید کا انتظام بے انتہا اچھا ہوتا ہے۔

فلسفی: بڑی اچھی لڑکی ہے ناہید۔

ناہید: (ہنس کر) اوہو۔ بہت بزرگ بن کر آپ فرما رہے ہیں۔ ابا جان ابھی جمال صاحب فرما رہے تھے یہ جگہ اب رہنے قابل نہیں ہے۔

سرکار: کیوں؟

ناہید: وہی ابا جان یہ دیوار کے پیچھے فیکٹری جو قائم ہو گئی ہے ہر وقت کا عذاب ہے یہ۔ آپ نے اس زمین

کو خرید لیا ہوتا تو اچھا ہوتا۔

سرکار : (چونک کر) میں نے، اسے میں نے خرید لیا ہوتا ؟

ناہید : میرا مطلب یہ ہے ابا جان! جیسا کہ جمال صاحب بھی کہہ رہے تھے۔ فیکٹری بننے سے تو یہ جگہ محفوظ رہتی۔

سرکار : ہاں ہاں یہ تو صحیح ہے مگر اب کیا ہو سکتا ہے بٹیا۔

ناہید : یہاں تو اب چار شریف آدمیوں کو بلایا بھی نہیں جا سکتا۔

جمال : ناہید! کسی اور جگہ مکان کیوں نہ بنوا لیا جائے۔

ناہید : ہاں ابا جان میرا بھی یہی خیال ہے۔

سرکار : ہاں بیٹی! ضرور ذرا ڈھنگ کی کوئی جگہ مل جائے تو یہاں سے کسی اور جگہ اٹھ چلیں گے۔

فلسفی : مگر وہاں بھی تو مکان بنتے بناتے سال چھ مہینے لگ ہی جائیں گے۔

جمال : کوئی بات نہیں فلسفی صاحب۔ یہاں سے تو نجات مل جائے گی اس دھوئیں دھکڑ میں سانس لینا دشوار ہو رہا ہے۔

ناہید : ابا جان۔ جمال صاحب کا کہنا ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔

(باہر سے پھر شور و غل کی آوازیں آتی ہیں اتنے زور کی کہ اندر کی آواز دب جاتی ہے)

ناہید : (چیخ کر) ابا جان یہاں آخر کوئی کیسے رہ سکتا ہے ابا جان یہ سنئے منشی جی کو ذرا بھیج کر اس فیکٹری کے کسی صاحب کو بلا کر سمجھا دیجئے کہ شور و غل تو کم کرا دیں۔ اس مکان میں آدمی بستے ہیں۔ جانور نہیں۔

سرکار : ہوں۔ میں ابھی منشی جی کو بھیجتا ہوں۔

ناہید : آپ بیٹھئے میں منشی جی سے کہہ آتی ہوں

سرکار : نہ نہ تم یہیں رہو ناہید بیٹا۔ میں بلوا کر سمجھا دیتا ہوں۔

ناہید : نہیں ابا جان! یہ ناقابل برداشت ہے میں منشی جی سے کہے دیتی ہوں۔

(جانے کی آمادہ باہر جا کر ناہید آواز دیتی ہے)

ناہید : منشی جی ـــــــ منشی جی

منشی جی : جی بیٹا ـــــــ جی بیٹا

ناہید : منشی جی ! اس فیکٹری کا کوئی مالک یا جو کوئی بھی ہو جا کر بلا لاؤ ۔

منشی جی : بیٹا اس وقت تو صرف منیجر صاحب ہوتے ہیں وہی آج کل دن رات یہاں رہتے ہیں ۔

ناہید : تو انہیں بلا لائیے ۔ جلدی ۔ حد کر دی ہے ۔ ان لوگوں نے ۔

منشی جی : ابھی جا کر بلا لایا بیٹا

(جانے کی آواز)

وقفہ

سرکار : کیوں بیٹی ۔ کوئی ملا ؟

ناہید : بھیجا ہے منشی جی کو ابا جان ! وہ منیجر صاحب کو بلا لائیں گے ۔

سرکار : ہیں ؟ منیجر صاحب کو ، یہاں بلایا ہے ؟

ناہید : کیوں ابا جان ـــــــ آپ گھبرا کیوں رہے ہیں ؟

سرکار : کوئی نہیں بیٹی ۔ ۔ ۔ تو ـــــــ ایسے لوگوں کو یہاں بلانا بھی ـــــــ اور خاص طور سے ایسے وقت جب دوسرے لوگ چائے پہ بیٹھے ہیں ذرا ـــــــ

ناہید : کوئی بات نہیں ۔ ایک کپ چائے بھی پی لیں گے ـــــــ

جمال : ایک کپ نہیں ـــــــ "ایک کوپ" کہو ـــــــ

(ہنستا ہے)

شاعر : آپ ہنستے کیوں ہیں جمال صاحب ۔ کسی دن آپ بھی بولنے لگیں گے ۔

(منشی جی اور منیجر آتے ہیں)

منشی جی : منیجر صاحب آئے ہوئے ہیں ۔

ناہید : بھیج دیجئے ۔

سرکار : آیئے منیجر صاحب ۔ آیئے تشریف لائیے ۔ لیجئے چائے پیجئے ۔

فرخ : شکریہ ! کہئے کیسے بلایا ۔

سرکار : کوئی خاص بات نہیں ہے ۔ منیجر صاحب ۔

ناہید : بات یہ ہے منیجر صاحب ۔ رات ہو رہی ہے ۔ اور آپ کی فیکٹری کا کام بند نہیں ہوا ۔ اس قدر شور و غل ہوتا ہے کہ کہا نہیں جا سکتا ۔

فرخ : مجھے افسوس ہے ۔ مگر کیا بتاؤں ۔ فیکٹری چونکہ زیر تعمیر ہے ۔ اس لیے یہ ٹرکس بار بار آتی جاتی ہیں ۔ ہم لوگ جلد سے جلد اسے چلا دینا چاہتے ہیں ۔

ناہید : ابھی یہ حال ہے ۔ جب چلنے لگے گی فیکٹری تو کیا حشر ہوگا ۔

فرخ : یہ تو آپ جانتی ہی ہیں ۔ کارخانے جہاں ہوتے ہیں وہاں تھوڑا بہت شور و غل تو ہوتا ہی ہے ۔

ناہید : آپ اسے تھوڑا بہت کہتے ہیں ۔ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی ۔

جمال : ناہید ! منیجر صاحب تو اس کے عادی ہیں ۔

فرخ : جی ہاں ! میں تو اس کا عادی ہو گیا ہوں ۔ رفتہ رفتہ آپ لوگ بھی اس کے عادی ہو جائیں گے ۔

جمال : یعنی آپ ہی کی طرح منیجر صاحب ہو جائیں گے ۔ خدا نخواستہ ۔

(ہنستا ہے ۔ دوسرے بھی ہنستے ہیں)

فرخ : جی میری طرح تو آپ نہ ہو سکیں گے ۔ مگر کوشش کیجئے ۔

جمال : منیجر بننے کی ۔

فرخ : برائی کیا ہے ۔ شاید کام کے آدمی بن سکیں ۔

جمال : وہ تو آپ کو دیکھ کر ہی ظاہر ہو گیا ۔ نام بھی منیجر کام بھی منیجری ۔

(ہنستا ہے)

فرخ : نام تو میرا منیجر نہیں ہے ۔ نام تو میرا فرخ ہے ۔

جمال : کیا فرمایا آپ نے ؟

فرخ : فرخ ــــــــ

جمال : اچھا فرخ صاحب عرف منیجر صاحب ! آپ بڑے کام کے آدمی ہیں ۔ یہ تو معلوم ہو گیا مگر آپ ایک کام اور کیجئے ۔ خدا کیلئے یہ شور و غل بند کروا دیجئے ۔

فرخ : یہ میرے بس کی بات نہیں ہے ۔

ناہید : فرخ صاحب ــــــ آخر تہذیب بھی کوئی چیز ہے ۔

فرخ : میری تہذیب اور آپ کی تہذیب میں فرق ہے ۔

(باہر پھر ٹرک کے کھڑکھڑانے کی آواز آتی ہے)

ناہید : یہ ہے آپ کی تہذیب ۔

فرخ : جی ہاں ۔

شاعر : تم شعر بھی سمجھ سکتے ہو منیجر صاحب ۔

فرخ : جی نہیں ۔

فلسفی : تم فلسفہ نہیں سمجھ سکتے ۔ فرخ میاں ؟

فرخ : جی نہیں ۔

جمال : پھر آپ کیا سمجھ سکتے ہیں ۔

فرخ : میں اپنی فیکٹری کو سمجھتا ہوں ۔ مشینوں کو سمجھتا ہوں ۔ ان کے ہر کل پرزے سے واقف ہوں ۔ میں نے اس کی ٹریننگ حاصل کی ہے ۔ میں یہ جانتا ہوں کہ کام کرنا باتیں بنانے سے زیادہ مشکل ہے ۔

ناہید : فرخ صاحب ! یہاں شاعر اور فلسفی ویسے ہی موجود ہیں ۔ آپ لیکچر رہنے دیجئے ۔

فرخ : اچھا تو اجازت دیجئے ۔

ناہید : (طنزیہ) فرخ صاحب آپ واقعی فیکٹری کے منیجر ہیں ۔ اس قابل ہیں ۔

فرخ : آپ خفا ہیں ۔ مگر میں مجبور ہوں ۔ آپ اپنی چار دیواری کو دنیا سمجھے ہوئے ہیں ۔ آپ نے جھانک کر کبھی باہر نہیں دیکھا ۔ اس دیوار کے پیچھے دنیا بدل رہی ہے ۔ دنیا بدل گئی ہے ۔

سرکار : منیجر صاحب! آپ ناہید کی باتوں سے خفا ہوں گے۔

ناہید : آپ ایسے لوگوں سے ایسی باتیں کیسے کر لیتے ہیں۔ میں تو ایسے لوگوں پر خفا ہونا بھی اپنی توہین سمجھتی ہوں۔

فرخ : یہ تو آپ اپنے ابا جان کو سمجھ دیجیے۔ وہ اور منیجر جی کتنی بار میری فیکٹری پر جا چکے ہیں۔

سرکار : منیجر صاحب اب آپ جا سکتے ہیں۔ چلیے میں آپکو باہر تک پہنچا آؤں۔

فرخ : شکریہ ——— میں خود ہی چلا جاؤں گا۔

ناہید : ابا جان ——— آپ کو کیا ہو گیا ہے۔

سرکار : کچھ نہیں بیٹا۔ کچھ نہیں۔ اسے تم بیٹھو۔ میں ——— میں ابھی آتا ہوں۔

ناہید : ابا جان! ——— ابا جان آپ نہیں جا سکتے۔

فرخ : میں خود ہی چلا جاؤں گا۔ مجھے کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔

(جاتا ہے)

ناہید : ابا جان۔ آپ وہاں کیوں گئے تھے۔ بتایئے ابا جان۔ آپ فیکٹری پر کیوں گئے تھے؟

سرکار : تم کس قدر عجیب ہو بیٹی۔ بھئی میں اس لیے گیا تھا منع کرنے اس شور و غل کو روکنے۔

ناہید : سچ کہتے ہیں ابا جان؟

سرکار : (مسکرا کر) سچ بیٹی۔ بالکل سچ۔

ناہید : کس قدر غیر مہذب ہے یہ منیجر ابا جان۔

سرکار : ہاں ہاں۔ بہت غیر مہذب ہے۔ بہت ———

فیڈ آؤٹ

○

تیسرا منظر

سرکار اپنے کمرے میں لیٹے ہوئے ہیں۔ منشی جی کو آواز دیتے ہیں

سرکار : اے منشی جی —— منشی جی !

منشی جی ۔ جی سرکار آیا ۔

(آنے کی آواز)

سرکار : منشی جی ! کل شام کا واقعہ معلوم ہے آپ کو

منشی جی : معلوم ہے سرکار ۔

سرکار : ناہید اس بنیجر سے کس قدر خفا ہو گئی ۔ وہ اس جگہ کو چھوڑ دینا چاہتی ہے ۔

منشی جی : پھر کیا ہوگا سرکار ؟

سرکار : کوئی دوسرا مکان کہیں بنوانا ہوگا منشی جی ۔ جیسے بھی ہو ۔

منشی جی : مگر سرکار ۔

سرکار : کچھ نہیں منشی جی ۔ ناہید کی خوشی میری خوشی ہے ۔

منشی جی : مگر سرکار آپ جانتے ہیں ۔ آپ جانتے ہیں سرکار مکان بنانے کے لیے کافی رقم کی ضرورت ہے ۔

سرکار : ہوں ۔ منشی جی ۔ اس مکان کو فیکٹری کے بنیجر سے مل کر فروخت کر دیجئے ۔

منشی جی : جی سرکار :

سرکار : ہاں منشی جی ! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ۔ مجھے جو کچھ پہلے کرنا چاہئے تھا وہ میں اب کر رہا ہوں اور اب وقت گذر چکا ہے منشی جی ۔ اب وقت گذر چکا ہے اب تو زمین پر فیکٹری ہی بنے گی اور میری جائیداد فروخت ہو جائے گی ۔ وہ تو فروخت ہو چکی اب رہ ہی کیا گیا ہے ۔

منشی جی : سرکار آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں ۔

سرکار: منشی جی! آپ کل ہی جاکر مکان اور اسکے ارد گرد جو زمین ہے۔ اس کی بات چیت بنیجر سے کر آئیں اب اسے فروخت کر دینا ہی بہتر ہے۔ مگر کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو منشی جی سمجھے آپ۔

منشی جی: بہت اچھا سرکار!

سرکار: میں چاہتا ہوں زمین کو پہلے بیچ دیا جائے اور مکان بعد میں فروخت ہو جائے گا۔ زمین کے روپے سے میں ناہید کی شادی کرنا چاہتا ہوں۔

منشی جی: جی سرکار!

سرکار: ہاں منشی جی۔ آپ سمجھنے کیوں نہیں۔ آج میں معاملہ کو آپ سے زیادہ سمجھ گیا ہوں مجھے تعجب سے نہ دیکھئے منشی جی! مکان ابھی رہنے دیجئے۔ یہیں ناہید کا بیاہ ہو گا۔ زمین بیچ دی جائے مگر منشی جی جمال کو نہ معلوم ہو ورنہ مجھے ڈر لگ رہا ہے منشی جی۔

(ناہید کی آواز آتی ہے)

ناہید: ابا جان! —— —— ابا جان!!

سرکار: منشی جی! ناہید آرہی ہے آپ جائیے۔ مگر نہایت احتیاط سے معاملہ کیجئے۔

(جانے کی آواز)

(فیڈ آؤٹ)

○

چوتھا منظر

موٹر کی آواز نیڈران ہوتی ہے۔ ہارن کی آواز۔ پھر موٹر سے اترنے
کی آواز۔

(ناہید جمال کے مکان پہ آتی ہے)

ناہید : (ملازم سے) جمال صاحب ہیں ؟

ملازم : جی ہاں۔ اطلاع کردوں ؟

ناہید : نہیں رہنے دو۔ میں خود چلی جاتی ہوں۔

(جانے کی آواز)

جمال : ہیلو ناہید آج بے وقت کیسے۔ بیٹھو کچھ پریشان سی نظر آتی ہو۔

ناہید : ہاں ! بہت پریشان : ابا جان کل سے بہت پریشان ہیں۔

جمال : کیوں خیریت۔ تو ہے کیا بات ہے ؟

ناہید : کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔

جمال : آخر ایک دم سے کیا بات ہوئی۔

ناہید : میں نے ابا جان سے بہت پوچھا۔ ہر طرح سے پوچھا مگر وہ کچھ بتاتے ہی نہیں۔ کہہ دیتے ہیں۔ کوئی بات نہیں۔
ہے مگر وہ پریشان بہت ہیں۔ ہو سکتا ہے ——————

جمال : کیا ہو سکتا ہے۔

ناہید : کیا بتاؤں۔ کیا ہو سکتا ہے۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ جمال تم ہمیشہ میرے ساتھ رہو گے ؟

جمال : ہمیشہ ——— ہمیشہ ناہید۔

ناہید : سچ کہتے ہو جمال

جمال : سچ!

ناہید : اب میں تم سے کہہ سکتی ہوں - اب مجھے ڈر نہیں ہے - ابا جان اور منشی جی کچھ بات کر رہے تھے اور منیجر بھی تو کہہ رہا تھا کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے - ضرور مگر کیا ہے میں یہ نہیں سمجھ سکی -

جمال : ہاں کچھ شک مجھے بھی ہے - تمھارے ابا جان منیجر کو دیکھ کر پریشان ہو گئے تھے مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا -

ناہید : پھر کیا ہوا کچھ بتاؤ جمال -

جمال : چلو ابھی چلتے ہیں خود منیجر سے دریافت کرتے ہیں ؛

ناہید : مگر وہ بتائے گا ؛

جمال : کیوں نہیں بتائے گا - چلو ابھی چلتے ہیں -

(جانے کی اور موٹر اسٹارٹ ہونے کی آواز - موٹر کے رکنے کی آواز -

جمال اور ناہید اترتے ہیں - مختلف قسم کے شور و غل کی آواز)

جمال : یہ آگئی فیکٹری - کس قدر شور ہے -

ناہید : ہوں - بڑی گھٹی ہوئی فضا ہے یہاں کی -

جمال : منیجر کا کمرہ وہ سامنے معلوم ہوتا ہے - چلو ادھر چلیں -

(چلنے کی آواز - پاس پہنچ کر ایک آدمی سے پوچھتا ہے ——

(کیوں بھئی یہ منیجر صاحب کا کمرہ ہے)

ملازم : جی ہاں ! بیٹھئے وہ ابھی ایک آدمی سے بات کر رہے ہیں -

جمال : بیٹھ جاؤ ناہید - یہیں بیٹھ جاؤ - ابھی ملتے ہیں منیجر صاحب سے -

دونوں بیٹھ جاتے ہیں - کمرے کے اندر سے منیجر کی آواز آتی ہے

فرخ : (کمرے سے آواز آتی ہے) تو منشی جی آپ کے سرکار یہ باقی زمین اور مکان بھی فروخت کر رہے ہیں ؛

منشی جی : (آواز کمرے سے آئیگی) ہاں منیجر صاحب فیکٹری کیلئے آپ کو زمین دی ہی جا چکی ہے اب اتنی زمین کیوں پڑی ہے -

جمال : (باہر ناہید سے بہت دھیرے کہتا ہے) سن رہی ہو ناہید؟

ناہید : مگر یہ تو منشی جی معلوم ہوتے ہیں۔

جمال : (چُپ کراتے ہوئے) منشی جی۔ آہستہ بولو۔ ناہید ذرا سنو۔

فرخ : (آواز آتی ہے) مگر منشی جی۔ یہ آپ کے سرکار کو ایکدم سے کیا ہو گیا ہے ؟ سب کچھ فروخت ہی کر ڈالیں گے۔

منشی جی : کیا بتاؤں منیجر صاحب۔ معاملہ ہی ایسا آ پڑا ہے۔ سرکار کی جائیداد پہلے ہی نکل چکی ہے اب رہی سہی زمین تھی اُسے بھی فروخت کرنا پڑ رہا ہے۔

فرخ : آخر بات کیا ہے ؛

منشی جی : بات کیا ہے۔ زمانے کی گردش ہے سرکار بٹیا کا بیاہ کرنا چاہتے ہیں اب بغیر اس زمین کے بیچے اخراجات کیسے برداشت کیئے جا سکتے ہیں۔

فرخ : اچھا تو یہ بات ہے مگر بیاہ کیلئے اتنے خرچ کی کیا ضرورت ہے۔ سادہ طور پر کیوں نہیں کر دیتے ؟

منشی جی : آپ نہیں سمجھتے منیجر صاحب۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ سرکار کے پاس اب جائیداد نہیں رہی تو ممکن ہے۔ ممکن ہے کہ بیاہ نہ ہو سکے منیجر صاحب۔ آپ یہ بات کسی سے کہئے نہیں۔

ناہید : (ایک دم سے چونک کر اُٹھ بیٹھتی ہے) منشی جی۔ منشی جی !

منشی جی : کون۔ آپ بیٹا آپ یہاں کہاں ؟

ناہید : منشی جی ! یہ آپ کیا کہہ رہے تھے۔ آپ نہایت — آپ نہایت — اوہو — میں کہاں آ گئی۔

منشی جی : بٹیا ! میں کچھ بھی نہیں کہہ رہا تھا۔

ناہید : آپ ——— آپ منشی جی (رُک کر) ہاں منشی جی۔ آپ کچھ بھی نہیں کہہ رہے تھے یہ سب ابا جان کہہ رہے تھے۔

منشی جی : ابا جان کہہ رہے تھے ——— یہ تم کیا کہہ رہی ہو بٹیا۔

ناہید : معلوم نہیں کیا کہہ رہی ہوں منشی جی، مجھے کچھ بھی نہیں معلوم۔

منشی جی : جمال میاں آپ بٹیا کو گھر لے جائیے ۔

جمال : چلو ناہید میں تمہیں گھر چھوڑ آتا ہوں ۔

ناہید : میرے گھر ـــ پھر ـــــ آپ مجھے چھوڑ کر چلے جائیے گا ؟

جمال : کیسی باتیں کرتی ہو ۔ ناہید ـــــ چلو ـــــ آؤ

(موٹر سٹارٹ ہونے کی آواز ۔ موٹر رکنے کی آواز ۔ دروازہ کھلنے کی آواز)

جمال : اچھا ناہید ۔ اب جاکر سو جاؤ ۔ تم بہت تھک گئی ہو کچھ سوچنا ہے ۔

ناہید : اور آپ کہاں جا رہے ہیں ۔

جمال : میں اپنے گھر جا رہا ہوں ۔

ناہید : اپنے گھر ۔

جمال : ہاں ۔

ناہید : آپ بیٹھیں گے نہیں ؟

جمال : نہیں مجھے بہت کام ہیں ۔ اچھا میں چلا تم اس قدر پریشان کیوں ہو آخر ایک نہ ایک دن یہ بات معلوم ہی ہوتی اچھا ہوا آج ہی معلوم ہو گئی ۔ یہ ضرور ہے کہ تمہارے ابا جان نے تمہیں دھوکہ دیا ہے ۔

ناہید : دھوکہ دیا ہے ۔ ابا جان نے مجھے دھوکہ دیا ہے ۔

جمال : ہاں تمہیں تمہاری زندگی کے سارے خوابوں کو ۔ خیر خدا حافظ ۔

(موٹر روانہ ہو جاتی ہے)

(منشی جی اور سرکار گفتگو کر رہے ہیں)

سرکار : منشی جی ۔

منشی جی : جی سرکار ۔

سرکار : منشی جی ۔

(پھر رُک جاتے ہیں)

منشی جی : جی سرکار ۔

سرکار : کچھ نہیں منشی جی جو ہونا تھا ۔ ہو چکا ۔ اس میں کسی کا قصور نہیں ۔ کسی کی خطا نہیں ہے ۔ ناہید بٹیا کو ایک دن یہ معلوم ہونا ہی تھا ۔ آخر کب تک یہ جھوٹ چلتا ۔ کب تک ۔ مگر اب کیا ہوگا (سانس لے کر) کیوں منشی جی ۔ آپ جمال کے ہاں گئے تھے نا ۔ انھوں نے کیا کہا ۔ واقعی انکار کر دیا ؟

منشی جی : ہاں سرکار ۔ ان کی آنکھیں بدل گئی ہیں ۔ میں گیا تو بڑی دیر کے بعد باہر نکلے اور صاف جواب دے دیا ۔

سرکار : کیا کہا ۔ انھوں نے ؟

منشی جی : کیسے بتاؤں سرکار

سرکار : بتائیے منشی جی ۔ میں اب سب کچھ سن چکا ہوں ۔

منشی جی : سرکار ! کہنے لگے ۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ سرکار کا یہ حال ہے میں ایسے گھرانے میں شادی نہیں کر سکتا ۔ مجھے اپنے آپ کو تباہ کرنا ہے کیا ؛

سرکار : ٹھیک ہی کہتے تھے منشی جی ! وہ مجھے یوں ہونک کر مت دیکھئے منشی جی ۔ وہ ٹھیک کہتے تھے اُنکا اگر یہ حال ہوتا تو میں بھی نہیں کرتا ۔ وہ وہاں منشی جی ۔ ایسے گھرانوں میں یہی ہوتا ہے ۔ سودا مستقل سودا ۔ مول ۔ تول جب تک جیب گرم ہے ایک دوسرے کو لوگ پہچانتے ہیں اس کے بعد اجنبی ہو جاتے ہیں ۔ یہ میں بھی طرح جانتا ہوں منشی جی ۔ یہی زہر میں بھی پیئے ہوئے ہوں ۔ یہی خون ۔ زہریلا خون مجھ میں بھی ہے ۔

(قدموں کی آواز)

منشی جی : سرکار ۔ بٹیا آرہی ہیں ۔ بٹیا آرہی ہیں ۔

سرکار : آنے دو منشی جی ۔ آؤ بیٹی ۔ ارے تم ۔ اس قدر اداس کیوں ہو ۔ ہائیں یہ کیا ۔ تمھاری آنکھوں میں آنسو ۔

ناہید : اباجان ! میں سب سُن رہی تھی ۔

سرکار : سُن رہی تھیں ۔ اوہ تو تم نے ہماری گفتگو سُن لی ؟

ناہید : اباجان !

پھوٹ کر رونے لگتی ہے

سرکار : بیٹی ۔ بیٹی تمھارا باپ تمھارا مجرم ہے تم اسے معاف نہیں کر سکتی ہو بیٹی ادھر دیکھو بیٹی ۔ بیٹی سنو تو وہ ———

ناہید : اباجان ! ہم سب مجرم ہیں ۔ ایک دوسرے سے ڈرتے رہتے ہیں ۔ چھپے رہتے ہیں حقیقت کا سامنا نہیں کرتے ۔ میں اب چھپ چھپ کے باتیں سننے لگی ہوں ۔ مگر ہم مجبور رہیں ۔ زندگی بدل چکی ہے اور ہم اس حال میں ہیں ۔ دنیا سے دور ۔ دنیا سے الگ ۔ ہم نے دنیا اور اپنے درمیان ایک سمجھے ہیں کہ ادھر کچھ بھی نہیں ہے حالانکہ سب کچھ ادھر ہے ———— ہزاروں لاکھوں کام کرنے والے آدمی اُدھر ہیں اور یہاں میں ہوں ۔ آپ ہیں منشی جی ہیں اور کوئی بھی نہیں ۔ اس دیوار کے پیچھے سب کچھ ہے اور ادھر اُدھر تنہائی ہے خاموشی ہے ۔ میں یہاں رہ نہیں سکتی ۔ یہاں میرا دم گھٹ رہا ہے اباجان ! یہاں زندگی نہیں ۔ یہاں ویرانی ہے ۔ یہاں سب سرگوشیوں میں بولتے ہیں ۔ ایک دوسرے سے ڈرتے ہوئے اور وہاں شور شامل ہے ۔ کھلی ہوئی آواز ہے ۔ زندگی کی آواز ۔ میں یہاں نہیں رہ سکتی اباجان ۔ یہ جگہ مجھے نگل لے گی ۔ میں جا رہی ہوں

(ٹرک کے گھڑگھڑانے کی آواز)

سرکار : کہاں جا رہی ہو بیٹی ۔ کہاں جا رہی ہو ۔

ناہید : فیکٹری کی طرف ۔

سرکار : فیکٹری کی طرف ۔ وہاں کیا ہے ؟

ناہید : میں وہاں کام کرنا چاہتی ہوں ۔ کوئی بھی کام کچھ بھی ہو ۔

(تیزی سے جاتی ہے ۔ راستے میں قمرخ ملتا ہے)

فرخ : منشی جی ہیں۔ آپ اس قدر تیزی سے کہاں جا رہی ہیں۔

ناہید : فرخ صاحب۔ منیجر صاحب

فرخ : آپ مجھے فرخ ہی کہئے۔

ناہید : منیجر صاحب!

فرخ : آپ مجھ فرخ ہی کہئے تو کیا بُرا ہے۔

ناہید : فرخ صاحب میں آپ ہی کے ہاں جا رہی تھی۔

فرخ : میرے یہاں۔

ناہید : ہاں فیکٹری میں۔ منیجر صاحب (رُک کر) معاف کیجئے فرخ صاحب آپ کے ہاں کوئی جگہ ہے میرا مطلب ہے لکھنے پڑھنے کی۔

فرخ : کیوں کیا بات ہے؟

ناہید : میں کام کرنا چاہتی ہوں۔ کیسا بھی ہو کام کرنا چاہتی ہوں۔

فرخ : یہ تو نیک خیال ہے۔

ناہید : آپ مذاق سمجھتے ہیں۔ آپ مسکرا رہے ہیں۔

فرخ : نہیں میں خوش ہو رہا ہوں۔ واقعی خوش ہو رہا ہوں۔ لیکن ابھی فیکٹری تیار نہیں ہوئی جس وقت تیار ہو جائے گی اور جگہ ہو گی۔ میں ضرور آپ کو اطلاع کرا دوں گا۔ یوں آپ چلئے آج فیکٹری دیکھ لیجئے یہ ایک نئی دنیا ہے اور آپ کے لیے ایک نیا تجربہ ہے۔

ناہید : اور آپ کے لیے۔

فرخ : میں تو اس کا عادی ہوں اور میری تو دنیا ہی ہے۔

ناہید : میں چاہتی میری دنیا بھی یہی ہو جائے۔

فرخ : اس دنیا سے اس دنیا میں چلی آیئے یہ دنیا آپ کی ہو جائے گی۔

ناہید : میں آنا چاہتی ہوں۔ فرخ صاحب مگر مجھے راہ نہیں مل رہی ہے۔

فرخ : آپ میرے ساتھ چلی آیئے۔

ناہید : آپ کے ساتھ۔ آپ مجھے لے جا سکتے ہیں وہاں ؟

فرخ : کہاں ؟

ناہید : جہاں زندگی ہے۔ کام کاج ہے۔

فرخ : آپ چل سکتی ہیں میرے ساتھ۔

ناہید : ہاں ؟

(ترکس کی مسلسل گھڑ گھڑاہٹ میں آواز دبتی جاتی ہے)

ناہید : میں جانا چاہتی ہوں مجھے لے چلیئے۔ مجھے لے چلیئے۔ میں یہاں نہیں رہ سکتی مجھے لے چلیئے۔

آواز گھڑ گھڑاہٹ میں بالکل دب جاتی ہے

فیڈ آؤٹ

پردہ

○

حویلی
میرزا ادیب

کردار

ارجمند بانو	شہزادہ صاحب کی بیٹی
ممتاز بانو	شہزادہ صاحب کی چھوٹی بیٹی
شہزادہ ابو جہانگیر اکبر بیگ	شہزادہ صاحب حویلی کے مالک
جہانگیر	شہزادہ صاحب کا بیٹا
فیروز نوازش رحمت	شہزادہ صاحب کے پرانے ملازم
بنک کا منیجر	

پہلا منظر

(حویلی کا ایک خاص کمرہ، عام کمروں سے زیادہ وسیع۔ چھت اُونچی اور دیواریں گو بوسیدہ، لیکن ان پر پہلی نظر پڑتے ہی ذہن میں عظمت کا ایک ایسا احساس پیدا ہوتا ہے جو عام طور پر شاندار پرانی عمارتوں سے وابستہ ہے۔ سامنے کی دیوار پر مینٹل پیس کے اُوپر دو بڑی تصویریں ہیں جن کے چوڑے سنہری چوکھٹے ابھی تک جگمگا رہے ہیں۔ پہلی تصویر میں حویلی کے موجودہ مالک شہزادہ ابوجہانگیر مرزا اکبر بیگ کے والد گرامی جلوہ گر ہیں۔ ایک لحیم و شحیم بزرگ داڑھی سیاہ سر پر چوگوشیہ ٹوپی اور جسم قبا میں چھپا ہُوا۔ دوسری تصویر شہزادہ صاحب کے دادا صاحب ——— کی ہے یہ بزرگ چوگوشیہ ٹوپی ریشمی کرتہ اور چوڑی دار پائجامہ پہنے، ایک سنہری کُرسی پر بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ———

مینٹل پیس پر ایک منقش پردہ لٹکا ہُوا۔ اس کے اوپر درمیان میں سنگِ مرمر کا بنا ہُوا ایک بہت خوبصورت — تاج محل اور اس کے اردگرد چینی کے گلدانوں میں کاغذی پھول مینٹل پیس کے سامنے ایک پلنگ پر سفید چادر بچھی ہوئی، ریشمی تکیہ کٹہرے سے لگا ہُوا۔ پلنگ کے پاس ایک تپائی، اور اس کے پاس ترتیب سے رکھی ہوئی تین پرانی طرز کی کُرسیاں دروازہ جنوبی دیوار میں جس پر ایک منقش پردہ پڑا ہے کمرے میں جتنا فرنیچر نظر آتا ہے سب کا سب شہزادہ صاحب کے باپ دادا کے وقت کا ہے، شہزادہ صاحب کی مالی حالت نے کبھی اس کی اجازت نہیں دی کہ

وہ پرانے فرنیچر میں کچھ اضافہ کرسکیں —

(جس وقت پردہ اٹھتا ہے ——— اور یہ وقت دن کا تیسرا پہر ہے
ارجمند بانو کردشیے سے رومال کے ایک کونے میں کوئی پھول وغیرہ کاڑھتی
ہوئی دروازے میں سے نکل کر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی پلنگ کی
طرف بڑھ رہی ہے۔ ارجمند بانو شہزادہ صاحب کی بڑی لڑکی ہے۔ عمر
چھبیس ستائیس کے لگ بھگ چہرے کے نقوش تیکھے، چھریرا بدن۔
معمولی قسم کے دوپٹے قمیص اور پاجامے میں ملبوس۔ نگاہیں رومال پر
جمی ہیں۔ پیشانی سے کوئی گہری سوچ نمایاں ہے۔ ابھی وہ پلنگ کے پاس
ہی پہنچتی ہے کہ دروازے کے باہر سے اس کی چھوٹی بہن ممتاز بانو کی آواز
آتی ہے "آپی" ——— ارجمند بانو رومال سے نظریں ہٹا کر دیکھتی
ہے اور جواباً کہتی ہے "آؤ تازی"۔ تین چار لمحوں کے بعد ممتاز بانو آتی
ہے بہن کا سا ناک نقشہ۔ لباس بھی وہی بہن سے تین چار سال چھوٹی ہوگی
ممتاز بانو کو اندر آتے دیکھ کر ارجمند بانو بڑھ کر ایک کرسی کے پاس رک
جاتی ہے ممتاز اس کے سامنے پہنچ کر ٹھہر جاتی ہے۔)

ارجمند بانو : کیوں تازی !

ممتاز بانو : نہیں ہیں۔

ارجمند بانو : کتابوں والے کمرے میں دیکھا ہوتا۔

ممتاز بانو : حویلی کا ایک ایک کونہ دیکھ آئی ہوں، ابھی باہر ہیں۔

ارجمند بانو : چار بج رہے ہیں اور آج تو انھوں نے ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ خدا جانے کہاں ہیں اور کیا کر رہے
ہیں۔

ممتاز بانو : کیا کر رہے ہیں ——— آپ نہیں جانتیں آپی ! اسی فکر میں سرگرداں ہیں۔ اس کے سوا اور کیا فکر ہو

سکتی ہے انھیں۔

ارجمند بانو: (آہ بھر کر) اس فکر میں تو انھیں نہ دن کا آرام سوجھتا ہے۔ نہ رات کی نیند۔

ممتاز بانو: یہی تو مصیبت ہے۔

ارجمند بانو: میں نے صبح کہا تھا "ابا حضور! ناشتہ دو منٹ میں تیار ہوجاتا ہے ذرا توقف کر لیجئے" کہنے لگے "بھوک نہیں ہے اور دیکھو شاید جلدی آسکوں، کھانے پر میرا انتظار نہ کرنا۔"

ممتاز بانو: آپی! آپ کو معلوم ہے معاملہ بہت نازک صورت اختیار کر گیا ہے، بنک کے تین نوٹس آچکے ہیں سارا روپیہ ادا کرو ورنہ ــــــــ

ارجمند بانو: (جلدی سے) دوسری صورت ان کے لیے قطعاً ناقابلِ برداشت ہے (رومال پر نظریں جما کر) ہوگا کیا آخر؟

ممتاز بانو: جو ہونا ہے وہ تو ہو کر رہے گا۔

ارجمند بانو: (بہن کو گھورتے ہوئے) نہیں ایسا نہیں ہوگا تازی۔

ممتاز بانو: تو آپی! ذرا مجھے بتائیے نا، اور کیا صورت ممکن ہے؟

ارجمند بانو: اباجان رات کے چوبیس گھنٹے تگ و دو کر رہے ہیں کچھ نہ کچھ تو ہوگا ضرور۔

ممتاز بانو: آپی! اتنی بڑی رقم کا انتظام ہوجائے گا کیا؟ پنتالیس ہزار سے کم رقم نہیں ہے بنک والوں کی۔

ارجمند بانو: کبھی بالکل معمولی رقم ہوگی۔ سود در سود کے چکر نے اتنی بڑی رقم بنا دی ہے۔

ممتاز بانو: بنک والے تو بہر حال وہی رقم مانگیں گے جو واجب الادا ہے۔ انھیں اس سے کیا واسطہ کہ داداجان مرحوم نے اس وقت کتنی معمولی رقم پر حویلی رہن رکھی تھی۔ اب اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ حویلی بنک کے حوالے کر دی جائے۔ ــــــ اور بنک والے یہ چھوڑیں گے بھی کیوں؟ آپی!

ارجمند بانو: تازی! تم نے اباجان کے دل و دماغ کو ابھی سمجھا ہی نہیں، جو شخص اپنی حویلی کو اپنی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ سمجھتا ہے اور جس شخص کی نظروں میں یہ عمارت خاندانی عظمت کی سب سے بڑی نشانی ہو وہ دنیا کی ہر چیز چھوڑ دے گا، حویلی کسی حال میں بھی نہیں چھوڑے گا۔ تمھیں خبر نہیں اس حویلی کو بچانے کے

لیے انھوں نے اب تک کیا کیا ہے، کیسی کیسی کوشش کی ہے ــــ کیسے کیسے طریقے اختیار کئے ہیں کہ اور سب کچھ چلا جائے حویلی سلامت رہے پھر بھی تم ایسی بات کہتی ہو!

ممتاز بانو: میں سب کچھ جانتی ہوں آپی! اباجان نے اس کے لیے جوا کھیلا ہے، ریس میں شامل ہوئے ہیں ڈربی کے ٹکٹ خریدے ہیں دفتری ملازمت کے علاوہ گھر میں بیٹھ کر بھی کام کیا ہے مگر اپنی تمام کوششوں کے باوجود سود کی رقم بھی ادا نہیں کر سکے۔

ارجمند بانو: سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ انھوں نے جو کچھ کیا ہے تنہا کیا ہے جبیٹے نے ساتھ نہیں دیا بلکہ الٹی مخالفت کی ہے۔

ممتاز بانو: اسی لیے انھوں نے بیٹے کو گھر سے نکل جانے کا حکم دیدیا تھا، ــــ اور اب ہم اس کی صورت کو ترس گئی ہیں۔

ارجمند بانو: یہ بدقسمتی ہے اباجان کی ــــ لوگ کہتے ہیں بیٹا باپ کا عصا ہوتا ہے۔ مگر یہاں بیٹا باپ کی راہ میں رکاوٹ بن گیا ہے۔

ممتاز بانو: آپی! ذرا یہ بھی سوچئے آخر بیٹا کر کیا سکتا ہے؟

ارجمند بانو: کم از کم باپ کا ساتھ تو دیتا۔

ممتاز بانو: وہ کہتا ہے حویلی کے لیے اپنی زندگی کو تباہ نہیں کیا جا سکتا، عزت و آبرو کی زندگی ہر جگہ بسر کی جا سکتی ہے۔ حویلی جاتی ہے تو جانے دیجئے کسی اور مکان کا فوراً بندوبست ہو سکتا ہے وہاں ہم اطمینان کے ساتھ زندگی گزار سکتے ہیں۔

ارجمند بانو: اباجان حویلی سے نہیں نکلیں گے، پرسوں انھوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا، جب تک میں زندہ ہوں کسی اجنبی کا قدم یہاں نہیں آ سکتا"

ممتاز بانو: تو وہ پینتالیس ہزار کا قرض کیوں کر ادا ہو سکے گا آپی؟

(ارجمند بانو اس کے جواب میں بہن کو یاس انگیز نظروں سے دیکھتی ہے، زبان سے کوئی لفظ نہیں نکالتی۔)

آپ اسے گستاخی سمجھیں گی، لیکن میں یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ اگر دادا جان نے بنک سے روپیہ قرض نہ لیا ہوتا، تو یہ مصیبت ہم پر نازل نہ ہوتی۔ جہانگیر کہتا ہے دادا جان نے یہ روپیہ محض عیش و عشرت کے لیے لیا تھا۔

ارجمند بانو: جہانگیر نے تمہارا دماغ بھی خراب کر دیا ہے، خدارا! ایسی بات ابا جان کے سامنے نہ کہنا انھیں سخت صدمہ ہوگا۔

ممتاز بانو: کاش ابا جان کے دل میں یہ بات بیٹھ جائے کہ اب حویلی ہمارے پاس نہیں رہ سکتی۔ فضول کوشش نہ کریں، اور اس عمر میں خواہ مخواہ پریشانی نہ اٹھائیں۔

ارجمند بانو بہن کو گھور کر دیکھتی ہے اور پھر سر جھکا کر کاڑھنے میں مصروف ہو جاتی ہے۔ ممتاز رُخ پھیر کر تصویروں دیکھنے لگتی ہے باہر سے شہزادہ صاحب کی آواز آتی ہے۔ "بیٹی ارجمند بانو"

ارجمند بانو کروشیے سے نظر ہٹا کر دروازے کی طرف دیکھتی ہے اور اُدھر جانے لگتی ہے۔ ممتاز بانو وہیں کھڑی رہتی ہے، مگر اب وہ بھی دروازے کی طرف دیکھ رہی ہے۔ شہزادہ ابو جہانگیر مرزا اکبر بیگ آتے ہیں۔ بچاس پچپن سال کے نحیف الجثہ آدمی صحت کے اعتبار سے اپنے باپ دادا سے قطعی مختلف، کمر جھکی ہوئی، آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے لباس سیاہ اچکن جس کے تمام بٹن ٹوٹے ہوئے، چوڑی دار پاجامہ سر پر دوپلی، دائیں ہاتھ میں عصا جس کے سرے پر چاندی کا خول چڑھا ہوا ہے، چہرہ بتا رہا ہے کہ یہ شخص بڑی کشمکش کے عالم میں سے گذر رہا ہے۔

شہزادہ صاحب آتے ہی کرسی پر گر پڑتے ہیں۔ دونوں بیٹیاں پاس پہنچ جاتی ہیں۔

ارجمند بانو: تسلیم ابا حضور!

ممتاز بانو: تسلیم ابا جان!

شہزادہ صاحب: جیتی رہو (عصا کرسی کی پشت سے لگا کر) خدا تمہیں زمانے کی چشمِ بد سے بچائے۔ (سانس درست کرنے کے لیے ذرا رک کر) بہت برا زمانہ آگیا ہے نہ کبھی دیکھا نہ سنا۔

ارجمند بانو: ہاں ابا حضور!

شہزادہ صاحب: میری عدم موجودگی میں کوئی آیا تو نہیں تھا؟

ارجمند بانو: کوئی نہیں ابا جان!

ممتاز بانو: آپی! وہ بنک کا چپڑاسی جو آیا تھا۔

شہزادہ صاحب: آیا ہوگا ———— اُن لوگوں کا کام ہی یہ ہے کہ شرفا کو پریشان کرتے پھریں۔

ارجمند بانو: (موضوع گفتگو بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے) ابا حضور! آج آپ نے ناشتہ بھی نہیں کیا تھا کھانا چن دوں۔

شہزادہ صاحب: نہیں بیٹی بھوک نہیں ہے۔

ارجمند بانو: ابا جان آپ کی صحت پہلے ہی کافی گر چکی ہے (ممتاز بانو سے) تازی! جلدی سے دسترخوان بچھائے۔

ممتاز بانو: بہتر (جانے لگتی ہے)

شہزادہ صاحب: (ہاتھ کے اشارے سے روک کر) نہیں تازی بیٹی!

ممتاز بانو: آپ اس طرح فکر نہ کریں ابا جان، جو ہونا ہے وہ تو ہو کر رہے گا۔

ارجمند بانو: (بہن کو گھورتے ہوئے) تازی کا مطلب ہے ابا حضور اگر آپ بالکل فکر نہ کریں، بہتری کی کوئی صورت ضرور نکل آئے گی۔

شہزادہ صاحب: بہتری کی صورت تو خدا ہی دکھائے ہے۔

ارجمند بانو: الحمدللہ!

ممتاز بانو : (جیسے اپنے کانوں پر اعتماد نہیں کرسکی) ابا جان آپنے فرمایا ہے قرض اُتر جائے گا؟

ارجمند بانو : انسان کوشش کرے تو ضرور کامیاب ہوجاتا ہے (ممتاز بانو سے مخاطب ہوکر) ابا جان نے حویلی کے بیچے ایسی کوششیں کی ہیں کہ کوئی کیا کرے گا۔

شہزادہ صاحب : یہ ننگ و ناموس کا سوال ہے حویلی ہاتھ سے نکل گئی تو سب کچھ ختم ہوگیا۔ (اندوہناک لہجے میں) افسوس اس بات کا ہے کہ سب سے زیادہ دکھ مجھے کسی غیر نے نہیں اس شخص نے پہنچایا ہے جسے دنیا لخت جگر کہتی ہے۔

ارجمند بانو : ابا جان! کچھ نہ کچھ تو ضرور کھا لیجئے۔ آخر صبح سے بھوکے ہیں۔

شہزادہ صاحب : نہیں بیٹی! بھوک نہیں ہے البتہ آرام ضرور کروں گا کچھ دیر۔

(شہزادہ صاحب اٹھ کر عصا سنبھالتے ہیں اور دروازے کی طرف جانے لگتے ہیں پھر یکایک رُک جاتے ہیں۔)

ہاں بیٹی یاد آیا۔ دو چار دن تک چند نہایت معزز مہمان آرہے ہیں ابھی سے اہتمام شروع ہو جانا چاہیئے۔ سمجھ لیا نا۔

ارجمند بانو : بہتر ابا حضور!

ممتاز بانو : مہمان ------ کون ابا جان!

شہزادہ صاحب : نواب سرفراز خاں کے گھر والے ———— میری ارجمند بانو حویلی سے نکل کر محل میں رہے گی۔

ممتاز بانو : ابا جان! (کچھ کہنا چاہتی ہے مگر رُک جاتی ہے) ارجمند شرما کر منہ دوسری طرف پھیر لیتی ہے۔

شہزادہ صاحب : نواب سرفراز خاں سات پشت سے نواب چلے آرہے ہیں ابا جان مرحوم کے جگری دوست تھے دراصل ان کا خاندان ہمارے نسل ہی کی ایک معزز شاخ ہے۔

(ممتاز بانو زمین پر نگاہیں جمائے کھڑی رہتی ہے ——— شہزادہ صاحب دروازے سے نکل جاتے ہیں، دونوں لڑکیاں انھیں جاتے ہوئے

دیکھتی رہتی ہیں ۔)

ممتاز بانو: اباجان ——— کیا کر رہے ہیں میں تو سمجھ ہی نہیں سکی۔

(ارجمند بانو کوئی جواب نہیں دیتی)

آپی میں کیا کہہ رہی ہوں؟

ارجمند بانو: (لہجے میں دبا دبا غم) اباجان جو کچھ کریں گے ہماری بہتری کے لیے کریں گے میں صرف یہ جانتی ہوں۔

ممتاز بانو: مگر سوچئے تو آپی! نواب سرفراز خان کی عمر خدا جھوٹ نہ بلوائے، اباجان سے کم از کم اٹھ دس سال زیادہ ہوگی۔ اور پھر تین بیویاں پہلے ہی ان کے گھر میں ہیں۔

ارجمند بانو: مجھ سے ایسی باتیں نہ کرو ممتازی۔

ممتاز بانو: تو کس سے کروں آپی!

ارجمند بانو: کسی سے نہیں ——— کسی سے کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں۔

ممتاز بانو: آپی! اگر میں آپ کی بجائے ہوتی تو انکار کر دیتی۔

ارجمند بانو: تمہارے تو دیدوں کا پانی مر گیا ہے۔

(کرسی پر بیٹھ کر کاڑھنے میں مصروف ہو جاتی ہے۔)

ممتاز بانو: اباجان کے سر پر صرف ایک دھن سوار ہے، — صرف ایک دھن ——— اور کچھ سوچتے ہی نہیں۔

(ارجمند بانو اسے گھور کے دیکھتی ہے ——— ممتاز بانو بھی کرسی پر بیٹھ جاتی ہے، جہانگیر آتا ہے، انیس بیس برس کا نوجوان، چہرہ بھرا بھرا، کوٹ پتلون پہنے ہوئے، پاؤں میں بوٹ، بھائی کو دیکھتے ہی ارجمند بانو اور ممتاز بانو پر حیرت اور مسرت کی ملی جلی کیفیت چھا جاتی ہے، فوراً اٹھ بیٹھتی ہیں)

ارجمند بانو: جہانگیر تم ——

ممتاز بانو: اباجان سے جھگڑا کر کے بہنوں کو بھی فراموش کر دیا۔ خون سفید ہو گیا ہے شاید تمھارا۔

جہانگیر: میں کیا کرتا، اباجان مجھے دشمن سمجھتے ہیں۔ میری صورت بھی دیکھنے کے روادار نہیں ہیں۔

ارجمند بانو: تم معافی کیوں نہیں مانگ لیتے بھیا! تمھیں اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ بیچارے کس قدر پریشان رہتے ہیں۔ کتنی بڑی مصیبت ٹوٹ پڑی ہے اُن پر۔

جہانگیر: وہ تو ہم سب کو جہنم میں جھونکنے کا ارادہ کر چکے ہیں۔

ارجمند بانو: پھر وہی باتیں —— میں تو سمجھی تھی تم نیک ارادے سے آئے ہو۔

جہانگیر: میں ایک خاص ارادے ہی سے آیا ہوں۔

ارجمند بانو: خاص ارادہ، کیا ہے خاص ارادہ! خدا کے لیے کچھ نہ کر جاؤ —— اگر تمھارے خیالات وہی ہیں تو وہ تمھیں یہاں دیکھ کر ——

جہانگیر: (جلدی سے) میں جانتا ہوں۔

ارجمند بانو: اللہ بتاؤ نا کیا ارادہ ہے تمھارا —— کوئی ایسی بات نہ کرنا —— ورنہ نہ ملو ان سے یہ بہتر ہے۔ سنا جہانگیر!

(دروازے پر شہزادہ صاحب آتے ہیں اور چُپ چاپ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر بیٹے کو شعلہ ریز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔)

شہزادہ صاحب: میری حویلی میں تمھیں کس نے آنے کی اجازت دی؟ یہاں تمھارا کیا کام ہے؟

(ارجمند بانو خوفزدہ سی ہو جاتی ہے۔ ممتاز بانو بھی سہم جاتی ہے مگر اس کی حالت بہن جیسی نہیں۔ جہانگیر پر مطلقاً کوئی اثر نہیں ہوتا)

جہانگیر: میں یہاں اپنا ایک نہایت ناخوشگوار فرض ادا کرنے آیا ہوں۔

شہزادہ صاحب: تم اور فرض! روشنی اور تاریکی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ اگر تمھیں اپنے فرض کا ذرہ برابر

بھی احساس ہوتا تو میرے ساتھ شامل ہو کر خاندانی ننگ و ناموس کی حفاظت کرتے، بزدلوں کی طرح بھاگ نہ جاتے!

جہانگیر: اباجان! آپ جس چیز کو خاندانی ننگ و ناموس کہتے ہیں وہ میری نظروں میں بوسیدہ اینٹوں کے ایک بے ترتیب ڈھیر کے سوا کچھ بھی نہیں۔ میں اس کے لیے اپنے دل و دماغ کا خون تباہ نہیں کر سکتا تھا۔

شہزادہ صاحب: تم ابھی تک میری حویلی کو بوسیدہ اینٹوں کا ایک ڈھیر سمجھتے ہو؟

جہانگیر: اباجان! اس کے علاوہ یہ کیا ہے۔ یہ مانا ہمارے کئی بزرگوں نے ان دیواروں کے اندر بڑی نوابانہ شان سے زندگی بسر کی تھی مگر اباجان! آپ جس زمانے کا خواب دیکھ رہے ہیں وہ زمانہ بہت پیچھے جا کر ماضی کا حصہ بن چکا ہے۔ اس حویلی کی بنیادیں کمزور ہو چکی ہیں۔ اس کے در و دیوار پر کائی جم چکی ہے اور جو خاندان اس کے اندر رہتا تھا، اس کی روایات ختم ہو چکی ہیں۔ نئے زمانے کا سورج طلوع ہو رہا ہے۔ لیکن آپ ابھی تک ماضی کی سرد راکھ سے زندگی کی گرمی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ محض فریب ہے ———— ایک بہت بڑا دھوکا ہے

شہزادہ صاحب: اس قسم کے فقرے تم پہلے بھی کئی بار کہہ چکے ہو اور آج بھی کہہ رہے ہو ———— میرے کان ان سے بیزار ہیں اور میں تمھاری شکل سے بھی بیزار ہوں۔

جہانگیر: یہ میری بدقسمتی ہے۔

شہزادہ صاحب: بس یہی کہنے کے لئے آئے تھے تم!

جہانگیر: نہیں۔

شہزادہ صاحب: نہیں!

(غضب ناک نظروں سے جہانگیر کو دیکھتا ہے)

جہانگیر: آپی! (بہنوں سے مخاطب ہو کر) تم لوگ ذرا اُدھر چلے جاؤ۔

(دونوں بہنیں ایک دوسری کو دیکھتی ہیں، ایک دو لمحے دیکھتی ہیں پھر

ممتاز بانو دروازے کی طرف قدم اٹھاتی ہے، ارجمند بانو بھی اس کے
پیچھے پیچھے جانے لگتی ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ جانا نہیں چاہتیں
مجبور ہو کر جا رہی ہیں، دونوں نظروں سے دور ہو جاتی ہیں۔

شہزادہ صاحب : کہو۔

جہانگیر : (لہجے میں ملائمت) دیکھئے ابا جان! آپ نے اب تک جو کچھ کیا ہے اس کی وجہ سے آپ
کے مختصر خاندان کو بہت دکھ اٹھانے پڑے ہیں، آپ اپنے جنون میں مبتلا رہے اور ہماری اماں بغیر دوا
دارو کے رحلت فرما گئیں، آپ کو ہمیشہ اس بات کی فکر رہی ہے کہ کوئی زندہ رہے یا سسک سسک
کر مر جائے لیکن آپ کی اس منحوس حویلی کا ایک ذرہ بھی کسی دوسرے کے قبضے میں نہ چلا جائے آپ
اس کے لیے دیوانے ہو گئے ہیں، ماسوائے حویلی کے اور کچھ سوجھتا ہی نہیں آپ کو۔
آپ نے اپنی زندگی کی قیمتی سے قیمتی شئے بھی اس کے لیے قربان کر دی ہے۔ میں نے آپ کی مخالفت
کی، آپ نے مجھے ذلیل کر کے یہاں سے نکال دیا ——— میں نے یہ ظلم برداشت کر لیا۔
مگر ابا جان! میں ایک لمحے کے لیے بھی یہ بات برداشت نہیں کر سکتا کہ آپ میری بہن کی زندگی
اس بوسیدہ حویلی کی بھینٹ چڑھا دیں۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ کبھی نہیں ہوگا ابا جان!

شہزادہ صاحب : کیا مطلب؟

جہانگیر : آپ آپی کا ہاتھ اس پاجی سرفراز خاں کے ہاتھ میں دینے کا ارادہ کر چکے ہیں جس کے پاجی پن کی شہرت
شہر کے کونے کونے میں پھیل چکی ہے اور یہ صرف اس لیے کہ سرفراز خان اس حویلی کا قرض ادا کر دیں۔

شہزادہ صاحب : میری لڑکی تو اب سرفراز ہی کے محل میں جائے گی۔

جہانگیر : ایسا نہیں ہوگا۔

شہزادہ صاحب : تم کون ہو کچھ کہنے والے۔ تمہارا میرے اور میری بچیوں کے ساتھ کیا واسطہ! شرم نہیں
آتی یہ بات کہتے ہوئے، ہمیں مصیبت میں چھوڑ کر چلے گئے اور آج آئے ہو باتیں بنانے۔

جہانگیر : (باپ کے الفاظ کاٹتے ہوئے) آپ غلط کہہ رہے ہیں ابا جان! میں آپ کو اور اپنی بہنوں کو ایک لمحے

کے لیے بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ ایک سعادت مند بیٹے کی حیثیت سے میرا فرض تھا کہ اپنے بوڑھے باپ کو آرام پہنچاؤں اور وہ فرض بھی ادا کروں جو میری بہنوں کی طرف سے مجھ پہ عائد ہوتا ہے ——— مگر آپ نے میرے اور میرے فرض کے درمیان یہ منحوس حویلی کھڑی کر دی ——— میں کیا کرتا ——— ایسی حالت میں میں کیا کر سکتا تھا، آپ خود ہی فرمائیں! خدا کے لیے مجھے اپنا فرض ادا کرنے دیجیے یہ بوسیدہ دیواریں ہمارے قبضے میں نہیں رہ سکتیں، ان کا سینہ ان چھوڑ دیجیے!

شہزادہ صاحب: (اپنے دونوں ہاتھ شمالی اور جنوبی دیواروں کی طرف پھیلا کر) تم انھیں بوسیدہ دیواریں کہتے رہو ——— یہ بوسیدہ دیواریں ہیں کیا؟ اگر تمھاری آنکھوں پر پردہ پڑ چکا ہوتا تو تم دیکھتے کہ یہی دیواریں صدیوں سے ہماری خاندانی عظمت کا مقدس بوجھ اٹھائے کھڑی ہیں۔ انھی دیواروں کے ذرے ذرے میں ہمارے ننگ و ناموس کے چراغ روشن ہیں۔ جب تک یہ دیواریں ہمارے پاس ہیں، ہماری عزت، ہمارا خاندانی ننگ و ناموس اور ہماری شان و شوکت زندہ و سلامت ہے مگر جب اس حویلی کے دروازے ہم پر بند ہو گئے۔ ہم ہر اس چیز سے محروم ہو جائیں گے جسے ہمارے محترم آبا و اجداد نے بطور ورثے کے ہمارے سپرد کیا تھا۔ امارت ختم ہو گئی۔ لیکن جب تک یہ دیواریں ہمارے اردگرد کھڑی ہیں ہماری عظمت برقرار ہے یہ صرف اسی حویلی کی برکت ہے کہ اس گئے گزرے دور میں بھی لوگ ہمیں شہزادہ صاحب کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ تم اسی درخت کو کاٹنے پر تلے ہو جس کی بلند شاخ پر بیٹھ کر آسمان کی ہمسری کر سکتے ہو؟

جہانگیر: اباجان! میں اس درخت کو کیا کاٹوں گا اسے تو زمانے کا آرہ خود ہی کاٹ کر رکھ دے گا۔

شہزادہ صاحب: میں پوچھتا ہوں، جب تمھیں میری حویلی سے کوئی واسطہ نہیں تو اس حویلی کے اندر رہنے والوں سے کیا واسطہ ہو سکتا ہے؟

جہانگیر: میں حویلی کی آپ کی طرح پرستش نہیں کر سکتا، اباجان! آپ نے اپنی ساری دنیا ان دیواروں کے اندر آباد کر رکھی ہے۔ میری دنیا یہ نہیں ہے ——— کائنات کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی ہے۔

شہزادہ صاحب: تو جاؤ کائنات کی وسعتوں میں اڑتے پھرو۔ یہاں تمھارا کیا کام؟

جہانگیر: اباجان! میں آپ کی خدمت میں بڑے ادب کے ساتھ یہ گزارش پیش کرنے آیا ہوں کہ حویلی کے لیے
اپنی اولاد کی زندگی تباہ نہ کریں۔

شہزادہ صاحب: اپنی اولاد کی بہتری میں خوب سمجھتا ہوں۔

جہانگیر: آپ نے سوچا ایک عیاش شخص کے گھر میں آپ کی بیٹی کا کیا حال ہوگا؟

شہزادہ صاحب: میں جو کچھ کر رہا ہوں، خوب سوچ سمجھ کر رہا ہوں۔

جہانگیر: نہیں اباجان! آپ نے کچھ نہیں سوچا۔ اگر آپ نے ایک باپ کی طرح اس معاملے پر غور کیا ہوتا
تو سرفراز خاں کے نام ہی سے نفرت کرتے۔ چہ جائیکہ آپ اپنی لڑکی اس مردود کے گھر بھیجنے
کا ارادہ کریں۔ اس میں شک نہیں کہ ایسا کرنے سے آپ کی حویلی آپ کے قبضے میں رہے گی، مگر آپ
کی بیٹی سرفراز خاں کی عیاشیوں کا شکار ہو کر سسک سسک کر مر جائے گی۔ خدارا! سوچئے آپ
کیا کر رہے ہیں مجھے بتائیے اباجان! کیا آپ ان بے جان دیواروں کے لیے اپنی بیٹی کو بیچ دیں گے
اپنے جگر کے ٹکڑے کو اٹھا کر ایک اندھے کنویں میں پھینک دیں گے؟

شہزادہ صاحب: اس قسم کے ذلیل لفظ منہ سے نکالتے ہوئے تجھے شرم نہیں آتی۔ نواب سرفراز خاں اس
رشتے کے بعد اس خاندان ہی کے ایک رکن ہو جائیں گے۔ میرا بیٹا خاندانی عزت کا دشمن ہے۔
خدا نے مجھے دوسرا بیٹا دے دیا ہے ---- بہرحال میں اس معاملے میں ہر طرح مختار ہوں جاؤ میری
نظروں سے دور ہو جاؤ!

جہانگیر: میری بہن اس شخص کے گھر میں نہیں جائے گی۔

شہزادہ صاحب: میں نے جو کچھ طے کر لیا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ میرا فیصلہ اٹل ہے۔

جہانگیر: اباجان!

شہزادہ صاحب: ایک لفظ نہیں ———— جاؤ چلے جاؤ یہاں سے۔

جہانگیر: آپ آپی کو اس حویلی کی بھینٹ نہیں چڑھا سکتے۔

شہزادہ صاحب: میں کہتا ہوں چلے جاؤ، اپنی منحوس شکل میری آنکھوں سے دور لے جاؤ۔

جہانگیر : مَیں یہیں رہوں گا ابّا جان! اور دیکھوں گا وہ عیاش نواب کس طرح یہاں آنے کی جرأت کرسکتا ہے
مَیں اپنی زندگی کی قیمت پہ بھی یہ شرمناک سودا بازی نہیں ہونے دوں گا۔

شہزادہ صاحب : (زیادہ گرج کر) چلے جاؤ ––– جاتے ہو یا نہیں تم! مَیں تمہیں اپنی آنکھوں کے
سامنے اپنی مقدس حویلی میں نہیں دیکھ سکتا، جاؤ دفع ہو جاؤ۔

(ارجمند بانو اور ممتاز بانو بھاگ کر آتی ہیں، باپ اور بھائی کے
درمیان کھڑی ہو جاتی ہیں۔)

ممتاز بانو : جہانگیر، اُدھر چلے جاؤ تم۔

شہزادہ صاحب : نہیں اِدھر اُدھر ہرگز نہیں۔ اس کا منحوس سایہ بھی ان متبرک دیواروں پر نہیں پڑنا چاہیے اس سے
کہو، یہاں سے دفع ہو جائے۔

ممتاز بانو : جہانگیر چلو نا،

(ممتاز بانو بھائی کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے اور دروازے کی طرف جانے
لگتی ہے ارجمند بانو اس کے پیچھے قدم اٹھا رہی ہے ––– شہزادہ صاحب
شعلہ ریز نگاہوں سے بیٹے کو دروازے میں سے نکلتے ہوئے دیکھ
رہے ہیں۔)

پردہ

دوسرا منظر

(شہزادہ حسنا کی خوابگاہ : اس منظر میں سٹیج کا صرف وہی حصہ نظر آتا ہے جو ایک ٹیبل پر پڑے ہوئے لیمپ کی مدھم روشنی میں ہے۔ رات نصف کے قریب گذر چکی ہے۔ شہزادہ صاحب پلنگ کے اوپر سامنے کی دیوار سے نشست لگائے نوٹوں کے بنڈل ہاتھی دانت کے ایک صندوقچے میں ڈال رہے ہیں۔ فضا پرسکون ہے ———

باہر سے ممتاز بانو کی ہلکی سی آواز آتی ہے۔ ابا جان! شہزادہ صاحب سر اٹھا کر مشرقی جانب دیکھتے ہیں۔ ممتاز بانو کی دوبارہ آواز آتی ہے شہزادہ حسنا صندوقچہ بند کر دیتے ہیں)

شہزادہ صاحب : کیا ہے بیٹی؟ پریشان کیوں ہو؟

(ممتاز بانو اندر آتی ہے، روشنی میں اس کا سارا جسم نظر نہیں آتا)

ممتاز : میں کچھ کہنے آئی ہوں ابا جان!

شہزادہ صاحب : کہو۔

ممتاز بانو : میں یہ کہنے آئی ہوں ابا جان! حالات خطرناک نقطے پر پہنچ گئے ہیں۔

شہزادہ صاحب : تمہارے ذہن کو وہ بدبخت مسموم کر رہا ہے ورنہ حالات بالکل توقع کے مطابق ہیں۔ سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ حویلی ہمارے پاس نہیں رہے گی، الحمد اللہ! یہ خطرہ ہمیشہ کے لیے دور ہو گیا۔ ملا الجماعت نے فرمایا ہے، میں برات سے کہ اس وقت یہاں آؤں گا جب حویلی سے بنک والوں کا کوئی تعلق باقی نہیں رہے گا ——— چنانچہ انھوں نے اس کا انتظام بھی کر دیا ہے — خدا کا شکر ہے، میں اب بنک کا سارا قرض بے باق کر دوں گا۔

ممتاز بانو : اباجان! اگر یہ حویلی ہمارے پاس نہ رہے تو کیا ہوگا ؟

شہزادہ صاحب : (بیٹی کو گھور کر دیکھتے ہوئے) پوچھتی ہو کیا ہوگا۔ اگر یہ حویلی پاس نہ رہی تو باقی رہ کیا جائے گا ہمارے پاس !

ممتاز بانو : اباجان! آپ یہ ارادہ ختم کردیں۔

شہزادہ صاحب : کون سا ارادہ ؟

ممتاز بانو : آپی کو نواب سرفراز خاں کے ہاں بھیجنے کا ارادہ !

شہزادہ صاحب : کیا کہنا چاہتی ہو تم :

ممتاز بانو : اباجان ! جو کچھ میں محسوس کر رہی ہوں وہ آپ محسوس نہیں کرسکتے حویلی پاس نہ رہی تو شائد ہماری خاندانی عظمت برقرار نہیں رہے گی لیکن اباجان ! دوسری صورت میں کیا ہوسکتا ہے کہ ہم اپنی کسی نہایت عزیزترین ہستی سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جائیں۔

شہزادہ صاحب : ممتاز بانو! میں سمجھتا تھا تم بہت ذہین اور بیدار مغز بچی ہو میں نے ہمیشہ تمھاری ذات پر فخر کیا ہے مگر آج تم جس قسم کی باتیں کر رہی ہو وہ میری توقع کے بالکل خلاف ہے اس کم بخت نے اپنے زہریلے خیالات سے تمھیں بھی متاثر کرلیا ہے اور مجھے اس کا بہت افسوس ہے۔

ممتاز بانو : میں نے کہا ہے نا ——— جو کچھ میں محسوس کر رہی ہوں وہ آپ محسوس نہیں کرسکتے۔

شہزادہ صاحب : تم نے کیا محسوس کیا ہے ؟

ممتاز بانو : (ذرا توقف کے بعد) اباجان ! اباجان آپ کو معلوم نہیں۔ جہانگیر نے کیا کہا تھا آپکے سامنے ؛

شہزادہ صاحب : میں ان گیدڑ بھبکیوں سے نہیں ڈرسکتا !

ممتاز بانو : اباجان! آپ جس چیز کا ارادہ کر لیتے ہیں اسے پورا کرکے چھوڑتے ہیں ——— آخر وہ بھی آپ کا بیٹا ہے۔ وہ یہ شادی نہیں ہونے دے گا۔ اس نے کہا تھا میں دیکھوں گا وہ عیاش نواب کس طرح یہاں آتا ہے اور ——— ان الفاظ کا مفہوم کتنا خوفناک ہے — آپ نہیں جانتے اباجان !

شہزادہ صاحب: بیٹی وہ کیا کرے گا؟ ـــــ انتہائی خوفناک اقدام یہ ہے کہ وہ نواب صاحب پر حملہ کردے گا۔اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کر سکتا ،مگر اس سے پہلے کہ وہ نواب صاحب پر بُری نظر ڈالے اسے اپنے باپ کی بوڑھی ہڈیوں کا مقابلہ کرنا ہوگا۔

ممتاز بانو: تو یہ حادثہ کتنا دلخراش ہوگا اباجان!

شہزادہ صاحب: (اطمینان کے ساتھ) بیٹی ناز ی! تم خواہ مخواہ پریشان ہورہی ہو ـــــ کچھ بھی نہیں ہوگا! میری طرح تم بھی مطمئن رہو ـــــ تمھاری بہن بڑی شان کے ساتھ نواب صاحب کے محل میں رہے گی۔

ممتاز بانو: نہیں اباجان!

شہزادہ صاحب: معلوم ہوتا ہے اس وقت تمھارے حواس جواب دے چکے ہیں۔

ممتاز بانو: آج کا واقعہ ہے ـــــ جہانگیر نے آپی سے کہا "آپی! اگر تم انکار کردو تو معاملہ سلجھ سکتا ہے"

شہزادہ صاحب: میری بیٹی میرے سامنے انکار کردے ـــــ میں جانتا ہوں یہ قیامت تک ممکن نہیں۔ وہ شاہی خاندان کی لڑکی ہے کبھی خفیف الحرکتی کا شکار نہیں ہوسکتی۔

ممتاز بانو: اباجان! جہانگیر کے پے درپے اصرار پر اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

شہزادہ صاحب: کیا مطلب؟ (گویا انہیں اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آرہا ہے) کیا کہہ رہی ہے تُو

ممتاز بانو: میں جانتی ہوں آپی باپ کے سامنے انکار کی جرأت نہیں کرسکتی۔مگر اس نے بھائی کے سامنے بھی اثبات میں سر ہلادیا تھا۔

شہزادہ صاحب: میں نہیں مانتا۔

ممتاز بانو: آپ نہیں مانتے ـــــ آپ نہیں مانیں گے لیکن میں جانتی ہوں آپی کے دل میں کیا ارادہ پرورش پاچکا ہے ـــــ وہ کیا سوچ رہی ہے ـــــ اس الجھن کو سلجھانے کے لیے اس کے دماغ میں کیا تدبیر آئی ہے۔ اباجان: خدا کے لیے اس معاملے پر خود کچھ سوچیے۔ ورنہ آپی چلی جائے تو بھی صرف اس بات کا رنج ہوگا کہ ہمارے خاندان کی عظمت کی یادگار جا رہی ہے پاپ میں نہیں رہی ـــــ

لیکن اگر آپ کو اس بڑھاپے میں اپنے سامنے بیٹی کی لاش دیکھنی پڑی تو کیا ہوگا ابّا جان! ابّا جان

(شہزادہ صاحب چپ چاپ بیٹی کو دیکھتے رہتے ہیں)

شہزادہ صاحب: ممتاز بانو! یہ فضول خیال اپنے دماغ سے نکال دو ——— وہ ملعون جہانگیر اس قسم کی تدبیروں سے میری ہمت اور میرے ارادوں کو شکست نہیں دے سکتا۔ تم بے فکر ہو کر سو رہو۔ ارجمند بانو سے میں صبح ملوں گا اور یہ کام بخیر و خوبی انجام پا جائے گا ——— جاؤ اب تم۔

ممتاز بانو: ابّا جان!

شہزادہ صاحب: جاؤ اب تم ——— میں جو کہتا ہوں بے فکر رہو ——— بالکل بے فکر۔

(شہزادہ صاحب تکیے پر سر رکھ دیتے ہیں۔ ممتاز بانو مایوسانہ اٹھتی ہے اور اندھیرے میں غائب ہو جاتی ہے۔)

تیسرا منظر

(شہزادہ صاحب کی خوابگاہ ۔ اس کی ایک جھلک دُوسرے منظر
میں دکھائی جا چکی ہے، چونکہ وہ رات کا وقت تھا اس لیے ہمیں صرف
وہی حصہ نظر آیا تھا جو لیمپ کی روشنی میں تھا۔ مگر اب پورا کمرہ ہمارے سامنے
ہے۔ یہ کمرہ پہلے منظر کے کمرے سے نصف ہوگا۔ کمرے کی سب سے
نمایاں چیز سامنے کی دیوار سے لگا ہوا ایک طویل و عریض پلنگ ہے۔
پلنگ کے اُوپر ہاتھی دانت کا وہ صندوقچہ پڑا ہے جسے ہم دوسرے منظر
میں دیکھ چکے ہیں۔ صندوقچے کا ڈھکنا کھلا ہے صندوقچے کے ارد گرد کچھ
کاغذات بکھرے پڑے ہیں۔ پلنگ کے سرہانے کی طرف ایک تپائی کے اُوپر
شہزادہ صاحب کا عصا اور پاندان پڑا ہے۔ ان کے علاوہ کچھ کتابیں بھی نظر
آ رہی ہیں۔ دروازہ مشرقی دیوار میں ہے جس کے دونوں پٹ کھلے ہیں پردہ اُٹھتا
ہے تو اسٹیج خالی دکھائی دیتی ہے ...... باہر شہزادہ صاحب کی
گرجتی ہوئی آواز گونج رہی ہے" ارجمند بانو —— تازی! کہاں ہو تم
لوگ —— " کسی قدر دیر سے ارجمند بانو کی آواز آتی ہے
"ابا جان" شہزادہ صاحب دروازے میں داخل ہوتے ہیں سخت گھبرائے
ہوئے ہیں —— پیشانی فکر آلود ہے ۔)

شہزادہ صاحب : آج میری آنکھوں کو یہ بھی دیکھنا تھا —— جو قیامت بھی ٹوٹنی تھی مجھ پہ !

(کمرے میں آتا ہے۔ پیچھے پیچھے بیگم ارجمند بانو، ممتاز بانو
اور جہانگیر آتے ہیں ۔)

ارجمند بانو : کیا ہُوا ابا حضور ؟

شہزادہ صاحب : تمام کا تمام روپیہ کہاں گیا ـــــــ کس نے میرے کمرے میں پہنچ کر صندوقچہ کھولنے کی جرأت کی ہے ؟

(شہزادہ صاحب غضبناک نگاہوں سے جہانگیر کو دیکھتے ہیں)

جہانگیر : ابا جان ! مَیں آپ کے کمرے میں نہیں آیا۔

شہزادہ صاحب : تو اور کون آیا ہے تجھ میں اتنی جرأت کہ میری خوابگاہ میں پہنچ کر میرے صندوقچے کا تالا توڑ کر سارا روپیہ لے جائے ۔

جہانگیر : مَیں قسم کھا کر کہتا ہوں ـــــــ مَیں نے یہ حرکت نہیں کی ۔

شہزادہ صاحب : تمہارے سوا اور کوئی شخص یہ کام نہیں کر سکتا ـــــــ اگر تمہارے ملعون جسم میں خاندانی شرافت کا ایک ذرہ بھی باقی ہے تو رقم واپس کر دو ـــــــ تو سمجھتا ہے کہ مَیں چیخ و پکار کر کے خاموش ہو جاؤں گا، ایسا ہرگز نہیں ہوگا ـــــــ مَیں تجھے جیل کی سلاخوں ہی کے پیچھے نہیں پھانسی کے تختہ پر بھی دیکھ سکتا ہوں ! اپنے ذلیل ارادے کو پورا کرنے کے لیے تُو نے چوری کی ہے، تمام کی تمام رقم چرا لی ہے، لاؤ روپیہ (پُورے زور سے گرج کر) لاؤ میرا روپیہ ـــــــ لاؤ

جہانگیر : (بدستور اطمینان سے) مَیں نے روپیہ نہیں نکالا۔

ارجمند بانو : (بھائی کے پاس پہنچ کر) جہانگیر یہ کیا ہو رہا ہے ـــــــ کیوں ہمیں خاک میں ملانے پر تلے ہو خدا کے لیے ـــــــ رسول کے لیے ـــــــ

(رونے لگتی ہے)

شہزادہ صاحب : یہ سمجھتا ہے میں بوڑھا ہو گیا ہوں ـــــــ یہ معاملہ پولیس کے پاس بعد میں جائے گا پہلے تو مَیں ـــــــ

(شہزادہ صاحب صندوقچہ اٹھا کر بیٹے کی طرف بڑھتے ہیں ۔

ممتاز بانو جلدی سے درمیان میں آ جاتی ہے)

ممتاز بانو : اباجان ! روپیہ میں نے نکالا تھا ۔

شہزادہ صاحب : کیا ؟

ممتاز بانو : روپیہ میں نے نکالا تھا ۔

(شہزادہ صاحب کے ہاتھ خود بخود رک جاتے ہیں آنکھیں پھاڑ
پھاڑ کر بیٹی کو دیکھنے لگتے ہیں ــــــ ممتاز بانو جلدی سے
نکل جاتی ہے تین چار لمحوں تک اسٹیج پر یہی عالم رہتا ہے ممتاز بانو
واپس آتی ہے اس کے ہاتھ میں رومال میں کوئی چیز لپٹی ہوئی ہے
رومال باپ کی طرف بڑھاتی ہے شہزادہ صاحب صندوقچہ پلنگ
پر رکھ رومال پکڑ لیتے ہیں ۔ اس میں سے راکھ نیچے گرنے لگتی ہے)

شہزادہ صاحب : یہ کیا ــــــ راکھ !

ممتاز بانو : اباجان ! یہ وہی نوٹ ہیں جو اس صندوقچے میں بند تھے ــــــ میں نے آپ کی عدم موجودگی میں تالا توڑ ڈالا ــــــ نوٹوں کو خاکستر کر دیا ــــــ میں پاگل ہو گئی تھی اباجان ! مجھے اور کچھ بھی نہیں سوجھا ــــــ مجھے کچھ بھی نہ سوجھ سکا ۔ ایک طرف بہن کی نعش نظر آئی ــــــ دوسری طرف بھائی کو پولیس کے نرغے میں دیکھا ــــــ اباجان ! ــــــ

(ممتاز بانو باپ کے قدموں پر گر پڑتی ہے ــــــ اور
سسکیاں بھرنے لگتی ہے ۔ شہزادہ صاحب بُت بنے کھڑے
ہیں یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ کوئی بھیانک سپنا دیکھ رہے
ہیں ۔ رومال سے راکھ ابھی گر رہی ہے
جہانگیر کمرے سے نکل جاتا ہے ۔)

پردہ گرتا ہے

○

چوتھا منظر

(ایک ایسا کمرہ جو پہلے منظر کے کمرے سے بھی بڑا ہے سادہ ——
سامنے کی دیوار پر شہزادہ صاحب کے باپ دادا کی تصویریں آویزاں ہیں
جو پہلے منظر میں دکھائی گئی تھیں۔ آنے جانے کے لیے دو دروازے ایک
مشرقی دیوار میں جو حویلی کے اندر جاتا ہے اور دوسرا مغربی دیوار میں جو باہر
جاتا ہے کمرے کے وسط میں ایک اونچی سنہری کرسی، اس کرسی پر
شہزادہ صاحب کے والد اور دادا بیٹھا کرتے تھے کرسی کی دائیں جانب
ایک تپائی کے اوپر سنگِ مرمر کا وہ تاج محل جسے ہم پہلے منظر میں دیکھ
چکے ہیں اور اس کے علاوہ کپڑوں کے چند جوڑے۔

جس وقت پردہ اٹھتا ہے کرسی خالی نظر آتی ہے کرسی کے پاس تین
آدمی کھڑے ہیں: فیروز، نوازش اور رحمت۔ فیروز اور نوازش ادھیڑ عمر
کے آدمی ہیں، لباس کرتہ، پاجامہ، تیسرا یعنی رحمت ان سے چھوٹا ہے۔
باہر شور برپا ہے، معلوم نہیں ہوتا اس شور کی نوعیت کیا ہے۔ یہ
شور گھٹتا بڑھتا ہے، مگر رہتا ہے منظر کے اختتام تک)

نوازش : سمجھ میں نہیں آتا ہمیں بلایا کیوں گیا ہے۔

فیروز : ہمرے کو کیا خبر، رحمت جانے ہے۔

رحمت : میں کیا جانوں، شہزادہ صاحب بولے، کہنے لگے، ہمارے خاندان کے جتنے ملازم شہر میں رہتے ہیں سب کے سب حویلی میں آئیں۔

فیروز : کاہے کو —— پھر بانٹی جائے گی کیا؟

رحمت : کچھ نہ کچھ تو ضرور بانٹا جائے گا ——— وہ تپائی پر تھال تو پڑا ہے۔
فیروز : پر یار بات کچھ ہمری سمجھ میں ناہیں آوت ہے، بھاریا مہر اگر کیا روشن کرے گا۔
رحمت : گھبراتے کیوں ہو ——— سمجھ میں آ جائے گی یہ بات ——— ابھی شہزادہ صاحب آ جاتے ہیں۔

مشرقی دیوار میں شہزادہ صاحب آتے ہیں۔ نہایت شاندار نوابی لباس
یہ لباس ان کے مرحوم والد صاحب پہنا کرتے ہوں گے، سر پر چوگوشیہ چمکتی
ہوئی ٹوپی، سنہری قبا، چوڑی دار ریشمی پاجامہ، دائیں ہاتھ میں عصا، تینوں شخص
ان کی یہ شان دیکھ کر ٹھٹک جاتے ہیں۔ جھک کر آداب بجا لاتے ہیں ———
شہزادہ صاحب نوابانہ شان کے ساتھ آکر کرسی میں بیٹھ جاتے ہیں

شہزادہ صاحب : ہم نے کہا تھا، ہمارے تمام قدیمی نمک خوار آئیں۔ صرف تین آئے ہیں۔ باقی کیوں نہیں
آئے، انھیں کیا اطلاع نہیں دی گئی؟

فیروز : ہمرے کو ان کی کھبر ناہیں حجور!
رحمت : کچھ مر کھپ گئے ہیں ——— کچھ باہر چلے گئے ہیں۔
نوازش : جی ہاں ——— جانی خانساماں تو میرے سامنے ڈھاکے کو چلا گیا تھا۔
شہزادہ صاحب : جانی کا کوئی بھائی وغیرہ بھی نہیں تھا ——— اسے ساتھ لے آتے۔
فیروز : غلطی ہوئی ——— ہمرے کو یہ کھبر نہیں تھی۔
شہزادہ صاحب : تو تم تینوں آ گئے ہو ——— ہم خوش ہیں کہ تم نے نمک حلالی کا ثبوت دیا ہے۔ آج
نمک جس شخص نے بھی ہمارے خاندان کی خدمت کی ہے ہم اسے فراموش نہیں کریں گے۔
رحمت : حضور کی بڑی مہربانی!
شہزادہ صاحب : ہمارے خلد آشیاں دادا جان اور جنت مکان قبلہ والد صاحب سال میں ایک مرتبہ ضرور
اپنے ملازموں کو خلعت دیا کرتے تھے۔ عام طور پر عید سے ایک روز پہلے یہ تقریب ہوتی تھی۔ ہم آج
اپنی پرانی رسم کو پورا کریں گے۔ اگرچہ تم لوگ آج ہمارے ملازم نہیں ہو، مگر تم نے اس عالی شان حویلی میں

رہنے والوں کی خدمت کی ہے۔ ہم تمہاری پرانی خدمات پر انعام دیں گے۔ اس حویلی کی فضاؤں میں زرد جواہر لٹائے گئے ہیں۔ مانگنے والوں نے جو مانگا ہے اپنی جھولیوں میں اس سے کہیں زیادہ پایا ہے ان دیواروں نے ہر شخص کو سہارا دیا ہے جس نے سب دروازوں سے مایوس ہو کر ہمارا دروازہ کھٹکھٹایا ہے۔ ان دیواروں کے نیچے وسیع دسترخوان پر ہر آدمی کا خیر مقدم کیا گیا ہے جس نے اپنا دستِ طلب ہماری طرف بڑھایا ہے ـــــ زمانے کا رنگ دیکھو آج اس حویلی میں رہنے والے ہی اس کے دشمن ہو گئے ہیں ـــــ ہمارے بدبخت بیٹے نے ہمیں شکست دینے کی کوشش کی ـــــ ہماری اپنی بیٹی نے ہمارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا ـــــ مگر خدا کا شکر ہے یہ حویلی (قدم لڑکھڑانے لگتے ہیں) آج بھی ہماری ہے ـــــ ہمارے جیتے جی ـــــ

(باہر شور ایک دم بڑھ جاتا ہے)

کوئی شخص یہاں نہیں آ سکتا ـــــ لو (تیائی کی طرف اشارہ کر کے) یہ انعام تمہارا ہے۔

(رحمت کپڑے اور فیروز تاج محل اٹھاتا ہے)

رحمت: حضور! تاحشر سلامت رہیں۔

شہزادہ صاحب: یہ شور کیوں ہو رہا ہے ـــــ وہ دروازہ بند کر دو جا کر۔

(نوازش مغربی دروازہ بند کر دیتا ہے شور کم ہو جاتا ہے)

جس حویلی نے (زور زور سے سانس لینے لگتے ہیں)

رحمت: کیا بات ہے شہزادہ صاحب، آپ کی طبیعت۔

(مغربی دروازے پر زور زور سے دستک پڑنے لگتی ہے)

شہزادہ صاحب: (کھڑے ہو کر) ہم کہہ رہے ہیں ـــــ جس حویلی نے سالہا سال تک ہماری شان و شوکت کا ساتھ دیا ہے ـــــ وہ آج بھی ـــــ ہمارے ننگ و ناموس کی حفاظت کرے گی کسی غیر کا منحوس قدم یہاں نہیں آ سکتا۔ یہ اونچی چھت ہمارے سروں پر قائم رہے گی ـــــ یہ بلند دیواریں ـــــ ہمارے اردگرد کھڑی ـــــ رہیں گی ـــــ ہماری عظمت کی یہ

تابناک یادگار ہمیشہ سلامت ـــــ رہے گی ـــــ کوئی شخص اس کا ایک ذرہ بھی چھین کر نہیں لے جا سکتا ـــــ کوئی غیر قدم یہاں نہیں آ سکتا ـــــ ہم ـــــ ہم ـــــ

(شہزادہ صاحب دھم سے زمین پر گر پڑتے ہیں۔ نوازش، فیروز اور رحمت "میّوں! شہزادہ صاحب" کہتے ہوئے انھیں اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں ـــــ شہزادہ صاحب کی آنکھیں پتھرا چکی ہیں ـــ چہرے کا رنگ نیلا پڑ گیا ہے۔ منہ سے خون بہ رہا ہے۔ رحمت زور زور سے شہزادہ صاحب، شہزادہ صاحب پکارتا ہے۔

مشرقی دروازے سے جہانگیر، ارجمند بانو اور ممتاز بانو آتے ہیں۔

جہانگیر کیا ہوا ابا جان کو! کہہ کر باپ پر جھک جاتا ہے۔ ارجمند بانو "ابا حضور ابا جان" کہہ کر باپ سے چمٹ جاتی ہے۔ باپ کا جسم بے حس و حرکت ہے۔

ممتاز بانو بھی باپ پر جھک گئی ہے۔ دونوں لڑکیاں زار و قطار رو رہی ہیں۔ مغربی دروازے پر زور زور سے دستک ہوتی ہے۔ لڑکیوں کی چیخوں میں کڑکتی ہوئی آواز ہے۔ "دروازہ کھولو" فیروز جا کر دروازہ کھول دیتا ہے۔ بنک کا منیجر اندر آتا ہے۔ دروازے پر ہی کھڑے کھڑے کہتا ہے)

بنک کا منیجر: (آواز بھاری) تم لوگ ابھی تک یہیں ہو ـــــ سارا سامان نہیں گیا۔ حویلی نیلام ہو چکی ہے نیا مالک آ رہا ہے (سب کو پریشان دیکھ کر) ارے یہ کیا (آگے بڑھ کر شہزادہ صاحب کی لاش دیکھتا ہے) بڑے میاں کو کیا ہو گیا ہے؟ ـــــ ارے اس نے تو زہر کھا لیا ہے۔ رنگ نیلا پڑ گیا ہے۔ پولیس کو اطلاع کرو۔

(بنک کا منیجر جلدی سے دروازے کی طرف جاتا ہے۔ ارجمند بانو اور ممتاز بانو زار و قطار رو رہی ہیں۔ جہانگیر کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے ہیں اسی حالت میں پردہ گرتا ہے

۴۱ء

مہمان

ممتاز مفتی

کردار

جمیل	عمر تیس سال، دفتر میں اسسٹنٹ کی آسامی پر فائز ہے
ثریا	جمیل کی بیوی، عمر چھبیس سال
بدھو	اُن کا نوکر، عمر اٹھارہ سال
اکبر	جمیل کا دوست عمر چھبیس سال
ناز	اکبر کی بیوی عمر اکیس سال

منظر

(جمیل کے مکان کا ایک کمرہ، پشت کی دیوار میں ایک بڑا دروازہ بائیں ہاتھ دو کھڑکیاں اور دائیں ہاتھ کی دیوار میں ایک معمولی دروازہ۔

کمرہ کا ساز و سامان عام ہے، ایک پرانی وضع کی سنگار میز، ایک بیڈ، دو آرام کرسیاں اور دو دو میزیں۔ ان کے علاوہ ایک ریڈیو کچھ کتابیں اور ایک چھوٹی الماری)

○

ایک اوسط گھرانے کا عام سا کمرہ جو بیک وقت نشست گاہ اور خوابگاہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے

وقت — دن — اتوار ———

جمیل کرسی پر بیٹھا ہے اس کے سامنے میز پر حساب کی کاپی رکھی ہے منہ میں پنسل دبائے وہ کچھ سوچ رہا ہے۔ جمیل کی بیوی ثریا چارپائی پر بیٹھی بچی کے فراک پر بٹن ٹانک رہی ہے وہ انکھیوں سے جمیل کی طرف دیکھتی جاتی ہے پردہ اٹھنے کے بعد کچھ دیر تک خاموشی چھائی رہتی ہے جمیل بار بار حساب کی طرف دیکھتا ہے اور مبہم طور پر ٹھنڈا سانس بھرتا ہے اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں ہیں۔ ثریا بار بار اس کی طرف دیکھتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں دبا دبا سا تبسم جھلکتا ہے جس میں واضح طور پر طنز ہے۔

ثریا : میں پوچھتی ہوں بار بار حساب جوڑنے سے مشکل حل ہو جائے گی کیا؟

جمیل : پھر تم بیچ میں بولنے سے باز نہ آؤ گی ؟
ثریا : میں نہ بولوں تو آپ کے منہ سے مکھیاں نکلنے لگیں ۔
جمیل : (اپنے آپ سے) تین سو، تین سو پچپن اور چھپتر یہ ہوئے چار سو۔
ثریا : بار بار گننے سے ان رقموں کی میزان کم ہو جائے گی کیا ؟
جمیل : پھر گڑبڑ کر دیا۔ آہ ! پانچ منٹ کے لیے بھی تو تمھاری زبان منہ میں چین سے نہیں رہ سکتی اگر اللہ میاں عورت کے منہ پر ایک کنڈی لگا دیتے جس پر تالا لگایا جا سکتا تو زندگی کس قدر سکھی ہو جاتی۔ نروان ہی نروان ہو جاتا پھر تو۔
ثریا : لیکن مہاتما جی، عورتوں کے خلاف منہ سے جھاگ نکالنے سے یہ رقم، جو ہمیں قرض خواہوں کو فوری ادا کرنی ہے کم نہ ہوگی اور آپ چاہے سارا دن حساب جوڑتے رہیں یہ پانچ سو بتیس روپے پانچ سو تیس نہ ہو گے۔ ہاں !
جمیل : لیکن اتنی ساری رقم ہم کیسے ادا کریں گے ؟ اب کی بار ۲۵۲ تو تنخواہ کے آئیں گے اور تین بقایا کا بل ہوگا یعنی کل رقم پانچسو باون ہوگی۔
ثریا : ٹھیک تو ہے پانچ سو بتیس قرض ادا کر دیں گے باقی بچے بیس۔ اللہ کے فضل سے ہو جائے گا گزارہ۔
جمیل : تم تو مذاق کرتی ہو، ۲۰ روپے میں مہینہ کیسے گزرے گا ۔
ثریا : اگر میں کہوں اللہ کے فضل سے ہو جائے گا تو کہتے ہیں تم مذاق کرتی ہو اور جب آپ خود کہا کرتے ہیں تم نہیں سمجھتیں ثریا۔ اللہ کے فضل سے ٹھیک ہو جائے گا اس وقت تو آپ پر مکمل سنجیدگی کا عالم طاری ہوتا ہے ۔
جمیل : لاحول ولاقوۃ ! پھر وہی مذاق۔ ذرا سنجیدگی سے سوچو نا۔
ثریا : میں پوچھتی ہوں جب جیب میں پیسے ہوتے ہیں آپ کے اس وقت تو آپ حاتم بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور اگر میں ٹوکوں تو کیسی نفرت سے کہتے ہیں تم عورتیں ! تم اس قدر خسیس کیوں ہوتی ہو۔ ذرا فراخدلی سے کام لو۔ اب آپ کی وہ فراخدلی کیا ہوئی ؟
جمیل : بس تم تو صرف طعنے دینا جانتی ہو۔ ہونہہ !

ثریا : میری بات سنتا کون ہے یہاں ؟

(دروازہ پر کھٹکا ہوتا ہے)

جمیل : ہائیں یہ کون ہے ؟

ثریا : ہوگا تمہارا ہی کوئی دوست ، اِدھر چائے کا وقت ہوا اُدھر کوئی آپہنچا ۔ کیوں نہ آئے ، اللہ کے فضل سے کھاتا پیتا گھر ہے اب ان کو کیا معلوم کہ اندر سے کیا حالت ہے ؟

جمیل : بُدھو او بُدھو ! دیکھنا باہر کے دروازے پہ کون ہے ، بھاگ کر جانا ذرا (بہ آواز بلند) اونہوں ، میرا کوئی دوست ہوتا تو آواز دیتا ، دروازہ نہ کھٹکھٹاتا ۔

ثریا : مَیں نے کہا ۔ آپ خود جا کر دیکھیں ، بُدھو کا کیا اعتبار ۔

جمیل : تم تو خواہ مخواہ اُس سے بدظن ہو ۔

بُدھو : (داخل ہو کر) آپ نے مجھے بلایا ہے بابوجی ؟

ثریا : لیجئے کر لیجئے بات ۔ مَیں تو خواہ مخواہ بدظن ہوں اس سے ۔

جمیل : ابے بے وقوف ، میرے منہ کی طرف کیا دیکھتا ہے باہر جا کر دیکھ کون ہے ۔

بُدھو : بہت اچھا بابوجی ! (باہر جاتا ہے)

جمیل : نوکر بھی وہ لائے ہیں آپ چُن کر جس کا جواب نہیں ۔ اتنا سمجھ دار ہے اگر مَیں کہوں یہ اخبار اندر میز پر رکھ دے اور یہ خط لیٹر بکس میں ڈال آ تو اخبار لیٹر بکس میں ٹھونس آئے گا اور خط میز پر ۔

بُدھو : (داخل ہو کر) باہر تو کوئی نہیں بابوجی ۔ یہ پرچی ہی پڑی تھی ۔ ڈیوڑھی میں ۔

ثریا : دکھا تو ؟

(بُدھو پرچی ثریا کو دیتا ہے)

(جا اب تو جا کر کپڑے اِستری کر)

بُدھو : اچھا جی !

ثریا : ہے اللہ ، یہ تو ایک اور بل ہے ؟

جمیل : ایک اور بل ؟

ثریا : پانی کا بل ہے۔ پندرہ روپے بارہ آنے کا۔

جمیل : اتنا بل ؟

ثریا : اس وقت تو پروا نہیں ہوتی جب آپ نہانے لگتے ہیں گھنٹوں شپاشپ ہوتی رہتی ہے۔

جمیل : میں تو صرف ایکبار نہاتا ہوں دو گڑویاں ڈالیں رام رام کیا اور باہر نکل آیا۔ البتہ تم دن میں بتیس دفعہ منہ ہاتھ دھوتی ہو۔

ثریا : توبہ ہے ! فضول خرچ خود ہیں اور الزام مجھ پر دھرتے ہیں۔

جمیل : خرچ کی کوئی حد ہے لو اور مقابلہ کر لو۔ تم ریشم پہنتی ہو اور میں موٹا کھدر۔ تمھارا سنگار ہی ختم نہیں ہوتا اور میں منہ پر گیلا تولیہ مار کر گزارہ کر لیتا ہوں۔ پھر تیل لو۔ ماشاءاللہ بال اتنے ہیں کہ سمیٹے نہیں جاتے، چار سیر کا تیل پڑ جاتا ہے ان میں۔

ثریا : اور آپ نہیں لگاتے تیل کیا ؟

جمیل : کیوں مذاق کرتی ہو بیگم سارا سر تو گنجا ہوا جا رہا ہے، تیل کہاں لگاؤں گا میں ؟ دیکھ لو سر تو رہا نہیں اپنا۔ ماشے کا سارا چہرہ بنا جا رہا ہے۔

ثریا : جبھی تو صابون کا خرچ زیادہ ہوتا ہے۔

جمیل : اب یہ سولہ روپے اور بڑھ گئے پانی کے بل کے۔

ثریا : کتنے ہو گئے کل۔ پانچ سو بتیس اور سولہ کتنے ہوئے ؟

جمیل : پانچ سو اڑتالیس۔

ثریا : ہائے۔ میں تو بھول ہی گئی ایک بل اور بھی ہے۔

جمیل : نہ نہ خدا کے لئے اُسے بھولی ہی رہو۔ ورنہ اپنا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔

ثریا : وہ بل ہے جبھی تو ڈاکٹر کا۔

جمیل : اوہ ! وہ تو بڑا ضروری ہے۔

ثریا : میرا کیا ہے۔ میں تو کبھی بیمار پڑتی ہی نہیں۔ آپ ہی مہینے میں ایک بار شیشی بھر اکرتے ہیں ڈاکٹر سے۔
جمیل : بیمار پڑجاتا ہوں اگر تو کیا یہ میرا قصور ہے ؟
ثریا : اور کیا میرا ہے ؟ مجھے تو ڈبل چوٹ پڑجاتا ہے۔
جمیل : ڈبل چوٹ ؟ وہ کیسے ؟
ثریا : زیادہ کھانے سے۔ ایک تو باورچی خانے کا خرچ بڑھتا ہے اور دوسرے ڈاکٹر کا بل۔
جمیل : اب باتیں بنانے سے کیا فائدہ۔ سوال تو یہ ہے کہ کریں کیا ؟
ثریا : مجھ سے پوچھئے تو میں تو کہوں گی تمام بل ادا کر دیجئے۔
جمیل : تمام بل ادا کردیں تو خود یتیم خانے میں داخل ہو جائیں یا پیٹ پر پتھر باندھ لیں ؟
ثریا : دیکھئے اس مصیبت سے نکلنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ یہ روز کے بہانے اب نہیں چلیں گے اس لیے بل ادا کر دیجئے اور ایک مہینے کی چھٹی لے کر کسی کے گھر مہمان بن کر جا رہیں۔ اتفاق سے بچوں کی چھٹیاں ہیں، صرف آپ کو ہی چھٹی لینی پڑے گی۔
جمیل : بھئی واہ کیا بات سوجھی ہے ؟
ثریا : اس طرح اس ماہ کا خرچ بھی نہ ہوگا اور قرضہ بھی سارے کا سارا ادا ہو جائے گا۔
جمیل : خدا کی قسم بڑی اچھی تجویز ہے۔
ثریا : صرف جانے آنے کا کرایہ لگے گا اور دس ایک روپیہ کے پھل خریدنے پڑیں گے۔
جمیل : وہ کس لیے ؟
ثریا : آخر جس کے ہاں جائیں گے اس کے لیے کوئی چیز لے کر ہی جائیں گے دستور جو ہوا۔
جمیل : تو میں کل ہی چھٹی کے لیے درخواست دے دوں ؟
ثریا : مل جائے گی کیا ؟
جمیل : کیوں نہیں افسر بے چارا بڑا اچھا ہے۔ اگر کل درخواست دوں تو پرسوں سے چھٹی منظور ہو جائے گی اور کل تنخواہ اور ایریرز کے دونوں بل بھی مل جائیں گے۔

ثریا : تو پھر ہم کل بل وغیرہ ادا کر کے، شام کی گاڑی سے روانہ ہو جائیں۔

جمیل : ٹھیک ہے لیکن سوال یہ ہے کہ جائیں کہاں ؟

ثریا : لو، ایک ہی تو جگہ ہے جانے کے لیے۔

جمیل : وہ کون سی ؟

ثریا : اے ہے نازؔ کے ہاں اور کہاں ؟ دیکھئے نا رشتہ داروں کے ہاں جانے کے لئے تو میں تیار نہیں ہوں نہ بھئی، ان کا احسان لینے سے تو بھوکوں مرنا بہتر ہے وہ وہ باتیں نکلتی ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔

جمیل : یہ تو ٹھیک ہے۔

ثریا : میں تو سچ بات کہوں گی، ہاں رشتہ داروں کو چھوڑ کر باقی رہیں سہیلیاں جن کے ساتھ بے تکلفی ہے زبیدہ سلیمہ اور زیب النسا، تو کراچی میں ہیں۔ اب اتنا کرایہ خرچ کر کے کراچی کون جائے ؛ بس لے دے کر نازؔ ہی ہے اور پھر اللہ کے فضل سے کھاتا پیتا گھرانہ ہے ان کا۔ اپنی زمینیں ہیں ملازمت بھی ہے اور ایمان کی بات یہ ہے کہ عید کے چاند کی طرح ہماری راہ دیکھتی ہیں۔

جمیل : ہاں بھئی ہے بڑی محبت والی۔ اور اس کے میاں اکبر بھی خوب آدمی ہیں۔ واہ واہ !

ثریا : پردہ وہ نہیں کرتی، نہ میں اکبر صاحب سے پردہ کرتی ہوں پھر ان کا گھر بھی صاف ستھرا اور فراخ ہے اور پھر ایبٹ آباد۔ منظر بھی خوبصورت اور آب و ہوا بھی اچھی۔

جمیل : بس تو پھر طے ہو گیا۔ تم تیاری کر لو بیگم، کل شام کی بس سے روانہ ہو جائیں۔

ثریا : کیوں شام کو کیوں چلیں ؛ شام کو وہاں پہنچ کیوں نہ جائیں۔ دو گھنٹے میں تو بس وہاں پہنچ جاتی ہے چار بجے کی بس سے چلیں تو چھ بجے وہاں پہنچ جائیں گے، چھ نہیں تو ساڑھے سہی۔

جمیل : واہ واہ بیگم، کیا بات پیدا کی ہے۔ بڑی بات ہوئی نا آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام۔ ایک تو قرضہ اتر جائے گا اور دوسرے ایبٹ آباد کی سیر مفت میں۔

ثریا : آپ جو کہتے تھے کوئی تجویز بتاؤ (ناز سے) تو میں نے کہا بتا ہی دو۔

جمیل : اس وقت تو کمال کر دیا تم نے ثریا۔ ذرا دیکھو نا میری طرف !

ثریا : اب لگے بنانے۔

جمیل : اگر میں ہفت اقلیم کا بادشاہ ہوتا تو اس تجویز پر ساری بادشاہی تمھیں بخش دیتا۔

ثریا : پہلے قرضہ تو چکا لیجئے، پھر ہفت اقلیم کی بادشاہت بخش دینا۔

جمیل : قرضہ؟ قرضہ تو سمجھو درست ہو گیا آج رات یوں ٹانگیں پھیلا کر بے فکری سے سوئیں گے۔

بدھو : (باہر سے شور) بابوجی بابوجی آ گئے آ گئے

جمیل : ہائیں! یہ کیا چلا رہا ہے؟

ثریا : نہ جانے ہر وقت کیا بکتا رہتا ہے۔ اللہ مارا! بدھو کہیں کا

بدھو : (باہر سے) بابوجی بابوجی! وہ آ گئے (اندر داخل ہوتے ہوئے) بابوجی!

جمیل : ابے کیا بکتا ہے تو؟

بدھو : نہیں صاحب بکتا تو نہیں میں تو کہہ رہا ہوں۔

جمیل : بند کر بکواس کو۔

بدھو : لیکن بابوجی وہ جو آ گئے ہیں تو میں کیا کروں۔

ثریا : کون آ گئے ہیں اسے ہے اسے بات تو کرنے دیجئے، کون آئے ہیں بدھو؟

بدھو : بیگم صاحبہ کہہ تو رہا ہوں۔ کہ مے مان آئے ہیں

جمیل : مہمان آئے ہیں؟

ثریا : کون مہمان آئے ہیں؟

بدھو : وہ باہر تانگے سے سامان اتروا رہے ہیں جی!

ثریا : سامان اتروا رہے ہیں؟

بدھو : ہاں بیگم صاحبہ! وہی ایبٹ آباد والے جو پچھلے سال آئے تھے۔

ثریا : ہائیں! کیا ناز یہاں پہنچ گئی؟

جمیل : ارے، یہ کیسے ہو سکتا ہے ہم تو خود وہاں جا رہے ہیں۔

بدھو : جی وہی ایبٹ آباد والی بیگم صاحبہ اور ان کے صاحب ۔

ثریا : (سر پکڑ کر بیٹھ جاتی ہے) ہئے یہ کیا ہو گیا !

جمیل : سمجھو تباہ ہو گئے بیگم !

(ناز دوڑی دوڑی داخل ہوتی ہے ۔)

ناز : ہئے ۔ مَیں تو تمہیں دیکھنے کو ترس گئی تھی ۔

ثریا : شکر ہے اللہ کا میری ناز آئی ۔

(دونوں بغلگیر ہوتی ہیں)

ناز : ہئے مَیں تو کب سے انتظار کر رہی تھی کہ کب انھیں چھٹی ملے اور کب ہم تمھارے پاس پہنچیں ۔

(اکبر داخل ہوتا ہے)

اکبر : اسلام علیکم کیئے مزاج اچھے ہیں ؟

جمیل : آئیے آئیے ، ابکی مرتبہ تو بہت راہ دکھائی

اکبر : ملازم ٹھہرے چھٹی ملے تو بات بنے ۔ کب سے درخواست دے رکھی تھی کل دو مہینے کی چھٹی منظور ہوئی اور آج یہاں پہنچ گئے ۔

ثریا : آنے کی اطلاع ہی نہ دی ۔ حد کر دی آپ نے ۔

ناز : تو اطلاع کی کیا ضرورت تھی ۔ مَیں تو بلکہ چاہتی تھی کہ ایک دم آکر تمھارے گلے لگ جاؤں ۔ ایک دم ۔

ثریا : ہئے مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے ۔

(دونوں بغلگیر ہوتی ہیں)

جمیل : اکبر صاحب آپ کی صحت تو ماشاء اللہ !

اکبر : مَیں تو بلکہ دبلا ہو گیا ہوں ۔

ناز : آج سے دو مہینے پہلے دیکھتے آپ انھیں تو حیران رہ جاتے ۔ اب تو دبلے ہو گئے ہیں ۔ آپ بھائی جان آپ تو سدا رنگ کی طرح ہمیشہ ایک سے ہی رہتے ہیں ۔ اسے رتی اور ذکی کہاں ہیں ۔

ثریا : قدا پڑوسیوں کے ہاں گئے ہیں۔ انھوں نے بلایا تھا نہ جانے کیا بات ہے۔

ناز : اچھے تو ہیں نا۔

ثریا : ہئے کیا پوچھتی ہو، ناک میں دم کر رکھا ہے، دونوں نے۔ ایسی ایسی شرارتیں سوجھتی ہیں کہ کیا بتاؤں۔
دن بھر پریشان کئے رہتے ہیں۔

ناز : اے ہے بچے ہی تو ہیں۔

ثریا : میں کہتی ہوں پہلے جائیے ہوگی یا ———

اکبر : انہوں تکلف کی کوئی بات ہی نہیں۔

ثریا : تکلف کس بات کا بھائی جان، آپ کا اپنا گھر ہے۔

اکبر : ناشتہ کرکے چلے تھے وہاں سے اور کھانا یہاں ریفرشمنٹ روم میں کھا آئے۔

ثریا : ہئے کتنی بری بات۔

جمیل : یہ تو بڑی زیادتی ہے۔

ثریا : کوئی غیر کے گھر تو نہیں آنا تھا کہ اسٹیشن پر کھانا کھا کر آتے۔ چھی بھائی جان !

ناز : پوچھو ان سے، میں تو کہہ رہی تھی۔ یہ مناسب نہیں ثریا برا مانے گی۔ لیکن انھوں نے میری ایک نہ سنی۔

ثریا : کیوں نہ مانوں برا۔

اکبر : اچھا غلطی ہوئی، آئندہ سے نہ ہوگی

ثریا : تو اب چائے تو لگی ہوگی نا: آپ اٹھئے نا ذرا۔

ناز : بھئی اب تکلف نہ کرنا۔

ثریا : لے ہے اس میں تکلف کی کیا بات ہے۔ (باہر نکل جاتی ہے)

جمیل : میں ابھی آیا، جب تک آپ ذرا پسینہ سکھا لیجئے

(باہر جاتا ہے)

اکبر : آج کل پسینہ کہاں سوکھتا ہے (ہنستا ہے)

(کچھ دیر کے لئے خاموشی رہتی ہے اکبر اخبار دیکھتا ہے' ناز بے کار
بیٹھی رہتی ہے)

ناز : دیکھا میری تجویز کیسی رہی۔ آپ تو مانتے ہی نہیں تھے۔

اکبر : مجھے کیا پتہ تھا کہ ایسا بھی ہوتا ہے۔

ناز : کچھ پتہ بھی ہو آپ کو' بے کار سارا دن اللہ ماری کتابیں الٹتے رہتے ہیں

اکبر : (ہنستا ہے)

ناز : اب دو ماہ میں کم از کم چھ سو روپیہ بچ جائے گا

اکبر : بالکل۔

ناز : اور چار سو مکان کا کرایہ آ جائے گا' یہ ہُوا ایک ہزار۔ ہزار میں سے چھ سات سو کے اچھے جوڑے بن جائیں گے نازلی کے لیے۔ باقی روپیہ شادی پر لین دین کے کام آئے گا اس طرح نازلی کی شادی پر قرضہ اٹھانا نہ پڑے گا۔

اکبر : بڑی اچھی تجویز سوجھی ہے تمھیں' کیا بات ہے (ہنستا ہے)

ناز : اور پھر نہ کسی کا احسان اور نہ گلہ شکایت۔ اپنی سہیلی کا گھر ہے جس طرح چاہو آزادی سے رہو یہاں اور جب تک جی چاہے رہو۔ اور سہیلی بھی ایسی کہ قدموں تلے آنکھیں بچھاتی ہے۔

اکبر : ہاں بھئی بڑی محبت کرتی ہے ہم سے۔ بڑی ہنس مکھ طبیعت پائی ہے۔

ناز : دونوں ہی ایسے اچھے ہیں کہ کیا بتاؤں میں۔

بدھو : (داخل ہو کر) صاحب سامان لگا دیا آپ کے کمرے میں۔

ناز : کون سے کمرے میں لگایا ہے بدھو؟

بدھو : بیگم صاحبہ اُسی کمرے میں جہاں آپ پہلے ٹھہرے تھے۔ جو دیکھنا ہو تو دیکھ لیں آپ۔

ناز : ہاں ہاں! چلئے نا دیکھ لیں اپنا کمرہ۔ دو مہینے ٹھہرنا ہے یہاں۔ پھر واپس آ جائیں گے یہاں جب تک ثریا اور بھائی جان بھی فارغ ہو جائیں گے۔

اکبر : ہاں ہاں ٹھیک ہے۔

(تینوں جاتے ہیں)

(کچھ دیر تک اسٹیج خالی رہتی ہے)

جمیل : (اپنے ہی دھیان میں داخل ہوتا ہے۔ ہاتھ میں اخبار ہے) یہ خبر دیکھی آپ نے اکبر صاحب؟ (کمرے کو خالی دیکھ کر) ارے یہ لوگ کہاں گئے۔

ثریا : (ساتھ ساتھ داخل ہوتی ہے) اپنا کمرہ دیکھنے گئے ہیں۔ میں نے بڑھو کے ہاتھ کہلا بھیجا تھا۔

جمیل : اب کیا ہوگا بیگم؟ اب تو لینے کے دینے پڑ گئے۔

ثریا : ہٹے مجھے کیا معلوم تھا کہ یوں ہوگا۔

جمیل : تو پھر اب کیا کریں؟

ثریا : میں نے کہا آپ کے پاس کوئی تار کا فارم ہے؟

جمیل : معلوم نہیں، شاید ہو۔ کیوں تار دینا ہے کیا؟

ثریا : اونہوں!

جمیل : تو پھر؟

ثریا : کوئی ایسی تجویز کیجئے کہ کہیں سے تار آجائے۔

جمیل : کہاں سے آجائے تار؟

ثریا : اے ہے کہیں سے آجائے۔ لاہور سے آجائے کہ خالہ سخت بیمار ہے۔

جمیل : خدانخواستہ خالہ کیوں بیمار ہو؟

ثریا : اوہو، آپ تو سمجھتے ہی نہیں۔ میں کب کہتی ہوں کہ خالہ بیمار ہو۔ خالی تار ہی آجائے پھر اس بہانے ہم لاہور جانے کو تیار ہو جائیں گے اور ناز کو مجبوراً جانا پڑے گا۔

جمیل : اوہ یہ بات ہے۔ لیکن اس سے ہمیں کیا فائدہ ہوگا؟ ہم کہاں جائیں گے؟

ثریا : وہ بعد میں سوچ لیں گے۔

جمیل : لیکن تار کیسے آئے۔

ثریا : لے ہے جھوٹ موٹ کا تار فارم بھر کر دروازے میں پھینک دیں اور دروازہ کھٹکھٹا دیں تو بدھو اٹھا لائے گا وہ سمجھیں گے تار والا پھینک گیا ہے اس کا معائنہ تو کریں گے نہیں وہ کسی پرانے تار پر یہ نیا پیغام لکھ کر تاریخ نوٹ دیں۔

تمیل : ہاں یہ تو ہو سکتا ہے۔

ثریا : تو پھر آپ جلدی کریں۔

تمیل : اچھا۔

(اٹھ کر جاتا ہے۔ ثریا بیٹھ کر بنتی ہے، سوچتی ہے۔ بدھو ٹرے اٹھائے داخل ہوتا ہے۔ ٹرے میں شربت کا جگ ہے اور چار گلاس)

ثریا : (بدھو کو دیکھ کر) نازنہ (بہ آواز بلند) بھائی جان اب آئیں بھی نا۔

(نازنہ اور اکبر داخل ہوتے ہیں)

ثریا : لے ہے پانی تو پی لیجئے پیاس لگی ہوگی؟

(نازنہ اور اکبر بیٹھ جاتے ہیں ثریا گلاس بھر کر دیتی ہے)

نازنہ : بھائی جان کہاں گئے؟

ثریا : ادھر اپنے کمرے میں بیٹھے کوئی کاغذ تلاش کر رہے ہیں۔

نازنہ : انھیں بلاؤ نا۔

ثریا : ابھی آجائیں گے، تم فکر نہ کرو شکنجبین کی خوشبو پہنچے گی تو خود بھاگیں گے۔

اکبر : کیوں؟

ثریا : توبہ ہے۔ دن میں دس مرتبہ شکنجبین پیتے ہیں۔ لیمو کے رسیا ہیں۔

نازنہ : (ہنس کر) آپ کی طرح۔

اکبر : ثریا ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دبلی ہو گئی ہو تم۔

ثریا : دبلی تو نہیں بھائی جان۔ ویسے آپ جانتے ہیں انسان کو فکر لگا ہو تو۔

اکبر : فکر۔ کیسا فکر ؟

ناز : ہائیں ثریا۔

ثریا : وہی خالہ کا فکر ہے۔

ناز : خالہ کا ؟ کونسی خالہ کا ؟

ثریا : وہ ایک ہی تو خالہ ہیں میری۔ تمھیں خط میں نہیں لکھا انھوں نے ؟

ناز : نہیں تو !

اکبر : کب لکھا تھا ؟

ثریا : نہ جانے کل یا پرسوں۔

اکبر : تو وہ خط دفتر میں پڑا ہوگا۔ ابھی ملا نہیں۔

ناز : پھر ہُوا کیا خالہ کو ؟

ثریا : اے ہے تانگے میں جا رہی تھیں اپنی سہیلی کی طرف کہ موٹر سے ٹکر ہو گئی۔

ناز : ہائیں ٹکر ہو گئی ؟

ثریا : ویسے چوٹ نہیں آئی لیکن صدمہ پہنچا ہے۔

ناز : شکر ہے اللہ کا۔ میں بھی ———

ثریا : اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے مگر جب تک خیریت کی خبر نہ آئے فکر تو لگا ہی رہے گا۔

اکبر : وہ تو ہے۔

ناز : توبہ میری تو جان نکال لی۔ تو نے ٹکر کی بات کر کے۔

ثریا : میں تو آپ خبر سن کر سٹپٹا گئی تھی۔

ناز : سٹپٹانا تو تھا ہی۔ (باہر دروازے پر دستک)

اکبر : بات ہی ایسی ہے۔

ناز : چلو اب تو اللہ نے فضل کر دیا۔

ثریا : بدھو باہر جاکر دیکھو دروازے پر کون ہے ؟

بدھو : (داخل ہوکر) مجھے بلایا بیگم صاحب ؟

ثریا : لو دیکھو لو اللہ مار، بالکل بدھو ہے۔ کہہ رہی ہوں باہر جاکر دیکھو کون ہے اور تو یہاں آکر پوچھتا ہے مجھ سے

توبہ ہے۔

جمیل : (ہاتھ میں تار کا فارم اٹھائے داخل ہوتا ہے) ثریا بیگم تار۔

ثریا : ہائے اللہ تار!

جمیل : خالہ کی حالت اچھی نہیں۔

ثریا : ہائے خالہ (چیخ مار کر بے ہوش ہو جاتی ہے)

ناز : پنکھی پنکھی، لے ہے پانی۔ پانی لاؤ۔ میں منہ پر چھینٹے دوں۔ یا اللہ کیا ہوگیا میری ثریا کو۔

جمیل : گھبراؤ نہیں —— میں ابھی سمیلنگ سالٹس کی شیشی لاتا ہوں۔

(باہر بھاگ جاتا ہے)

(بدھو باہر جاتا ہے —— پانی لانے کے لیے)

(ناز شربت کے چھینٹے مارتی ہے ثریا کے منہ پر)

اکبر : سارا کیا کرایا تباہ ہو گیا بیگم۔

ناز : آپ تو چھوٹی سی بات پر گھبرا جاتے ہیں۔

اکبر : میں کہتا ہوں۔

ناز : اونہوں! (ثریا کی طرف اشارہ کرتی ہے)

اکبر : وہ تو بے چاری بے ہوش پڑی ہے۔ میں کہتا ہوں اچھے بجائے چھ سو رپے۔

ناز : اونھوں، کیا کہہ رہے ہیں آپ (بدھو پانی لے کر داخل ہوتا ہے)

(جمیل شیشہ لے کر ثریا کو سنگھاتا ہے، ثریا ہوش میں آتی ہے

ہوں ہوں کرنے کے بعد دفعتاً چلاتی ہے)

ثریا : نہیں میں تو ابھی جاؤں گی خالہ کے پاس۔ ابھی۔

ناز : لے ہے اس حالت میں ؟

ثریا : چاہے کچھ بھی ہو۔

جمیل : اس وقت اسے کچھ نہ کہو ناز بہن (ثریا سے) میں ابھی لیے چلتا ہوں تمھیں گھبراؤ نہیں۔ خدا خیر کرے گا۔

ثریا : موٹر کا وقت ہے ابھی تانگا منگوالیں اور میرے سوٹ کیس میں دو جوڑے رکھ دیں میں آپ رکھ لوں گی۔

ناز : نہیں نہیں !

ثریا : اب میں ٹھیک ہوں۔ ٹھیک ہوں اوں اوں : معاف کرنا ناز۔ مگر مجبوری ہے مجھے جانا ہی ہوگا۔ اے بدھو، سوٹ کیس لے آ میرا بھاگ کر جا۔

بدھو : بہت اچھا بیگم صاحب (جاتا ہے)

ثریا : وقت کیا ہے بھائی جان ؟

اکبر : ایک بجنے میں دس منٹ ہیں۔

ثریا : وقت بہت کم ہے آپ جا کر رکھ دیں کپڑے میرے سوٹ کیس میں۔ اور بدھو کو بھیج دیں تانگہ لانے کے لیے۔ ہائے ناز کتنا افسوس ہے مجھے۔ ہمارا سارا پروگرام تباہ ہو گیا۔ تمھیں کتنی تکلیف ہوئی۔

بدھو : ابھی لایا بابو جی (باہر سے)

ثریا : بڑی تکلیف ہوئی تمھیں۔

ناز : تو تکلیف کس بات کی ؟ ابھی ایک منٹ میں اپنا سامان تیار کر لیتی ہوں، باقی سامان یہیں پڑا رہے گا۔

جمیل : آخر پروگرام خراب ہوا آپ کا۔

ناز : تو اس میں خرابی کی کیا بات۔ تمھارے ساتھ جائیں گے اور پھر ساتھ ہی واپس آجائیں گے۔

ثریا : کیا کہا ساتھ ؟

ناز : اور کیا۔

ثریا : تمھیں تکلیف کرنے کی کیا ضرورت ہے خواہ مخواہ ؟

ناز : تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تمھاری خالہ کی یہ حالت ہو اور میں مزاج پرسی کے لیے نہ جاؤں خالہ کیا کہیں گی ؟

ثریا : نہیں خالہ کیا کہیں گی بھلا ؟

ناز : نہ ثریا، چاہے وہ کہیں یا نہ کہیں میں تو ضرور جا کر دیکھوں گی انھیں۔ میرا جی تو نہیں چاہتا کہ میں نہ جاؤں جیسے تمھاری خالہ ویسے میری۔ اور پھر تمھاری ایک ہی تو خالہ ہے، انھیں پتہ ہے آپ جا کر لالائیں ناسوٹ کیسی

وقت کرتے ہے۔

اکبر : (جاتے ہوئے) ابھی لاتا ہوں۔

ثریا : لیکن ناز

ناز : (منہ پر ہاتھ رکھ دیتی ہے) نہ ثریا، اس بات میں تو تمھیں میری ضد ماننا پڑے گی ہی، تو ضرور جاؤں گی چاہے کچھ ہو

جمیل : (ایک طرف) یا اللہ تو ہی عزت رکھنے والا ہے۔

ثریا : میری بات تو سنو۔

ناز : نہیں، میں نہیں سنوں گی۔

بدھو : (باہر سے) بیگم صاحبہ، بیگم صاحبہ! وہ آ گئے وہ آ گئے۔

ثریا : میں کہتی ہوں ضد نہ کرو۔

ناز : نہ بھئی یہ نہیں ہو سکتا۔

بدھو : (داخل ہو کر) وہ آ گئے صاحب وہ آ گئے۔

جمیل : وہ آ گئے۔ وہ آ گئے کیا ؟ یہ کون تانگے سے آیا ہے۔

بدھو : جی تانگے پر ہی آئے ہیں وہ۔

جمیل : کیا جھک مار رہا ہے تو ؟

ثریا : اسے بات تو کرنے دو۔ کون آیا ہے بدھو ؟

بدھو : مہمان آئے ہیں بیگم صاحبہ۔

جمیل : مہمان !

ثریا : کون مہمان ؟ کوئی ان سے ملنے والا آیا ہے کیا ؟

بدھو : جی نہیں لاہور والی خالہ آئی ہیں۔

ثریا : کیا کہا ؟

جمیل : ارے !

اکبر : ہائیں

بدھو : وہ جو لاہور والی خالہ ہیں وہ آئی ہیں تانگے سے سامان اتروا رہی ہیں۔

ثریا : (سر پکڑ کر بیٹھ جاتی ہے) میرے اللہ !

(جمیل بے ساختہ قہقہہ مار کر ہنستا ہے جیسے ہسٹریا کا دورہ
پڑ گیا ہو ناز اور اکبر حیرانی سے اس کا منہ دیکھتے ہیں)

پردہ
آہستہ آہستہ گرتا ہے

○

مریضِ قلب
ناصر شمسی

کردار

قیصر : ایک نوجوان لڑکی

ابّا جان : قیصر کے والد

انور : قیصر کا چچا زاد بھائی

بھابی جان : انور کی والدہ

○

منظر

ایک نیم روشن کمرہ ۔ کمرے کے وسط میں دیوار کے قریب دو خانے والی ایک میز رکھی ہے میز پر ایک لیمپ جس کا شیڈ ایک جانب جھکا ہوا ہے اندھیری جانب ایک پلنگ نظر آ رہا ہے جس پر کوئی کپڑا اوڑھے لیٹا ہوا ہے روشن جانب دو رسالے پڑے ہیں ۔ میز پر اس کے نیچے کے خانے میں دوا کی چھوٹی بڑی متعدد شیشیاں، تسلا، اگالدان، گلاس، پیالی وغیرہ نرسنگ کا کچھ ضروری سامان رکھا ہوا ہے ۔ روشن جانب میز سے دور ہٹ کر ایک پلنگ بچھا ہوا ہے جس پر سفید رنگ پلنگ پوش پھیلا ہوا ہے ۔

رات کے دس بج چکے ہیں قیصر اور انور کرسیوں پر بیٹھے ہیں دونوں کے ذہن اپنے اپنے خیالات کا پیچھا کر رہے ہیں اس لیے خاموشی طاری ہے قیصر چھریرے بدن کی لڑکی ہے کوئی اٹھارہ برس کا سن ہوگا ——— شکل و صورت بالکل معمولی ہے لیکن چند باتیں بالکل واضح ہیں ناک اور ٹھوڑی خود اعتمادی کا پتہ دیتی ہیں ساتھ ہی رخسار کا آنکھوں کی جانب اوپر کو کبھی کبھی کھنچ جانا بتاتا ہے کہ زندگی میں کچھ تلخیاں بھی سہی ہیں ۔ پیشانی سے ذکاوت ٹپکتی ہے ۔ اعضا کی معمولی سی حرکت بھی کچھ بتانا چاہتی ہے اس لیے وہ حسن پیدا ہو جاتا ہے جسے اندازی شوخی کہتے ہیں آنکھوں میں ایک خاص مقناطیسی چمک ہے جس کی برابری آئینہ کی قلعی بھی نہیں کرتی اور اب وہ جسے چاہیں شیشہ میں اتار لیتی ہیں ۔ انور ایک قبول صورت جوان ہے آنکھیں ڈاکٹری کی موٹی موٹی کتابیں پڑھتے پڑھتے بھینگی پڑ چکی ہیں دوہرا جسم ہے اور سینہ چکلا ۔ چہرے پر خاصا اچھا گوشت چڑھا ہوا ہے شاید اس وجہ سے کہ اپنی غذا میں پروٹین

ہائیسٹرو کلورائیڈ وغیرہ کا ٹھیک امتزاج قائم رکھتا ہے حرکات میں ذرا سا بھونڈا

پن ہے اور بات کرنے میں ذرا سی جھجک !)

قیصر : (خاموشی توڑتے ہوئے) جائیے۔ آپ تو جاکر سو جائیے (میز پر رکھی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے) رات زیادہ ہوگئی ہے۔

انور : اور تم ؟

قیصر : میں بھی سو ہی جاؤں گی۔

انور : لیکن کب ؟

قیصر : آپ تو جرح کرنے لگے۔

انور : تم ہمیشہ غلط سمجھتی ہو۔

قیصر : (ایک عارفانہ انداز میں زیر لب مسکراتی ہے ——— اور مسکراہٹ کو انور کی نظروں سے چھپانے کے لیے پلنگ کی طرف گردن کرکے) اب تشویش کی تو کوئی ایسی بات نہیں۔

انور : نہیں! رات آرام سے گزر جائے گی میں نے خواب آور دوا دے دی ہے۔

قیصر : نقصان تو نہیں کرے گی ؟

انور : میں تمہارے (لفظ "تمہارے" کو سارے فقرے کا مرکز بناتے ہوئے) والد کو ایسی دوا دے سکتا ہوں ! قیصر تمھیں یہ شبہ ہو سکتا ہے ؟

قیصر : ("تمہارے" سے سرشار ہو کر) نہیں ! (مضطرب لہجہ میں) لیکن مجھے ڈر سا لگتا ہے۔

انور : آخر کیوں ؟

قیصر : آپ جانتے ہیں ابا جان کا دل بہت کمزور ہے۔

انور : (خاطر جمعی کے لیے) یہ تو کچھ تسکین ہی دے گی (قیصر کی جانب جھک کر آہستہ سے) معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیماری خاندانی کمزوری ہے

(ایک پُر معنی ہلکا سا قہقہہ لگاتا ہے جس کا مفہوم قیصر فوراً تاڑ جاتی ہے

اور فطری طور پر شرماتی ہے۔)

قیصر : (تجاہل عارفانہ کے ساتھ) جی ہاں! چچا جان بھی تو کمزوریٔ قلب ہی کے مریض تھے اور یونہی یک بیک ایک دن ہارٹ فیلیر سے (کچھ اس طرح منہ بناتی ہے کہ "چل بسے" کا مفہوم ادا ہو جاتا ہے)

انور : ہاں!

قیصر : آپ کو تو بہت رنج ہوا ہوگا؟

انور : کیوں نہیں۔ باپ جیسی نعمت سر سے اٹھ جائے اور رنج نہ ہو۔

قیصر : (تشویش کے ساتھ) اور اب میں سوچتی ہوں

انور : کیا؟

قیصر : یہی کہ اباجان کے بعد جب اس دنیا میں میرا کوئی نہ رہے گا —— تو —— میرا سر چکرانے لگتا ہے۔

انور : (مخاطب کرتے ہوئے) قیصر؟

قیصر : (چونک کر) کیوں کیا ہے؟

انور : (جھجکتے ہوئے) میں تم سے کچھ —— کہنا چاہتا تھا —— کئی دن سے ——

قیصر : تو اب کہہ دیجئے (لیکن اٹھ کر میز کے پاس چلی جاتی ہے)

انور : پہلے یہاں آکر بیٹھو۔

قیصر : (ایسا لہجہ جو خود ایک دعوت ہے) توبہ! آپ میرا کیا کیجئے گا۔

انور : میں —— میں نہیں —— تم کو —— ——

قیصر : (ایک سیمیں قہقہہ کے ساتھ) ارے آپ تو ہکلانے لگے۔ وہ بات ایسی کیا ہے

انور : (چڑ کر) جاؤ۔ نہیں کہتے —— تم مذاق اڑاتی ہو؛

قیصر : (مناتے ہوئے) نہیں کہہ بھی دیجئے —— اچھا! اب نہیں ہنسوں گی۔

انور : تو آؤ۔ یہاں بیٹھو۔ تب کہوں گا

قیصر : اس میں وہاں آ کر بیٹھنے کی آخر کیا ضرورت ہے ؟

انور : (جھوٹ موٹ) تم کھڑی کھڑی تھک جاؤ گی !

قیصر : میں ایسی نازک تو نہیں کہ گھڑی بھر میں تھک جاؤں ۔

انور : لیکن اگر بات گھنٹوں کی ہو تو ،

قیصر : (نخوت سے گردن ہلاتے ہوئے) جائیے ! آپ بھی ایسی باتیں کرتے ہیں ؛

انور : میں گھسیٹ کر تمہیں بٹھاؤں گا ۔

قیصر : میں چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا لوں گی ۔

(انور کھڑا ہوتا ہے اور قیصر کی طرف دیکھتا ہے)

قیصر : (دو قدم پیچھے ہٹ کر) شی ! ابا میاں جاگ جائیں گے ۔

(انور رک جاتا ہے اور اندھیری جانب پچھلے پلنگ کی طرف دیکھتا ہے لیکن کوئی حرکت ہوتی نہ دیکھ کر)

انور : تم کیسی بلا کی تیز ہو قیصر !

قیصر : (شوخی سے) ہوں تو سہی ——— لیکن ——— آپ جتنی نہیں ———

انور : سچ ۔

قیصر : آپ کی قسم

انور : (ہنس کر) میری قسم

قیصر : اچھا وہ بات کیا تھی جو آپ کہہ رہے تھے ، کہہ رہے تھے اور ہکلا رہے تھے (ہلکا سا قہقہہ)

(انور قیصر کی طرف بڑھتا ہے اور قیصر کرسیوں کی آڑ لیتی ہے)

قیصر : اور جس کے لیے بلا کر پاس بٹھا رہے تھے ۔ (چڑانے کو ہنستی ہے)

(انور قیصر کو پکڑنے ایک کرسی کے پیچھے پہنچتا ہے تو قیصر دوسری کرسی کے پیچھے چلی جاتی ہے)

قیصر : اور پھر جس کے لیے خود پکڑنے آ رہے تھے (کھلکھلا کر ہنستی ہے)

انور : لیکن اب تو پکڑ کر ہی چھوڑوں گا!

قیصر : پکڑیے تب جانیں؛

انور : اچھا تو پکڑوں؛

قیصر : (قہقہہ لگا کر) اور اب تک کیا کر رہے تھے؛

(انور کرسی کو ایک طرف دھکا دے کر قیصر کو پکڑ ہی لیتا ہے قیصر ہلکی سی چیخ مارتی ہے کہ اندھیری جانب پلنگ پر ابا جان کروٹ لیتے ہیں اور نحیف سی "ہائے" سنائی دیتی ہے قیصر لڑکھڑا جاتی ہے اور انور ایک طرف کرسی کے پیچھے کھڑا ہو جاتا ہے اب ابا جان کا منہ روشنی کی جانب ہے پیشانی پر ان گنت جھریاں ہیں اور آنکھوں کے گرد گہرے گہرے خوفناک سیاہ حلقے رخسار پچکے ہوئے ہیں اور باچھیں بہت ہی جھکی ہوئی ہیں۔ ابا جان کپڑے میں سے ہاتھ نکال کر اپنے بالوں پر پھیرتے ہیں۔ بھویں ذرا اوپر کو چڑھتی ہیں اور آہستہ سے اپنی بیٹی کو آواز دیتے ہیں)

ابا جان : بیٹی! —— بیٹی قیصر

قیصر : (حواس درست کرتے ہوئے) جی —— ابا جان!

ابا جان : یہ کیسی آواز ہوئی تھی؛ —— کیا گر اتھا؛

قیصر : (جلدی سے کرسی کو سیدھا کرتے ہوئے) کچھ نہیں ابا!

ابا جان : تو میرا دل دھڑکا ہوگا —— بالکل ایسی آواز تھی جیسے دھڑ سے کوئی چیز آ پڑی ہو۔

قیصر : نہیں ابا جان! آپ کا وہم ہے اور کچھ نہیں۔ آپ سو جائیے؛

ابا جان : کیا بجا ہوگا؛

قیصر : اول شب ہے۔ ساڑھے دس بجے ہیں (پھر جلدی سے باپ کے سرہانے جھکتے ہوئے) اب زیادہ

کمزوری تو نہیں محسوس ہو رہی۔

اباجان : نہیں بیٹی ——— (اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے) ہائے (انور پر نظر پڑتی ہے) میاں انور بھی تم یہیں ہو؟

انور : (گھبرائے ہوئے) میں —— میں ———

قیصر : (لقمہ دیتے ہوئے) یہ آپ کے دل کی حرکت گننے آئے تھے (توجہ منتقل کرتے ہوئے) ابا دوا سے کچھ آرام ملا؟

اباجان : بیٹی! بھلا کہیں دوا سے بھی آرام ہوا ہے۔

قیصر : (منہ پھلا کر) ابا۔ آپ تو ہمت ہار دیتے ہیں آپ خود بھی تو اپنی طبیعت سنبھالیے تب ہی تو آرام ہوگا۔

انور : میں صبح تک اس دوا کا اثر اور دیکھتا ہوں ورنہ کل نسخہ بدل دوں گا۔

اباجان : نہیں میاں! مجھے تو اس دوا سے ہی بہت فائدہ ہے ——— تم بھلا کب تک دوا بدلتے رہو گے

انور : چچا جان! کوئی نہ کوئی دوا تو شفا دے گی ہی (آلہ لیکر قریب آتا ہے) میں ذرا (BEATING) دیکھ لوں۔

اباجان : تم بے کار پریشان ہو رہے ہو تھک گئے ہو گے بس اب تم آرام کرو!

انور : بیکار کیوں چچا جان! خدا نے چاہا تو آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔

قیصر : میں نے وعدہ کیا ہے کہ اگر ابا بالکل اچھے ہو گئے تو انھیں ایک سوئیٹر بن کر دوں گی۔

انور : (مسکرا کر) چچا جان! آپ نے سنا۔

اباجان : تم دونوں کی امیدیں اور کوششیں دیکھ کر میرا دل اور بھی بیٹھا جاتا ہے۔

انور : نہیں چچا جان!

اباجان : میں نے تو قیصر کو بہت منع کیا تھا کہ بیٹی نہ لکھو انھیں۔ ایسی حالت میں علاج بیکار ہے لیکن یہ نہ مانی۔

قیصر : ابا نے تو بہت منع کیا لیکن میرا دل چاہتا تھا کہ ایک دفعہ ان کا لگ کر غور سے علاج ہو جائے

انور : علاج میں تو کوئی کسر میں اٹھا نہیں رکھوں گا (دل پر آلہ لگاتا ہے)

اباجان : تم بھی اپنی سی کرکے دیکھ لو : ہونا ہوا کچھ نہیں —— میرا وقت آگیا ہے —— پورا ہوا چاہتا ہے

قیصر : نہیں ابا !

انور : نہیں چچا جان !

اباجان : نہ تم روک سکتے ہو اور نہ میں رک سکتا ہوں ۔

انور : (دل پر سے تار ہٹاتے ہوئے) ایسا نہ کہئے چچا جان ۔

قیصر : (پلنگ پر جھک کر جیسے دل منہ میں آگیا ہو) اباجان ! —————— میرے ابا !

اباجان : تم لوگ نہیں جانتے ۔ میں اپنی حالت خوب جانتا ہوں ۔

قیصر : (آنکھوں سے آنسو ٹپکتے ہیں) اباجان ! ایسا نہ کہئے ۔ نہ کہئے ایسا ۔

اباجان : بیٹی (باپ کی آواز بھی بھاری ہو جاتی ہے) قیصر ! میں تیری ——————

انور : (گھبرا کر) جلدی ! ماتھے پر بام لگاؤ ۔ میں دوا دیتا ہوں ۔—— پیر کھول دو —— جلد !

(قیصر جلدی سے پیر کھول دیتی ہے ۔ انور دوا حلق میں ڈالتا ہے اور
قیصر جلد جلد ماتھے پر بام لگانا شروع کرتی ہے)

اباجان : تم —— تم

انور : آپ آنکھیں بند کر لیجئے بس —— بس —— اب آپ سو جائیے ۔

(تھوڑے وقفہ بعد)

(قیصر استفہامیہ نگاہوں سے انور کی جانب دیکھتی ہے)

انور : (واپس کرسی کے پاس آکر نہایت خشک لہجہ میں) حالت تشویش ناک ہے ۔

قیصر : تو پھر کیا ہو ۔

انور : انھیں مکمل آرام دینا چاہئے اور ہاں دودھ لاکر یہیں رکھ لو ، اگر آنکھ کھلے تو تھوڑا سا پلا دینا ۔

قیصر : میں لے آؤں گی ۔ اچھا اب آپ جاکر سو جائیے ۔

انور : قیصر ۔ ذرا سی بھی کوئی بات ہو تو فوراً مجھے اٹھا لینا ۔

قیصر : ہاں ہاں ـــــ آپ جائیے

انور : (جاتے ہوئے)

(انور بائیں جانب چلا جاتا ہے اور قیصر دودھ کا جگ اٹھا کر دائیں جانب۔ کچھ دیر بعد ایک ادھیڑ عمر عورت داخل ہوتی ہے۔ ماتھے پر ہلکا سا ایک بل۔ ہونٹ بھنچے ہوئے۔ کمرے میں ادھر اُدھر دیکھتی ہے اور پھر کرسی کے پاس آکر تمکنت سے کھڑی ہو جاتی ہے۔ ایک نظر پلنگ پر ڈالتی ہے لیکن سوتا دیکھ کر واپس جانے کے لیے مڑتی ہے کہ پلنگ پر سے آواز آتی ہے)

اباجان : قیصر! ـــ بیٹی قیصر! (بھابی جان رک جاتی ہیں لیکن کوئی جواب نہیں دیتیں۔ اباجان جواب نہ پاکر لیکن ایک عورت کو کھڑا دیکھ کر) کون ہے؟

بھابی جان : میں ہوں۔

اباجان : بھابی جان! ـــــ اوہو ـــــ آپ! ـــ اتنی رات گئے۔

بھابی جان : میں ذرا دیکھنے آئی تھی

اباجان : آپ نے ناحق تکلیف کی، میرا تو کچھ ایک سا ہی حال رہتا ہے۔

بھابی جان : (لاپروائی سے) ہوں۔

اباجان : ابھی ابھی انور میاں مجھے دیکھ کر گئے ہیں۔ میں انھیں بہت منع کرتا ہوں۔ کہتا ہوں علاج سے کیا حاصل لیکن وہ برابر آ آ کر دیکھتے ہیں۔ دوائیں بدلتے ہیں۔

بھابی جان : انور رات کو بھی آکر دیکھتا ہے؟

اباجان : ہاں، ہاں کل رات ہی آئے تھے۔

بھابی جان : کیا بجا ہوگا اس وقت؟

اباجان : کوئی ایک بجا ہوگا ـــــ آپ بیٹھ جائیے!

بھابی جان : قیصر کہاں ہے؟

اباجان : ابھی تو یہیں تھی۔ ـــــــ کچھ کام تھا اُس سے ؟

بھابی جان : نہیں ۔

اباجان : اس غریب کی جان مصیبت میں ہے ، میں تو مر ہی رہا ہوں لیکن یہ میرے ساتھ زندہ درگور ہوتی جا رہی ہے ۔

بھابی جان : (طنزیہ ہنستے ہوئے) غریب !

اباجان : (حیرت سے) کیوں کیا ہُوا ؟

بھابی جان : تو آپ کو کچھ نہیں معلوم ؟

اباجان : کیا ؟

بھابی جان : (طنزاً) آپ کو بھلا کیوں نظر آتا ؟

اباجان : کیا مطلب ؟

بھابی جان : آپ کی آنکھوں کے سامنے سب کچھ ہوتا ہے اور آپ ـــــ کچھ بھی نہیں جانتے ۔

اباجان : آپ جو کچھ کہنا چاہتی ہیں کہہ کیوں نہیں دیتیں !

بھابی جان : (ترشی سے) میں بھی کہنے ہی آئی ہوں ۔

اباجان : (بگڑ کر) تو کہہ دیجئے ۔

بھابی جان : سنیئے ! میں انور کا قیصر کے پاس آنا پسند نہیں کرتی ـــــ اور مجھے شبہ ہے ــ کہ ــ

اباجان : (احتجاجاً) بھابی جان !

بھابی جان : آپ کے بھائی نے سر توڑ کوشش کی کہ یہ رشتہ ہو جائے ۔ لیکن نہ اُن کی زندگی میں یہ رشتہ ہُوا اور نہ اب کبھی ہوگا ۔

اباجان : بھائی جان کا اصرار ضرور تھا ، لیکن میں نے تو منظور نہیں کیا تھا ۔

بھابی جان : آپ منظور کرتے بھی تو بے کار تھا ۔ میں کبھی راضی نہ ہوتی اور میری رضامندی کے بغیر وہ انگلی نہیں ہلا سکتے تھے ۔

اباجان : (غصہ کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں) مجھے بھی یہی شبہ تھا۔

بھابی جان : مجھ پہ تو شبہ ہوگیا لیکن اپنی بیٹی پر شبہ نہیں ہوتا۔

اباجان : کس بات کا ؟

بھابی جان : میں قیصر کے تیور ٹھیک نہیں دیکھ رہی۔

اباجان : (حیران ہوکر) یعنی ؟

بھابی جان : میں نے آپ کو یہاں علاج کے واسطے آنے دیا تھا اس لیے نہیں کہ آپ کی بیٹی میرے لڑکے پر ڈورے ڈالنے شروع کردے۔

(اباجان کے چہرے پر خون دوڑ جاتا ہے آنکھیں اُبل آتی ہیں غصہ سے کانپنے لگتے ہیں۔)

اباجان : (چیخ کر) آپ —— آپ نے کیسے کہا —— آپ —————— آپ ——

(قیصر ہاتھ میں دودھ کا جگ لیے داخل ہوتی ہے لیکن باپ کو مشتعل دیکھ کر جگ ہاتھ سے چھوڑ، دوڑ کر باپ سے لپٹ جاتی ہے۔)

قیصر : کیا ہوا ابا ؟ ———— ابا ! آپ لیٹ جایئے —— آپ کو آرام کرنا چاہیئے —— اور بھائی نے سخت تاکید کی ہے۔

اباجان : (بھابی سے مخاطب ہوکر، غصہ سے کانپتے ہوئے) آپ کے پاس چار پیسے ہیں اس لیے آپ ہم غریبوں کو جو چاہیں کہہ لیں۔

قیصر : ابا آپ لیٹ جایئے۔

اباجان : (اسی لہجہ میں) آپ نے میری بیٹی کو سمجھا کیا ہے ؟

قیصر : (تیز تیز نگاہوں سے چچی کی طرف دیکھتی ہے) مجھے کچھ کہا ہے نا ابا ؟

اباجان : ایسی بات کہی ہے جو دشمن کی بیٹی کو بھی نہیں کہتے !

قیصر : تو کیا ہوا۔ بڑی چچی کو کہہ لینے دیجئے ــــــ ۔ آپ آرام کیجئے۔

ابا جان : میرا خون کھول رہا ہے بیٹی :

قیصر : ایسی کیا بات کہہ دی ؟

ابا جان : میں تو زبان پر بھی نہیں لا سکتا۔ میری رگوں میں خون آگ کی طرح بھڑک رہا ہے۔

بھابی جان : (اطمینان کے ساتھ) یہ تجھے نہیں بتائیں گے لیکن میں بتائے دیتی ہوں۔

ابا جان : اسے کہتے شرم نہیں آتی آپ کو !

بھابی جان : جسے کرتے شرم نہ آئی اس سے کہتے کیا شرم ؟

ابا جان : (جیسے کوئی ... کی نس میں چبھتا ہو) بھابی جان :

قیصر : (ملتجیانہ) ابا آپ آرام کیجئے۔ نہیں تو مرض میں زیادتی ہو جائے گی۔

بھابی جان : سن قیصر :

قیصر . (تیار ہو کر) کہئے ۔

بھابی جان : مجھے شبہ ہے کہ تو باپ کی تیمارداری کی آڑ میں اپنے لیے زمین ہموار کر رہی ہے

قیصر : (حیرت سے) چچی جان

بھابی جان : بے چاری کیسی انجان بنتی ہے ۔

قیصر : آپ کیا کہہ رہی ہیں ؟

بھابی جان : گریبان میں منہ ڈال کر دیکھ میں کیا کہہ رہی ہوں

ابا جان : (غصہ سے پلنگ پر سے اٹھنے کوشش کرتے ہوئے) میں ــــــ میں ـــ ـــ

قیصر : (جلدی سے باپ کو پکڑتے ہوئے) آپ لیٹے رہیئے ابا (روتے ہوئے) آپ کی طبیعت ابھی بگڑ چکی ہے آپ کو بالکل آرام کرنا چاہئے (چچی سے) آپ کتنی ظالم ہیں آپ کو ان کی حالت پر بھی رحم نہیں آتا۔

بھابی جان : تو بیٹی ہو کر باپ کے مرتے وقت اس دھن میں ہے اور دوسرے کو ظالم کہتی ہے ۔

قیصر : آپ مجھ پر ناحق نہ جانے کیا طوفان اٹھا رہی ہیں ۔

بھابی جان: (غصہ سے) تو میں جھوٹ کہہ رہی ہوں؟

قیصر: میں کیا جانوں ——— ابا جان! آپ تھوڑا سا دودھ پی لیجئے۔

بھابی جان: (غصہ سے چیختے ہوئے) تو میری آنکھوں میں خاک ڈالنا چاہتی ہے۔

ابا جان: بھابی جان ——— آپ ——— آپ ———

قیصر: (فقرہ پورا کرتے ہوئے) آپ تشریف لے جایئے (ابا کے شانے پکڑ کر پلنگ پر لٹا دیتی ہے)

بھابی جان: تو کون مجھے حکم دینے والی! (دھڑ سے کرسی پر بیٹھ جاتی ہیں) میں آج اس کا فیصلہ کر کے جاؤں گی۔

قیصر: (رونے ہوئے) آپ (باپ کی طرف اشارہ کر کے) ان کو فیصلہ کرنا چاہتی ہیں؟

بھابی جان: (تلملا کر) میں تیری یہ ساری تیزی نکال دوں گی۔ کیا مروڑا ہے میری بات کو۔

قیصر: نہیں تو اور کیا کرنا چاہتی ہیں۔

بھابی جان: میں تیری عقل ٹھکانے لگانا چاہتی ہوں۔

قیصر: تو آپ نے مجھے اپنے کمرے میں بلا لیا ہوتا، آخر ان کے سامنے یہ سب کچھ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

بھابی جان: تاکہ انھیں بھی تو معلوم ہو جائے کہ مرتے باپ کے بستر کے برابر بیٹی اپنی سیج بسانا چاہتی ہے۔

(ابا جان چیخ مار کر پلنگ سے اٹھتے ہیں۔ لیکن نڈھال ہو کر گر پڑتے ہیں)

قیصر: (باپ کو سنبھالتے ہوئے چچی سے) پڑ گئی آپ کے کلیجے میں ٹھنڈک۔

بھابی جان: چپ بدتمیز!

(انور داخل ہوتا ہے)

انور: میں نے ابھی چچا جان کی آواز سنی تھی (جلدی سے پلنگ کی طرف لپکتے ہوئے) قیصر! تم نے فوراً مجھے کیوں نہ بلایا ——— ان کی پیشانی پر پسینے آ رہے ہیں، جلدی سے پیر کھولو بھلا دیکھو یہ حال ہو رہا ہے اور تم نے مجھ سے آ کر کہا تک نہیں۔

(قیصر روتی رہتی ہے۔ انور پلٹ کر اپنی ماں کو کھڑا دیکھتا ہے)

انور: ان کی یہ حالت ہوتی دیکھ آپ نے بھی مجھ سے آ کر نہیں کہا؟

انھیں ایک دورہ ابھی اس سے پہلے پڑ چکا ہے ۔

(ماں بھی کوئی جواب نہیں دیتی)

انور : کیوں ۔ یہ بات کیا ہے ؟ (دونوں کی طرف مشتبہ نگاہوں سے دیکھتا ہے قیصر روتی رہتی ہے اور بھابی جان منہ پھلائے کرسی پر بیٹھی رہتی ہے دونوں میں سے کوئی جواب نہیں دیتا ۔

انور : تم دونوں میں سے کوئی نہیں بولتا ۔ —— آخر اتنی دیر میں کیا ہوگیا ہے ؟

قیصر : آپ جائیے ۔ ہو چکا علاج ۔ ہم کل صبح کی ٹرین سے واپس جا رہے ہیں ۔

انور : تم دیوانی تو نہیں ہوگئی ہو ۔

قیصر : ہم یہاں علاج کرانے آئے تھے ۔ ان کا خاتمہ نہیں ۔

انور : لیکن ان کا خاتمہ کون کر رہا ہے ؟

قیصر : چچی جان ۔

(انور تیز تیز نگاہوں سے اپنی ماں کی طرف دیکھتا ہے)

بھابی جان : اس لڑکی کا تو دماغ پھر گیا ہے ۔

(بھابی جان اُٹھ کر چلی جاتی ہیں ۔ انور حیرت سے دروازہ کی جانب دیکھتا رہ جاتا ہے ۔ قیصر باپ کے سرہانے روتی ہے)

انور : (قیصر کے پاس آتے ہوئے) آخر کیا بات ہوئی تھی ؟

قیصر : (اور زور سے رونے لگتی ہے) آپ یہاں سے چلے جائیے ۔

انور : آخر کچھ بات بھی تو بتاؤ ۔

قیصر : آپ کی ماں نہیں چاہتیں کہ آپ ایک منٹ بھی میرے پاس ٹھہریں ۔

انور : تم تو دیوانی ہوگئی ہو قیصر !

قیصر : آپ کی ماں نہ جانے کیا کیا کچھ ابا سے کہتی رہیں ۔ —— میرے متعلق ——

انور : آخر کیا کچھ کہہ دیا معلوم تو ہو ؟

قیصر : مجھے شرم آتی ہے کہتے۔

انور : (ہنس کر) تم تو بالکل بچی ہو۔

قیصر : آپ کی تو ہنسی ہوتی ہے لیکن میں ناحق بدنام ہو جاؤں گی۔

انور : (سنجیدگی سے) تو میرا نام ایسا بُرا ہے؟

قیصر : میں آپ کے نام کو تو نہیں کہہ رہی

انور : میں تو کچھ یہ ہی سمجھا!

قیصر : خیر اب ہم کل صبح چلے جائیں گے پھر آپ کی ماں کو میری پرچھائی بھی نظر نہیں آئے گی۔

انور : لیکن تمھیں تو میں نے بلایا تھا!

قیصر : لیکن میں آپ کے پاس تو نہیں آئی تھی؛

انور : لیکن اب بلاؤں تو؟

قیصر : آپ بیکار کی باتیں کرتے ہیں۔

انور : خیر۔ تم اب اس گھر سے نہیں جا سکتیں۔

قیصر : آپ کی زبردستی ہے۔

انور : البتہ اگر تمھیں مجھ سے ایسی ہی نفرت ہو تو ————

قیصر : آپ کیا باتیں کر رہے ہیں۔

انور : میں تمھیں اپنا کرنا چاہتا ہوں۔ ———— اپنا ————

(انور پیچھے سے قیصر کی دونوں بانہیں پکڑ لیتا ہے)

قیصر : (انداز سے) چھوڑ دیجیے بھی!

انور : میں تمھیں چاہتا ہوں قیصر ———— میں چاہتا ہوں کہ تم ہر دم میرے پاس رہو میرے سینے کے نزدیک، تاکہ دل کی حرکت دوگنی ہو جائے۔

قیصر : (چھیڑ سے) بس صرف اسی لیے۔

انور : (جھجکتے ہوئے) میں تمہیں جب دیکھتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے میرے سونے کا انجکشن لگا دیا ہے
جسم میں گرمی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ چہرہ تمتما اٹھتا ہے اور ایک عجیب حرارت محسوس ہونے لگتی ہے۔

(قیصر پر جیسے جادو کر دیا ہو۔ انور کے سینے سے اپنی پیٹھ لگائے سر ٹیڑھا
کر کے انور کے شانے پر لٹکائے بے سکت کھڑی ہے)

انور : جب میں ہسپتال میں مریضوں کے آپریشن کرتا ہوں تو ان کے سرد جسم کو چھو کر مجھے جھرجھری سی آتی ہے اور میرے
جسم میں سے بھی جان نکلنے لگتی ہے ——— لیکن قیصر تمہیں چھو کر مجھ میں ایک نئی جان آجاتی ہے رگ
رگ میں خون دوڑنے لگتا ہے۔ ایک عجیب خود رفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔

(قیصر بھی از خود رفتہ انور کی باتوں میں محو ہے کہ اتنی دیر میں ابا جان بری طرح ہاتھ
پیر مارتے ہیں اور کچھ بڑبڑاتے ہیں قیصر کی آنکھوں کی پتلیاں جواب تک ایک جگہ
جمی ہوئی تھیں آہستہ آہستہ حرکت کرتی ہیں اور باپ کی طرف جاتی ہیں باپ کو دیکھ
کر آنکھیں پھٹ جاتی ہیں چہرہ پر دہشت نمایاں ہوتی ہے اور قیصر ایک جھٹکے سے اپنے
جسم کو انور کے سینے سے الگ کر کے پلنگ کی طرف دوڑتی ہے اور باپ کے سر
کے برابر اپنا سر رکھ دیتی ہے۔

ابا جان : میری بیٹی ——— کس نے کہا ——— کس نے کہا ——— جھوٹ بالکل جھوٹ ———

قیصر : ابا ..... ابا جان!

ابا جان : کون؟ ——— کون؟ ——— قیصر ——— ابھی میں زندہ ہوں میرے ہوتے ہوئے
تجھے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔

قیصر : آپ سو جائیے ابا!

ابا جان : میری بیٹی ——— نہیں نہیں ——— ایسا نہیں ہو سکتا ——— وہ مجھے بہت چاہتی ہے۔

قیصر : ابا! آپ کو آرام کرنا چاہیے۔ آپ کی طبیعت خراب ہے ابا!

ابا جان : میرا خون کھول رہا ہے۔

قیصر : (طنزیانہ انداز میں) ابا! اپنی طبیعت سنبھالیے !

اباجان : جس کا باپ مر رہا ہو ———— وہ بیٹی ———— نہیں ——— نہیں ——

قیصر : (روتے ہوئے) ابا ——— آپ کوشش کیجیے میری خاطر ——— اپنی طبیعت سنبھالیے۔

اباجان : میں اچھا ہوں ——— اچھا ہوں ——— ہم چلیں گے ——— اپنے گھر ——— کل ——

قیصر : ہاں ابا۔ اب سو جائیے ——— کل چلیں گے ——— سو جائیے

(قیصر سر پر گیلا تولیہ رکھتی ——— اور چند منٹ پلنگ پر جھکی رہتی ہے)

قیصر : (انور سے) بس اب آپ بھی سو جائیے۔

انور : اب تم جاؤ گی تو نہیں :

قیصر : (نخرے سے) جائیے بھی !

انور : وعدہ کرتی ہو ؟

قیصر : (مسکرا کر) آپ تو جرح کرنے لگتے ہیں۔

انور : تم ہمیشہ غلط مطلب سمجھتی ہو۔

(انور قیصر کے نزدیک آ جاتا ہے)

قیصر : شکریہ! بس اب جائیے !

(انور کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن قیصر پہلے سے ہی ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش
رہنے کا اشارہ کرتی ہے اور ہاتھ سے جانے کو کہتی ہے انور چلا جاتا ہے۔ قیصر
کے لبوں پر مسکراہٹ ہے اور پھر ایک لمحے کو سامنے جھک کر اپنے بالوں میں
اپنی انگلیوں سے کنگھی سی کرتی ہے۔ پھر ابا کے برابر اپنا تکیہ کھینچ لیتی ہے کچھ دیر
سر اٹھاتی ہے اور ———————)

قیصر : جس کا باپ مر رہا ہو ———— وہ بیٹی ———— (ایک آہ سے اعتراف کرتے
ہوئے) وہ عورت ہے ؟

○

نُوری خالہ

ہاجرہ مسرورؔ

کردار

لیفٹیننٹ عزیز بیس پچیس کی درمیانی عمر کا تندرست خوبصورت نوجوان ٹھہر ٹھہر کر اور الفاظ چبا کر بولتا ہے۔

شاہدہ نازک سی خوبصورت لڑکی جس کی شادی چند دن پہلے عزیز سے ہوئی ہے بڑے ناز سے اور بن بن کر بولتی ہے۔

ماموں رضا راکھ کے رنگ کے بالوں والے پچاس پچپن کی عمر کے آدمی۔ گرے سوٹ اور عنابی ٹائی میں اپنی عمر سے کم نظر آتے ہیں کچھ گھبرائے ہوئے سے بات کرتے ہوئے ہاتھ اور سر سے اشارے کرتے جاتے ہیں۔

○

پہلا منظر

(پردہ اٹھتا ہے تو ایک چھوٹا سا کمرہ نظر آتا ہے ننھا سا صوفہ سیٹ اور دو آرام کرسیاں عام انداز سے لگی ہوتی ہیں درمیان میں کشمیری لکڑی کے کام کی چھوٹی سی تپائی ہے جس پر لمبا سا گلدان مرجھائے ہوئے پھولوں سے سجا رکھا ہے سامنے آتشدان ہے جس کی کارنس پر پیتل اور چینی کے چند کھلونے ہیں اور ان کھلونوں کے علاوہ درمیان میں کسی عورت کی بڑی سی تصویر سنہرے فریم میں لگی ہوئی رکھی ہے تصویر ضرورت سے زیادہ انلارج کئے جانے کے باعث دھندلی نظر آتی ہے — تصویر کے دونوں طرف لکڑی کے رنگین شمع دانوں میں آدھ جلی موم بتیاں لگی ہوئی ہیں آتشدان کے دونوں پہلوؤں میں دو دروازے ہیں جن پر گہرے نیلے رنگ کے پردے لگے ہوئے ہیں۔ پردہ اٹھنے کے چند سیکنڈ بعد داہنے دروازے سے شاہدہ اندر داخل ہوتی ہے اس کے کپڑوں میں سرخ رنگ کی بہتات ہے وہ سنبھل سنبھل کر اپنے ہونٹوں کی لپ اسٹک رومال سے برابر کر رہی ہے —— اس کے پیچھے عزیز اندر آتا ہے —— وہ اپنی وردی میں ہے جس کی کریز غائب ہے۔ اس کی انگلیوں میں سگریٹ ہے جسے وہ بار بار چوسنے کے انداز سے ہونٹوں کی طرف لے جاتا ہے۔)

عزیز: (کھنکھار کر رومال جیب سے نکالتا ہے اور منہ رگڑ کر پونچھتے ہوئے) خوب پہنچے بھئی آپ کی یادداشت کی داد دینا پڑتی ہے۔ آپ کو ایک دم یہاں کا پتہ خوب یاد آیا۔ ورنہ میری اسکیم تو

چوٹ ہوگئی تھی (بڑھ کر شاہدہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتا ہے) آپ بھی اپنے دل میں کہتی ہوں گی کہ عجیب بے تکا آدمی ہے اپنی نئی دلہن کو لے کر یوں ہی منہ اٹھائے نیا گھر بسانے چل پڑا۔ —— کیوں —— ایسی پیاری دلہن کو ٹانگے میں پھرا پھرا کر تھکا مارا (شاہدہ کی ٹھوڑی پکڑ کر سر اونچا کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن شاہدہ شرما کر الگ ہو جاتی ہے) دراصل مجھے یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ مسعود صاحب قبلہ گھر بند کر کے ایسی سردی میں مری تشریف لے گئے ہوں گے (پاؤں پٹخ کر جوتوں کی گرد جھاڑتا ہے اور قالین سے گرد کا ایک بگولا اٹھتا ہے) اور —— اور —— (گھبرا کر) اور معاف کیجئے گا، تمام دھول اڑ گئی —— آپ تو جانتی ہی ہیں کہ فوجی لوگ ذرا بدتمیز ہوتے ہیں —— ہوں۔ ————

(شاہدہ کی طرف دیکھ کر بیٹھے انداز سے مسکراتا ہے)

شاہدہ : (گھبرا کر پلکیں جھپکاتی ہے اور پھر شرمائے ہوئے) اوں۔ مَیں، مَیں تو —— میرا مطلب ہے میں نے اپنی طرف سے تھوڑی کہا تھا —— مَیں نے کہا تھا لوگ کہتے ہیں۔

عزیز : یعنی آپ کا مطلب ہے، کہ لوگ کہتے ہیں، پھر آپ کا فوجیوں کے بارے میں کیا خیال ہے۔

شاہدہ : (ناز سے) واہ آپ بات خوب یاد رکھتے ہیں۔

عزیز : (شاہدہ کے قریب آتے ہوئے) نہیں ویسے میرا حافظہ کافی کمزور ہے لیکن آپ کی باتیں بھی کوئی بھول سکتا ہے۔ کیوں ہماری شادی کو دس دن ہو گئے نا، دیکھئے مجھے شادی کی تاریخ تک یاد نہیں آ رہی۔

شاہدہ : (کچھ پژمردہ ہو کر تعجب سے) اچھا سچ مچ —— ہاں شادی اتنی اہم بات تو نہیں کہ اس کی تاریخ یاد رکھی جائے۔

(پھیکی ہنسی ہنستی ہے)

عزیز : اور کیا! اب یہ تاریخوں وغیرہ کا حساب بھی یاد رکھنا جھنجھٹ ہے تو بس آپ کے سوا کچھ یاد نہیں! سچ معلوم ہوتا ہے جیسے۔

شاہدہ: جیسے؟

عزیز: جیسے آپ مجھے جنم جنم سے یاد ہیں حالانکہ شاید ہماری شادی کو دس دن ہوئے ہیں۔

(شاہدہ بن کر ہنستی ہے)

عزیز: اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے —— سچ کہتا ہوں مجھے آپ کی ایک ایک بات، ایک ایک حرکت تک یاد ہے حتیٰ کہ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جب سے آج تک آپ کی پلکیں کتنی بار جھپکی ہیں۔

(عزیز کمر پہ ہاتھ باندھ کر شاہدہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتا ہے شاہدہ ایک لمحہ مبہوت رہ کر پیچھے ہٹتی ہے۔)

شاہدہ: واہ! خواہ مخواہ بناتے ہیں آپ (کچھ سوچ کر) اچھا بتائیے میری پلکیں جب سے آج تک کتنی بار جھپکی ہیں۔ چلئے آپ کی بات کا امتحان ہو جائے۔

عزیز: (پوری سنجیدگی سے) جناب فی منٹ پندرہ دفعہ کی رفتار سے اس حساب سے ایک گھنٹے میں نوسو مرتبہ اور ایک دن میں اکیس ہزار چھ سو مرتبہ اور پھر اکیس ہزار چھ کو دس سے ضرب دے کر بنے غالباً —— (آں غالباً۔)

شاہدہ: (بے ساختہ ہنستی ہے) غلط بالکل غلط۔

عزیز: ٹھیک بالکل ٹھیک۔

(شاہدہ ہنسے جا رہی ہے عزیز اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس کی کمر میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے اور شاہدہ تیزی سے آتشدان کے قریب چلی جاتی ہے)

شاہدہ: (جیسے اپنے آپ سے) تمام گرد ہی گرد تھی راستے میں —— کتنی بار منہ دھویا، پھر بھوت کے بھوت۔ تمام جسم پر دھول کی تہ جم گئی —— جانے نوکر کب رضا ماموں کو اطلاع دے کر آئے گا: پانی گرم ہو جاتا تو پہلے ہم لوگ نہا لیتے، ٹھیک ہے نا؟

(شاہدہ آتشدان سے لگ کر شرماتے ہوئے عزیز کو دیکھتی ہے لیکن

عزیز بچوں کی طرح منہ بنا کر صوفے پر بیٹھ جاتا ہے اور سگریٹ سلگانے
لگتا ہے۔)

شاہدہ: دیکھئے ذرا، یہاں بھی ہر طرف خاک دھول ہی ہے یہ نوکر بڑے مفت خورے ہوتے ہیں۔
(کارنس پر پھونک مار کر خاک اڑاتی ہے) اب بے چارے رضا ماموں جیسے لوگ بیٹھ کر گھر گرہستی
تو نہیں کر سکتے۔

(شاہدہ آتشدان پر سے بڑی تصویر اٹھا کر مرغ پر سے جھاڑتی
ہے اور دو ایک لمحے اسے غور سے دیکھ کر ٹھنڈی لمبی سانس لیتی
ہے)

شاہدہ: یہ بے چاری ہوتیں تو اس گھر کا یہ حال کیوں ہوتا۔

عزیز: شکر ہے، میرا خیال آپ کو نہیں، اس گھر کا خیال تو ہے ـــــ دوسری کروا دیجئے اپنے
ماموں جان کی شادی دن رات گھر کی صفائی کیا کریں گی نئی ممانی۔

(عزیز بچوں کی طرح روٹھ کر ہونٹ لٹکا لیتا ہے اور صوفے پر
پاؤں پھیلا کر نیم دراز ہو جاتا ہے)

شاہدہ: (ایک اور لمبی سانس لے کر) وہ بھلا رضا ماموں شادی کیسے کریں گے۔

عزیز: (بے تعلقی سے) جیسے پہلے کی ہوگی، آسان ترکیب ہے۔

شاہدہ: واہ پہلے بھی کہاں کی تھی شادی؟

عزیز: مجھے کیا معلوم کہاں کی تھی؟ آپ بتا دیجئے!

شاہدہ: میرا مطلب ہے ماموں کی شادی ہوئی ہی نہیں۔

عزیز: تو پھر یہ تصویر؟

(چونک کر تصویر کی طرف اشارہ کرتا ہے اور شاہدہ تصویر اس کے
ہاتھ میں دے دیتی ہے، عزیز تصویر پر ایک نظر ڈالتا ہے)

عزیز : (سرسری طور پر) اچھی تصویر ہے۔

شاہدہ : صرف اچھی؟ جناب بے حد حسین تھیں ہماری نور جہاں خالہ

عزیز : (چونک کر) آں . رضا صاحب کی بہن —— عجیب انداز سے باتیں کرتی ہیں آپ یعنی آپ ابھی کہہ رہی تھیں کہ یہ تصویر والی خاتون یہاں ہوتیں تو گھر یُوں بُری حالت میں نہ ہوتا۔

شاہدہ : اور کیا ؟

عزیز : (طنز سے ہنس کر) اچھی تو کہتا ہوں کہ آپ کی باتیں سمجھنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ یعنی آپ کے ہاں رواج ہے کہ بہنیں تمام عمر بھائی کے گھر کی صفائی کرنے کو بیٹھی رہتی ہیں۔ میرا خیال ہے گھر کی صفائی کا اتنا خیال شاید ہی کوئی بہن کرتی ہو —— یہ تو بس آپ ہیں کہ اسے ان فکروں کے میرے پاس تک آ کر نہیں بیٹھنیں۔ کیا بات کہ جناب آتشدان کی صفائی ہو رہی ہے —— جہنم میں جائے خاک دھول۔

شاہدہ : (اداس ہو کر) تو یہ بالبس آپ کو رات دن اپنی پڑی رہتی ہے —— لے کے بے چاری نور جہاں خالہ کو رضا ماموں کی بہن بنا ڈالا۔

عزیز : (ذرا چڑ کر) اب آپ کے حافظے کی تعریف کر دی تو اس کا یہ مطلب ہیں کہ میں آپ کی خالہ کو آپ کے ماموں کی بہن نہیں بھی مان لوں۔

شاہدہ : (ایک دم بُرا مان کر اور ضرورت سے زیادہ اداس ہو کر) آپ کو جانے کیا ہو جاتا ہے طبیعت ہی بدل جاتی ہے ایک ذرا میرا مطلب ہے، آپ کی خواہش کے خلاف —— ایسا بھی کیا۔

(شاہدہ رنجیدہ ہو کر تصویر رکھ دیتی ہے اور منہ پھیر کر کھڑی ہو جاتی ہے، عزیز سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا کر اس کی طرف دیکھتا ہے اور کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے اٹھتا ہے۔)

عزیز : ارے آپ تو ناراض ہو گئیں، دیکھوں ذرا میری گڑیا کے منہ پر غصہ کیسا لگتا ہے (شاہدہ کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اپنی طرف کرتا ہے) اچھا تو پھر میں سننے کو تیار ہوں کہ آپ کی خالہ آپ کے ماموں کی بہن

نہیں ہوتیں بلکہ ــــــــ

شاہدہ : (اسی کبیدہ خاطر انداز میں) نوری خالہ چچا زاد بہن تھیں رضا ماموں کی ــــــ اور کچھ ــــــ

عزیز : (خوشامد کے انداز میں) خوب اتنی سی بات تھی ــ پہلے ہی فقرے میں بتا دیا ہوتا، آپ تو جانتی ہیں ہم فوجی ذرا دماغ سے کام کم ہی لیتے ہیں، اوں، ٹھیک ہے ؟

(شاہدہ چپ رہتی ہے جیسے وہ ابھی تک ناراض ہو)

عزیز : آئیے صوفے پر مل کر بیٹھیں، شادی کے بعد گھر میں رسم و رواج کے اتنے ہنگامے تھے کہ دن میں آپ کی صورت تک نظر نہ آتی تھی۔ بس راتوں کو چاند کی طرح طلوع ہوا کرتی تھیں جب تو آپ بہو بیگم تھیں سب کی، مگر اب صرف میری شدو ہیں، آئیے صوفے پر بیٹھیں۔

(شاہدہ مسحور سی اس کے سہارے چلتی صوفے پر اس کے پاس بیٹھ جاتی ہے۔)

اور قریب آ جائیے شادو رانی، ایسے (اپنے قریب شاہدہ کو سمیٹتا ہے) میں ہمیشہ سے خواب دیکھتا تھا کہ ایک سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں چاند سی شدو کے ساتھ آزادی سے ایک ہی صوفے پر بیٹھوں ــــــ بس ایسے۔

(عزیز محبت سے اس کے سر پر اپنا گال رکھ کر آنکھیں بند کر لیتا ہے، اچانک بائیں دروازے کا پردہ ہٹتا ہے اور ماموں رضا اندر آ جاتے ہیں، عزیز اور شاہدہ ایک دوسرے سے یوں الگ ہوتے ہیں، جیسے کانٹے چبھ گئے ہوں، دونوں گھبرا کر کھڑے ہو جاتے ہیں ــــــ)

ماموں : (انتہائی شرمندہ ہوتے) ارے بھئی حد کر دی، غیریت کی تم نے شاہدہ بی بی، ایک خط تو ڈال دیا ہوتا۔ اسٹیشن پہنچتا۔

شاہدہ : (دوپٹہ سر پر ڈال کر شرماتے ہوئے) مگر ماموں جان بات یہ تھی کہ عزیز صاحب اپنے کسی دوست

کے ہاں رکنا چاہتے تھے ہم وہاں پہنچے تو معلوم ہوا وہ لوگ مری گئے ہوئے ہیں۔

عزیز: (جھینپ کر) جی ہاں! بڑی پریشانی ہوئی۔ میں نے کہا ہوٹل چلیں۔ مگر پھر شاہدہ نے دماغ پر زور دیا تو آپ کا پتہ یاد کر کے چھوڑا۔ یہ کہتی تھیں ماموں کے ہوتے ہوئے ہوٹل میں ٹھہرنا مناسب نہیں معاف کیجئے گا ہم لوگوں نے آکر (عزیز کھسیا کر دونوں ہاتھ ملتا ہے)

ماموں: ہر بھئی! خواہ مخواہ خیریت کی باتیں بھی تو کہتا ہوں کہ تم لوگوں نے مجھے اپنا سمجھنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ اگر تم مجھے اپنا سمجھتے تو کسی دوست کے ہاں ٹھہرنے کی بات ذہن میں آتی ہی نہیں، کیوں ٹھیک ہے نا؟

عزیز: مگر آپ سے، میرا مطلب ہے، میری ملاقات نہیں تھی، اس لیے۔

ماموں: ہاں میں شادی میں نہیں آسکا مگر شاہدہ مجھے بہت عزیز ہے، پھر پھڑک کر رہ گیا۔ بات یہ ہے عزیز میاں! یہ شادی وادی کے ہنگامے میرے جیسے آدمی کے بس کے فٹ نہیں بیٹھتے۔ حالانکہ میں شدو کو دلہن بنے دیکھنا چاہتا تھا مگر یہ شادی وادی (لمبی سانس لیتے ہوئے) اوہ! مگر تم لوگ کھڑے کیوں ہو، بیٹھو بھئی۔

(عزیز اور شاہدہ سعادت مند بچوں کی طرح صوفے کی طرف لپکتے ہیں، عزیز ایک کونے میں اور شاہدہ دوسرے کونے میں سمٹ جاتے ہیں، دوسرے لمحے ماموں دونوں کو پُر شفقت نظروں سے دیکھ کر دونوں کے بیچ میں سما جاتے ہیں)

میں کہہ رہا تھا کہ بھئی یہ شادی وادی ——————

(عزیز حیران نظروں سے شاہدہ کو دیکھتا ہے اور ماموں رُک کر ہنس پڑتے ہیں)

ماموں: (اداس ہنسی ہنس کر) تم مجھے نہیں جانتے عزیز میاں! خیر خیر! تم لوگ نہا دھو لو، تمہارے بال خاک دھول میں اٹے ہوئے ہیں (اونچی آواز سے) ارے میاں شرفو! بھائی حمام گرم کر دو۔ اور ہاں تم لوگوں نے سامان کہاں رکھا ہے اپنا؟

شاہدہ : جی آپ کے بیڈروم میں، آپ کو تکلیف تو ہو گی۔

ماموں : افوہ بھئی، پھر وہی تکلف کی باتیں بھئی یہ مکان بڑا بے تکا ہے کل تین کمرے ہیں مگر دل میں جگہ ہونا چاہئے۔ نئی نسل اس بات کو تو کیا سمجھے گی۔ بہرحال میرا تو جی خوش ہو گیا۔ تم لوگوں کو دیکھ کر اطمینان سے رہو، اپنا گھر سمجھ کر۔

عزیز : جی تھوڑے دنوں تک مجھے فیملی کوارٹر مل جائے گا انشاء اللہ! بس بات یہ ہوئی کہ میں شادی کے سلسلے میں چھٹی پر تھا، جیسے ہی ڈیوٹی پر پہنچا، تبادلے کے آرڈر مل گئے، بڑی پریشانی ہوئی یہ آپ کی بھانجی بے چاری، بڑی کوفت میں مبتلا ہوں گی کہ بغیر انتظام کے ———

ماموں۔ (بات کاٹ کر) اسے بھائی تو شاہدہ کو اس کے میکے چھوڑ آتے، جب پکا انتظام ہو جاتا تو پھر ——— چہ مگر تم نئی نسل کے لوگ مادی اقدار کے آ گئے۔ ———

عزیز (ہڑبڑا کر) جی جی ہاں۔

(شرم سے سرخ ہو کر سر کھجانے لگتا ہے)

ماموں : عزیز میاں شرمانے کی بات نہیں ہے میں پرانے ٹھاٹ کا آدمی نہیں کہ رشتے ناطے دیکھ کر بات کروں۔ میں تو کھل کر بات کرتا ہوں مجھ سے تم دوستانہ طریقے سے بات کر سکتے ہو اطمینان سے رہو۔ (لمبی سانس لے کر) آج تم لوگوں کے آ جانے سے گھر کتنا اچھا معلوم ہو رہا ہے۔

پردہ

○

دوسرا منظر

ماموں رضا کا بیڈ روم: کمرے کے بیچوں بیچ پلنگ بچھا ہوا ہے
جس کی چادر میلی ہے اور تکیے کا آدھا غلاف اترا ہوا ہے۔ پلنگ کے پاس
ایک تپائی ہے جس پر چند کتابیں بے ترتیبی سے رکھی ہوئی ہیں اور ساتھ
ہی نیلے شیڈ کا لیمپ ہے۔ پلنگ کے سامنے زمین پر کشمیری نمدا بچھا ہوا ہے
جو میلے پن کی وجہ سے خاکی رنگ کا نظر آ رہا ہے۔ اس کمرے میں سامنے
کی دیوار میں ایک دروازہ اور ایک کھڑکی ہے جس پر مٹیالے رنگ کے
پردے پڑے ہوئے ہیں۔ داہنے ہاتھ کی دیوار میں ایک دروازہ ہے جو
غسل خانے میں جاتا ہے اور بائیں طرف کا دروازہ کھانے کے کمرے
میں کھلتا ہے۔ اس وقت غسل خانے کا دروازہ بند ہے اور کھانے کے
کمرے کا نیم وا۔ کمرے کے ایک کونے میں کپڑوں کی پرانی الماری کے
قریب دو بستر اور چند سوٹ کیس وغیرہ سلیقے سے رکھے ہوئے ہیں۔ شاہدہ
بائیں دروازے سے اندر آتی ہے اور دروازے کی چٹخنی لگا دیتی ہے
پلٹ کر اپنے سامان کی طرف آتی ہے اور ایک سوٹ کیس کھول کر اکڑوں زمین
پر بیٹھ کر کچھ الٹ پلٹ کرتی ہے وہ ابھی تک اسی لباس میں ہے جو پہلے منظر
میں پہنے ہوئے تھی۔ غسل خانے کا دروازہ کھلتا ہے اور عزیز ڈریسنگ گون
پہنے نیچے سروں میں گنگناتا، تولیہ سے بال پونچھتا کمرے میں آتا ہے۔ شاہدہ
اپنے کام میں منہمک ہے۔ عزیز کھانے کے کمرے کے دروازے تک جاتا
ہے ہاتھ سے چٹخنی ٹٹول کر واپس آتا ہے اور ہنستے ہوئے شاہدہ کے قریب

(دبے قدموں جاکر اسے جوں کا توں گود میں اٹھانے لگتا ہے شاہدہ کشمکش
کرتی ہے)

شاہدہ: ہائیں ہائیں کچھ دیوانے ہوئے ہیں آپ بھی اللہ چھوڑیئے۔
(اپنے آپ کو چھڑا لیتی ہے)

عزیز: اچھا میری دیوانگی کی اطلاع اس وقت ہوئی ہے آپ کو۔

شاہدہ: اور بھی ہٹئے ادھر جھکے آ گیا، خواہ مخواہ بچوں کی طرح۔

عزیز: شدو، شدو رانی (اس کی طرف بڑھتا ہے) بور ہو گئے شاہدہ، کتنا لمبا سفر تھا اچانک چلنا
ہوا، ورنہ کو پے ریزرو ہو جاتا تو ——— کیوں سفر کیسا ٹھاٹ دار کٹتا؛ کیوں؟

شاہدہ: ہائے اللہ! آپ بھی بس حد ہے کیسی باتیں سوچتے رہتے ہیں (شرماتی ہے)

عزیز: ہاں جانے میرے دماغ کو کیا ہو گیا ہے ——— بھوسہ بھر گیا ہے، واقعی بڑی بداخلاقی کی
بات ہے، یہ سوچنا کہ دو انسان آرام سے سفر کریں ——— بس اب تو آپ کا فتویٰ اچھا ہو گا نا۔
(شاہدہ کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اٹھاتا ہے اور شاہدہ زبردستی سر
نیچا کر لیتی ہے)
(بڑی گہری گمبھیر آواز میں) شدو میری چاند رانی (شاہدہ کے سر پر اپنا گال رگڑتا ہے)

شاہدہ: (ایک دم الگ ہو کر) ہٹئے بس ایک دم گندی ہو رہی ہوں، خود تو جلدی سے نہا دھو کر تازہ دم
ہو گئے اور میرا یہ حال ہے کہ ابھی تک سر میں ریل سی چل رہی ہے اور ناک حلق میں اتنی خاک اٹی
ہوئی ہے کہ جی متلایا جا رہا ہے مگر آپ کو میری حالت سے کیا غرض، ٹھیک تو کہتے ہیں ماموں رضا
کہ نئی نسل والے مادی اقتدار کے پیچھے۔ ———

عزیز: (ایک دم پلٹ کر) ہوں تو یہ کہئے ———
(چپ ہو کر ایک دم ٹہلنے لگتا ہے)

شاہدہ: (غور سے اس کی طرف دیکھ کر) کیا کہوں، کیوں بھئی بد ھ گئے وہ تو میں جانتی تھی۔

عزیز: (ایک دم ہنس کر) کہاں، کہیں بھی نہیں —— اچھا اب آپ جلدی سے نہا لیں پھر سنیما چلیں گے
دو بجنے والے ہیں آدھے گھنٹے میں تیار ہو جائیے۔ کل سے تو میری ڈیوٹی ہے۔ اتنے دنوں بعد
ڈیوٹی پر جانے سے جی گھبرا رہا ہے۔ اس لیے آج ذرا عیش کر لیں۔ سنیما سے واپسی پر کہیں چائے
پئیں گے، پھر کچھ شاپنگ کریں گے اور پھر رات کا کھانا کسی اچھے سے ہوٹل میں کھائیں گے۔
ٹھیک ہے، ہفتہ دس دن میں ہمیں کوارٹر مل جائے گا، اس کے بعد تو آپ گھر والی بن جائیں گی۔
اور گھر کی دھولیں جھاڑنے میں لگ جائیں گی۔

(ناز سے ہنس کر شاہدہ دوبارہ زمین پر بیٹھ کر کپڑے الٹنے پلٹنے
لگتی ہے، عزیز سیٹی بجا کر ٹہلنا شروع کر دیتا ہے دفعتاً وہ رک
کر شاہدہ کی کتابیں الٹنے پلٹنے لگتا ہے)

عزیز: اوہ بڑی بڑی کتابیں جمع کی ہیں ماموں نے، اب سے، یوگ ودیا! (ایک کتاب اٹھا کر فوراً
رکھ دیتا ہے) اور یہ ڈی ایچ لارنس، ایسے، اور پھر یہ مہاتما گاندھی کی "خود نوشت سوانح" اور
یہ افرا ڈائٹ:

(پھر سیٹی بجاتا ہے اور پھر ٹہلنے لگتا ہے، شاہدہ شلوار میں کمر بند
ڈال رہی ہے، اسے ایک لمحے تک غور سے دیکھنے کے بعد عزیز
پلنگ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ جاتا ہے)

شاہدہ! یہ ماموں بھی خوب آدمی ہیں بے چارے

شاہدہ: جی ہاں، بڑے مخلص، بڑے شریف آدمی ہیں بہت پڑھے لکھے ہیں کئی سال یورپ میں رہ آئے
مگر طبیعت ذرا نہیں بدلی، یہاں آکر کیمسٹ شاپ کھول لی اور خاموشی سے زندگی گزار رہے ہیں کہتے
ہیں یورپ صرف جسم ہے اور ایشیا صرف روح، وہ روح کی عظمت کے بہت قائل ہیں

عزیز: گویا روحانیات کے قائل ہیں یعنی روحیں وغیرہ بلانا جانتے ہیں۔

شاہدہ: ہٹئے مذاق نہ کیجئے، آپ نے کیا انھیں شعبدہ باز سمجھا ہے۔ وہ تو بس روح کی عظمت اور

پاکیزگی کے قائل ہیں۔ جیسے ——

عزیز: (بات کاٹ کر) بھئی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی، روح یعنی جان یعنی زندگی —— پھر زندگی تو جسم ہے نا ——

شاہدہ: اونہہ بھئی، ان معنوں میں ——

عزیز: اے تابی سنے ابھئی نوجی، میرے پلّے یہ باتیں نہیں پڑتیں۔ —— ہاں یہ آپ کی نوری خالہ کا کیا قصہ ہے؟

(شاہدہ شلوار میں کمر بند ڈالتے ہوئے عزیز کے پاس پلنگ پر
پاؤں لٹکا کر بیٹھ جاتی ہے، پے در پے کئی ٹھنڈی سانسیں لیتی ہے)

شاہدہ: نوری خالہ بہت زیادہ خوبصورت، بڑی شرمیلی تھیں، رضا ماموں اُن پر مرتے تھے، مگر نوری خالہ اتنی پاک باز تھیں کہ انھوں نے کبھی رضا ماموں کو اپنی انگلی تک نہ چھونے دی۔ ایک بار رضا ماموں نے انگنی پر لٹکتے ہوئے نوری خالہ کے دوپٹے کو آنکھوں سے لگا لیا تھا تو نوری خالہ بہت روئیں اور کہا کہ "رضا تم نے محبت کی پاکیزگی پر خاک ڈال دی —— اس کے بعد رضا ماموں ان کے عشق میں بالکل مجذوب سے ہو گئے یہ قصّے سارے خاندان کی لڑکیوں کو بڑی تفصیل سے یاد ہیں۔

(شاہدہ شلوار گود میں ڈال کر سر اٹھائے کچھ سوچتی ہے اور پھر
ٹھنڈی سانس لیتی ہے۔)

عزیز: ارے پھر نوری خالہ کو رضا ماموں پسند نہ ہوں گے، جبھی تو وہ انھیں چھونا تک گوارا نہ کرتی تھیں۔

شاہدہ: (ملامت بھری نظروں سے دیکھ کر) ارے آپ کیا سمجھیں گے ان باتوں کو، آپ تو بس —— ارے وہ تو کہتی تھیں کہ جو کرنا ہے بیکہ آپا سے کہو، مگر رضا ماموں اور نوری خالہ کے اباؤں کی آپس میں بڑی دشمنی تھی، دونوں بھائی تھے مگر ایک دوسرے سے بیزار، آپ تو جانتے ہیں ہم پٹھانوں کو، بات نہیں بھولتی، رضا ماموں دیوانے بنے ہو گئے مگر رضا ماموں کے ابا کو معلوم ہوا تو بہت بگڑے کہ میرے دشمن کی بیٹی میرے گھر بہو بن کر نہیں آسکتی، رضا ماموں نوری خالہ کے ابا کے پیروں پر گرے بہت گڑگڑائے مگر

انھوں نے جواب دیا کہ تیرے بجائے تیرا باپ آکر پاؤں پکڑے تو پھر اس بارے میں سوچوں گا، پھر بھی وعدہ نہیں ——— یہ قصہ سارے خاندان بلکہ سارے شہر میں اُڑ گیا، رضا ماموں اتنے بیمار پڑے کہ دم لبوں پہ آ گیا۔

عزیز : تو بھگا لے جاتے نوری خالہ کو۔

شاہدہ : (بڑے دکھ سے) واہ! آپ کیسی باتیں کرتے ہیں ہمارے خاندان میں کبھی کا ہے کو ایسی باتیں ہوئی تھیں اور پھر نوری خالہ تو حوروں سے زیادہ پاک تھیں بھلا وہ مر نہ جاتیں اس سے پہلے؟

عزیز : اچھا پھر کیا ہوا؟

شاہدہ : پھر نوری خالہ کی خاندان ہی میں شادی ہو گئی اور بے چاری چُپ چاپ اس سماج

عزیز : (بات کاٹ کر) اچھا پھر کیا ہوا؟

شاہدہ : پھر سات سال بعد نوری خالہ کے خاوند کو دق ہو گئی اور وہ مر گئے ——— رضا ماموں نے پھر نوری خالہ کے آبا کے سامنے ہاتھ پھیلایا... پھر انکار ہو گیا۔ لیکن اس بار نوری خالہ کی مرضی لی گئی، نوری خالہ عزت پر قربان ہونے والی تھیں، باپ سے کہلوا دیا کہ جیسی آپ کی مرضی۔ رضا ماموں کو یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے شکایت بھجوائی۔ نوری خالہ نے جواب بھجوایا کہ کیا تم ایسی لڑکی سے محبت کر سکتے ہو، جو اپنے باپ کا غرور اور عزت خاک میں ملا دے ——— نوری خالہ کے اس جواب کا رضا ماموں پر بہت اثر ہوا، اور وہ پہلے سے کہیں زیادہ نوری خالہ پر مرنے لگے۔

عزیز : سچ بھئی، شادی میں اپنی رضامندی کون سا گناہ تھا۔ میں کہتا ہوں۔

شاہدہ : اپنی بات جانے دیجئے۔ ہاں تو پھر چند سال بعد نوری خالہ کا ایک اور نکاح ہو گیا، سال نہیں گزرا تھا کہ ان کا یہ والا میاں ایک اور عورت سے نکاح کر کے نوری خالہ کا زیور بیچ کر جنوبی افریقہ بھاگ گیا اور وہاں پہنچنے کے پانچ سال بعد اس نے نوری خالہ کو طلاق نامہ بھجوا دیا۔

(شاہدہ دکھ سے ایک دم چپ ہو جاتی ہے)

عزیز : پھر اس کے بعد؟

شاہدہ : اس دوران میں رضا ماموں پر سب نے بہت زور ڈالا کہ وہ کہیں شادی کرلیں۔ مگر رضا ماموں کچھ نہ کہتے۔ وہ کہتے نوری میری ہے میں اسی کا انتظار کروں گا۔

عزیز : اب اس کے بعد تو شادی ہو جانا چاہئے تھی۔

شاہدہ : مگر نہیں ہوئی، نوری خالہ کی بدنصیبی کے پیش نظر ان کے ابا اس بات پر تیار ہو گئے کہ اگر رضا اب اپنے باپ کو لے کر آئے تو وہ نوری خالہ کو رضا سے بیاہ دیں گے۔ سارے خاندان نے اس سلسلے میں دوڑ بھاگ کی تھی۔ اس قصے میں کئی سال لگ گئے، لیکن رضا ماموں کے ابا نے کہا میں اپنے بھائی سے دشمنی ختم کرنے کی غرض سے ان کے گھر کی بیٹی لینے کو تیار ہوں، مگر نوری میری بہو نہیں بن سکتی۔ بلکہ نوری کی سب سے بڑی لڑکی گل بانو۔

عزیز : آں —— مگر کیوں ؟

شاہدہ : نوری خالہ کے بال سفید ہو گئے تھے اس لیے۔

عزیز : مگر رضا ماموں کے بال بھی تو سفید ہو گئے ہوں گے۔

شاہدہ : ہاں مگر رضا ماموں ابھی تک کنوارے تھے اور نوری خالہ دو دفعہ کی بیاہی۔ (شاہدہ کے ہونٹ کپکپانے میں آواز بھرا جاتی ہے) گل بانو کے لیے رضا ماموں کا نام سن کر نوری خالہ نے گھر کے کنوئیں میں چھلانگ لگا دی۔ کچھ کہتے ہیں وہ پانی کی بالٹی نکالنے میں اتفاق سے گر گئیں۔

عزیز : اُفوہ ——— پھر کیا ہوا ؟

شاہدہ : (سسکی لے کر) وہی جو مرنے کے بعد ہوتا ہے۔

(عزیز یوں سر ہلاتا ہے جیسے وہ ایک دم سمجھ گیا ہو، شاہدہ غم سے سر جھکائے ہوئے ہے عزیز اسے بازوؤں سے پکڑ کر تھپکتا ہے۔)

اس کے بعد سے آج تک رضا ماموں نوری خالہ کے نام پر زندہ ہیں مگر انھوں نے کسی عورت کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا، وہ کہتے ہیں نوری جیسی بیوی [illegible] آج نہیں مل سکتی [illegible] اور میں [illegible] انتظار کر رہا ہوں

(شاہدہ وہ چہرے سے آنسو پونچھتی ہے، عزیز ہمدردی سے اس کا
سر سہلاتا ہے اور آرام سے بستر پر لٹا دیتا ہے)

شاہدہ : (ایک دم جذباتی ہو کر) عزیز میرا دل دھڑک رہا ہے، خدا ہماری محبت کو پروان چڑھائے
میرے قریب آجاؤ —— اور قریب !

(عزیز جذباتی ہو کر جھکتا ہے کہ دروازے پر زور کی دستک ہوتی ہے
پردہ دوبارہ اٹھتا ہے، عزیز گھبرا کر دروازہ کھولتا ہے، شاہدہ
آنسو پونچھتی ہوئی غسل خانے میں چلی جاتی ہے، ماموں بڑے معصوم
انداز سے اندر آتے ہیں اور آرام کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں عزیز
شرمندہ سا ہو جاتا ہے)

ماموں : یہ تم یہاں کیوں بند ہو، باہر نکلو صاف ہوا لو (اٹھ کر سامنے کی کھڑکی اور دروازہ کھول دیتے ہیں) صاف ہوا روح کی صفائی کے لیے بے حد ضروری ہوتی ہے

عزیز : جی ذرا شاہدہ کی طبیعت اچھی نہیں تھی، میں نے کہا ہم لوگ نہالیں تو شاید تکان اُتر جائے —— آپ دکان پر سے کب تشریف لائے؟

ماموں : اسے یہاں دکان پر تو میں کہہ آیا کہ میں نہیں آؤں گا۔ دکان پر جانا تو درمیں تنہائی سے بچنے کا مشغلہ ہے جب تک تم لوگ ہو میں دکان پر نہیں جاؤں گا۔

عزیز : (گھبرا کر) جی نہیں جناب! آپ ہماری وجہ سے اپنا نقصان نہ کریں۔ دراصل ہم تو یوں ہی شرمندہ ہیں آپ اطمینان سے اپنے معمول کے مطابق ۔

ماموں : (تیزی سے بات کاٹ کر) ہاں تکلیف کی بات تو یہی ہے جو تم کہہ رہے ہو مگر میں جانتا ہوں کہ اپنے گھر آئے ہوؤں کو اکیلا گھبرانے کے لیے نہیں چھوڑتے ۔

عزیز : (پریشان ہو کر) مگر ہم اکیلے تو نہیں ہیں، ہم بالکل نہیں گھبرائیں گے۔ پھر آپ کا نقصان ہوگا دکان پر نہ جانے سے ۔

ماموں : میرا نقصان کیا ہوگا آدھی درجن ملازم ہوتے ہیں دکان پر ___ اور پھر میاں بے تکلفی معاف کیجئے بلکہ خود مجھے بھی تم لوگوں کے ساتھ رہنا پسند ہے، ایک زمانے سے تنہا رہتے رہتے اکتا گیا ہوں۔

عزیز : میں تو کہتا ہوں آپ تکلف۔

(شاہدہ غسل خانے کا دروازہ زور سے کھٹکھٹاتی ہے)

ماموں : کیا بات ہے شاہدہ؟

عزیز : کپڑے بدلیں گی شاید!

ماموں : اچھا تو پھر آؤ ڈرائنگ روم میں چل کر بیٹھیں!

(ماموں دھیرے دھیرے دروازے تک جاتے ہیں عزیز منہ پھیر کے اپنا سامان اِدھر اُدھر کرنے لگتا ہے گویا بہت ضروری کام یاد آگیا ہو)

ماموں : (دروازے میں غائب ہو کر) آجاؤ بھائی آرام سے بیٹھو آکر۔

عزیز : بہت اچھا جناب حاضر ہوا۔ ذرا کپڑے پہن لوں۔

(عزیز لپک کر دروازے میں چٹخنی لگا دیتا ہے شاہدہ غسل خانے سے باہر آتی ہے وہ گلابی رنگ کا ریشمی ڈریسنگ گون پہنے ہے اور سر پہ تولیہ لپیٹے ہے۔)

عزیز : آگئیں میری شاہدہ رانی : (اس کے سر پر سے تولیہ کھینچ لیتا ہے اور اس کی بھیگی ہوئی لٹیں ہاتھوں میں لے کر اپنے دونوں رخساروں پر بھینچتا ہے شاہدہ مسحور ہو کر مسکراتی ہے)

ایک بات بتاؤں؟

شاہدہ : کیا بات؟

عزیز : بڑے راز کی بات ہے۔

شاہدہ : اللہ جلدی سے بتا دیجئے، کچھ بھی جانا ہے۔

عزیز : (اس کے بازو دبا کر) تم اس وقت سیپ میں سے نکلی ہوئی جل پری لگ رہی ہو۔

شاہدہ : (اتراکر) ہوں ہٹئے کبھی بھی نہیں۔

(اچانک دروازہ بھڑبھڑایا جاتا ہے)

ماموں کی آواز : ارے بھئی عزیز میاں آدمی، بھئی تمھیں اپنا یورپ کا البم دکھاؤں۔

(عزیز کے ہاتھ گر جاتے ہیں مگر وہ شاہدہ کو بازوؤں میں بھینچنے کی ایک بار کوشش کرتا ہے، شاہدہ اس طرح پریشان ہوکر پیچھے ہٹتی ہے، جیسے اُسے کوئی دیکھ رہا ہو۔)

شاہدہ . ہائے اللہ جلدی سے جائیے کیا کہیں گے ماموں، انھیں کیا پتہ مجھے تو شرم آتی ہے لیجیے، یہ کپڑے جلدی سے پہن لیجیے۔

عزیز : اچھا شاہدہ خوب دور دور وہ لو سمجھوں گا تم سے، بڑی خراب ہو تم۔

(پیار سے اس کے بال مٹھی میں لے کر چھوڑ دیتا ہے)

ماموں کی آواز : آچکو عزیز میاں، ایسی بڑھیا چیز دکھاؤں تمھیں۔

عزیز : (غسل خانے کی طرف جاتے ہوئے) حاضر ہوا قبلہ بس ایک منٹ میں۔

پردہ

○

تیسرا منظر

(وہی ڈرائنگ روم، اپنی پچھلی ترتیب کے مطابق پردہ اٹھتا ہے تو
ماموں رضا سامنے بڑے صوفے پر بیٹھے ہیں نیم دراز ہیں ٹانگیں کشمیری تپائی
پر ہیں، پردہ اٹھنے کے فوراً بعد ماموں "ارے آجاؤ بھائی" کا نعرہ بلند
کرتے ہیں، ان کی گود میں سیاہ رنگ کا ایک فوٹو البم رکھا ہوا ہے جسے
وہ الٹ پلٹ رہے ہیں دائیں دروازے سے عزیز ٹائی کی گرہ درست
کرتا ہوا اندر آتا ہے اس وقت وہ گرم چائنیز سوٹ میں ملبوس ہے۔)

ماموں: عزیز میاں کیسے نوجوان ہو بھئی! میں بڈھا آدمی پہلے اٹھ کر نہا دھو کر سونے پر سہاگہ کہ صبح گھر سے نکلتے کے لیے مشکل سے پانچ منٹ تیاری کے لیتا ہوں اور تم ہو کہ کپڑے پہن رہے ہیں۔ ——

عزیز: جی جی! ہاں بس، ابھی ہی۔

ماموں: شاہدہ کہاں ہے ادھر سے بھئی شاہدہ!

عزیز: جی وہ تیار ہو رہی ہیں، ہمیں پکچر جانا ہے اس وقت

ماموں: پکچر؟ ارے بھئی ان پکچرز میں دکھاری کیا ہوتا ہے مجھے تو نفرت ہے یورپ میں دو ایک بار دوستوں کے اصرار پر گیا۔ مجھے تو اختلاج ہو گیا، گری ہوئی عشق بازیاں دیکھ کر، عزیز میاں بات در اصل یہ ہے کہ زمانہ آج کل اقتدار کے پیچھے بھاگ رہا ہے اس سے محبت کا اعلیٰ اور ارفع جذبہ بھی محفوظ نہیں رہا۔ —— اور پھر یہ غیر ملکی کتابیں اور فلمیں، فلم تو صرف جسم ہی جسم ہیں۔

عزیز: جی جی ہاں ٹھیک ہے۔

ماموں: پھر فلم دیکھ کر اپنا وقت کیوں ضائع کرتے ہیں؟

عزیز: یوں ہی جناب، بس دیکھ لیتا ہوں —— پھر اس وقت تو شاہدہ جانا چاہتی ہے، بات

یہ ہے کہ شادی کے بعد ہمیں پہلی مرتبہ خودمختاری ملی ہے۔ ہم دونوں پہلی بار اکٹھے فلم دیکھنے جا رہے ہیں ——— (گھڑی دیکھ کر) اوہ کافی وقت ہو گیا۔

(یوں تو ظاہر کرتا ہے جیسے دوسرے لمحے اسے چل دینا ہے۔)

ماموں : (حیران ہو کر) خوب! شاہدہ کے بارے میں تو سنا تھا کہ وہ فلموں سے بہت چڑتی ہے۔ (اندر سے) شاہدہ! ارے شاہدہ بی بی، ادھر تو آؤ۔

(عزیز متذبذب کیفیت میں ادھر اُدھر ٹہلتا رہتا ہے۔ شاہدہ خوب بنی سنوری ہاتھ میں سیپ ستاروں سے مزین سرخ بٹوہ لیے نظر آتی ہے۔ عزیز اس کی طرف دیکھ کر بے تابی سے چلنے کا اشارہ کرتا ہے۔ ماموں جلدی سے اُٹھ کر شاہدہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیتے ہیں۔)

شاہدہ : (عزیز کی طرف دیکھ کر) چلئے گا نہیں، تین بج رہے ہیں۔

ماموں : چلی جانا، میں روکوں گا نہیں، مگر پوچھتا ہوں تم فلموں کی قائل کب سے ہو گئیں۔

شاہدہ : جی ہاں کنوارپنے میں فلم کا زیادہ شوق بہتر نہیں ہوتا مگر اب تو (شرماتی ہے)

ماموں : مگر فلم میں رکھا ہی کیا ہوتا ہے؟

شاہدہ : مگر دیکھیے انسان کوئی تفریح تو کرے۔ چلیے نا، اس وقت تو آپ بھی ہمارے ساتھ چلیے۔ (تیزی سے اٹھ کھڑی ہوتی ہے) پھر ٹکٹ نہیں ملے گی۔

ماموں : خوب! میں چلوں پکچر! کمال ہے۔ اچھا تم لوگ چائے تو پی لو۔

عزیز : بس آپ تکلیف نہ کریں ہم دونوں وہیں چائے پی لیں گے۔ رات کھانے پر بھی ہمارا انتظار نہ کریں۔

(ماموں کچھ بڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں)

ماموں : اچھا میں نوکر سے تانگے کے لیے کہہ دوں۔

(ماموں اپنی دروازے سے جاتے ہیں)

عزیز : (بیچوں کی ہوا کترتا ہے) خوب ضد کی آپ نے اس وقت، میں تو سمجھا تھا پروگرام غرق ہوا۔

(مسکراکر) اور ہاں یہ آپ نے ماموں کو ساتھ چلنے کی دعوت کیوں دی تھی؟ میں جانتا ہوں یہ مجھ سے دور بیٹھ کر بیٹھنے کی ترکیب نکالی تھی آپ نے۔ وہ تو کہو شکر ہے کہ وہ پکچر وغیرہ پسند نہیں کرتے۔

شاہدہ : (بٹوہ انگلی میں لٹکا کر جھلاتے ہوئے لچک لچک کر) جی یہ بات مجھے معلوم تھی جبھی تو میں نے انہیں دعوت دے دی۔

عزیز : ہوں، چالاک لڑکی! اچھا اسی بات پہ (جلدی سے بڑھ کر شاہدہ کا ہاتھ چومتا ہے) پیسے کافی رکھ لیے ہیں نا؟ ہو سکتا ہے رش ہو، باکس کا ٹکٹ تو لیں گے، کیوں؟

شاہدہ : (ناز سے بگڑ کر) پھر بے ایمانی کی باتیں ——————— جائیے ہم نہیں بولتے۔ (ہاتھ چھڑاتی ہے)

عزیز : ارے پتہ نہیں کیسی باتیں سوچتی ہیں آپ ——————— یہ بیویوں والے ڈھنگ نہیں ———

شاہدہ : بیوی ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ——————— واہ ہر وقت میرا مذاق بنائے رکھتے رہیں۔

عزیز : ہر وقت؛ میرا تو جی چاہتا ہے، آنکھوں پر بٹھاؤں۔ ——————— محبت ایسی اندھی ہوتی ہے۔

شاہدہ : (ایک دم منہ اتر جاتا ہے اور سنجیدگی سے پلکیں جھپکا کر) اگر محبت صرف مذاق بنا لینے کا نام ہے تو رضا ماموں پھر ساری زندگی آپ کے خیال میں جھک مارتے رہے ——— سچی محبت تو محض نام پر زندگی بسر کروا دیتی ہے۔

عزیز : (ایک لخت سنجیدہ ہو کر) مگر شاہدہ! مرد اور عورت کی محبت میں

ماموں : (اچانک کمرے میں آتے ہوئے) تانگہ آگیا۔

(دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنستے ہیں)

ماموں: (کوٹ کا کالر درست کرتے ہوئے) چلو بھئی جلدی چلیں۔

شاہدہ: آپ دکان پر جا رہے ہیں؟ اچھا ہے۔

ماموں: (حیران ہو کر) دکان کیوں۔ جب تک تم لوگ ہو دکان جانا بند۔

عزیز: پھر؟

ماموں: (شفقت سے ہنستے ہوئے) میں نے کہا نا شاہدہ بٹیا نے ساتھ چلنے کو کہا ہے۔ نہ گیا تو تم لوگ بُرا مانو گے۔ نئے دولھا دولھن کی بات نہیں ٹالنا چاہیے۔ چلو میں بھی تمھارے ساتھ چلتا ہوں بھئی میں ڈرتا ہوں۔ تم لوگ مجھے بالکل داڑھی والا بوڑھا ماموں نہ سمجھ لو۔

(بڑا جوان قہقہہ لگاتے ہیں اور شاہدہ اور عزیز کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر دروازے سے غائب ہو جاتے ہیں)

پردہ

○

چوتھا منظر

(وہی ڈرائنگ روم اور وہی ترتیب، صرف اتنی تبدیلی ہے کہ کمرے
کی تمام روشنیاں جل رہی ہیں عزیز کمرے میں اکیلا صوفے پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھا
ہے، اس نے سیاہ پتلون، سوٹ کے ساتھ ڈریسنگ گاؤن پہنے ہے وہ تھکا ہوا
نظر آتا ہے۔ کئی انگڑائیاں اور جمائیاں لینے کے بعد ہاتھ میں جلتی ہوئی سگریٹ
ایش ٹرے میں مروڑ دیتا ہے۔ چند لمحوں بعد شاہدہ اندر سے کپڑے بدلے اور
گرم لبادہ اوڑھے آتی ہے اور عزیز کے پیروں کے قریب صوفے پر ٹک
جاتی ہے۔)

شاہدہ: پتہ نہیں ماموں جان سینما سے واپسی پر بازار میں کیوں اتر گئے ---- معلوم ہوتا ہے کھانے
میں کچھ تکلف شامل کریں گے (رک کر) ہمیں ہوٹل میں کھانے سے روکا اس لیے سوچا ہوگا حلوہ
پراٹھا جیسا مزہ ---- ماڈرن ہوٹل ---- ہمارا خیال ہے ہم لوگوں کی اتنی خاطر کر رہے ہیں
بے جا ہو رہی ہے۔

(عزیز خاموش چھت کی طرف دیکھتا رہتا ہے)

کیا بھوک لگ رہی ہے؟ لگی تو ہوگی، سفر میں کھانا اچھی طرح کھایا نہیں جاتا۔

عزیز: نہیں تو!

شاہدہ: پھر چپ کیوں ہیں؟ کیا بہت تھک گئے؟ جائیے تھوڑی دیر آرام کر لیجیے ماموں کے بستر پر لیٹ
جائیے۔ ماموں آجائیں تو جلدی سے کھانا کھا کر سونے کا انتظام کریں۔ (عزیز خاموش رہتا ہے۔ شاہدہ
اسے غور سے دیکھتی ہے) معلوم ہوتا ہے آپ کو یہ جگہ پسند نہیں آئی۔ ابھی سے جا رہے ہیں۔ ماموں رئیس
تو نہیں مگر دل کے بڑے ہیں جب سے ہم آئے ہیں کتنی اپنائیت سے پیش آ رہے ہیں۔

عزیز : بے شک ! لیکن میں کوئی اعتراض تو نہیں کر رہا ہوں ۔ ویسے ہی طبیعت ذرا سست ہے ، پھر پوچھی
اس لیئے اور آپ خدا جانے کیا کچھ سوچنے لگیں ، دراصل آپ کے ماموں کی بڑی عنایت ہے کہ وہ

شاہدہ : (تیوری سے) آپ نے پھر عجیب سی باتیں شروع کر دیں ۔ خیر !

عزیز : (صوفے پر بیٹھ کر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے) میں آپ سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا دراصل
اب تک تو اس کا موقع ہی نہ ملا ------ اب ہم ------

شاہدہ : تو کیجئے باتیں ، روک کون رہا ہے ۔

عزیز : دیکھئے شاہدہ (اس کا چہرہ اپنی طرف کر کے سنجیدگی سے) میں کہنا چاہتا تھا کہ ---

ماموں : (اندر آکر ہنستے ہوئے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر) بتاؤ میں تم لوگوں کے لیئے کیا لینے گیا تھا ؟

شاہدہ : (عزیز کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے بچوں کی طرح) ماموں آپ میرے لیئے ٹافی لائے
ہوں گے ۔ جب میں چھوٹی سی تھی تو آپ ٹافی لایا کرتے تھے

ماموں : (بزرگ بنتے ہوئے) اچھا بھئی ، ذہین لڑکی ہے ۔ یہ لو اپنی ٹافی (جیب سے چھوٹا ڈبہ نکال کر دیتے ہیں)
اور پھر جادوگروں کے انداز سے پوچھتے ہیں) اچھا اب بتاؤ اصل میں کیا لایا ہوں ؟ تھوڑا اتہ پتہ
بتائے دیتا ہوں ۔ خوب چمکنے ، بڑے رنگین ہاتھ میں آکر پھسلتے ہیں ، ایک منٹ کے اندر بتاؤ ورنہ
ہار جاؤ گے ۔

شاہدہ : (خوش ہو کر عزیز کی طرف شرارت سے دیکھتے ہوئے) آں ۔ آں ! اچھا یہ بتایئے ، یہ کس کام کے
لیئے یعنی استعمال کیا ہے ؟ یہ معلوم ہو تو فوراً بوجھ لیں گے ۔

ماموں : (بہت دلچسپی لیتے ہوئے) تو اتنا حوالہ دیتا ہوں ، بھئی کھیلنے کی چیز ہے ۔

عزیز : اجی کر ، بنٹے ۔

ماموں : آئیں ! بنٹے کیا ؟

عزیز : شیشے کی گولیاں !

ماموں : ہار گئے تم لوگ ۔

(جیب سے تاش کا پیکٹ نکال کر تپائی پر پھینکتے ہیں اور عزیز بھانجی لیتا ہے)

ماموں: (ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتے ہوئے، عزیز کے پاس شش کر) بھئی برسوں ہوگئے تاش کھیلے ہوئے، بچپن میں کھیلتا تھا، مگر آج سوچا تم لوگوں کے ساتھ مل کر کھیلوں تم خوش ہوگے تو میں بھی خوش ہوں گا۔

عزیز: (سر پکڑ کر) مگر ماموں صاحب میں تاش کھیلنا بھول گیا ہوں اور پھر مجھے دلچسپی بھی نہیں۔

شاہدہ: (چونک کر اتر سے منہ سے عزیز کی طرف دیکھتے ہوئے) ماموں! انھیں آرام کرنے دیجئے، یہ تھک گئے ہیں کل کھیلیں گے سب یا آئیے، ہم آپ کھیلیں۔

ماموں: واہ ری لڑکی، یہ کیسے ہو سکتا ہے تم اکیلے کھیلو گی آج کل کے جوڑوں میں اتنی بھی مروت نہیں ہایک وہ لوگ تھے کہ جان دے دیتے تھے۔

(شاہدہ شرمندہ ہو کر رہ جاتی ہے)

عزیز: مگر ماموں! ان باتوں سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کھیلئے آپ دونوں میں ذرا آرام کروں گا۔

ماموں: واہ! ابھی نہیں تم ہی کھیلو، اٹھو کھانا لگے جب تک بازی جمے گی، چلو رمی ہو جانے۔

عزیز: ارے ذاری سے، مجھے رمی نہیں آتی۔

ماموں: ایک منٹ میں آ جائے گی۔

(تاش پھینٹ کر بانٹنے لگتے ہیں، عزیز مڑ کر آتش دان کو گھورتا ہے اور پھر سستی سے پتے اٹھا لیتا ہے۔)

ماموں: (پتے دیکھتے ہوئے) جب تک تم لوگ ہو نہ تو میں دکان پر جاؤں گا نہ کہیں، دن بھر مزے سے تاش کھیلا کریں گے اس طرح تم لوگوں کا پردیس میں جی نہیں گھبرائے گا —— میرا جی بھی خوش رہنے لگا گھر کتنا اچھا لگنے لگا ہے تم لوگوں کے آنے سے۔

پردہ

○

چھٹا منظر

(وہی ڈرائنگ روم۔ روشنیاں بدستور جل رہی ہیں خواب گاہ کا پردہ
کھسکا ہُوا ہے۔ اس کمرے سے عزیز رومال سے ہاتھ پونچھتا ہوا اندر
آتا ہے اس کے پیچھے شاہدہ تولیہ سے ہاتھ پونچھتی آ رہی ہے۔ عزیز
سستی اور پیٹ بھرے پن سے صوفے پر بیٹھ جاتا ہے کھانے کے
کمرے سے برتن اٹھانے کی آواز آ رہی ہے)

شاہدہ : (بجھی ہوئی آواز میں) چھوٹا سا گھر ہے، کوئی خالتو مزہ نہیں میرا خیال ہے ہم یہیں قالین پر بستر لگا لیں
کیوں کیا خیال ہے؟

عزیز : (دانت کریدتے ہوئے سرجھری سے) ہاں ٹھیک ہے!

شاہدہ : ماموں تو اصرار کر رہے ہیں کہ سب کے سب انہی کے بیڈ روم میں سو رہیں (ہنس کر) کتنے بھولے ہیں
بے چارے ماموں، بالکل فرشتہ! انہیں پتہ ہی نہیں کہ سر تاج من سلامت کا منہ پھولا ہُوا ہے
(شوخی سے عزیز کے بال پکڑ کر چھوڑ دیتی ہے)

عزیز : (مسکرا کر لڑنے کی کوشش کرتے ہوئے) ہاں منہ پھولا ہُوا ہے، کب سے دورہ کر رہی
ہیں ـــــ میں تو سچ مچ ناراض ہوں، مجھے معلوم ہوتا کہ آپ یہاں پہنچ کر اور دُور ہو جائیں گی
تو سیدھا ہوٹل جاتا۔

شاہدہ : (ہنس کر) بڑے خود غرض ہیں آپ، جی چاہتا ہے کہ بس ـــــــ
(مٹھیاں بند کر کے کھول دیتی ہے)

عزیز : کیا چاہتا ہے جی! ذرا ہمیں بھی تو معلوم ہو'
(شاہدہ کا ہاتھ پکڑ کر محبت بھری نظروں سے دیکھتا ہے)

شاہدہ: (ہاتھ چھڑا کر) ابھی اللہ بڑے وہ ہیں آپ جائیے ہم سے نہ بولیئے۔

عزیز: بولیں گی کیسے نہیں، ابھی سارے دروازے بند کر کے گلا دباؤں گا تو پھر جلدی سے ماموں کو مدد کے لیے پکارنا (پیار سے اس کی گردن دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر) یوں!

شاہدہ: یہ پھر آپنے قصائی پن سے مجھے دھمکایا، پھر کہوں کہ فوجی ہیں۔

عزیز: (الگ ہو کر) اچھا آیئے میل کریں ——— (ہاتھ پکڑ کر دباتا ہے) چلئے اب جلدی سے بستر یہاں سے اٹھئیں۔ دو دن سفر میں کیٹے اور آج کا دن بھی یونہی ہوتے گزرا، دراصل مجھے آپ سے بہت سی اہم باتیں کرنا ہیں ——— (ایک دم سنجیدہ ہو کر) اب ہم نئی زندگی شروع کر رہے ہیں۔ ابھی تک تو میری امی نے آپکو دلہن بیگم بنا رکھا اور اب میں اتنی جلدی سے آپ کو ساتھ لا کر گھر والی بنانے دے رہا ہوں ——— ان میں تو بات کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ بے چارے آپ کے ماموں جان دکان نہیں جائیں گے (ٹھنڈی سانس لے کر) پھر جب میں ڈیوٹی سے واپس آؤں گا تو بے چارے آپ کے ماموں ہمارے ساتھ بیٹھ کر تاش کھیلیں گے ہم باہر جائیں گے تو وہ بے چارے بڑا ماننے کے خیال سے ہو سکتا ہے ہمارے ساتھ جائیں۔ بس اب تو جب تک ہمیں کوارٹر نہیں ملتا یوں ہی چلے گا دعا کرو دو چار دن میں مل جائے۔

شاہدہ: (ٹھنڈی سانس لے کر) آپ تو یوں ٹھنڈی سانسیں لے رہے ہیں جیسے پھنس گئے ہیں۔ بیچارے ماموں محض ہماری خاطر تو اتنی قربانی کر رہے ہیں۔ اب انہیں کیا معلوم کہ آپ ——— خیر میں تو کہتی ہوں جب تک کوارٹر نہیں ملتا ہوٹل میں رہ لیں۔ مگر بے چارے ماموں کا دل ٹوٹے گا، اب یہاں رک گئے ہیں تو چند دن بسر کر لیجئے، ورنہ سارے خاندان میں ہماری بدتمیزی اور بدمزاجی کے چرچے ہوں گے (منہ پھیر کر) مجھے معلوم ہوتا کہ آپ میرے رشتے داروں کو پسند نہیں کرتے تو ———

عزیز: (پریشان ہو کر) جو بھی شدوررانی! آپ خدا جانے بات کہاں کی کہاں لے جاتی ہیں — میرا یہ مطلب تھوڑی تھا کہ مجھے یہاں کسی اور قسم کی تکلیف ہے۔ (خوشامد سے) میں کیا کروں شدو!

ہوجاتے ہیں شاہدہ اور عزیز ایک دوسرے کو پریشان نظروں
سے دیکھتے ہیں شاہدہ عزیز کے قریب آکر بے بسی سے کھڑی ہو
ہو جاتی ہے ۔)

عزیز : شاہدہ (سوکھی سوکھی نظروں سے دیکھتا ہے)

شاہدہ : (عزم سے) نہیں ہم یہیں سوئیں گے قالین پر ۔

(شاہدہ تیزی سے خوابگاہ والے دروازے میں چلی جاتی ہے عزیز
پریشان کھڑا ہے خوابگاہ میں ماموں اور شاہدہ کی تیز تیز آوازیں سنی جاسکتی ہیں
اور اس کے بعد شاہدہ بستر بند گھسیٹتی ہوئی اور ہنستی ہوئی ڈرائنگ روم میں
داخل ہوتی ہے بستر عزیز کے سامنے بڑے فاتحانہ انداز سے ڈال کر ہاتھ
جھاڑتی ہے)

شاہدہ : (اونچی آواز سے) میں کہتی ہوں ماموں خواہ مخواہ ہم سے غیروں جیسا تکلف کرتے ہیں بھلا قالین پر
گدا بچھا کر سونے میں کون سی تکلیف ہوگی؛ بھلا ہم ماموں کے کمرے میں سو کر انہیں کیوں ڈسٹرب
کریں

عزیز : (اونچی آواز سے) اور کیا بلکہ پلنگ سے زیادہ تو زمین پر مجھے آرام ملتا ہے میں تو اپنے گھر میں بھی
کبھی کبھی خوشی سے زمین پر سوتا ہوں، پھر ماموں کی برسوں کی تنہائی کی عادت، بیماری وجہ کر وہ اپنا
طرز زندگی کیوں بدلیں ۔ کیوں شاہدہ ؟

(پیار سے شاہدہ کے گال پر چپت لگا کر بستر کھولتا ہے)

شاہدہ : بالکل ٹھیک ہے، جب سے ہم آئے ہیں ماموں ہمارے لیے کتنی تکلیف اٹھا رہے ہیں ۔

(شاہدہ گدے اٹھا کر بچھاتی ہے اور پھر دونوں مل کر گدے
تلے اوپر بچھاتے ہیں ——— عزیز کھانے کے کمرے میں
کھلنے والا دروازہ بند کرتا ہے اور شاہدہ گرم چادر اتار کر صوفے پر

پھینکتی ہے، عزیز دھم سے بستر پر لمبا لمبا لیٹ جاتا ہے، اور
شاہدہ خوابگاہ والے دروازے کی طرف بڑھتی ہے اور دروازہ
بند کرنے لگتی ہے کہ اچانک ماموں کندھے پر اپنا بستر اٹھائے
اندر گھس آتے ہیں۔

شاہدہ: (تقریباً چیخ کر) ارے ماموں!

(عزیز بستر پر لُڑھک کر بیٹھ جاتا ہے)

ماموں: (بستر عزیز کے بستر کے قریب ڈال کر) بھئی تم لوگ زمین پر سوؤ گے تو میں پلنگ پر نہیں سو سکتا، میں بھی زمین پر سوؤں گا۔ حد ہے میرے گھر میں برسوں بعد کوئی آئے اور زمین پر لیٹے

(ماموں بڑے دکھی انداز میں اپنا بستر عزیز کے قریب بچھانے لگتے ہیں۔ عزیز اچک کر الگ کھڑا ہو جاتا ہے شاہدہ چپ چاپ دروازے کے قریب کھڑی ہے)

ماموں: ارے بھئی عزیز میاں تم کھڑے کیوں ہو گئے لیٹو، میں بھی کوئی بڈھا داڑھی والا ماموں ہوں، میں تو اپنے چھوٹوں سے برابری کا سلوک پسند کرتا ہوں، میرا لحاظ نہ کرو، بے تکلفی سے لیٹو میاں اور شاہدہ تم کھڑی کیوں ہو، تمھارا بستر کہاں ہے؟

(شاہدہ اور عزیز شرمندہ ہو کر ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں شاہدہ مردہ چال سے آ کر گھٹنوں کے بل جھک کر اپنا گدا الگ کر لیتی ہے۔ چند لمحوں کے بعد سکوت کے بعد تینوں بستر پر لیٹ جاتے ہیں۔ ترتیب یوں ہے، بیچ میں عزیز، عزیز کے بائیں طرف شاہدہ اور دائیں طرف ماموں)

ماموں: گھر کتنا اچھا معلوم ہو رہا ہے آج، جب تک تم لوگ ہو روزانہ سب مل کر اسی طرح زمین پر لیٹا کریں گے۔ واقعی زمین پر پلنگ سے زیادہ آرام ملتا ہے۔

(پردہ تیزی سے گرتا ہے)

ساتواں منظر

پردہ اٹھتا ہے تو اسٹیج پر اندھیرا ہے بارہ کا گجر ہوتا ہے۔ اچانک تیز روشنی کی ایک کرن نمودار ہوتی ہے اور تینوں کرداروں کے چہرے روشن ہو جاتے ہیں، صرف عزیز لیٹا ہوا جاگ رہا ہے اور سر کھجا رہا ہے۔ ایک لمحے بعد روشنی مینٹل پیس پر رکھی ہوئی بڑی سی تصویر پر مرکوز ہو کر غائب ہو جاتی ہے ——— چند لمحوں کے لیے اندھیرا ہو جاتا ہے

اور پھر)

عزیز : (اچھل کر) بھوت بھوت ———

(اور اس کے بعد ماموں اور شاہدہ کی ملی جلی چیخیں اچانک روشنی ہوتی ہے تو ماموں سوئچ کے پاس کھڑے کانپتے نظر آتے ہیں، شاہدہ خوف سے اپنے گالوں کو تھامے کھڑی ہے، عزیز بستر پر بیٹھا جھوم رہا ہے

عزیز : (دھیمی آواز میں) بھوت ——— بھوت شدہ بھوت ہے یہاں

(شاہدہ ڈر کر ادھر ادھر دیکھتی ہے)

شاہدہ : (قریب آکر ڈرتے ہوئے) کہاں تھا بھوت ؟

ماموں : کیسا بھوت تھا؟

عزیز : (بدستور) بھوت، بھوت شدہ۔

شاہدہ : (گھبرا کر تقریباً روتے ہوئے) ہائے اللہ عزیز صاحب کیا ہو گیا آپ کو۔

عزیز : (ڈوبی ہوئی آواز میں) بہت بڑا بھوت، نوری خالہ کی تصویر کا بھوت وہ سامنے سرہانے کھڑا تھا۔ کہتا تھا تم دونوں کو کھا جاؤں گا ——— خیاؤں ——— خیاؤں بولتا تھا، ایک دم سفید شدہ !

بھوت ہے یہاں، بھاگو یہاں سے۔

ماموں گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھتے ہیں اور پھر خوفزدہ ہو کر جلدی

سے دونوں کے قریب آجاتے ہیں)

ماموں : کیا کہہ رہے ہو، نوری کی پاک روح کا بھوت ؟

عزیز : شدو ! ایک دم سفید بھوت، خیاؤں، خیاؤں کرتا تھا اس نے کہا تم دونوں کو بھی پاک کریں گے

یہاں بھوت ہے۔

(دفعتاً عزیز اچک کر تکیہ اور کمبل اٹھا کر خوابگاہ کے دروازے کی

طرف بھاگتا ہے اس کے پیچھے شاہدہ ہے دونوں خوابگاہ کے دروازے

میں گھس کر دروازہ بند کرتے ہیں کہ اس لمحے ماموں بھوت بھوت چلاتے

اسی دروازے کو اپنے جسم کی پوری طاقت سے دھکا دے کر

کھولتے ہیں اور اندر غائب ہو جاتے ہیں، اس کے فوراً بعد اسٹیج پر ایک

دم اندھیرا ہو جاتا ہے۔)

اور پردہ گرتا ہے